قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ❖ شمارہ 07 ❖ جون 2013ء

ماہنامہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراز علی ہاشمی 0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

پانچ سال، کٹھن پانچ سال بالآخر گزر ہی گئے۔ مہنگائی، لاقانونیت، دہشت گردی کے زخموں نے کسی پل چین لینے نہ دیا مگر سچ کہا گیا ہے کہ وقت کا کام ہے گزرنا وہ گزر ہی جاتا ہے۔ یہ دشوار ترین ایام بھی گزر گئے اور عوام نے نواز شریف کو منتخب کرلیا۔ میاں صاحب میدانِ سیاست میں نووارد نہیں ہیں، اس سے قبل 26 سال ایوان میں گزار چکے ہیں لیکن اس بار انہیں انتہائی دشوار مراحل کا سامنا ہے۔ عوام میں مہنگائی، لوڈشیڈنگ اور دہشت گردی کی وجہ سے غم وغصہ بھرا ہوا ہے۔ اس لیے ہر قدم پھونک کر اٹھانا ہوگا، پھر جاتے جاتے پچھلی حکومت نے ایران سے گیس پائپ لائن کا معاہدہ کرلیا تھا۔ یہ معاہدہ نادیدہ آقاؤں کو بالکل پسند نہیں کیونکہ اضافی گیس کی پاکستان آمد بے شمار مسائل کا حل ہے اور پاکستانی معیشت کے استحکام کا باعث ہے۔ پھر گوادر پورٹ کا مسئلہ بھی سامنے ہے جس کی وجہ سے صرف راہداری ٹیکس کی مد میں وطنِ عزیز کو اتنا مل جائے گا کہ ڈھائی، تین سال میں تمام بیرونی قرضے ادا ہوجائیں گے۔ یعنی پاکستان کلی طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے گا اور یہ بات مغربی دنیا کو کسی طور پسند نہیں کہ گوادر پورٹ چین کے تصرف میں آئے اور چین مغرب کی منڈیوں پر قابض ہوجائے۔ اس کے علاوہ دیگر چھوٹے مسائل بھی ہیں جن میں سرفہرست کیئر ٹیکر گورنمنٹ کی مختلف محکموں میں عہدوں کی بندر بانٹ ہے۔ اس کا کڑوا پھل بھی میاں صاحب کو چکھنا ہے۔ گزشتہ بار جب اقتدار کا تاج ان کے سر پر تھا تو انہوں نے نعرہ دیا تھا ''کشکول توڑ دیں گے'' جس کے جواب میں بیرونِ ملک مقیم افراد نے لاکھوں ڈالرز عطیہ کیا تھا۔ امید ہے اس بار میاں صاحب واقعی کشکول توڑ کر عوام کو بیرونی قرضوں کے بوجھ سے نکال لیں گے۔ ورنہ بقول حفیظ میرٹھی ؎

ہم ضرورت اور انا کی کشمکش دیکھا کیے
بھیک ٹھکرایا کیے دامن بھی پھیلایا کیے

معراج رسول

مردِ میدان

سرگزشت

کشمیریوں کا وہ ایک مشہور گھرانا تھا۔ اس گھرانے کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت پنجاب کے دو ہی بڑے شہر تھے ایک تھا لاہور اور دوسرا امرت سر، یہ خاندان امرتسر میں رہ رہا تھا۔ اسی خاندان میں 1882ء میں اس بچے نے جنم لیا۔ باپ نے اپنی پسند سے اس کا نام غلام محمد رکھا۔ خاندان میں رائج رسم کے مطابق پیدا ہونے کے چالیس دن بعد اس بچے کو غسل وغیرہ کرا کر نئے کپڑے پہنائے گئے پھر باپ نے گود میں اٹھایا اور گھر سے کچھ دوری پر بنے اکھاڑے میں لے جا کر مٹی پر لٹا دیا، چچا نے اسے گود میں اٹھایا اور چوم کر دوبارہ مٹی پر لٹا دیا پھر دونوں پیروں کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک ہاتھ کی دوری پر لے گئے اور پھر اسی عمل کو دہرانے کے لیے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ننھا سا بچہ، اس افتاد پر اسے گھبرا جانا چاہیے تھا۔ زور زور سے رونا چاہیے تھا مگر وہ تو کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی دیکھ کر چچا نے کہا ''عزیز بھایا یہ تو بہت نام کمائے گا۔'' عزیز نے پیار بھری نظروں سے بچے کی طرف دیکھا پھر بھائی سے کہا ''اب اس کی تربیت تمہاری ذمے داری ہے۔ غلام خاندان کا نام اونچا کرنے کے لیے اچھی تربیت کی بہت ضرورت ہے۔'' چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کی بات پر مسکراتے ہوئے تائید میں گردن ہلا دی اور اسی روز اس نے عہد کرلیا کہ اس شیر خوار کو اپنے فن میں ایسا طاق بنائے گا کہ ایک عالم اس کے فن کا لوہا مانے گا۔ شہرت کا ہما اس کے سر پر بیٹھے گا۔ وہ بچہ ابھی پالنے میں تھا پھر بھی چچا پابندی سے بھتیجے کے پاس آتا اور اکھاڑے کی مٹی اس کے بدن پر مل دیتا۔ دن بھر وہ بچہ سرسوں کے تیل میں گویا نہایا رہتا اس لیے چچا جب سورج ڈھلے مٹی لے کر آتا اور اس کے بدن پر ملتا تو وہ زور زور سے کھلکھلانے لگتا تب وہ بھائی کو مخاطب کرتا ''دیکھ لینا یہ ہم سب سے آگے بہت آگے جائے گا، ابھی سے اسے مٹی پسند ہے تو یہ مٹی کی عزت کا رکھوالا ثابت ہوگا۔'' بھائی جواب میں مسکرا کر رہ جاتی۔ وہ بچہ ابھی تین سال کا ہی ہوا تھا کہ باپ نے اسے اکھاڑے کی دھول میں لڑھکانا شروع کردیا۔ سورج نکلنے سے ذرا پہلے اسے لے جا کر دھول میں بٹھاتا اور اپنے ہاتھوں سے اس کے جسم پر مٹی ملتا۔ پھر جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اسے رسم ادا کرکے چچا کی شاگردی میں باضابطہ دے دیا گیا۔ اب اس کی تربیت کی پوری ذمے داری چچا پر تھی۔ وہ اسے آنے والے دنوں کے لیے تیار کرنے لگا۔ 1910ء میں جب وہ اٹھائیس سال کا تھا تو اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ اس وقت پورے برصغیر میں رحیم پہلوان کا طوطی بول رہا تھا۔ اسے رستمِ ہند کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کی طاقت سے سب ڈرتے تھے۔ وہ تین سو کے قریب پہلوانوں کو اٹھا کر پٹخ چکا تھا۔ ایسے قوی پہلوان کو للکارنا آسان نہیں مگر غلام محمد نے اسے چاروں شانے چت کردیا۔ رحیم پہلوان کو شکست دینا معمولی بات نہ تھی۔ پورے برصغیر میں واہ واہ مچ گئی۔ اسی سال انگلستان میں جان بل ورلڈ ریسلنگ چیمپئن شپ منعقد ہوئی۔ اس میں شرکت کے لیے دنیا بھر کے پہلوانوں کو مدعو کیا گیا۔ برصغیر سے غلام محمد کو دعوت دی گئی۔ غلام محمد اپنے بھائی غلام بخش اور احمد بخش کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہاں ایک سے ایک دیو قامت پہلوان آئے ہوئے تھے۔ غلام محمد کا قد کم تھا۔ اس کے چھوٹے قد کو دیکھتے ہوئے منتظمین نے اسے مقابلے میں شریک ہونے سے منع کردیا۔ تب غلام محمد نے وہاں موجود تمام پہلوانوں کو چیلنج دے دیا کہ اگر کوئی اسے پانچ منٹ سے زیادہ روک لے گا تو وہ اسے اپنی طرف سے پانچ پاؤنڈ بطور انعام دے گا۔ شروع میں تین پہلوان مقابلے میں اترے انہیں دو سے ڈھائی منٹ میں غلام محمد نے چت کردیا۔ پھر دنیا کے مشہور پہلوانوں میں سے بارہ اکھاڑے میں اترے اس نے انہیں بھی دو دو ڈھائی ڈھائی منٹ میں شکست دے دی۔ اس کی چستی پھرتی اور قوت کا صحیح استعمال دیکھ کر منتظمین نے مقابلے میں شرکت کی اجازت دے دی۔ اس عالمی مقابلے میں اس کے مقابل پولینڈ کے پہلوان زبسکو کو اتارا گیا، اس مقابلے کو ''اس صدی کی کشتی'' کا نام دیا گیا تھا۔ مقابلہ شام چار بجے شروع ہوا۔ پہلے راؤنڈ میں ہی غلام محمد نے میدان مار لیا۔ دوسرے اور تیسرے راؤنڈ میں کوئی کسی کو چت نہ کرسکا۔ ایک کے بعد ایک راؤنڈ گزرتے رہے لیکن کوئی کسی کو ہرا نہ پایا تب منتظمین نے اعلان کیا کہ اب یہ مقابلہ اگلے ہفتے ہوگا۔ لیکن اگلے ہفتے زبسکو مقابلے میں نہیں آیا اور عالمی پہلوانی کا اعزاز ''جون بل بیلٹ'' غلام محمد کو مل گیا۔ 1928ء میں مہاراجا پٹیالہ نے زبسکو کو بلوا کر غلام محمد سے کشتی کرائی۔ غلام محمد نے پہلے ہی ہلے میں اسے چت کردیا۔ یہ مقابلہ صرف تیس سیکنڈ میں طے ہوگیا تھا۔ غلام محمد تیس سال سے زیادہ عرصے تک اکھاڑے کی دنیا کا بے تاج بادشاہ رہا۔ اس نے ایک ہزار دو سو سے زائد پہلوانوں کو شکست دی۔ اسے برصغیر کا پہلا پہلوان ہونے کا اعزاز حاصل ہے جس نے عالمی اعزاز حاصل کیا۔ 1959ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے پرائڈ آف پرفارمنس کا صدارتی تمغہ اور پانچ ہزار روپے بطور انعام دیا گیا۔ 1960ء میں یہ عالمی شہرت یافتہ پہلوان طبعی موت کی گود میں جا سویا۔ دنیا غلام محمد کو گاما پہلوان کے نام سے پہچانتی ہے۔

☆

شہرِ خیال

☆ ڈاکٹر آر ایم ای کی ریاض سعودیہ سے آمد "ڈاکٹر ساجد صاحب نے اپریل کے شمارے میں فرزندِ فرنگ پر خوب تحقیقاتی، علمی، معلوماتی اور دلچسپ مضمون تحریر فرمایا۔ تعارفی اور تمہیدی بیان بھی خوب تھا۔ غالباً انہوں نے دینی حمیت اور غیرتِ ملی سے مغلوب برصغیر کے نالائق، نااہل، ناعاقبت اندیش حکمران، امراء، وزراء کی کوتاہیوں، ضمیر فروشی، غداری اور طوائف الملوکی سے چشم پوشی اختیار کی۔ فرنگی قلیل افرادی قوت اور دیگر لاتعداد مسائل کے باوجود غالب وفاتح رہے۔ اور عیش وعشرت، طاؤس ورباب میں مستغرق دیسی حکمران وعملدار اور مال وزر سے بکے ہوئے ضمیر فروش افراد نے ملک وملت کی آزادی کو اغیار کے ہاتھ بیچ دیا اور غلامی کا طوق پہن لیا۔ تاریخ حقائق سے چشم پوشی نہیں اختیار کرتی۔ غلطیوں کے ارتکاب کرنے والے اگر سزاوار نہیں ٹھہرائے جاسکتے تو کسی رحم اور انعام کے مستحق بھی نہیں ہوسکتے۔ کچھ عرصہ قبل میں کسی عزیز کے ہمراہ امریکا میں سفر میں تھا اور گاڑی اوور اسپیڈنگ کے باعث روک دی گئی۔ جب ٹریفک سارجنٹ چالان کی خاطر ہماری گاڑی کے قریب آیا تو میں نے اس سے کہا کہ امید ہے یہ پھر کبھی غلطی نہیں کرسکتا۔ کہنے لگا کہ یہ تو کہا نہیں جاسکتا کہ یہ آیندہ غلطی کرے گا یا نہیں لیکن میں غلطی نہیں کروں گا۔ اور پھر تنبیہی اسلوب میں مجھ سے کہا کہ تم کو اپنے اخلاص وشعور کا جائزہ لینا پڑے گا کہ تم نے اس کی غلطی پر کیوں نہ ٹوکا۔ حیرت آمیز امر یہ ہے کہ برصغیر کے حکمران دوسروں کا عبرتناک حشر دیکھنے کے باوجود کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے اور عیش وعشرت میں مگن اور مست رہے۔ اللہ نے اسی لیے عبرت ناک واقعات سے باخبر بچاؤ اور استعدادی تدابیر کی اہمیت کی شدومد سے تاکید فرمائی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ان کو والد نے بتایا کہ انگریز عملدار جب معائنے کے لیے گھوڑے پر سوار پہنچا تو جاگیرداروں کی روایت کے مطابق لوگ گھوڑے کے اردگرد بھاگتے ہوئے آئے۔ انگریز نے اس بھاگ دوڑ کی وجہ دریافت کی۔ بتایا گیا کہ اس کی خدمت تابعداری اور اس کو گھوڑے سے نیچے اتارنے کے لیے، وہ کہنے لگا کہ نہ تو میں بیمار ہوں اور نہ معذور اور نہ ہی غیر ضروری وجاہلانہ روایت کا حامی یا مرید۔ لارڈ ڈلہوزی کے بیان کردہ حیات کے شب وروز اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ وائسرے ہند اپنے ملک وملت کی سربلندی اور ملکی عظیم مفادات کی خاطر عیش وعشرت کی بجائے کتنی سادا اور محنت وتکلیف دہ عسرت زدہ زندگی گزار رہا تھا حتیٰ کہ اہل وعیال بھی اس کی شفقت، عنایات اور توجہ سے محروم رہے۔ اور کم وبیش فرنگی عساکر ودیگر مجموعہ عملہ اپنے قائدین کی تقلید میں اپنے ملک وملت کے عظیم مفادات کے لیے بہترین عملی نمونہ ومثال بنے ہوئے تھے جبکہ دیسی حکمران اور ان کے نااہل خوشامدی درباری عیش وعشرت، طوائف الملوکی اور اندھیر نگری چوپٹ راج کا راج ودربار سجائے ہوئے تھے۔ بلاشبہ فرنگ نے اپنے مفادات کے لیے منظم قانون وانصاف اور حکمرانی کا شعور پیدا کیا۔ عدالتی تنظیم اور قانونی عدل وانصاف قائم کیا۔ تعلیمی مدارس، اسکول کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ صحت کے مراکز، اسپتال بنائے۔ زرعی زمین اور نظام زراعت بنایا حتیٰ کہ جنگلات کا نظام بنایا۔ پوسٹ آفس کا منظم انتظام قائم کیا۔ مواصلات، سڑکیں، نہروں، ریل، بندرگاہیں، کانکنی وغیرہ کا بہترین سسٹم متعارف کرایا جو ناپید تھے۔ مذہبی ہم آہنگی اور سوشل سماجی اقدار پر مبنی نظام قائم کیا۔ گویا زندگی اور نظام حکومت کے مجموعہ شعبۂ حیات کا بہترین نظام قائم کیا اور یہ اسی بہترین کارکردگی کا نتیجہ تھا کہ برصغیر نے ایک منظم اور UNIFIED UNIT خطے کی شکل وصورت اختیار کرلی ورنہ دیگر صورت ایسا ناممکن تھا۔ تاریخی حقائق کو من وعن تسلیم کرلیا جائے تو تنظیم، قانون، عدل وانصاف، ڈسپلن کو بنیاد بنایا گیا جہاں متعدد قومیتیں مختلف عقائد، مذہبی وسماجی، نظریاتی تفرقے اور ظلم وبربریت کا راج تھا۔ جنگل راج کی بیخ کنی کا تصور ہی ناپید تھا۔ محترم نوربانو نے علمی Giants کا مختصر تعارف اور اہم معلومات بہترین انداز میں پیش کیں۔ اللہ مزید توفیق دے۔ قلم نگری کے ابن بطوطہ (آفاقی صاحب) فلمی آفاق کے حدود اربعہ سے سیاحتی افق پر طائرانہ انداز میں ترکی کے خطے میں ظاہر ہوئے۔ مختصر دورہ کے باوجود انہوں نے اہم ودلچسپ معلومات فراہم کیں اور علمی وتاریخی حقائق سے بھرپور وستائشی جائزہ پیش کیا۔ اللہ کرے

زورِ قلم مزید ومزید تر۔ استنبول سے جب انقرہ جانا ہوا تو ریل میں سفری سہولتیں۔ آرام دہ ماحول منظم عملی کارکردگی باعثِ تحسین تھی۔ موسم کے مطابق سوتے وقت بہترین صاف ستھرے بستر کی فراہمی ہوئی بغیر کسی منت وسماجت یا طلب کے۔ ریسٹورنٹ کی نفیس اور منظم خدمات۔ بات مقامی ٹرین کی ہو رہی ہے اورینٹ ایکسپریس کی نہیں۔ استنبول میں جہاں مشرقی اور اسلامی رنگ جھلکتا تھا۔ البتہ انقرہ مغربی طرز حیات کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ گائیڈ جو بے حد مہذب، تعلیم یافتہ اور نفیس انگریزی زبان میں تفصیلات بیان کررہا تھا۔ جب اتاترک کی یادگار میں لے گیا تو گیٹ میں داخل ہونے کے بعد اتاترک کے خوبصورت اور مرعوب کن فل سائز مجسمہ صبح کی دلفریب دھوپ میں چمکتا نظر آیا۔"

☆ فضل دین کا ای میل "میں سرگزشت بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، گزشتہ دنوں ایک کہانی بہ عنوان زندگی ارسال کی تھی۔ اب تک آپ نے بتایا نہیں کہ اس کہانی کا کیا بنا (آپ کی تحریر سرگزشت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے ورنہ اب تک جگہ بنا چکی ہوتی)"

☆ علی مغل نے کلوال، مانسہرہ سے لکھا ہے "اس بار سرگزشت میں ستراط کو پڑھا تو مزہ آگیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد زندہ باد۔ لیکن کیا ستراط اور بقراط ایک ہی شخص ہے؟ (جی نہیں دو الگ زمانے کے دو الگ فلسفی ہیں) اپنے ایاز بھائی کی کہانی ماما پڑھی تو مزہ دوبالا ہوگیا۔ میں شہرِ خیال کے بھائیوں اور بہنوں کو بڑے فخر سے بتانا چاہوں گا کہ اپنے محمد ایاز راہی صاحب نے دلکش کتاب یادوں کی بستی لکھی تو پنجاب رائٹرز ویلفیئر فنڈ کی جانب سے انہیں پچاس ہزار روپے کا کراس چیک عطا ہوا ہے جس کے لیے محمد ایاز راہی صاحب ڈھیروں ڈھیر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سرگزشت کا شکریہ کہ ہم جیسے نااہلوں کو بھی کبھار جگہ مل جاتی ہے۔"

☆ شاہد جہانگیر پشاور نے رقمطراز ہیں "اداریہ ہمیشہ کی طرح آنے والے خدشات سے آگاہ کررہا ہے کہ اگر اس بار بھی مخلص اور محبِ وطن نمائندوں کو منتخب نہ کیا گیا تو قرض کے بوجھ تلے دبی پاکستانی قوم اور آنے والی کئی نسلیں اس بوجھ سے نہ صرف نجات نہ پاسکیں گی، بلکہ یہ بوجھ مزید بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور ہم قافلہ در قافلہ دلدلوں میں دھنستے ہی چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اس بار بھی ایک تاریخی موضوع عقلِ کل، یعنی ارسطو کے بارے میں بہت سی نئی معلومات لے کر آئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے موضوع سے خوب انصاف کیا ہے۔ ارسطو جس نے سچ کی خاطر مرکر خود کو تاریخ کے صفحات میں امر کرلیا۔ ابن کبیر صاحب نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے غازی ہیرو ایم ایم عالم کے حالاتِ زندگی پر بہت خوبصورت اور معلومات افزا مضمون لکھ کر نئی نسل کو اپنے نامور ہیرو سے بڑے خوبصورت انداز سے روشناس کرایا ہے۔ جس کے کارناموں پر اپنے تو فخر کرتے ہی ہیں ان کی جرأتِ رندانہ کا لوہا دشمن بھی مانتے ہیں۔ پاک فضائیہ بجا طور پر اپنے اس بطلِ جلیل پر فخر کرسکتی ہے۔ روس افغان جنگ میں ایم ایم عالم (مرحوم) کے کردار کا پہلی بار علم ہوا وہ ایک درویش صفت شاہین تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات مزید بلند کرے۔ (آمین) محترم آفاقی صاحب نے اس مرتبہ مرحوم فلمی دنیا سے باہر نکل کر پالتو جانوروں سے متعلق اپنے تجربات ہم سے شیئر کیے۔ آفاقی صاحب کا ترکی کا دلچسپ سفرنامہ ترکی نمی دانم، غالباً پہلے بھی سرگزشت ہی میں پڑھ چکے ہیں، پھر بھی قندِ مکرر کے طور پر اور نئے پڑھنے والوں کی کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ (جی نہیں یہ نیا سفرنامہ ہے) زین مہدی صاحب کا دو انگلیوں والے، حیرت انگیز فیچر تھا، میڈیکل سائنس جو کہ آج اپنے پورے عروج پر ہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ آج بھی اس قسم کی بیماریوں کا اور چند اور جان لیوا بیماریوں کا علاج اور سدباب کرنے سے قاصر ہے۔ این جی اوز کا کردار بھی اس سلسلے میں ناقابلِ معافی ہے اور شرم آنی چاہیے ایسے لوگوں کو جو اس آفت زدہ بستی کے لوگوں کی مدد کرنے کی بجائے ان سے بھیک منگواتے ہیں اور منشیات کی اسمگلنگ کے لیے بطور کیریئر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ سچ بیانیوں میں عمیرہ صاحبہ کی سچ بیانی آپا میرج بیورو، متاثر کن تحریر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں تو میرج بیورو، کے بارے میں کچھ اچھا تاثر نہ تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ آپا زینب جیسے نیک سیرت اور پُرخلوص لوگ بھی اس لائن سے وابستہ ہیں۔ گونگی محبت، منظر امام صاحب بہت اچھے اور پرانے لکھاری ہیں انہوں نے سرورق کی کہانی خوب تحریر کی ہے۔ لیکن کہانی کا انجام پہلے ہی سے معلوم ہوگیا تھا کہ گولی کا نشانہ کون بنے گا۔ ماما، محمد ایاز راہی کی سچ بیانی اپنے منطقی انجام کو غیر متوقع انداز میں پہنچی اور آخر تک سسپنس برقرار رہا۔ یہ ایک اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ کبھی کبھی انسان اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر حیوانیت کے درجے سے بھی نیچے گرجاتا ہے۔ ماحول کی منظر کشی اور خوبصورت الفاظ کا استعمال راہی صاحب نے بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔ شہرِ خیال، سدرہ بانو ناگوری کو کرسیٔ صدارت مبارک، سب نے ہی اچھے تبصرے کیے ہیں اس خط میں سب کا الگ سے تذکرہ اب ناممکن ہے کیونکہ پہلے ہی خط کافی طویل ہوگیا ہے میرا خیال ہے کہ اب رانا محمد سجاد صاحب کا شکوہ دور ہوگیا ہوگا کہ میرا تبصرہ مختصر ہوتا ہے۔ آخر میں تمام قارئین سرگزشت اور خاص طور پر شہرِ خیال کے ساتھیوں اسرار الحق، طاہر الدین بیگ، سعید احمد چاند، وحید ریاست بھٹی اور معراج الدین آف مردان کا خاص طور پر بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنے تبصروں میں میری حوصلہ افزائی کی اور ماضی کے سپر اسٹار گل حمید، کے بارے میں لکھے ہوئے میرے آرٹیکل کو پسند کیا۔ اور ہاں معراج الدین آف مردان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کیا انہوں نے حسبِ وعدہ، گل حمید (مرحوم) کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔"

☆ عزیز اللہ لکھتے ہیں "سرگزشت ہمیشہ میری توجہ کا مرکز رہا ہے۔ چاہے کتنا بھی میں مصروف رہوں لیکن سرگزشت کے لیے وقت کی قربانی دی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے "ہم جتنا اب خوش ہیں پہلے کبھی نہیں تھے کیوں نہیں۔ خوشیوں پر ہمارا پورا پورا حق ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے جتنا مزہ سچ بیانیاں پڑھ کے ملتا ہے الفاظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک سچ بیانی ہماری اپنی زندگی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اپریل کے شمارے میں چوتھی سچ بیانی واپسی زندگی سے بھرپور، یاسمین اور خواجہ احمر کی داستانِ حیات ہے۔ بیس سال کی لڑکی اگر بچی بچی 60 سال

کے مرد سے محبت کرے تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ محبت کرنا گناہ تو نہیں۔ چاہے روحانی ہو یا جسمانی۔ انسان کو جب تک زندہ ہے قدم قدم پر محبت کی ضرورت رہتی ہے۔ چینی اور جاپانیوں کی لمبی عمر کا راز صرف اور صرف اپنے آپ کو ہر حال میں خوش رکھنا ہے۔ پاکستانیوں سے عرض ہے اپنے آپ کو محبت کے حوالے کرو، کسی سے نفرت مت کرو۔ یاسمین ایک عورت ہو کر کتنا بڑا رسک لے رہی ہے یقین کریں صرف ایک مسکراہٹ، نقلی دواؤں عطائی ڈاکٹروں، ڈپریشن، خشک، بور زندگی سے ہمیشہ کے لیے نجات، فریش، تروتازہ زندگی کی اولین چوائس ہے۔ میری دلی تمنا ہے ہر پاکستانی لمبی عمر پائے، بشرطیکہ اپنی خوشیاں دوسروں میں بانٹے۔ ایک بات اور کہنا چاہوں گا شہرِ خیال کے صفحات ماہنامہ سرگزشت میں چھپنے والے مضامین اور ان پر قارئینِ سرگزشت کے تبصرے اور دوستانہ انداز میں ان پر اظہارِ خیال کے لیے مخصوص ہیں۔ ان صفحات پر کسی بھی شخص کو یہ موقع نہیں ملنا چاہیے کہ وہ کسی دوسرے کی ذاتی اور نجی گھریلو زندگی کو ڈسکس کرے۔ جیسا کہ سعودی عرب (ریاض) کے رہائشی ڈاکٹر آر ایم اے صاحب نے اپنے خط (سرگزشت اپریل 2013ء) میں کیا۔ ایک ایسا شخص (دلیپ کمار) جو کہ اپنی زندگی کے 91ویں برس میں داخل ہو چکا ہے۔ الزائمر اور ضعیفی میں لاحق ہونے والے دوسرے امراض میں مبتلا ہو کر صاحبِ فراش زندگی گزار رہا ہے۔ اسے عمر کے اس حصے میں خود غرضی، بے وفائی اور بزدلی کے طعنے دینا کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔ دلیپ کمار تو خود زندگی بھر دوسروں کی خود غرضی اور بے وفائی کا شکار رہا۔ جہاں تک ان پر ڈاکٹر صاحب نے بزدلی کا الزام لگایا ہے تو یہ بچہ بچہ جانتا ہے کہ ہندوستان میں جب بھی مسلمانوں پر کڑا وقت آیا ہے تو دلیپ کمار نے انتہائی دلیری سے اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ دیا ہے۔ چاہے وہ گجرات (انڈیا) کے مسلم کش فسادات ہوں یا بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ، ہر موقع پر وہ مسلمانوں کی امداد اور حمایت کے لیے موجود رہے ہیں۔ بابری مسجد کی شہادت پر ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کیا اور ایک انتہائی جوشیلی تقریر کی جس کے نتیجے میں انہیں پہلے قید اور پھر گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس تقریر کے نتیجے میں شیوسینا کے غنڈوں نے ان کی رہائش گاہ پر دستی بم پھینکا، ہندو پریس نے ان کی دل آزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور ہر دور میں ان سے بہت کمتر درجے کے اداکاروں کو ان کے برابر لانے کی بے سود کوششیں کرتے رہے۔ آج انہیں جب اداکاری چھوڑے برسوں بیت گئے، ان کے پائے کا اداکار بھارت پیدا نہ کر سکا اور نہ ہی کر سکے گا۔ جہاں تک ان کے فلاحی کاموں کا تعلق ہے تو اس میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے اور بلا تفریق مذہب و ملت وہ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے رہے ہیں۔ چاہے وہ بنگال کی قحط سالی ہو، سیلاب کی تباہ کاری ہو یا متعدی امراض کے خلاف مہم ہو دلیپ کمار ہمیشہ آفت زدگان کی امداد کے لیے تن من دھن سے مصروف رہے ہیں۔ پاکستان میں فاطمید جیسے مفید مراکز کا قیام ہو یا شوکت خانم کینسر اسپتال کے لیے فنڈ ریزنگ کی مہم، دلیپ کمار کو جب بھی بلایا گیا وہ آئے اور اس مہم میں حصہ لیا۔ انہی فلاحی کاموں کے صلے میں حکومتِ پاکستان نے انہیں پاکستان کے سب سے بڑے سول اعزاز سے نوازا۔ ان کی یہ عزت بھی بھارت میں ان کی مخالف لابی سے ہضم نہ ہو سکی اور ان پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا کہ وہ یہ تمغہ حکومت پاکستان کو واپس کر دیں۔ لیکن دلیپ صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ تمغہ انہیں اداکاری نہیں بلکہ ان کے فلاحی کاموں کے سلسلے میں دیا گیا ہے اور وہ انہیں واپس نہیں کریں گے۔ اس موقع پر بھی ہندو انتہا پسندوں نے ان کے گھر پر حملے کیے لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اب رہ گیا ان کے پشاور کے آبائی گھر کا معاملہ تو یہ کام تو وہ اپنے پہلے دورۂ پاکستان کے موقع پر ہی کر چکے تھے اور مکان پشاور کے شہریوں کے نام کر دیا تھا کہ اس مکان کو کسی بھی فلاحی کام کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے تمام بھائی بہنوں کے دستخطوں سے مزین ایک عدد مختار نامہ بھی بھارت سے بھجوایا تھا، جس کی فوٹو کاپی فروری کے سرگزشت میں شائع ہوئی۔ امید ہے کہ ڈاکٹر آر ایم اے صاحب کی تسلی ہو گئی ہو گی۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے میں امید کرتا ہوں کے قارئینِ سرگزشت ایسی باتوں سے ہمیشہ کی طرح پرہیز کریں گے۔''

☆ منظر علی خان نے لاہور سے لکھا ہے'' سقراط پر جامع مضمون بہت پسند آیا۔ سقراط نے زہر کا پیالہ پی لیا مگر سچ سے نہ ہٹا نہ ہی ملکی قوانین کو توڑا۔ اگرچہ وہ اپنی جان بچا سکتا تھا۔ ہماری قوم کا تو یہ حال ہے کہ محض دولت بچانے کے لیے فراڈ پر فراڈ کیے جا رہے ہیں۔ ممبر اسمبلی بننے کے لیے جھوٹ بول لینا معمولی بات ہے۔ ضمیر نام کی کوئی چیز ان نام نہاد بڑوں کے پاس نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو خیال آتا ہے کہ ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ جہاں کا وزیراعظم نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی سے کہے کہ ہاں میں نے اپنے علاقے کے لوگوں کو نوکریاں دلوائی ہیں اور آئندہ بھی دلواؤں گا۔ میرٹ کے قتلِ عام کو یہ لوگ اپنی کارکردگی سمجھتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ غازی کے عنوان سے ایم ایم عالم کا تذکرہ اچھا لگا۔ ہمارے قومی ہیرو اور وطن پرست شخص کے ساتھ پاکستان کے حلقہ اربابِ اختیار نے جو کیا وہ ساری قوم کے لیے شرمساری کا سبب ہے کہ انہیں پنشن اور دیگر مالی مراعات جو ان کا حق تھیں اس سے بھی محروم رکھا گیا۔ مہم ساز کا برفانی سمندر میں انوکھا سفر اچھا لگا۔ خواب گاہ میں چیتا اتنا مختصر تھا کہ شکاریات کا مزہ نہ دے سکا۔ زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم سیاحت کے باب میں خاصا دلچسپ ہے۔ حقیقی اسلام، سرتاسر محبت ہے۔ اس مختصر زندگی میں لوگ نفرتیں کیسے پال لیتے ہیں۔ جبکہ نفرت پر فتح صرف محبت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ سراب، حسبِ معمول دلچسپ اور پُرکشش ہے۔ سچ بیانیوں میں گونگی محبت، میں شکنجہ کا انجام سلیمان کی اچھی فطرت کی عکاسی ہے۔ صلِ علیٰ جذبہ عقیدت کی تاثیر ہے۔ چراغ سے چراغ، میں بزرگ اور اس کی بیٹی کی اصل حقیقت سامنے نہ آسکی اور تشنگی کا احساس رہا۔ تاہم کسی کو راہِ راست پر لانا بہت خوب ہے۔ ''آج کا جرم'' اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی سرشت نیکی اور بھلائی ہے اور کوئی شخص مجرم پیدا نہیں ہوتا بلکہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، بہرحال عالیہ اچھی لڑکی تھی اور اپنے مزاج کے مطابق بالآخر اچھائی کی طرف لوٹ گئی۔ جھول، پیٹرول ختم ہو جانے سے واردات ناکام ہو گئی، کنجوسی کی بری عادت کم پیٹرول ڈلوانے کے سبب ڈاکا ناکام ہو گیا۔ سفید بھالو، ایک نفسیاتی سچ ہے اپنے ماحول کو ترک کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

☆ عمران خان یاور، شاہ کوٹ ننکانہ صاحب سے لکھتے ہیں'' سرگزشت سے ہمارا تعلق آٹھویں جماعت سے ہے یعنی لگ بھگ تیرہ سال

سے۔ عمرو عیار، ٹارزن، عمران سیریز سے ہوتے ہوتے سرگزشت اور جاسوسی تک پہنچنے میں ہمیں آٹھ سال لگے، گھر والوں سے چھپ کر ڈائجسٹ پڑھتے تھے۔ خیر پڑھائی بھی جاری رہی اور ہم نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر بھی کر لیا۔ اب ہم ممتاز مفتی، نسیم حجازی، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ابن انشاء، منٹو، شفیق الرحمن اور مشتاق احمد یوسفی کو پڑھنے لگے مگر سرگزشت پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ دیگر ادبِ صحافت میں وقت گزارنے کا موقع بھی ہاتھ آیا جب روزنامہ جنگ میں اسٹاف رپورٹر کے طور پر کام کیا۔ مصروفیت بڑھی مگر سرگزشت کے لیے تو ٹائم نکال ہی لیتے تھے۔ اب ہم جرنلزم کے لیکچرر ہو گئے ہیں اور ماشاء اللہ سے سی ایس ایس کا امتحان دے کر رزلٹ کے منتظر ہیں مگر ابھی بھی سرگزشت ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ سرگزشت ایک معیاری ڈائجسٹ ہے جو ہمیں، سائنسی، ادبی، تاریخی، دینی و دنیاوی معلومات کے ساتھ ساتھ معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ اب ہم نہ صرف خود سرگزشت پڑھتے ہیں بلکہ اپنے طلبا کو بھی اس کے فوائد کے بارے میں بتاتے ہیں اور Motivate کرتے ہیں۔ زندگی کے اس سفر میں سرگزشت سے حاصل ہونے والی معلومات نے نہ صرف تعلیم میں بلکہ بعد میں عملی زندگی میں بھی معاونت کی ہے اور کر رہی ہیں۔ ''فرزندِ فرنگ'' دلچسپ تحریر تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے بارے میں تفصیلی معلومات تھیں۔ آج کل ابراہم لنکن کا میڈیا میں بڑا چرچا ہے۔ کچھ دن پہلے ہی ''ابراہم لنکن ویمپائر ہنٹر'' دیکھی اور پھر ''لنکن کی لاش'' کی چوری۔ پڑھنے کو مل گئی، واقعی مجرموں نے ابراہم لنکن کی لاش چوری کرنے کا بہت انوکھا طریقہ سوچا تھا۔ اس کے بعد ہم نے پڑھی ''فلمی الف لیلہ'' آفاقی صاحب کی زبانی بیتے دنوں کی کچھ حسین یادوں کا پتا چلا۔ بدقسمتی سے شاہ کوٹ میں سرگزشت میسر نہیں اس لیے ہم فیصل آباد سے منگواتے ہیں۔ (صرف 700 روپے میں سالانہ خریدار بن جائیں سرگزشت آپ کو گھر بیٹھے...... مل جایا کرے گا) ابھی باقی تحریریں نہیں پڑھیں کیونکہ ڈائجسٹ لیٹ ملتا ہے۔''

☆ کھاناں سے کامریڈ کنول کا مکتوب'' ہمارے محلّے کے ایک علم دوست سلیم کامریڈ کے توسط سے سرگزشت کے کچھ گزشتہ مہینوں کے پرچے پڑھنے کو ملے۔ پڑھنے کے بعد پتا چلا کہ سرگزشت کا مواد دیگر ڈائجسٹوں سے اچھا اور معیاری ہے۔ مضامین نہایت معلوماتی ہیں۔ ایک گزارش چاہتی ہوں امید ہے کہ گزارش پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔ پرچہ میں دو کوپن ہوتے ہیں۔ 1، مقابلہ بیت بازی 2، شخصیت جب پرچہ میں سے قطع کر دیے جاتے ہیں تو کوپن کی پشت پر جو مواد ہوتا ہے وہ بھی کوپن کے ساتھ ہی شمارہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں شمارہ کا حسن گہنا جاتا ہے۔ اور آئندہ کے لیے اس کا مطالعہ کرنے والا قاری بیش قیمت مواد سے محروم رہ جاتا ہے۔ ایسا کریں کہ دونوں کوپن علیحدہ کاغذ پر تحریر کر کے شمارہ سے منسلک کرنے کا بندوبست کریں۔ (کوپن کی پشت پر مقابلے سے متعلق مواد ہوتا ہے) بیت بازی میں بھی انعامی مقابلہ کا سلسلہ جاری کریں۔ گلگت اور بلتستان سے متعلق بھرپور مضمون شائع کیا کریں۔ منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم سے متعلق جاندار تحریر شائع کریں۔ (منگلا اور تربیلا ڈیم پر تحریریں شائع ہو چکی ہیں)''

☆ اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل سے رقمطراز ہیں'' رانا محمد شاہد صاحب، دراصل عمر کی زیادتی نے سنجیدہ بنا دیا ہے ورنہ کسی کو مخاطب نہ کرنے کو ہماری خود غرضی اور تنگ مزاجی نہ جانیے۔ منظر علی خان صاحب، اپنائیت کا اظہار خوشی دے گیا ہے۔ یہ بے تکلف لہجہ مجھے بڑا پسند ہے۔ یاد کرنے اور سراہنے پر طاہر الدین بیگ، خالد کبیر، رانا محمد سجاد، نجم عمران خان اور ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری صاحبہ خصوصی اور دلی شکریہ قبول کریں۔ فلمی الف لیلہ، میں گھریلو جانوروں سے محبت اور پالنے سے متعلق مضمون انتہائی دلچسپ تھا۔ فلمی قصے کہانیاں چلتے رہنا چاہئیں یہ سب دوسرے عنوان کے تحت آنا چاہیے تھا تب بھی اتنا لطف آتا اب ہمیں فلمی الف لیلہ کی ایک قسط کی قربانی دینا پڑی ہے بہرحال سودا مہنگا نہیں پڑا ہے۔ خواب گاہ میں چیتا، ہلکے پھلکے انداز میں شکار کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ وقت کی بچت کرتے ہوئے سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ گونگی محبت، میں سلمان محض گونگا ہونے کی وجہ سے مار کھا گیا ورنہ وہ اپنی محبت حاصل کرنے کے ساتھ معاشرے میں اعلیٰ مقام کا حامل ہوتا لیکن یہ سب قدرت کا نظام ہے اسی میں مصلحت ہو گی۔ بس ایک خلش رہ گئی ہے کہ سلمان نے شکنجہ کے ناپاک وجود سے دھرتی کو پاک کر دیا۔ صلِ علیٰ، پڑھ کر کتنی یادیں تازہ ہو گئیں، کتنے پاکیزہ مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے مسجد ابوذر غفاری، مسجد نبوی سے ایک کلومیٹر شمال کی طرف ہے یہاں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا لمبا سجدہ کیا کہ حضرت عبدالرحمٰن فکرمند ہو کر رونے لگے کہ کہیں دو جہانوں کے مالک دورانِ سجدہ وفات پا گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھا کر فرمایا! عبدالرحمٰن جبرائیل علیہ السلام یہ خوش خبری لے کر آئے تھے کہ جو کوئی حضور کی ذات پر ایک بار درود بھیجے گا میں اس پر درود بھیجوں گا۔ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ درود پاک کی کیا فضیلت ہے۔ ناچیز اس مسجد کی کئی بار زیارت کر چکا ہے۔ چراغ سے چراغ، میں آیان خوش قسمت ٹھہرا کہ عاقبت سنور گئی اور میرا ایمان ہے کہ اگر نیک نیتی سے توبہ کر لی جائے تو وجود بچے جیسا پاک ہو جاتا ہے پھر دل میں وسوسوں کو جگہ نہیں دینا چاہیے۔ دشمن، پڑھ کر حیرت سے گنگ رہ گیا جادو سے متعلق اس میں اتنی معلومات تھیں کہ متاثرہ شخص عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور زندگی عذاب بن جاتی ہے لیکن یہاں بات سیدھی جان لینے تک آ پہنچی ہے۔ جو قتل کی منصوبہ بندی کرتا ہے وہ بھلا کیسے بخشش کے قابل ہے اور ایسا عمل احساسِ کمتری اور گھٹیا سوچ رکھنے والے کرتے ہیں تاکہ اس مکروہ فعل سے خود کو برتر اور قابلِ توجہ بنا لیں۔ لوگ ان کی چاپلوسی کریں گے تو انہیں تسکین حاصل ہو گی لیکن یہاں کوئی کمی دیکھنے کو نہیں ملی۔ دنیاوی مقام و مرتبہ حاصل تھا پھر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ وہ کسی عارضے میں مبتلا تھی جو انہیں اس راستے پر لائی اور نفسیاتی گرہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھتی چلی گئی۔ گھناؤنے کرتوتوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ آج کا جرم، اور جھول، پڑھ کر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جوان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے شارٹ کٹ راستے کی تلاش میں رہتے ہیں، جوش اور کامیابی کی خوشی میں کئی احتیاطیں بھول جاتے ہیں پھر یہی غلطی آخری ثابت ہوتی ہے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔''

☆ افتخار احمد گھمن کا خط لاہور سے ”سرگزشت میں حاضری دیے ایک عرصہ ہوگیا۔ کچھ گھریلو مصروفیات اور بچوں کی بیماری کے باعث تاخیر ہو رہی تھی اب گھریلو حالات بہتر ہیں تو کچھ وقت ملا ہے کہ سرگزشت میں حاضری دوں، لیکن اس دوران کوئی بھی سرگزشت پڑھنے سے رہ نہیں گیا۔ بہرحال سرگزشت میں بہتر تبدیلیاں آرہی ہیں، اداریے حسبِ معمول حالاتِ حاضرہ پر ہیں۔ شہرِ خیال میں تمام باسی باقاعدگی سے نظر آرہے ہیں۔ اس ماہ ہمارے تجزیہ نگار خالد کبیر لاہور بھی حاضر ہوئے۔ اعجاز حسین سُتھار غیر حاضر تھے۔ سقراط کے حالاتِ زندگی پڑھے۔ اس کا جرم یہی کہ لوگوں کو مروجہ روایات سے نکالنا چاہتا تھا۔ ہر دور میں ایسے شخص کے لیے رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔“

☆ احمد خان توحیدی کراچی سے رقمطراز ہیں ”برادر معراج رسول صاحب نگران حکومت تو چند دن کی مہمان ہے۔ بعد میں گیارہ کھرب قرضہ کی تلوار ہم غریب عوام کے سر پھاڑے گی۔ چند دن بعد نتیجہ آنے والا ہے۔ اللہ صادق و امین حکمران نصیب کرے۔ پیر صاحب کے بارے میں پہلی بار پڑھا۔ محفل شہرِ خیال میں سدرہ ناگوری کو کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ عبدالحمید بہاولپور، آسٹر کراچی، انجم ساحلی، خالد کبیر کے تبصرے مختصر مگر اچھے تھے۔ رانا سجاد مظفر گڑھ آپ کے دتی صاحب کے ساتھ آپ کے گیلانی صاحب کے فرزند نے بھی تین پیر غیروں سے حل کرائے اور زبردستی سند حاصل کی۔ اصل سند والوں کو کب حق ملتا ہے۔ رانا شاہد بورے والا، قوم نے قائداعظم، قائدِ ملت، محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی کب قدر کی جو قومی ہیرو ایم ایم عالم کی کرتے؟ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے ہیں۔ سقراط زہر کا پیالہ پی کر امر ہوگئے۔ غازی، گڈ اسٹوری ہے۔ ابن کبیر صاحب شکریہ اتنی تفصیل پہلے پڑھی نہ تھی۔ دو انگلیوں والے، اگر DNA کرائیں تو گڑبڑ دور ہوسکتی ہے۔ میرے ساتھ خاصی تعداد میں کام کرنے والے اندرونِ سندھ، شہداد پور کے گونگے بہرے ہیں۔ اور یہ بھی اس بیماری کو بددعا ہی سمجھتے ہیں۔ فلمی الف لیلہ، کیا آفاقی صاحب کے پاس سنیما ختم ہونے پر فلمی مواد بھی ختم ہوگیا ہے۔ فضول میں 25 صفحات کا ضیاع کیا۔ آفاقی صاحب کی تری نمی دانم ازدویری گڈ اسٹوری تیسری قسط کا انتظار ہے۔ حقیقی اسلام، نائن الیون کی اچھی تحریر مگر بربادی صرف مسلمانوں کی ہوئی۔ اصل مجرم اسرائیل ہے۔ سچا عشق، ملکہ وکٹوریہ کا ایک خاوند سے 9 بچے لازوال محبت واقعی سچا عشق ہے۔ بازیگر جان جوکھوں میں ڈال کر کرتب دکھانا غلط اقدام ہے۔ سراب، پلیز فتح خان اور شہباز کی دھینگا مشتی ختم کرکے حقیقی کہانی شروع کریں۔ گونگی محبت، میرے ساتھ کام کرنے والے گونگے بہرے بچپن سے درست تربیت کی جائے تو یہ بہت ذہین ہوتے ہیں۔ کارکردگی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ صلِ علیٰ، سب سے اچھی تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے رسولؐ سے محبت کرنے والوں کو اپنی رحمت سے خوب نوازتے ہیں۔ چراغ سے چراغ، بزرگ مستقیم صاحب اور ندا نے ایان کو صراطِ مستقیم پر لاکر واقعی اپنے نام کی لاج رکھ لی۔ ایان نے روزی کو اپنا کر نیک کام کیا۔ دشمن، باعث جہالت جعلی پیروں کا دھندا عروج پر ہے۔ نفیسہ جیسی تعلیم یافتہ عورت اپنے گڑھے میں خود گری۔ آج کا جرم، ارسلان نے اجنبی عالیہ سے مل کر خود غلطی کی۔ انجام اچھا ہوا، سعید بھالو، طارق ظفر نے نرگس سے شادی کرکے نیک کام کیا۔ ماحتا، شبانہ کی بے وفائی سے دردناک انجام شبیر کو بھی لے ڈوبا۔“

☆ ملک سیف علی اعوان نے نور پور سے لکھا ہے ”میں آپ کے پرچوں کا پرانا قاری ہوں امید ہے اپنی محفل میں کہیں تھوڑی سی جگہ عنایت کردیں گے پیشگی شکریہ۔ آپ کے توسط سے علی سفیان آفاقی صاحب سے چند باتیں عرض کرنا تھیں۔ ان کا دم غنیمت ہے جو ہمارا ماضی ہے بلکہ شاندار ماضی سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ اے حمید صاحب تھے جو اچھے زمانے کو یاد کرادیتے تھے۔ یا اب آفاقی صاحب ہیں۔ آفاقی صاحب فلمی کہانی میں بہت سے فنکاروں، لکھاریوں، کیمرا مینوں، میک اپ والوں تقریباً تمام شعبوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں لیکن بھٹی برادران کا نہیں کرتے اور اگر کیا بھی ہے تو کم از کم میں نے بہت تھوڑا پڑھا ہے۔ کیا وہ ہماری انڈسٹری کے درخشندہ ستارے نہیں تھے۔ ایک وقت تو ان کا انڈسٹری میں طوطی بولتا تھا۔ کیا وہ ہمارے پسندیدہ نہیں ہیں۔ براہِ کرم کبھی اپنے ان بھائیوں پر بھی تفصیل سے لکھ دیں۔“

☆ محمد عمران جونانی کی آمد کراچی سے ”مینا نا بینا نمبر کا اعلان دیکھ کر یقین ہو چلا ہے کہ منزل زیادہ دور نہیں۔ ابن کبیر نے اس مرتبہ بھی حسبِ معمول سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ایم ایم عالم کے بارے میں وقتاً فوقتاً پڑھا تھا لیکن مربوط انداز میں ان کا زندگی نامہ پڑھنے کا پہلا موقع تھا، ایمان تازہ ہوگیا۔ (آمین) حقیقی اسلام صائمہ اقبال کی شاندار تحریر تھی، اللہ کے کچھ ایسے مخلص بندے ہوتے ہیں جنہیں بڑے کاموں کے لیے چنا جاتا ہے۔ بلاشبہ رئیس، ایک ایسا ہی انسان ہے ورنہ ایسے حادثہ میں بچنے کے امکان نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور پھر ایسے عظیم کام کا بیڑا اٹھانا اور جانی دشمن کو معاف کردینا مذاق نہیں۔ مریم کے خان مہم ساز، کے ساتھ اپنے مخصوص رنگ میں نظر آئیں۔ عام طور پر آپ کی تحاریر کا موضوع ایسی ہی مہمات ہوتی ہیں جن کا خمیر سنسنی لیے ہوئے ہوتا ہے اور قاری آخر تک اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ دو انگلیوں والے، پڑھ کر افسوس ہوا۔ کاش کہ اس گاؤں کے باسیوں کو کوئی سمجھا سکے کہ اس نسل در نسل بیماری سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ زین مہدی صاحب! آپ نے اس صورتِ حال کو ہم تک پہنچا کر اپنی ذمہ داری پوری کردی اللہ قبول فرمائے۔ پہلی سچ بیانی گونگی محبت کچھ خاص تاثر نہ قائم کرسکی۔ صلِ علیٰ، ایمان افروز تحریر تھی بندہ دل سے اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کو یاد کرے تو رحمت کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے ہوتا ہے۔ اب کچھ تذکرہ شہرِ خیال کا ہو جائے۔ کرسیِ صدارت پر اپنی ہم شہر سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کا عمدہ تبصرہ پر مبنی خط دیکھ کر خوشی ہوئی، موبائل فون کے بارے میں آخری جملہ تو واقعی کمال تھا۔ محترمہ صوبی شاہ میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں، انسان دل سے خط لکھ کر ڈاک کے حوالے کرے اور وہ کسی وجہ سے نہ لگ سکے تو افسوس ہوتا ہے۔ خالد کبیر صاحب! پارچہ جات کے تسلسل پر آپ کی خوب نظر گئی۔ رانا محمد سجاد صاحب کا طویل خط اس مرتبہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ محمد عمران خان بھکر کا تبصرہ خوبصورت اور جامع تھا۔“

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی خیال آرائی بھکر سے ”مئی کے سرگزشت نے تو ڈرا کر رکھ دیا، مصور جی ہم پہلے ہی حالات سے ڈرے ہوئے ہیں ہر طرف فائرنگ دھماکے اس پر آپ نے ایسا سرورق بنا دیا۔ میرا دل تو ویسے ہی نازک ہے۔ کچھ ہمارے بے چارے دل کا ہی خیال کرلیں۔ شہرِ خیال والو کہاں چھپے بیٹھے ہو۔ نکل آؤ اپنے اپنے بلوں سے کہ ہر طرف الیکشن کی گہما گہمی ہے، میں تو نواز شریف کو ووٹ دوں گی اگر آپ سب ہمیشہ خوش رہنا چاہتے ہیں تو سب کو چھوڑ کر روبینہ نفیس انصاری کو وزارت سونپ دیں۔ آج کے مجرم پڑھ کر حیرت ہوئی، حبیب اور عالیہ جیسے لوگ بہت کم ہیں۔ اس کے علاوہ صلِ علیٰ، گونگی محبت نے بہت متاثر کیا۔ اللہ پاک سب کو اپنے امان میں رکھے اور بہت خوشیاں عطا فرمائے۔“

☆ عدنان ذاکر کا ای میل ”آپ سے گزارش ہے کہ پرچے میں کترنیں شامل کرتے وقت دیکھ لیا کریں۔ ایڈمرل شاہد کرم اللہ کو موجودہ چیف آف نیول اسٹاف لکھا گیا ہے جبکہ وہ کافی عرصہ پہلے سابق ہوچکے ہیں ان کے بعد تین مزید سی این سی آچکے ہیں (کترنیں دراصل اقتباس ہوتی ہیں۔ جس کتاب سے اخذ کیا گیا اس میں ردوبدل کرنا تحریف ہوگا)“

☆ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کی خیال آفرینی راولپنڈی سے ”ایڈیٹوریل میں معراج صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے حل اس کا وہی ہے کہ کوئی ماؤزے تنگ آئے یا خمینی جیسا زیرک جو موٹے پیٹوں میں سے خنجر مار مار کر ملکی اور غیر ملکی دولت نکلوائے اور عبرت ناک سزائیں ان چوروں لٹیروں کا مقدر بن جائیں (آمین) مکیش اکبرآبادی کا اتنا تفصیل سے تذکرہ پہلی بار پڑھا۔ شہرِ خیال خوب سجا ہوا ہے۔ سدرہ بانو ناگوری اور رانا محمد شاہد کے تبصرے سب سے اچھے رہے۔ خالد کبیر مختصر تبصرہ کے ساتھ حاضر ہیں اور ہمیں یاد کرنے کا شکریہ۔ اور شاہد جی آپ کو اور بہتر لکھنے کی مثال مل گئی ہے۔ وحید ریاست بھٹی جی آپ کی مختصری تحریر خاص نمبر میں شاید پڑھ لیں پھر معلوم ہوگا کہ کیسی ہے۔ ناصرہ احمد کی تجویز اچھی ہے مگر پاکستان میں یہ رسائل عام پڑھنے والے کو ملنے مشکل ہوتے ہیں پھر ہمارے لیے اصل لکھاری کا حوالہ کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری اللہ آپ کی پریشانی دور فرمائے ہم سب دعاگو ہیں۔ آمین! اور ہاں سعید احمد چاند کی تشریف آوری کا میں بھی منتظر ہوں۔ اور یہ ایم اے خالق بھی اتنے مختصر تبصرے کے ساتھ کیوں آئے ہیں؟ (یہی گلہ ہمیں بھی ہے) عقلِ کل ایک شاہکار تحریر ہے۔ پس منظر سے آگاہی ہوئی۔ افلاطون کے استادِ عظیم سقراط کا یہ عظیم سفرِ زندگی، اصول ہے۔ سقراط کے آخری وقت کا ایک مکالمہ کہ اس داستان میں اضافے کی جرات کرتا ہوں۔ ”شاگرد نے عرض کیا: استادِ محترم اگر آپ جیل سے بھاگنا چاہیں تو ناظم زنداں ہماری مدد کرے گا اسے ہم خرید چکے ہیں“ سقراط: کیا جیل سے فرار بددیانتی نہ ہوگی۔ ”شاگرد بولا“ جناب استاد ہمارے یہ بادشاہ کہاں کے دیانتدار ہیں کہ ہم دیانت برتیں؟“ سقراط بولے اور یہ الفاظ سنہرے الفاظ میں لکھنے کے قابل ہیں“ یہ تو کوئی معیار نہیں کہ آپ تبھی سچ بولیں گے جب آپ کو یقین ہو جائے کہ دوسرے بھی سچ بول رہے ہیں پھر اگر میں کہیں چلا بھی جاؤں تو کیا وہ لوگ مجھے معاف کردیں گے؟ اگر انہوں نے مجھے موت کے قابل سمجھا ہے تو بیگانوں سے آپ کیا توقع رکھتے ہیں؟“ غازی، میں ایم ایم عالم کی انتہائی تفصیلاً اور گہرائی میں لکھی زندگی کی اونچ نیچ کو پڑھا۔ ایک غازی انسان، ایک فرشتہ، ایک ولی کا درجہ رکھنے والے شخص کے ساتھ ہماری قوم اور بڑوں کا برتاؤ ان کے درجہ اولیٰ پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ کاش ہم عقل کے ان اندھوں کو اللہ کی طرف سے بصیرت دیے جانے پر عالم کو ائر مارشل دیکھتے! (جنرل ضیا نے ریٹائرڈ کردیا تھا)۔ روداد، دو انگلیوں والے، پڑھی۔ کوئی اللہ کا پہنچا ہوا انسان کبھی غلط بددعا نہیں دیتا۔ یہ RNA کے بعد DNA میں Mutation کہلاتی ہے اور DNA کے Hlix پر جو انتہائی خاص طریقے سے قدرت نے پروٹین کی ترتیب بنائی ہوئی ہے ان میں بھی بھی بیماری کی وجہ سے کزن شادی یا خاص وبا کی وجہ سے ترتیب تھوڑی سی بے ترتیب ہوجاتی ہے اور انسانی اعضا میں کمی و بیشی ہوجاتی ہے۔ ہمارے این جی او کو چاہیے تھا یا حکومت کی سطح پر اعلیٰ ترین تشخیص اور علاج امریکا یا انگلینڈ میں کروائیں تو یہ کمی ختم ہوسکتی ہے۔ ویسے زبردست رپورٹ تھی۔ سچ بیانیوں میں اس ماہ کی بیسٹ کہانی گونگی محبت رہی۔ منظر امام، کیا یہ ٹی وی والے ہی مشہور زمانہ منظر امام ہیں؟ (جی ہاں یہ وہی منظر امام ہیں جن کے زیادہ تر ٹی وی ڈرامے ہٹ ہوئے) انہوں نے ان مٹ داستان چنی ہے اور گونگا ہونے کے ناتے گھر والوں اور معاشرے کا ٹھکرایا انسان کس کس طرح سے توجہ حاصل کرتا ہے اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ اللہ بھی صرف محبت ہی محبت ہے اور انسان بھی اسی صفت سے کندن بنتا ہے۔ صلِ علیٰ، (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ان کہانیوں میں شامل نہ کریں کیونکہ یہ دنیا کی ہر چیز سے ماورا ہے۔ ان کی برکت، اپنی امت سے محبت اور پیار و محبت کی بارش ان گنت برکتوں کی پرتو ہے۔ واقعی ان پر درود بھیجنے والے اور کثرت سے بھیجنے والے یقیناً نوازے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ! تمام قارئین ایک دفعہ درود شریف بھی پڑھ لیں (اللھم......)“

☆ رانا محمد سجاد کا خلوص خاص مظفر گڑھ سے ”اب کی بار مئی کا مہینا وطنِ عزیز کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ الیکشن کمیشن نے اپنے جس عزم کا اعلان کیا تھا اس کو بھی پورا نہ کرسکا شور تو بہت اٹھا کہ بس اب کوئی لٹیرا، جعلی ڈگری والا، پارلیمنٹ کا حصہ نہیں بنے گا لیکن خفیہ ہاتھ حرکت میں آیا اور سب اہل ہوگئے۔ مئی کا شمارہ جلد حاصل ہوگیا سرورق بالکل پسند نہیں آیا البتہ کونے میں غازی کی تصویر نے غور سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ معراج رسول صاحب گزشتہ حکومت کے کارنامے گنوا رہے تھے خدا ایسی حکومت کسی دشمن کو بھی نہ دے 65 سالہ تاریخ میں یہ پانچ سال اندوہناک سمجھے جائیں گے۔ یک نئی حصے میں داخل ہوئے نام کچھ سنا سنا سا لگتا ہے بہرحال تعارف پہلی بار ہوا۔ سدرہ بانو ناگوری شہرِ خیال میں صفِ اول میں نظر آئیں بددعا والی بات خوب رہی چیزیں بری نہیں ہوتیں ان کا استعمال انہیں برا بناتا ہے عبدالحمید جانی کی حاضری ہوئی پہلی بار۔ محترمہ صوبی خط نہ شائع ہونے کا گلہ کررہی تھیں۔ آسٹر، بھئی یہ کیسا نام ہے۔ اور کہانی آپ کی ضرور شائع ہوگی اگر سرگزشت کے معیار پر اتری تو،

طاہرالدین بیگ خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ انجم فاروق ساحلی نے کافی دنوں بعد حاضری دی، خالد کبیر صاحب اتنی طویل غیر حاضری پر آپ سے باز پرس کی جاتی ہے۔ رانا صاحب اپنے مخصوص انداز سے حاضر ہوئے۔ محمد عمران ارے بھئی اتنی لمبی خاموشی کا کیا مطلب لیا جائے؟ منظر علی خان بس آپ دعا کرتے رہیں کہ یہ منافقت ہم سے دور ہو جائے۔ وحید ریاست بھٹی سرگزشت کی اتنی تعریفوں کا شکریہ، دیکھتے ہیں آپ کی تحریر خصوصی نمبر کا حصہ بنتی ہے یا نہیں۔ ویسے جناب بتائیں گے کہ خصوصی نمبر کب تک منظرِ عام پر آرہا ہے؟ (بہت جلد) ایم افضل کھرل کا تبصرہ پسند آیا۔ نیویارک سے ناصرہ احمد نے سرگزشت کے شہرِ خیال میں حاضری دی۔ امید ہے آپ آئندہ بھی تشریف لائیں گی۔ سب پاکستانیوں کو میری طرف سے سلام دیجیے گا۔ عمران جونانی، احمد خان توحیدی کے تبصرے پسند آئے۔ روبینہ نفیس صاحبہ اب غیر حاضری نہ ہو۔ امجد شاہ سفرنامے پر اعتراض کر رہے تھے۔ آپ سے اتفاق نہیں کرتے۔ خالق بھٹی صاحب کا خوبصورت تبصرہ تھا۔ شہرِ خیال کے پرانے ساتھی محترم انور اعجاز، ادیب الرحمٰن، اعجاز ستھار، محترم چاند صاحب غیر حاضر تھے پلیز جلد از جلد حاضر ہوں۔“

☆ عبدالقیوم سیال، ضلع مظفر گڑھ سے ”کافی عرصے سے سرگزشت کا خاموش قاری ہوں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں امید واثق ہے کہ ضرور شاملِ اشاعت کریں گے۔ (خوش آمدید) سرگزشت کی ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے اور اپنے اندر معلومات کا خزانہ لیے ہوتی ہے۔ معراج رسول صاحب کا مئی کے شمارے میں ملکی معاشی صورتِ حال پر تبصرہ پڑھا، پتا نہیں ہمارے حکمران اتنے قرض لے کر بھی ملک کی حالت کیوں نہیں سدھارتے؟ (کیوں کا جواب تو ہر پاکستانی کو معلوم ہے۔ کاش کوئی ایسا حکمراں ملے جس کا دل صرف پاکستان کے لیے دھڑکتا ہو) عوام نے یقیناً 11 مئی کو ووٹ کاسٹ کرتے وقت ایک بار ضرور سوچا ہوگا۔ ورنہ ایک بار پھر پانچ سال غربت، مہنگائی اور بدامنی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تحریروں میں ابن کبیر کی غازی، سب سے اچھی لگی جنگ 65ء کے ہیرو ایم ایم عالم کے مختصر حالاتِ زیست پڑھ کر معلوم ہوا کہ انہیں پاکستان سے شدید محبت تھی کاش! ہمارے حکمران بھی وطن سے اتنی محبت کرتے۔ زین مہدی کی دو انگلیوں والے، پڑھی افسوس ہوا کہ اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے بھی لوگ توہمات کا شکار ہیں۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔“

☆ وحید ریاست بھٹی نے کلر سیداں، راولپنڈی سے لکھا ہے ”ماہنامہ ”سرگزشت“ 29 اپریل کو مل گیا۔ جونہی صفحات الٹے تو یک صفحی سرگزشت میں جناب حضرت میکش اکبر آبادی کو براجمان پایا، واقعی باکمال تھے۔ پھر جب شہرِ خیال میں داخل ہوئے تو اپنا خط ڈھونڈنا شروع کیا اور تھوڑی سی تلاشِ بسیار کے بعد مل گیا اور پھر یہی فیصلہ کیا کہ اب باقاعدگی سے شہرِ خیال کا باسی بن جانا چاہیے۔ شہرِ خیال میں اپنوں کی محفل خوب سجی سجی سی تھی۔ عقلِ کل، کے ذریعے اپنے پسندیدہ مصنف ڈاکٹر ساجد امجد کو پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سقراط پہ لکھ کر حق ادا کر دیا۔ جنگ 1965ء کے ہیرو، ایم ایم عالم کے حوالے سے لکھی گئی ابن کبیر کی تحریر غازی، بازی لے گئی۔ ایمان کی حرارت لیے یہ تحریر سرگزشت کی پہچان بن گئی۔ زین مہدی صاحب ذرا سا مختلف انداز لیے بیٹھے تھے دو انگلیوں والے، اچھی تحریر تھی۔ ترکی یاترا کی طرف بڑھے ترکی کی سیر کرتے کرتے ہم خوابوں کی جنت میں کھو گئے ترک واقعی ترک ہیں کاش ہمارے حکمران بھی پیارے پاکستان کو دنیا کے لیے باعثِ نظارہ بنا سکیں۔ اے کاش! جس تحریر نے دل کی دنیا میں انقلاب برپا کیا وہ محترمہ صائمہ اقبال کی حقیقی اسلام تھی پڑھتے ہوئے جذب کی کیفیت طاری ہو گئی معراج رسول صاحب ایسی تحریریں پہلی فرصت میں میگزین کی زینت بنایا کریں۔ اس کی جزا اللہ پاک آپ کو دے گا۔ اسامہ عطاری کی، سچا عشق، بھی دلچسپی لیے ہوئے تھی مہم جوئی سے مجھے کچھ خاص دلچسپی نہیں ویسے مہم جوئی کرتے ہوئے ہی بندہ اچھا لگتا ہے شاید پڑھتے ہوئے نہیں۔ اپنے پسندیدہ لکھاری کاشف زبیر صاحب کی سراب، بالکل درست ٹریک پہ چل رہی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آخر میں آیا میرج بیورو، بڑی فکر انگیز تھی اور یوں ہم نے تین دن میں سرگزشت کو پڑھ لیا، آپ کو اور آپ کی ٹیم کو اتنا خوبصورت میگزین نکالنے پر مبارکباد۔ بینا نابینا نمبر کے حوالے سے مشہور گلوکار، موسیقار اور اداکار K.C.DEY کے حوالے سے ایک مضمون روانہ کیا تھا آپ نے اسے پتا نہیں پسند کیا یا نہیں آگاہی نہیں ہو سکی۔ (مضمون اچھا ہے لیکن کافی تشنگی ہے، ایکسپرٹ کو دیا ہے بنانے کے لیے، وہ کمی اگر پوری ہوگئی تو لگ جائے گا) آپ سے گزارش ہے کہ برِصغیر کے معروف گلوکار، محمد رفیع کی تینتیسویں برسی کے حوالے سے مضمون شاملِ اشاعت کر دیجیے گا۔ (محمد رفیع پر دقیق مضمون چھپ چکا ہے اگر کوئی نئی بات ہوئی تب لگے گا)“

☆ معراج الدین کی مردان سے یاد آوری ”سرگزشت حسبِ معمول 28 تاریخ کو ملا۔ اداریے میں مدیر صاحب ہر محبِ وطن کی طرح غیر ملکی قرضوں پر دل گرفتہ نظر آئے۔ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان پر غیر ملکی قرضوں کا حجم اتنا بڑھ گیا ہے کہ اگر اسے پاکستان کی مجموعی آبادی پر برابر تقسیم کیا جاتا تو ہر شہری پر 60 ہزار سے زائد قرضہ آتا ہے۔ تجزیہ نگار یہ بھی کہتے ہیں کہ آئی ایم ایف پاک ایران گیس پائپ لائن منصوبہ رکوانے کی سازش کے طور پر ان قرضہ جات کی واپسی کی شرائط میں مزید سختی کرنے پر بھی غور کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن پر رحم فرمائے (آمین) ہر جگہ قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ اس خط کو لکھنے سے صرف ایک گھنٹا قبل میری آنکھوں کے سامنے تین آدمیوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کیا گیا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری کی کراچی سے خیال آفرینی ”شہرِ خیال کی محفل میں اپنے تبصرے کو صدارت کی کرسی پر براجمان دیکھ کر یقین نہیں آیا، کیونکہ کافی عرصے سے اس کرسی پر مردوں کی حکمرانی دیکھتے آرہے ہیں اور اتنے اچھے اچھے تبصروں کی موجودگی میں اپنے خط کو پہلے نمبر پر دیکھنا یہ میرے لیے بڑے ہی اعزاز کی بات ہے اور آپ لوگوں کی بھی شکرگزار کہ بن کہے آپ نے میری خواہش پوری کر دی (تحریر اپنی جگہ خود بناتی ہے) طاہرالدین بیگ، رانا محمد سجاد اور دیگر ساتھیوں کے تبصرے پسند آئے، ڈاکٹر روبینہ رب تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ آپ کی پریشانی جلد از جلد دور ہو ایم اے خالق بھٹی ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم جسے ووٹ دے رہے ہیں وہ کتنا باکردار اور ایماندار ہے۔ وطنِ عزیز کے باسیوں دعا کرو کہ آنے والے حکمران ہمارے وطن کے لیے خیر کا باعث بنیں اب پرچے پر بات ہو جائے حقیقی اسلام، صائمہ اقبال، میں رئیس کے کردار نے بے حد متاثر کیا اس کا کردار نام نہاد مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ رئیس کے جیسا حوصلہ پانا تو دور کی بات ہے ہم تو اسلامی ملک کے باسی ہونے کے باوجود اپنوں کے خون کے پیاسے ہو چلے ہیں اور پیاس بھی ایسی کہ جو کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ہم لوگ غیر مسلموں کی نظر میں اپنا اور اپنے دین کا امیج خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

☆ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاولپور سے ”سرگزشت کے مارکیٹ میں پہنچنے کی تاریخ 28 مقرر ہے۔ بعض اوقات یہ مارکیٹ میں مقررہ تاریخ سے پہلے آجاتا ہے۔ لوگ اسے بھول بھلیوں میں 28 کو خریدنے بازار جاتے ہیں جس سے دنوں کی تاریخ خرید میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس سے کئی قارئین کے خطوط لیٹ ہو کر شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ امید ہے اس طرف توجہ دیں گے۔ (پہلے پہنچنا بہتر ہے بعد میں پہنچنا نقصان کا باعث)“

☆ عمران قریشی کی آمد کوئٹہ سے ”اپنی موجودہ تحریر فطرت، کے ہمراہ حاضر ہونے کی جسارت کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ تحریر آپ کے معیار پر پوری اترنے کی اہلیت رکھے گی۔ کوشش کرنا برحق ہے۔ لیکن کامیابی دینا خدا کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ کامیابی سے یاد آیا کہ گزشتہ سال میری تحریر جنس، سچ بیانیوں میں شائع ہوئی۔ لیکن اعزازی کاپی وصول نہ ہونے کی بدولت مجھے معلوم نہیں ہو پایا۔ یوں تحریر شائع ہونے کی خوشی سے محروم رہا۔ دو مہینے پہلے میری والدہ محترمہ کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں قریبی بک اسٹال کی جانب گئیں تب پرانے ڈائجسٹوں کی خریداری کے دوران جون 2012ء کے ماہنامے کی کاپی دستیاب ہوئی۔ انہوں نے کاپی لاکر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ فطرت کے نام سے تحریر حاضرِ خدمت ہے۔ گزارش یہ ہے کہ اگر تحریر قابلِ اشاعت ہوئی تب اعزازی کاپی ضرور ارسال کیجیے گا۔“

☆ انجم فاروق ساحلی کا خلوص نامہ لاہور سے ”امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر و خوبی ہوں گے۔ مئی کا سرگزشت ایکشن جیسے مناظر لیے منفرد ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ جو معمول سے مختلف جاذبِ نظر معلوم ہوا۔ خطوط کی محفل شہرِ خیال خوب ہری بھری تھی۔ خط شائع کرنے کا شکریہ۔ رنگین اشتہارات اولین صفحات پر نظروں میں شادابی پیدا کر رہے تھے۔ عقلِ کل عظیم فلاسفر کے متعلق اچھی تحریر تھی۔ مصنف دیکھ کر دلچسپی دوچند ہوگئی۔ جیمس ہیڈلے چیز ہمارے پسندیدہ ادیبوں میں شامل ہیں۔ انہیں سسپنس کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات میں کمال حاصل تھا وہ ہر معاشرتی کردار کو اس کے اصلی رنگ روپ میں پیش کیا کرتے تھے۔ ہم ساز، حقیقی اسلام، سچا عشق اچھی تحریریں تھیں۔“

☆ رانا محمد شاہد کا خط بورے والا سے ”معراج رسول کا اداریہ آج کے پاکستان کی ایک تلخ حقیقت تھا۔ کہتے ہیں ملک 2008ء سے پہلے اتنا مقروض نہیں تھا جتنا گزشتہ 5 سالوں میں ہوا ہے۔ کرپشن کا ایک بے مہار گھوڑا اس ملک کو قرض کی دلدل میں دھنساتا چلا گیا۔ شہرِ خیال کا فونٹ سائز آپ نے بڑا کر کے بہت اچھا کیا۔ یہی فونٹ رکھیں۔ رانا محمد سجاد نے اچھا لکھا۔ سیاست درحقیقت مفادات کا کھیل ہے۔ انڈین اداکاروں کے حوالے سے آپ کی بات کچھ عجیب تھی۔ شاہ رخ اگر مذہب سے اتنا ہی لگاؤ رکھتا تو کبھی ایک ہندو عورت سے شادی نہ کرتا یا اپنے بچوں کے نام ہندوؤں کے ناموں پر نہ رکھتا یا پھر یہ نہ کہتا کہ میرا کوئی مذہب نہیں، میرا مذہب انسانیت ہے۔ آپ بالی ووڈ پر ذرا غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ اکثر ہی مشہور جوڑے مسلمان اداکار اور ہندو اداکارہ یا مسلمان اداکارہ اور ہندو اداکار پر مشتمل ہوں گے۔ کچھ عرصے پہلے بھارت کے معروف ایٹمی سائنسداں عبدالکلام نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ قرآن پڑھنے کے بعد گیتا پڑھتے ہیں تاکہ قرآن کا اثر نہ ہو جائے، مزید کیا کہیں۔ ڈاکٹر روبینہ آپ نے کون سا الیکشن لڑنا تھا کہ ڈگری جعلی ہوتی۔ ویسے آپ کے نام کی لمبائی دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کا تعلق ہیروں کے خاندان سے ہے۔ تاریک کے ایک مشہور دانشور و مفکر سقراط پر تحریر دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ ابن کبیر نے عظیم پاکستانی ہیرو ایم ایم عالم کی زندگی پر ایک بھرپور مضمون تحریر کیا۔ ایم ایم عالم پاکستان کا ایک قیمتی اثاثہ تھے۔ بہادری اور جرأت کا نشان تھے۔ ایم ایم عالم حقیقی معنوں میں اقبال کے شاہین تھے۔ سندھ کے ضلع شکار پور کے اس گاؤں کے متعلق پڑھ کر حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ حکومت اس علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے کوئی اقدامات نہیں کر رہی۔“

☆ طاہرالدین بیگ کی میرپور خاص سے خوش بیانی ”شہرِ خیال میں دلچسپ خطوط خاص طور پر سدرہ بانو ناگوری کا دلچسپ خط آخری سطر بہت خوب رہی دونوں رانا صاحبان کے خطوط زبردست تھے ڈاکٹر صاحبہ کے لیے دل سے دعا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے دو جہاں کے رب ان کی اور سب کی پریشانیاں دور فرمادے آمین اواقعی علم کو موت نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کی تحریر عقلِ کل، آنکھ والے اندھوں کے لیے زبردست تحریر اور معلوماتی بھی ایم ایم عالم پر ابن کبیر نے غازی خوب لکھا اور بہت ہی اچھا لکھا ساتھ میں دو انگلیوں والے بڑی حیران کن تحریر معلومات کا خزانہ شکار پور کے گاؤں کا تذکرہ جسے زین مہدی نے تحریر کیا ہے۔ مریم کے خان ایک سرپھرے کی کہانی جسے انہوں نے بدیس سے لیا اور خوبصورت پیرائے میں سسپنس فل انداز سے لکھا کہ پڑھتے وقت دل بھی ادھر ادھر بھی ادھر واقعی اگر انسان ہمت اور حوصلہ کرلے تو کیا کام ہے مشکل، آفاقی صاحب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فلمی الف لیلہ میں سے اب الف لیلہ غائب ہو رہی ہے اسی لیے جانوروں پر تحریر۔ سفرنامہ خوب رہا تھا اب نشر مکرر میں بھی مزا دے رہا ہے (یہ نشر مکرر نہیں بلکہ تازہ سفرنامہ ہے) مزہ تو شکاریات کے پس منظر میں لکھی ہوئی خواب گاہ میں چھپا، اسلم فرخی صاحب برادر کہاں سے تلاش کرلی ایسی زبردست کہانی؟ آتے ہیں حقیقی اسلام کی طرف جسے صائمہ اقبال نے لکھا ہے اور زبردست لکھا ہے اس کہانی کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے بس یہ پڑھنے کی تحریر ہے اور اسے بار بار پڑھ کر اسامہ عطاری، سچا عشق، پڑھا اور کئی بار پڑھا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کہانی زبردست ہے تاریخ میں واقعی عشق کی ایسی مثال بہت کم ملے گی۔ امجد رئیس صاحب کی بازیگر باہر سے درآمد ہے اور زبردست درآمد ہے حوصلہ اور ہمت سے بھرپور مائیک رائن کی کہانی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ صل علی، ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے ہر پڑھنے والے کو چاہیے کہ فوٹو کاپی کرا کر اپنے دوستوں میں تقسیم کردے۔ ملک اور خاص طور پر کراچی والوں کے لیے انہیں چاہیے کہ اسے ضرور پڑھیں۔“

تاخیر سے موصول خطوط:

زہرہ گوہر (کراچی)۔ ثناء رحمٰن۔ نسیم الدین خان فہمی اللہ (ملتان)۔ نوید شہزاد، احسن فاروقی، محمد محمود، نازش انصار، وسیم منصور فاروقی، ملک میاں سرور (چنیوٹ)۔ محمد ظفر، سید نجم احسن، انجم تسلیم (گجرات) عاصم احسن، فاروق خان (فیصل آباد) نثار چغتائی۔ فہیم ارباز خان (ساہیوال) فرحان خان، رعنا ریاض (کراچی) فرحت حسین، زینب مرزا، رضا احسن، نعمان (نوشہرہ)۔ محمد رمضان، ادریس محمد خان (لاہور)۔ عارف حسین (سکھر)

ڈاکٹر ساجد امجد

زندگی گہرا سمندر ہے اور اسے ڈوب کر پار کرنا کارہائے دشوار صحیح مگر جو شناور ہوتے ہیں وہ اسے بھی پار کرکے زندگی گلزار کرلیتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی شناور تھا لیکن انوکھے مزاج کا تھا۔ اپنی زندگی میں انگارے بھرکر دوسروں کی زندگی کو برفاب بنانے کی سعی میں مصروف رہا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنے فن کا ماہر ہوتے ہوئے بھی اس کے گھر میں فاقے رقص کرتے تھے۔ دوا کے پیسے نہ ہونے کے سبب بچے بیماری سے دم توڑتے رہے۔ بیوی کے تن پر اچھا لباس نہ ہوتا پھر بھی وہ خوش رہتا اور دوسروں کے لیے جنت تلاش کرتا رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عالم اس کا دیوانہ ہے۔ اس کے بنائے ہوئے نکات نے کئی ملکوں کا تختہ الٹ دیا۔ آدھی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔

دنیا کے سب سے اہم اشتراکی مفکر کا زندگی نامہ

1813ء کی جنگِ آزادی نے جرمن قوم کے اندر حب الوطنی کا جذبہ تو پیدا کردیا تھا لیکن محض جذبے سے قومیں ترقی نہیں کرتیں، ایک صحیح سمت اور لائق حکمرانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ ملک عرصے تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ٹکڑوں میں بٹا رہا۔ صنعتی دنیا میں تو اس ملک کا کبھی شمار ہی نہیں تھا حالانکہ اس کے پڑوس میں فرانس اور انگلستان بھاپ کی طاقت کا استعمال خوب زور و شور سے کررہے تھے۔

جنگِ آزادی ختم ہوئی۔ فرانسیسی غلامی سے تو چھٹکارا مل گیا لیکن عام آدمی کی زندگی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ فرانسیسی چلے گئے لیکن جرمنی کے سرمایہ دار ان کا خون نچوڑنے کے لیے موجود تھے۔ کڑھن اور خلفشار کی ایک لہر پورے ملک میں دوڑ رہی تھی۔ بہترین دماغ عام دماغوں کو اس کڑھن سے نکالنے کے لیے سرگرم تھے۔ اس کے نتیجے میں سوشلزم کے بنیاد کار مزدوروں کے حقوق کے لیے جنگ آزما ہونے لگے۔ یہ جنگ تھی سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ، کارل مارکس اور فریڈرش اینگلز اس جنگ کے دو بنیادی کردار تھے۔

☆☆☆

''اگر ہمیں خود پر تہذیب و تمدن کے دروازے کھولنے ہیں تو ہمیں عیسائی مذہب اختیار کرنا ہوگا۔''

''آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ میرے سسر یعنی آپ کے والد یہودی کاہن تھے اور آپ عیسائی بننے کی باتیں کررہے ہیں۔''

''ان کے حالات کچھ اور تھے میرے معاملات دوسرے ہیں۔''

''تمہارے کیا معاملات ہیں۔''

''تم نہیں سمجھوگی۔ بس اتنا جان لو کہ اگر تہذیب کی دولت کو چرایا جاسکنا ممکن ہوتا تو میں ہرگز عیسائی مذہب اختیار نہ کرتا۔''

''آپ جیورسٹ ہیں۔ معاشرے میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ تبدیلیٔ مذہب کی شہرت ہوگی تو لوگ کیا کہیں گے۔''

''مذہب ہر شخص کا ذاتی فیصلہ ہوتا ہے۔''

”برابر کے کمرے میں ہمارا بچہ سو رہا ہے۔ جو صرف چھ سال کا ہے لیکن خاصا ذہین ہے۔ کیا وہ ان باتوں کو نہیں سمجھے گا۔“

”سچ پوچھو تو میں اس کی آیندہ زندگی کے لیے یہ سب کر رہا ہوں۔ وہ اس بات کو ضرور سمجھے گا۔“

”میں تو خیر آپ کی بیوی ہوں۔ آپ کے ہر کام میں شریک لیکن میں بھی ایک کاہن کی بیٹی ہوں۔ کیا وہ مجھے معاف کر دیں گے۔“

”ہمیں اپنی زندگی دیکھنی ہے۔ اگر کوئی ہمیں چھوڑتا ہے تو چھوڑ دے۔“

جرمنی کے علاقے رائین لینڈ میں ٹری ویس نامی مقام کے ایک گھر میں میاں بیوی کے درمیان یہ بحث شام تک چلتی رہی تھی۔

برابر کے کمرے میں سویا ہوا بچہ ایسی گہری نیند سویا تھا کہ اندھیرا اچھیل گیا تھا اور وہ اٹھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کی ماں اپنے شوہر سے بحث میں الجھی ہوئی تھی اس لیے اسے بھی اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ جب وہ بحث سے اکتا گئی تو بچے کو دیکھنے کے بہانے شوہر کے پاس سے اٹھ گئی۔ اس کے خیال کے مطابق ضروری تھا کہ دونوں الگ رہ کر اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

یہ بچہ کارل مارکس تھا جو اَب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ٹری ویس کے ایک گرامر اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ چکا تھا لیکن ابھی تک بستر پر ہی تھا۔

”آج تو تم بہت سو لیے۔“

”آپ نے مجھے سونے ہی کہاں دیا۔ آپ لوگ اتنی زور زور سے بول رہے تھے کہ آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ آپ لوگ تو مجھے سونے بھی نہیں دیتے۔“

”تمہارے ڈیڈی اب ایک نئی بحث میں پڑ گئے ہیں۔ معلوم نہیں تم ان باتوں کو سمجھو گے یا نہیں۔“

”کیسی بحث مام۔“

”تمہیں معلوم ہے ہم یہودی ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”اب تمہارے ڈیڈی کا اصرار ہے کہ ہمیں عیسائی مذہب اختیار کر لینا چاہیے۔“

”اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔“

”اس عظیم تبدیلی کو تم نہیں سمجھو گے۔“

”جب میں سمجھوں گا ہی نہیں تو آپ مجھے بتا کیوں رہی ہیں۔ اور ہاں ایک اور بات بتا دوں۔ ڈیڈی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہو گا۔ ان کی بات مان لیں۔ میرے بہت سے دوست عیسائی ہیں۔ یہ کوئی برائی تو نہیں ہے۔“

وہ دونوں میاں بیوی رات کے کھانے کے بعد بھی اسی موضوع پر بات کرتے رہے تھے بالآخر وفادار بیوی نے شوہر کی بات مان لی تھی۔

دوسرے دن اتوار تھا لہٰذا کارل مارکس کے باپ نے عبادت کے اس دن سے فائدہ اٹھایا اور گرجا میں جا کر ضروری مذہبی رسومات ادا کرنے کے بعد عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔

کارل مارکس نے ٹھیک کہا تھا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے کوئی بھی فرق نہیں پڑا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ فرق پڑا تھا تو اس کے والدین کو پڑا تھا۔ اس کے والد نے اس کی مسیحی تربیت کے لیے اسے اپنے ایک دوست لڈوگ فان ویسٹ فالن کے سپرد کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ شخص حکومت المانیہ کا پریوی کونسلر تھا۔

وہ فان ویسٹ کے گھر گیا تو اس گھر میں اسے سب سے زیادہ دلچسپ جینی نام کی لڑکی لگی جس کے بال بھورے اور ہنسی بہت تیکھی تھی۔ یہ فان ویسٹ کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے بھی اسے دیکھ کر کچھ کم دلچسپی نہیں دکھائی تھی بلکہ کارل مارکس نے تو یہی سوچا ہو گا کہ عیسائی بننے کا تحفہ ہے، جو اسے جینی کی شکل میں ملا ہے۔ مسٹر فان ویسٹ بھی نہایت ترقی پسند اور انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ شفیق بھی بہت تھے۔ وہ کھیل کھیل میں کارل مارکس کو کئی کام کی باتیں بتاتے رہے۔

کارل مارکس کی تعلیم و تربیت گرامر اسکول اور فان ویسٹ کے گھر پر ہوتی رہی۔

کارل مارکس اور جینی ساتھ ساتھ بڑے ہوتے رہے۔

بان یونیورسٹی سے کارل مارکس نے سترہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کا باپ چونکہ جیورسٹ تھا لہٰذا وہ بھی باپ کی پیروی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگا لیکن جلد ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ صرف قانون کی تعلیم حاصل کرنے سے یکسانیت کا شکار ہو جائے گا۔ وہ برلن یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تا کہ وہاں قانون کے علاوہ اور بھی مضامین پڑھ سکے۔

برلن یونیورسٹی میں اس کی ذہانت کو دنیا ہی دوسری نظر

آئی۔ قانون، فلسفہ، تاریخ، ادب اور آرٹ کے مطالعہ میں دن رات محو رہنے لگا۔

یہ شوقِ مطالعہ ایسا بڑھا کہ وہ تقریباً گوشہ نشیں ہو کر رہ گیا۔ دوستوں سے ملنا جلنا تقریباً ختم ہو گیا۔ کسی تفریحی مجلس میں جانا تو دور کی بات تھی۔ دن ہو یا رات اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہی دیکھی جاتی تھی۔ اس مطالعے نے اسے لکھنے کی طرف بھی راغب کیا۔ یونانی اور لاطینی کتابوں کے ترجمے کر کے رکھتا رہا۔ فلسفیانہ کتابیں پڑھتا تو ان میں اپنے طبع زاد فلسفیانہ اصول شامل کرتا جاتا۔ جینی کی ہم نشینی میں اس کے جذبات بھی جوان ہوتے رہے تھے لہٰذا اس نے شاعری بھی شروع کر دی۔ وہ نظمیں لکھتا رہا فلسفیانہ کتابیں پڑھتا رہا۔

اسے برلن یونیورٹی میں پڑھتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ یہ تمام عرصہ بے پناہ مطالعہ میں بسر ہوا تھا۔ کانٹ اور نطشے کا تو وہ حافظ ہو گیا تھا لیکن یہ بھی ہوا کہ ان دونوں فلسفیوں کی خامیاں اس سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ آہستہ آہستہ وہ ان سے دور ہوتا گیا اور پھر ”ہیگل“ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس فلسفی کا ایسا عاشق ہوا جیسے ہیگل کے سوا دنیا میں کوئی رہتا ہی نہ ہو حتیٰ کہ جینی سے ملتا تو اس وقت بھی اس کے بالوں کی خوبصورتی پر کوئی نظم سنانے کے بجائے ہیگل کے فلسفے پر گفتگو کرتا رہتا۔ جینی کو اس کی اس عادت سے چڑ ہونے لگی تھی۔ ایک دن اس نے کہہ بھی دیا تھا ”تم کہتے تو یہی ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے لیکن دراصل تمہاری محبوبہ ہیگل ہے۔“

ہیگل سے اس کا یہ عشق اتنا بڑھا کہ اب تک اس نے جو پڑھا تھا اور اس کی روشنی میں جو لکھا تھا سب بے کار نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی تمام نظمیں آتش دان میں پھینک دیں۔ کہانیوں اور ناولوں کے لیے جو مواد جمع کرتا رہا تھا وہ سب ضائع کر دیا۔

اپنی تخلیقات کے ضائع کرنے کا صدمہ تھا یا کیا تھا کہ وہ بیمار ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے لیے یہ علاج تجویز کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کسی پُرفضا مقام پر چلا جائے اور مطالعاتی سرگرمیاں موقوف کر دے۔

اس کی ذہنی کاوشوں کو دیکھ کر کوئی شخص بھی ہوتا یہی مشورہ دیتا۔

اس نے جبری آرام کے لیے ”شٹرالاؤ“ کا مقام منتخب کیا۔ وہ کچھ دن تو خالی بیٹھا خیالوں کے بان بنتا رہا۔

یہاں کے پُرفضا مقام سے دل بہلاتا رہا لیکن پھر اس فرصت سے اکتا گیا۔ ہیگل کی کتابوں نے پھر اسے اپنے جال میں جکڑ لیا۔ اس پر اچانک انکشاف ہوا کہ وہ ہیگل کی تمام تصنیفات ایک نہیں کئی کئی مرتبہ پڑھ چکا ہے مگر اس کے سامنے میدان کھلا تھا۔ ہیگل کی اپنی تصنیفات کے علاوہ بہت سی وہ کتابیں بھی تھیں جو مصنفوں نے اس کے (ہیگل کے) فلسفے پر لکھی تھیں اور اس کے نظریے سے اتفاق یا اختلاف کیا تھا۔ اس نے وہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہیگل کے مقلدوں اور مخالفوں میں سے شاید ہی کسی کی کوئی تصنیف ایسی ہو جو اس کی نظروں سے بچی ہو۔

ہیگل کا اندازِ بیان کچھ ایسا مشکل تھا کہ اسے سمجھ لینا آسان کام نہیں تھا۔ اس کی تصانیف کا مطالعہ بہت صبر آزما تھا۔ کارل مارکس اپنی بیماری کے باوجود ان کتابوں میں سر کھپاتا رہا۔ اور جب یونیورسٹی واپس آیا تو ہیگل کے فلسفے پر حرفِ آخر بن چکا تھا۔

گریجویٹ کلب میں ہونے والے مباحثوں میں اس کی دھوم مچ گئی۔ اس کے فلسفے میں وہ ایسے گوشے تلاش کر رہا تھا جو اب تک دوسروں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس کے لیے اسے سخت ریاضت اور مطالعے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔

اس کا باپ اس کی محنت سے واقف تھا۔ خوش بھی ہو رہا تھا لیکن اسے اس کی صحت کی طرف سے فکر بھی تھی۔ اس نے اس کے نام خط لکھا جس میں اسے دوسرے لڑکوں کی طرح آرام سے رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

”دوسرے لڑکے رات بھر چین کی میٹھی نیند سوتے ہیں لیکن میرا ذہین اور لائق بیٹا کارل کتابوں میں ڈوبا ہوا لمبی راتیں آنکھوں میں گزار دیتا ہے۔ خشک، روکھے اور سر توڑ مضامین میں الجھا ہوا جسم و روح کو گھلا رہا ہے..... پیچیدہ فلسفوں کی خاطر زندگی کا تمام آرام اور لطف اپنے اوپر حرام کیے ہوئے ہے۔ جو کچھ وہ آج تعمیر کرتا ہے اسے اگلے دن توڑ دیتا ہے اور آخر میں اس نتیجے میں پہنچتا ہے کہ دوسروں سے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ بھی گنوا بیٹھا ہے جو اس کے اپنے پاس تھا۔ اس کی صحت خراب ہو گئی ہے، جسم تھک گیا ہے۔ دماغ میں بے چینی اور خیالات میں پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔ دوسری طرف معمولی لوگوں کو دیکھو وہ نہایت آسانی سے اپنا سفر طے کرتے ہوئے آگے بڑھے چلے جاتے ہیں۔

کیا اچھا ہو اگر تم بھی اپنی اس خلوت نشینی اور شب

بیداری کو چھوڑ کر خوش مزاج اور اہلِ ذوق لوگوں کی صحبت میں اپنا کچھ وقت صرف کیا کرو......"

اس نے باپ کی نصیحت کو پڑھا ضرور۔ باپ کے درد کو محسوس بھی کیا لیکن اسے وہ زندگی عزیز نہیں ہو سکتی تھی جس کی جانب باپ کی شفقت بلا رہی تھی۔ وہ تن آسانی کی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اسے معمولی علم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ سرکاری عہدہ مل سکتا تھا۔ اس کے باپ کی منشا غالباً یہی تھی لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ وہ باپ کے خط کا جواب دینے کے بجائے نظم لکھنے بیٹھ گیا۔

ہم کیوں اپنی بے پناہ زندگی کو
ذلیل غلامی میں سوچ سوچ کر گھلائیں
جبکہ اپنی ہمت اور قوتِ بازو سے
ہم جدوجہد میں شریک ہو سکتے ہیں

اسے علم حاصل کرنے اور علم بانٹنے ہی میں لطف ملتا تھا۔ وہ کسی اعلیٰ سرکاری عہدے کے بجائے متمنی تھا کہ اسے پروفیسر بنا دیا جائے۔ اس نے خود کو پروفیسر شپ کا اہل بنانے کے لیے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا۔ فلسفہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس نے ڈیموکریٹس اور اپیقیورس کے فلسفوں پر کام شروع کر دیا اور جلد ہی اس کا مقالہ مکمل ہو گیا۔

اس کی عمر ابھی کل 23 سال تھی کہ اس نے جنیا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کر لی۔ اب وہ خوش تھا کہ اس کو اس کی امیدوں کا ثمر مل جائے گا لیکن جرمن یونیورسٹیاں بھی دیگر اداروں کی طرح خیالات کی آزادی کا مرکز نہ تھیں۔ کارل مارکس کی آزاد بیانی کو پسند نہیں کیا گیا۔ اس کی تحریروں کی روشنی میں اسے یونیورسٹی کے لیے خطرناک سمجھا گیا۔

اس جیسے آزاد خیال آدمی کے لیے صحافت کا پیشہ مناسب ہو سکتا تھا۔ قلم کے ذریعے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا تھا اور دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا سکتا تھا۔

جرمنوں کی سامراجی ذہنیت نے اس کے شاندار مستقبل کی راہ میں دیوار کھڑی کر دی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے باوجود وہ پروفیسر نہ بن سکا۔ شاید قدرت اسے کچھ اور بنانا چاہتی تھی۔ اس نے آزاد نامہ نگار کی حیثیت سے صحافت کا آغاز کر دیا۔

وہ اپنی رسمی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے محسن ویسٹ فالن کی بیٹی جینی بھی فراغت کے دن گزار رہی تھی لہٰذا دونوں کی ملاقاتیں جلد جلد ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ دونوں فلسفے کی خیالی دنیا سے نکل کر جذباتی گفتگو میں وقت گزاریں۔ دونوں سیر سپاٹوں میں مشغول ہو گئے اور ایک دن اس فلسفی نوجوان نے جس کی عمر بہ مشکل 24 سال ہوئی تھی جینی کو شادی کی پیش کش کر دی۔

"جینی!" میں نے نہایت سنجیدگی سے سوچا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری دوستی اب شادی میں بدل جانی چاہیے۔"

"شادی کوئی سودا نہیں ہے جسے تم خرید لوگے۔ اس کے لیے بڑوں کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ تمہارے والد مجھے پسند کرتے ہیں۔"

"میں اپنے والد کی نہیں تمہارے والد کی بات کر رہی ہوں۔"

"مجھے تمہاری رضامندی کی ضرورت ہے۔"

"کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"تم اپنے والد سے کہو، وہ میرے والد سے بات کریں۔ یہ معاملہ بڑوں کے ذریعے طے ہو تو اچھا ہے۔"

اس کے والد کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے گھر میں بات کی۔ والد نے جینی کے باپ سے بات کی۔ وہ ان دنوں کچھ نہیں کر رہا تھا لیکن اس کی ذہانت اس کے مستقبل کے روشن ہونے کی ضمانت تھی۔ ویسٹ فالن فوراً تیار ہو گئے۔ جینی اس کی بیوی بن کر اس کے گھر آ گئی۔

اس کے بے درد مضامین اخبارات میں شائع ہو رہے تھے۔ ان مضامین میں وہ ہیگل کا منطقی حربہ استعمال کرتے ہوئے سامراجیت اور قدامت پسندی پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی بے رحم تنقید ہی سے جرمنی کو روحانی آزادی ملے گی۔

شادی کے بعد اسے ایک مستقل آمدنی کی شدید ضرورت تھی۔ یہ سبیل اس طرح نکل آئی کہ رائین لینڈ کے بعض ترقی پسند لوگوں نے ایک اخبار نکالا۔ مارکس کو بھی اس اخبار میں لکھنے کی دعوت دی گئی۔ اس کے مضامین اس اخبار میں باقاعدگی سے شائع ہونے لگے۔

اس کے زوردار جملوں اور بے لاگ تبصروں نے ہر طرف دھوم مچا دی۔ اس کے مضامین نے اس اخبار کی اشاعت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اخبار کو ناز تھا کہ اس کے پاس ایک ایسا مصنف موجود ہے۔ انہی دنوں اس اخبار کے ایڈیٹر نے استعفیٰ دے دیا۔ اخبار کی انتظامیہ نے کارل مارکس کو اس اخبار کا ایڈیٹر بنا دیا۔

رائین گزٹ کی اس ملازمت نے یہ ضرورت اس کے سامنے لا کر کھڑی کر دی کہ وہ سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ اقتصادیات کا مطالعہ کرے۔

اس نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ ان معاملات پر بحث میں حصہ لینے کے لیے نا قابل ہے جو کہ عام طور پر مادّی مفاد سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ بعض مسائل ایسے سامنے آئے جنہوں نے اسے اکسایا کہ وہ اقتصادی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ان مسائل کی تحقیق میں ڈوب جائے۔

ان دنوں فرانسیسی سوشلزم اور کمیونزم کے ایسے خیالات کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی جن میں فلسفے کی ہلکی سی چاشنی بھی تھی۔ مارکس کو یہ سطحی خیالات پسند نہ آئے لیکن جب اس نے اپنا جائزہ لیا تو اس پر ظاہر ہوا کہ وہ بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس سطحی پن کو دور کر سکے اور فرانسیسی سوشلزم کی اصل روح کو لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔ اس کا ذاتی مطالعہ اس معاملے میں ناکافی تھا۔

حکومت کو یہ سطحی مضامین بھی ہضم نہ ہو سکے۔ حکومتی اداروں نے خطرے کی گھنٹی سن لی۔ مارکس کے مضامین حکومت کی رجعت پسندی اور سخت گیری کو مسلسل بے نقاب کر رہے تھے۔ سوشلزم دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔

ایک دن اخبار کی انتظامیہ نے کارل مارکس کو طلب کیا اور ایک خط اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس خط میں اخبار کے مالکان کو تنبیہ کی گئی تھی کہ وہ اپنا رویہ بدل لیں ورنہ ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ اخبار پر پابندی بھی لگ سکتی ہے۔

خط پڑھنے کے بعد مارکس نے سوال طلب نظروں سے مالکان کی جانب دیکھا۔

"آپ سمجھ گئے ہوں گے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔"

"میں قطعی نہیں سمجھا۔"

"کمال ہے! آپ یہ نہیں سمجھے کہ آپ کے مضامین حکومت کی نظروں میں ناپسندیدہ ہیں۔"

"حکومت کو چاہیے کہ میری تنقید کی روشنی میں اپنی اصلاح کرے۔ جرمنی کی آزادی اور ترقی اسی میں پوشیدہ ہے۔"

"اگر حکومت اپنی اصلاح نہیں کرتی تو ہمیں اپنی اصلاح کرنی ہوگی۔"

"ہماری اصلاح سے کیا مراد ہے۔"

"ہمیں اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنی ہوگی ورنہ اخبار بند ہو جائے گا۔"

"اخبار آپ کا ہے اس کے بند ہونے کی فکر آپ کو ہوگی۔ میں اپنے نظریات کیسے تبدیل کر سکتا ہوں۔"

"آپ یہاں ملازم ہیں۔ اخبار کی جو پالیسی ہوگی آپ کو اسی کے مطابق چلنا ہوگا۔"

"اگر میں ملازم نہ ہوتا۔"

"پھر ہم آپ سے پوچھنے والے کون تھے۔ آپ آزاد ہوتے۔"

"مجھے ملازمت سے زیادہ اپنی آزادی عزیز ہے۔ میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔"

"کارل مارکس جذباتی مت بنو۔ ملازمتیں روز روز نہیں ملتیں۔"

"اخبار بھی اس طرح نہیں چلتے۔ آپ پالیسی بدل بھی لیں گے تو بھی حکومت اخبار کو بند کر دے گی۔ مجھے ملازمت اس وقت بھی چھوڑنی ہوگی تو ابھی کیوں نہیں۔"

اس نے اخبار کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا۔

جینی سمجھ رہی تھی کہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کا کیا مطلب ہے۔ غربت اور مزید غربت لیکن وہ مطمئن بھی تھی کہ گھر میں ابھی بہت کچھ ہے جسے بیچ کر اپنی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

اخبار سے الگ ہو کر وہ نئے ابھرنے والے مضمون یعنی "سوشلزم" کے مطالعے میں غرق ہو گیا بالکل اسی طرح جیسے کبھی ہیگل کے مطالعہ میں غرق ہو گیا تھا۔ اس وقت سوشلسٹ ادب اس کے سامنے تھا اور وہ ایک کے بعد دوسری کتاب پڑھتا جا رہا تھا۔

دو سال کی انتھک محنت کے بعد وہ اس گہرے غوطے سے ابھرا تو اس کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ وہ پکا سوشلسٹ بن چکا تھا۔ وہ اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ اگر صنعتی دنیا کے ان افسوس ناک سماجی حالات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنا مقصود ہو تو وہ تبدیلیاں محض مزدوروں کی اپنی متفقہ کوششوں ہی سے عمل میں آ سکتی ہیں۔

جینی بڑی ہمت سے حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس کی زبان پر حرفِ شکایت نہیں تھی لیکن مارکس اس کی ذہنی کیفیت سے نا آشنا نہیں تھا۔ یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ جینی کو خوش رکھ سکے۔ خوش رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کے لیے پیسے کما سکے۔ اس کے لیے وہ برابر کوشش کرتا رہا تھا۔

اسے معلوم ہوا کہ پیرس سے ایک جرمن فرانسیسی سال نامہ جاری ہو رہا ہے۔ اس کے لیے ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔

اس نے درخواست دی۔ اس سے اچھا ایڈیٹر انہیں کون مل سکتا تھا۔ اس کی درخواست قبول ہوئی۔ ظاہر ہے اب اسے پیرس جانا تھا۔ وہ اکیلا نہیں جا سکتا تھا۔ جینی کو بھی اس کے ساتھ جانا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اتنی آسانی سے تیار نہیں ہوگی۔ اور وہی ہوا۔ اس کے لیے کئی دن تک اس سے بحث کرنی پڑی۔

جینی سے بحث کرتے ہوئے اسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ اس کے والدین تبدیلیٔ مذہب کے موضوع پر اسی طرح الجھے تھے اور بالآخر اس کی ماں تیار ہو گئی تھی۔

جینی کو بھی تیار ہونا پڑا۔

پیرس پہنچتے ہی اس نے سال نامے کی ترتیب کے لیے کام شروع کر دیا۔ مقالے آنے شروع ہو گئے۔ اس نے ان مقالوں کو پڑھنا شروع کیا۔ ایک مقالے کو پڑھتے وقت وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس مقالے میں مصنف نے انصاف کے نام پر موجودہ اقتصادی نظام کی مذمت کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یوٹوپین سوشلسٹوں کے بتائے ہوئے اقتصادی حل سے بھی اپنا اختلاف ظاہر کیا تھا۔

یہ مقالہ فریڈرش اینگلز نامی نوجوان کا لکھا ہوا تھا۔ مارکس نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آیا کہ یہ نوجوان مصنف اس سے ملنے رائین گزٹ کے دفتر میں بھی آیا تھا۔ مارکس کو افسوس ہوا کہ اس وقت وہ اینگلز کی صلاحیتوں کو بھانپ نہیں سکا تھا ورنہ آج اس کی دوستی کو کئی سال ہو چکے ہوتے۔ یہ مقالہ کسی عام ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔ اینگلز یقیناً دوستی رکھنے کے لائق ہے۔

اینگلز اس وقت مانچسٹر میں مقیم تھا۔

اینگلز کا یہ مقالہ ہی مارکس اور اینگلز کے درمیان اس حسین اور لافانی دوستی کی ابتدا بنا جس کی مثالیں دوستی کی تاریخ میں بہت کم ہوں گی۔ اینگلز کی دوستی کی بدولت ہی مارکس عمر بھر تصنیفی اور انقلابی سرگرمیوں میں مصروف رہ سکا۔ اینگلز نہ ہوتا تو شاید مارکس کسی ناموری کے بغیر ہی مفلسی کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن چکا ہوتا۔

فریڈرش اینگلز مارکس کی پیدائش کے دو سال بعد جرمنی کے اسی علاقے میں جہاں مارکس پیدا ہوا تھا ایک امیر مل مالک کے گھر پیدا ہوا تھا۔ گھر کا ماحول نہایت رجعت پسند اور دقیانوسی تھا۔ گھر کا ماحول تجارتی تھا لہٰذا اعلیٰ تعلیم کا موقع بھی نہ مل سکا اور باپ کی تجارت میں شامل ہونا پڑا۔ پھر اسے اریمن اینڈ اینگلز نامی کپڑے کے کارخانے میں ایجنٹ کی حیثیت سے مانچسٹر جانا پڑا۔

مانچسٹر جانے سے قبل وہ فلسفے اور سائنس کی دنیا میں نئے رجحانات اور نئے تجربات میں نہایت گہری دلچسپی لیتا رہا تھا۔

مانچسٹر جاتے وقت وہ کارل مارکس سے اس کے دفتر میں ملا تھا لیکن یہ ملاقات بہت ٹھنڈی رہی تھی۔ مارکس اس سے قطعی متاثر نہیں ہوا تھا لیکن اب اس کا مقالہ سامنے رکھا تھا اور وہ اینگلز کو یاد کر رہا تھا۔ اس نے قلم سنبھالا اور اینگلز کے نام ایک توصیفی خط لکھ دیا۔ اینگلز نے وعدہ کیا کہ وہ انگلستان سے واپسی میں اس سے ضرور ملاقات کرے گا۔

فرانس علم و آگہی کا سرچشمہ تھا۔ پیرس کے دورانِ قیام میں مارکس کی بہت سے سوشلسٹوں اور انقلاب پسندوں سے ملاقات ہوئی۔ سب سے اہم ملاقات پرودھون سے تھی جو اس وقت یورپ بھر کے صفِ اولین کے سوشلسٹ مفکروں میں شمار ہوتا تھا۔ مارکس سے اس کے ایسے قریبی تعلقات ہو گئے تھے کہ اکثر اقتصادی مسائل پر بحث کرتے ہوئے تمام رات گزار دیا کرتا تھا۔

سال نامے کے بند ہو جانے کے بعد یہ دوست اور کتابوں کا انبار ہی اس کا سرمایہ اور سہارا تھا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے وہ .... پیرس فارورڈ نامی اخبار میں جو کہ جمہوریت کا پیغام بردار تھا مضامین اور مقالات لکھنے لگا۔ ان مضامین میں جرمنی کی خودسر حکومت پر اکثر چوٹیں ہوا کرتی تھیں۔ مارکس یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ فرانس میں رہ کر جرمنی کی حکومت کے خلاف کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ جرمنی کی حکومت ان مضامین سے پریشان تھی۔ اس نے فرانس کی حکومت پر زور ڈال کر اسے ملک بدر کرا دیا۔

جرمنی کے دروازے بند تھے، فرانس سے نکالا جا رہا تھا۔ اس نے جو معمولی سا گھر کا سامان تھا باندھا اور بیلجیم کے شہر بروسلز پہنچ گیا۔

وہ اتنے غصے میں تھا کہ یہاں پہنچتے ہی احتجاج کے طور پر اپنے جرمن شہری حقوق واپس کر دیے اور پھر زندگی بھر کسی ملک کی شہریت نہ حاصل کی نہ قبول کی۔ آنکھیں کھول کر مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ یہ ایسی عادت تھی جو کسی حالت میں اس سے چھوٹ نہیں سکی تھی۔

اسے بروسلز آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اینگلز انگلستان سے واپس آگیا اور اس سے ملنے بروسلز آیا۔ اب تک دونوں کے درمیان خط کتابت ہوتی رہی تھی اب

دونوں آمنے سامنے تھے اور اس طرح مل رہے تھے جیسے برسوں پہلے مل کر بچھڑے تھے حالانکہ کبھی نہیں ملے تھے۔

"دوست میں نے تجارت کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور تصنیف و تالیف میں تمہاری مدد کرتا رہوں گا۔" اینگلز نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ کانٹوں بھرا راستہ ہے جس پر تم چلنے آگئے ہو۔ میں تو خیر عادی ہو چکا ہوں لیکن تم کیسے گزارہ کرو گے۔ تجارت کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے۔ کھاؤ گے کہاں سے؟"

اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا فی الحال تو وہ کتابیں دیکھو جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔"

اینگلز نے علم المعاشیات پر کتابوں کا ایک ڈھیر اس کے سامنے لگا دیا جو اس نے مارکس کے مطالعہ کے لیے یورپ کی مختلف زبانوں میں مہیا کی تھیں۔

اتنی کتابیں دیکھنے کے بعد مارکس کو کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ اس نے اپنی گھنی داڑھی میں انگلیاں پھیریں اور ایک کتاب اٹھالی۔ اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اینگلز اس کے پاس بیٹھا ہے یا اٹھ کر چلا گیا۔

اینگلز بروسلز میں اس کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

مارکس کو ان کتابوں کی صورت میں ایسی غذا مل گئی تھی کہ اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

شاید ان کتابوں کا نچوڑ ہی تھا جو اس نے اینگلز کے ساتھ مل کر اپنی تصنیف میں جمع کیا۔ اس کی یہ کتاب "متبرک خاندان" کے نام سے شائع ہوئی۔ اسے امید تھی کہ ہیگل کے نو مقلد سماجی تنقید کے میدان میں باہر نکل آئیں گے۔

اس کتاب میں تاریخ کے متعلق مارکس کا مشہور مادی نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے لکھا تھا۔

"یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی زمانے کو بلا اس زمانے کی صنعت اور اس وقت کے ذرائع پیداوار کا مطالعہ کیے سمجھا جا سکے۔ خیالات محض اسی حد تک اور اسی وقت تک کسی سماج کو ترقی دینے اور کسی سماج کے بنانے کی اہلیت اور طاقت اپنے اندر رکھ سکتے ہیں جس حد تک اور جس وقت تک کہ وہ خیالات عوام کے مفاد کی نمائندگی کرتے ہوں ورنہ ان خیالات سے سوائے اس کے کہ تھوڑی سی شورش پیدا ہو جائے کوئی مفید اور ٹھوس مقصد برآمد نہیں ہو سکتا......"

اس کے تصورِ مادیت کا نچوڑ یہ تھا۔

"یہ دنیا اپنے خمیر اپنی سرشت سے ہی مادی ہے۔ دنیا کے یہ مختلف النوع مظاہر، یہ تمام حقیقتیں اپنی مختلف شکلوں میں اور ارتقا کے مختلف مدارج میں متحرک مادہ ہی ہے اور کچھ نہیں۔ یہ دنیا مادے کے حرکتی قوانین کے مطابق ہی نشو و نما پاتی ہے اور اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔"

بروسلز کے مطالعاتی دور میں پرودھون کی کتاب فلسفۂ افلاس اس کے ہاتھ لگی۔ پرودھون سے اس کے ذاتی تعلقات تھے.... پیرس میں اس نے بہت سارا وقت اس کے ساتھ گزارا تھا۔ اس کی رائے کا قائل بھی تھا۔ اس نے نہایت مرعوبیت کے ساتھ کتاب کو اٹھایا اور پڑھنے بیٹھ گیا لیکن سطر سطر پر اختلاف کرتا چلا گیا۔ کتاب ختم ہوئی تو سرخ روشنائی سے بھر گئی تھی۔ مارکس ان حصوں کو انڈر لائن کرتا گیا تھا جہاں جہاں اسے اختلاف تھا۔

اختلافات کی تعداد اتنی ہو گئی تھی کہ ایک الگ کتاب تیار ہو سکتی تھی۔ وہ پرودھون کی کتاب کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

یہ کتاب اس نے فرانسیسی زبان میں لکھی اور "افلاس فلسفہ" اس کا نام رکھا۔

پرودھون سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے لیکن اس کتاب میں اس نے پرودھون پر کڑی نکتہ چینی کی، اینگلز نے اسے ٹوکا بھی۔

"پرودھون سے تمہاری دوستی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"جو چیز مجھے محنت کش طبقے کے مفاد کے خلاف نظر آئے گی اور صداقت کے منافی ہوگی میں اس کے خلاف ضرور لکھوں گا۔ دوستی خطرے میں پڑتی ہے تو پڑے۔ میں اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوئی تحریر نہیں لکھتا۔"

☆☆☆

ان دنوں لندن میں کمیونسٹوں کی ایک جماعت "جرمن مزدوروں کی تعلیمی انجمن" کے نام سے کام کر رہی تھی۔ یہ انجمن دراصل جرمن پناہ گزینوں کی اس ٹوٹی ہوئی انجمن کا ایک حصہ تھی جو پیرس میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے قیام کے دو سال بعد وہ لوگ جو انتہا پسند تھے اور مزدور پیشہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس انجمن سے الگ ہو گئے۔ ان لوگوں نے ایک الگ خفیہ انجمن قائم کر لی جس کا نام "انصاف پسندوں کی لیگ" رکھا۔ یہ نئی انجمن بہت جلد ترقی کر گئی۔ یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ جب فرانس میں جرمنی کے اثر سے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ

شروع ہوا تو اس کی مرکزی سرگرمیاں لندن منتقل ہوگئیں۔ لندن میں چونکہ قانونی طور پر ہر شہری کو تنظیمی حقوق حاصل تھے اس لیے اسے خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا اعلانیہ انجمن کی بنیاد رکھی گئی جس کا نام ''جرمن مزدوروں کی تعلیمی انجمن'' رکھا گیا۔

بڑی تعداد میں نئے ممبروں کی بھرتی کا آغاز ہوگیا۔

کارل مارکس بروسلز میں پناہ گزیں تھا اور اپنے سوشلسٹ خیالات کی بدولت مشہور ہورہا تھا۔ اس کی دو کتابیں بھی منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ گویا انقلابی سرگرمیوں میں مصروفِ کار تھا۔

بروسلز میں بھی مذکورہ لیگ (انصاف پسندوں کی لیگ) کے کچھ ممبر موجود تھے جنہیں مارکس کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور اس کے خیالات سننے کا موقع ملا تھا۔ کمیونسٹ خیالات کے یہ لوگ مارکس سے بہت متاثر تھے۔ ان لوگوں نے اپنی مرکزی کمیٹی (لندن) کو کارل مارکس کے بارے میں لکھا۔

''ایک ایسا دماغ بروسلز میں موجود ہے جس کا دل مزدوروں کی طرح دھڑکتا ہے۔ وہ نہ صرف دانش ور ہے بلکہ اس کا رہن سہن بھی مزدوروں کی طرح ہے۔ اس کی قربانیوں کا اعتراف یہ ہوگا کہ ہم اس کے ذہن کو کام میں لاکر مزدوروں کے مفاد میں نئی راہیں تلاش کریں۔ اسے لیگ میں شامل کرکے اس سے بڑے مفید کام لیے جاسکتے ہیں۔''

یہ خیالات لندن پہنچے تو انہیں بھی کارل مارکس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اسی قسم کے خیالات پیرس شاخ کی طرف سے بھی موصول ہوئے تو مرکزی کمیٹی کی توجہ کارل مارکس کی طرف مبذول ہوئی۔ مرکزی کمیٹی نے طے کیا کہ اپنے ایک نمائندے کو بروسلز بھیجا جائے جو مارکس کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرے اور اگر وہ کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو اسے اسی سال منعقد ہونے والی لیگ کی پہلی کانگریس میں مدعو بھی کرلیا جائے۔

ایک نمائندہ بروسلز آگیا اور ملاقات کے لیے اس کے گھر پہنچا۔ اس کا میزبان ایک معمولی سے کوٹ پینٹ اور بے پناہ گھنی داڑھی میں اس کے سامنے تھا۔ جس کمرے میں وہ بیٹھا تھا اس میں کتابوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ایک میلی سی دری بچھی تھی، اس پر بھی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ لکھنے کے لیے جگہ بنانی پڑتی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس سال یا اس سے کچھ زیادہ ہوگی لیکن کثرتِ کام سے بوڑھا نظر آرہا تھا لیکن چہرے پر ایسی دلفریب مسکراہٹ تھی جیسے سارے زمانے کی شفقت اس چہرے پر سمٹ آئی ہو۔ آنے والا اجنبی تھا لیکن اپنائیت کی کرنیں مارکس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھیں۔

''میرا نام مول (Moll) ہے۔''

''ناموں میں کیا رکھا ہے۔ آپ مجھ تک آئے ہیں تو یقیناً شائقِ علم ہوں گے ورنہ میرے گھر میں کیا رکھا ہے۔ میری بیوی کے پاس ایسے شاندار کپڑے بھی نہیں کہ آپ کے سامنے آسکے۔ کہیے میں آپ کی کیا خدمت کروں۔''

''آپ نے انصاف پسندوں کی لیگ کا نام سنا ہوگا۔''

''نام کیا میں تو اس کے کام سے بھی واقف ہوں۔ یہاں بروسلز میں اس کے بہت سے ممبر ہیں جو میرے پاس آتے رہتے ہیں۔''

''میں اسی لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''میں پھر پوچھوں گا کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں۔''

''میں اپنے ساتھیوں کی جانب سے آپ کو لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دینے آیا ہوں۔''

''کیا آپ نے یہ پوچھ لیا ہے کہ آپ کی لیگ میرے خیالات کو اپنانے کے لیے تیار ہے؟ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اب تک اس لیگ کے سیاسی پروگراموں میں خفیہ سازشوں کو اہمیت حاصل رہی ہے جبکہ میں سوشلزم کو سائنس کا درجہ دیتا ہوں اور یہ ایمان رکھتا ہوں کہ سوشلزم میں ہی انسانوں کی نجات ممکن ہے۔ میں سامراجی نظام سے متفق نہیں لیکن اسے مٹانے کے بجائے تبدیل کرنے کا خواہاں ہوں۔ یہ نظام ذہنی انقلاب کے بعد ہی تبدیل ہوسکتا ہے۔''

''جناب، ہم خود سمجھنے لگے ہیں کہ دہشت کاری جو ہمارا حربہ تھا بے سود تھا۔ اب ہم آپ کے خیالات سے استفادے کے حق میں ہیں۔''

''مجھے بھی اپنی سائنس کو عملی تجربے سے گزارنے کے لیے ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں اس لیگ کے پروگراموں میں شرکت کے لیے تیار ہوں۔'' مارکس نے کہا اور پھر قدرے توقف کے بعد مسٹر مول کے کان کے قریب

سرگوشی کی ''میں ایک اور کام کے آدمی کا نام بتاؤں جو مجھ سے بھی زیادہ آپ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔''

''ہمیں تو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔''

''اس شخص کا نام ہے فریڈرش اینگلز۔ اس سے ملنا ہے تو آپ کو پیرس جانا ہوگا۔ وہ ان دنوں پیرس میں مقیم ہے۔''

یہ نمائندہ پیرس گیا اور اینگلز کو بھی لیگ میں شامل کرلیا۔

لیگ میں شامل ہوتے ہی مارکس نے بروسلز میں اس کی ایک شاخ قائم کی اور اینگلز نے پیرس کی شاخوں سے اپنے تعلقات قائم کیے۔

لندن میں لیگ کی کانگریس منعقد ہوئی تو مارکس کو بھی مدعو کیا گیا۔ مارکس خود تو نہ جاسکا اس نے اپنے دوست ولیم وولف کو بھیجا البتہ اینگلز پیرس شاخ کی طرف سے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوا۔

اس اجلاس میں بڑے کام کی باتیں ہوئیں۔ لیگ کو از سرِ نو منظم کیا گیا اور لیگ کا نام بدل کر ''کمیونسٹ لیگ'' رکھا گیا اور لیگ کے مقاصد ظاہر کرتے ہوئے یہ اعلان جاری کیا گیا۔

''سرمایہ داروں کا زوال، مزدوروں کی حکومت، پرانے سرمایہ دارانہ سماج کا انہدام جو کہ طبقاتی خصوصیت پر قائم ہے اور ایک ایسے نئے سماج کی تعمیر جو طبقاتی تقسیم سے مبرّا اور شخصی ملکیت کی لعنت سے پاک ہوگا۔ اس لیگ کے مقاصد ہیں۔''

اسی سال لیگ کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں اینگلز کے ساتھ مارکس بھی شریک ہوا۔ مارکس نے اپنی تقریر میں اپنے نظریہ کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی۔

اس کے نظریہ پر لیگ کے ارکان دس دن تک برابر بحث کرتے رہے اور بالآخر مارکس کے بنیادی اصولوں پر اتفاق کرلیا گیا اور مارکس کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ اینگلز کی مدد سے لیگ کے اغراض و مقاصد، مینی فیسٹو کی شکل میں تحریر کرے۔

مارکس نے اینگلز کی مدد سے مینی فیسٹو تیار کیا۔ یہی وہ تحریر ہے جو آج دنیا میں کمیونسٹ مینی فیسٹو کے نام سے مشہور ہے۔

دنیا کے حالات تیزی سے تبدیل ہورہے تھے۔ انقلابِ فرانس نے یورپ بھر میں ایک ہلچل سی مچا ڈالی تھی۔ لیگ کے لیے بھی کام کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ ہر ملک مزدوروں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہوگیا تھا۔ لندن کی مرکزی کمیٹی نے اپنے اختیارات بروسلز کے سرکردہ ممبروں کو منتقل کردیے۔ مارکس ابھی بروسلز میں تھا اور بروسلز شاخ کی رہنمائی کررہا تھا۔

ابھی یہ اختیارات منتقل ہوئے ہی تھے کہ انقلاب کے شعلوں نے بروسلز کو بھی اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پیرس میں حالات مزدوروں کے حق میں چلے گئے تھے لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ تحریک کا مرکز پیرس کو بنایا جائے۔ بروسلز میں ایک خفیہ اجلاس ہوا جس میں منظوری دی گئی کہ تمام اختیارات مارکس کو دے دیے جائیں اور اس سے کہا جائے کہ وہ پیرس جاکر ایک نئی مرکزی کمیٹی قائم کرے۔

اس خفیہ اجلاس کی بھنک غالباً پولیس کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ پولیس کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کیا فیصلے ہوئے ہیں البتہ یہ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ حکومت کے خلاف سازشیں ہوئی ہوں گی اور ان سازشوں کا سدِّباب اس طرح ممکن ہے کہ کارل مارکس کو گرفتار کرلیا جائے۔ اس کی گرفتاری کے بعد ممبران خود بخود منتشر ہوجائیں گے۔

مارکس کے چھوٹے سے گھر کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کے نزدیک مارکس ایک خطرناک آدمی تھا اور وہ مزاحمت کرسکتا تھا۔ ان کا اندازہ غلط نکلا۔ مارکس خود باہر آگیا۔ پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔

اس گرفتاری کے بعد غالباً اعلیٰ حکام کی ہدایت کے مطابق اسے اس شرط پر رہا کردیا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس ملک سے نکل کر فرانس چلا جائے گا۔ مارکس کو پارٹی کا پیغام پہلے ہی مل چکا تھا لہٰذا اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

وہ جانے کی تیاری کررہا تھا کہ حکومت فرانس کے ایک اعلیٰ رکن کی جانب سے ایک دعوت نامہ اسے موصول ہوا۔

''جمہوریت فرانس کی سرزمین ہر حریت دوست کے لیے جائے پناہ ہے۔ ظلم نے آپ کو دیس سے نکالا ہے۔ آزاد فرانس آپ کے لیے اپنے دروازے کھولتا ہے۔ آپ کے لیے اور ان سب ساتھیوں کے لیے جو آزادی اور اخوت کے متبرک اصولوں کو حاصل کرنے کی خاطر جدوجہد میں مشغول ہیں۔''

اس نے ایک اور جلاوطنی کا تاج سر پر رکھا اور فرانس پہنچ گیا۔ فرانس پہنچتے ہی اس نے لیگ کی مرکزی کمیٹی کی

تشکیل تو کی۔ اس کے پہنچتے ہی جرمن مزدوروں کی ایک بھیڑ اس کے گرد جمع ہوگئی۔ اس نے ان کی تربیت کے لیے بڑے بڑے اجلاس منعقد کیے۔ مارکس کی تقریروں نے ان مزدوروں کے خون کو گرما دیا۔ جب ان مزدوروں پر مارکس کا نقطہ نظر پوری طرح واضح ہوگیا تو اس نے ان مزدوروں کو جرمنی واپس بھیجا کہ وہاں جا کر انقلاب کی تیاری کریں۔

مارکس نے مرکزی کمیٹی کی طرف سے ایک اعلان شائع کیا جس کا عنوان تھا "جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کے مطالبات۔"

یہ اعلان جرمنی کے اندر گوشے گوشے میں تقسیم کیا گیا۔ جب فضا اچھی طرح تیار ہوگئی تو مارکس اور اینگلز دونوں خود بھی اپنے پرانے علاقے وائین لینڈ پہنچ گئے۔ مارکس کے آبائی گھر میں اس کے بوڑھے ماں باپ اس کے منتظر تھے وہ اتنے عرصے کی جلاوطنی کے بعد ان سے مل رہا تھا۔ اس کی ماں اسے دیکھ کر رو پڑی تھی۔ باپ کی آنکھوں میں چمک تھی لیکن سوچ رہا تھا کاش! اس کا بیٹا صعوبتوں کا یہ راستہ اختیار نہ کرتا۔

"کارل مارکس، تمہیں یاد ہے میں نے کبھی تمہیں یہ نصیحت کی تھی کہ اتنی محنت نہ کرو۔ دوسرے لڑکوں کی طرح چین کی نیند سویا کرو۔ اب دیکھو تمہاری صحت کا کیا حال ہوگیا ہے۔"

اس کی ماں نے اسے سمجھایا۔ "انقلاب کا راستہ ترک کردو ورنہ اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتے رہو گے۔ سرمایہ داروں کے سکوں کے آگے تمہاری آواز دب جائے گی۔"

"کوئی سکہ ایسا نہیں بنا جو تمہارے بیٹے کو خرید سکے۔ رہی دربدری کی بات تو اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے مزدوروں کے حقوق کے لیے اتنا کام کیا ہے کہ اب سامراجی ملکوں کو ان کے حقوق دینے ہوں گے۔"

"کیا اچھا ہو کہ اب ہمیشہ کے لیے تم میرے پاس رہو۔"

"ایسا ہی ہوگا کیونکہ اس مرتبہ میں جرمنی میں رہنے کے لیے آیا ہوں۔"

"ہم تمہاری شہریت کی بحالی کے لیے کوشش کریں گے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں ایک نیا جرمنی تعمیر کروں گا۔ فرانس کے انقلاب کی طرح ایک نیا انقلاب یہاں بھی اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ میری شہریت اس نئے جرمنی سے مشروط ہوگی۔"

اب اسے ایک ایسے ہتھیار کی ضرورت تھی جسے کام میں لا کر وہ انقلاب کے لیے فضا تیار کرسکے۔ اس نے اور اینگلز نے مل کر حصہ دار تلاش کیے۔ جب خاطر خواہ سرمایہ اکٹھا ہوگیا تو "جدید رائین گزٹ" کے نام سے ایک اخبار کی داغ بیل ڈالی۔

اس اخبار کے کالموں میں اس نے نہایت بے خوفی سے انقلاب کی تلقین شروع کردی۔

"وقت آگیا ہے جب ہمیں سرمایہ داروں کو زبردستی نہتا کرنا ہوگا۔ انقلابی تشدد اور انقلابی دہشت کاری کی مدد سے نزع کی ان جاں گسل اور گھناؤنی گھڑیوں کو جن میں پھنسا ہوا آج کا سماج بے بسی کی حالت میں پاؤں رگڑ رگڑ کر جان دے رہا ہے ہمیں مختصر کرنا ہوگا۔ ہمیں ایک انقلابی فوج کو وجود میں لانا ہوگا اور اسے لے کر امیروں کی دنیا کو پیروں تلے روندتے ہوئے "غیر طبقاتی" سماج کی حدود میں داخل ہونا ہوگا۔"

دراصل انقلاب فرانس نے اسے ایک راہ سجھادی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ مزدوروں کے لیے پُرامن انقلاب کے تمام دروازے بند ہوچکے ہیں۔ مزدوروں کے لیے یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ کوئی بھی تبدیلی پُرامن طریقے سے لاسکیں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ قوتِ بازو اور تشدد کا راستہ اپنایا جائے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب وہ عدم تشدد کا قائل تھا مگر اب حالات دوسرے تھے۔

اس نے وقت کی عبارت کو پڑھ لیا تھا لیکن مزدوروں کی آنکھیں ان علامات کو پڑھنے سے قاصر رہیں۔ ان پر مارکس کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مزدوروں کو "انقلابی فوج" میں تبدیل نہ کرسکا۔

یہ اخبار ڈیڑھ سال کی کاوشوں کے بعد صرف اتنا کرسکا کہ مارکس کو حکومت کی نظروں میں لے آیا۔ حکومت کا تشدد اپنا رنگ دکھانے لگا۔ بہت سے مدیر قید کے خوف سے دوسرے ممالک کو چلے گئے۔ اخبار کے حصہ داروں نے ہاتھ اٹھالیا۔

مالی امداد بند ہوچکی تھی۔ اخبار کو بند ہوجانا چاہیے تھا لیکن مارکس اپنی ضد پر ڈٹا رہا۔ وہ اخبار بند کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

حصہ داروں نے امداد دینی بند کردی۔ کوئی بات نہیں۔

باپ کی طرف سے سات ہزار تھالر (جرمنی میں اس وقت رائج چاندی کا سکہ) ملے تھے جو جیب میں تھے۔ اس سے وہ اپنی کئی ضرورتیں پوری کرسکتا تھا لیکن وہ اپنی ذات کے بارے میں تو سوچتا ہی نہیں تھا۔ اس نے یہ رقم اخبار کو زندہ رکھنے میں لگادی۔

اس کے نزدیک یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ اخبار کی چھ ہزار کاپیاں فروخت ہورہی تھیں اور خیال تھا کہ جب ایک ماہ بعد خریداروں کی طرف سے رقم وصول ہوگی تو رقم کا بڑا حصہ واپس آجائے گا۔ اس رقم سے آئندہ ماہ کے لیے اخبار چھاپے جائیں گے۔

اس نے سوچا کچھ تھا ہو کچھ اور گیا۔ رقم کی وصولی ابھی ہوئی نہیں تھی کہ ملک بدری کا حکم آگیا۔ اس حکم نامے کو پڑھتے ہی اس نے اخبار کا انقلابی نمبر نکالا اور الوداعی مضمون لکھا۔

"ہمیں ستانے کے بہانے تراشنے کے لیے حکومت کیوں جھوٹ اور افترا کے پل باندھ رہی ہے۔ ہم انقلابی ہیں اس لیے دوسروں سے نہ بھیک مانگتے ہیں نہ امید رکھتے ہیں۔ جب ہمارے دن پھریں گے تو ہم تشدد کے لیے بہانے نہیں تراشیں گے۔"

اخبار بند ہوگیا۔ اب سوال تھا مزدوروں، کلرکوں کی تنخواہ کا اور قرض خواہوں کے حساب چکانے کا۔ جو پونجی بچ گئی تھی وہ اس مد میں چلی گئی۔

جیب میں کچھ نہیں تھا۔ بیوی کے کچھ زیور تھے وہ ان زیوروں کے سہارے پیرس چلا آیا کہ وہاں سرخ انقلاب آچکا تھا۔ سوچا یہ تھا کہ بیوی کا زیور گروی رکھ کر وہ پیرس سے اخبار نکالے گا لیکن یہاں تو پانسا ہی پلٹ چکا تھا۔ انقلاب دشمن طاقتیں اپنا اقتدار جما چکی تھیں۔ سرخ انقلاب کی سرخی زائل ہوچکی تھی۔ قدم رکھتے ہی اس کو قدم اٹھانے کا حکم مل گیا۔ جس ملک نے اس کے استقبال کے لیے بازو پھیلائے تھے اب اس پر تنگ تھا۔ اس کی بیوی امید سے تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے فوری طور پر ایک آرام دہ گھر کی ضرورت تھی۔

لندن ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں مارکس کو پناہ مل سکتی تھی۔ وہ لندن پہنچا اور ایک کرایہ دار سے دو کمرے کرائے پر لے کر رہنے لگا۔

یہاں پہنچتے ہی اس کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ مفلسی گھر میں رقص کررہی تھی۔ بچے کی صحت اور تندرستی کے لیے وسائل کہاں سے مہیا ہوتے۔ زچگی کے دوران اس کی بیوی کو بھی صحیح غذا نہیں مل سکی تھی۔ بچہ صحت مند ہوتا تو کیسے، جب سے پیدا ہوا تھا بیمار چلا آرہا تھا۔

مارکس کے لیے لندن شہر کی تمام دلچسپیاں ایک جگہ میں سمٹ آئی تھیں اور وہ جگہ تھی "برٹش میوزیم" علی الصباح دروازہ کھلتے ہی لائبریری میں پہنچ جاتا اور شام کو لائبریری بند ہونے تک سیاست، اقتصادیات، عمرانیات، ریاضی اور دوسری کتابیں چاٹتا رہتا۔

اس کا یہ لڑکا صرف ڈیڑھ سال تک اس کی غربت کا تماشا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ کچھ دنوں کے لیے اس کا برٹش میوزیم جانا موقف ہوگیا۔ اسے بیوی کا غم غلط کرنے اور باقی بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں رہنا ضروری تھا۔ اس عالم میں بھی وہ پڑھنے لکھنے کے لیے وقت نکال ہی لیتا تھا اور مضامین لکھ کر "نیویارک ٹریبون" میں بھیجتا رہتا تھا۔ مضمون کی اجرت دو پونڈ فی مضمون ملتی تھی۔ کبھی کبھی ناقابلِ اشاعت کے پیغام کے ساتھ مضمون واپس بھی آجاتا تھا۔

اس نے پھر برٹش میوزیم جانا شروع کردیا تھا۔ ایک دن وہ لائبریری سے واپس آیا تو گھر کا سامان باہر پڑا تھا۔ اس کی بیوی، دونوں بیٹیاں اور بڑا لڑکا سامان کے پاس بے یارومددگار بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا جینی؟ کرایہ تو ہم دے چکے پھر تمہیں نکالا کیوں گیا ہے۔"

"مکان مالک کہتا ہے کہ کرایہ اسے نہیں ملا۔"

"وہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے اس کے کرایہ دار کو کرایہ دے دیا تھا۔ اس نے مالک مکان کو پہنچا دیا ہوگا۔"

"کرایہ دار نے نہ اپنا کرایہ دیا نہ ہمارا۔ مالک مکان نے اسے بھی نکال دیا۔ وہ تو غائب ہوگیا، ہم یہاں پڑے ہیں۔"

"جینی اب کیا ہوسکتا ہے۔ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ سال بھر کا کرایہ میں ادا کرچکا۔ اب دوسرا مکان لیں بھی تو کیسے۔ ٹھہرو، میں مالک مکان سے بات کرتا ہوں۔"

وہ مالک مکان کے پاس گیا اور اس سے ہفتہ دس دن کی مہلت لے کر آگیا۔ بچوں جینی اور سب نے مل جل کر...

سامان اندر پہنچایا۔ اب سوال یہ تھا کہ پیسوں کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔

''سامان بیچے بغیر کام نہیں چل سکتا۔'' مارکس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''آپ اپنے کسی دوست کو کیوں نہیں پکارتے۔''

''مجھے بھیک مانگنا اچھا نہیں لگتا۔''

''ہم بھیک نہیں مانگ رہے ہیں لیکن یہ بھی تو زیادتی ہے کہ جو شخص دوسروں کی خدمت کرتا رہا ہو اسے اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔ تمہیں یہ حق تو حاصل ہے کہ جن لوگوں نے تمہارے خیالات اور صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے تم ان سے مدد مانگو۔''

''سامان بیچے بغیر کام نہیں چل سکتا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ گویا وہ فیصلہ کر چکا ہے۔

اس نے گھر کا سامان جس میں اس کی کتابیں بھی تھیں فروخت کر کے ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ یہ مکان ڈین اسٹریٹ پر لندن کے مزدور علاقے میں تھا۔ گھروں کے نام پر غلیظ ڈربے بنے ہوئے تھے جہاں ہر طرف چمنیوں سے نکلنے والا کثیف دھواں پھیلا رہتا تھا۔

یہ عجیب مزدور آیا تھا کہ گھر کے فرش پر کتابوں کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دوسرے کمرے میں بیمار بچے بلکتے سسکتے رہتے تھے۔

اس غلیظ گھر میں اس وقت کچھ رونق سی آگئی جب اینگلز اس کے پاس آگیا۔ وہ مارکس کے ساتھ شریک کار ہوگیا اور یہ دونوں یورپ کی ان انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے جن کا جال ہر جگہ بچھا دیا گیا تھا۔

اینگلز اس غربت خانے میں زیادہ عرصہ نہ گزار سکا۔ اسے دوبارہ تجارت کے کام میں داخل ہونا پڑا تاکہ وہاں سے وہ اتنا کما سکے کہ اس کا دوست مارکس معاش کی فکر سے آزاد ہو جائے اور اپنا وقت تصنیف و تالیف اور انقلابی سرگرمیوں میں لگا سکے۔

اینگلز کے رخصت ہوتے ہی آنگن میں دھوپ پھر پھیل گئی۔ اس کے گھر کے سامنے مزدوروں کی قطاریں روز گزرتی تھیں۔ ان میں سے بہت سوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں ایک ایسا شخص رہتا ہے جو اُن کے حقوق کی جنگ لڑ رہا ہے۔

سخت افلاس اور تنگدستی کا سامنا تھا۔ اخبارات سے ہونے والی آمدنی ضروریات کے لیے ناکافی تھی۔ بہتر غذا تو درکنار اتنا بھی نہیں تھا کہ بچوں کی دوا دارو کر سکے۔ کھانستے کھانستے خود ہی خاموش ہو جاتے تھے۔ بخار میں بدن جلتا تھا اور پھر ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ وہ خود ایک مصنوعی زندگی گزار رہا تھا۔ اندر سے بجھا ہوا تھا، سب کو خوش کرنے کے لیے ہنستا رہتا تھا۔ کتنی محبت سے جینی کو بیاہ کر لایا تھا اور اب اس کے بچوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اکثر اوقات گھر سے باہر صرف اس لیے نہیں نکل سکتا تھا کہ کوئی ڈھنگ کا کپڑا اس کے پاس نہ ہوتا تھا۔ کسی مضمون کا خاکہ ذہن میں پرورش پا چکا ہوتا تھا لیکن کاغذ خریدنے کے پیسے نہ ہوتے کہ خیالات کو کاغذ پر اتار سکے۔ آمدنی کا ایک یہی ذریعہ تھا مگر اس میں بھی رکاوٹیں حائل ہوتی رہتی تھیں۔ مضمون لکھ لیتا تو کئی کئی دن ڈاک کے ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہ ہوتے۔ کسی دوست کو لکھتا، کچھ پیسے آجاتے تو مضمون امریکا روانہ کرتا۔

اسی عالم افلاس میں اس کی چھوٹی بیٹی فرنزیکا کھانسی، بخار میں مبتلا ہوگئی۔ اس وقت اس کے چار بچے تھے، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔

بچے بیمار پڑتے ہی تھے لیکن خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتے تھے۔ انہیں عرفان سا ہوگیا تھا کہ باپ کے پاس پیسے نہیں جو کسی ڈاکٹر کو دکھا سکیں لیکن فرنزیکا جلد باز نکلی۔ صرف تین دن موت سے لڑی اور پھر ہمیشہ کے لیے سو گئی۔

جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ ایک ہفتہ قبل ہی اس نے اینگلز کو خط لکھا تھا۔

''ہفتہ بھر سے صرف روکھی روٹی اور ابلے آلوؤں پر گزارہ ہے۔ شاید اب یہ بھی نہ ملے اور فاقہ کرنا پڑے۔ کاغذ خریدنے کے پیسے نہ تھے اس لیے اخبار کو مضمون بھی نہ بھیج سکا۔ اب صرف یہ ہونا باقی ہے کہ مکان کی مالکن گھر سے نکال دے کیونکہ اس کے 22 پونڈ بقایا ہیں۔ اچھا ہے نکال دے 22 پونڈ تو بچیں گے۔ سبزی والے، قصاب، پرچون ان سب کا قرض الگ ہے۔ وہ چکاؤں تو مزید قرض لوں۔ چند ہفتوں سے مزدوروں سے قرض لے رہا ہوں۔ شرم کی بات ہے مگر کیا کروں......

فرنزیکا مرگئی تو دونوں میاں بیوی نے اس کی ٹھنڈی لاش برابر کے کمرے میں رکھ دی اور دوسرے کمرے میں تینوں بچوں کے ساتھ زمین پر بستر لگالیا۔ سونے کے لیے نہیں رونے کے لیے۔

کب تک روتے۔ زندگی اسی طرح گزری تھی۔ آنسو خشک ہوئے تو یہ سوچنے بیٹھ گئے کہ تدفین کا انتظام کیسے کیا جائے۔

ایک جلاوطن فرانسیسی گھر کے پاس رہتا تھا۔ جینی جی کڑا کر کے اس کے گھر گئی اور اپنی بپتا سنائی۔ ضرورت ایسی تھی کہ انکار کون کرتا۔ اس نے دو پونڈ قرض دے دیے۔ ان پیسوں سے تابوت بنوایا اور بیٹی کو رخصت کیا۔

مفلسی کا یہ عالم لیکن مارکس کے پایہ استقلال میں ذرا جنبش نہیں تھی۔ وہ اعلان کر رہا تھا۔ ''میں ہر مصیبت میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ بوژوا طبقہ مجھے میرے مقصد سے ہٹا کر سونا کمانے کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ وہ کبھی بھی مجھے سونا بنانے کی مشین نہیں بنا سکتے۔''

اخبار میں مضمون لکھنا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اخبار کے لیے لکھتے وقت اخبار کی پالیسی کو مدِنظر رکھنا پڑتا ہے۔ وہ تو ایک علمی مقالہ قلم بند کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے کام بھی شروع کر دیا تھا لیکن اخبار کے مضامین اس کا بہت سا وقت کھا لیتے تھے۔

یہ علمی مقالہ وہ تھا جو آج بھی دنیا کے سامنے اس کی کتاب ''داس کیپٹل'' کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے اور اس کے نظریات کی تفصیل ہے۔

اس کا دوست اینگلز 1850ء میں اس سے جدا ہوا تھا پھر اپنی تجارتی مصروفیات میں ایسا گم ہوا کہ دونوں دوست بیس سال تک نہ مل سکے لیکن جدا بھی نہیں ہوئے۔ خط و کتابت جاری رہی۔ دونوں ایک لفظ بھی آپس کے مشورے کے بغیر نہیں لکھتے تھے۔

لندن میں رہتے ہوئے اور غربت کا سامنا کرتے ہوئے اس کے رویے میں ذرا بھی لچک نہ آئی۔ اس کا ملنا بہت کم لوگوں سے تھا۔ ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف رہتا تھا۔ یہ مشاغل اپنی کتاب ''داس کیپٹل'' کی تیاری کے تھے۔ وہ اسے ایک لافانی کتاب بنا دینا چاہتا تھا جو سرمایہ اور محنت پر یادگار ہو اور علم معاشیات میں ہمیشہ کام آتی رہے۔

اینگلز کی طرف سے کچھ امداد آنے لگی تھی جس سے اس کے حالات قدرے بہتر ہوئے تھے۔ اب اس نے یہ معمول بنالیا تھا کہ اتوار کے دن وہ کوئی دماغی کام نہیں کرتا تھا۔ یہ دن اس نے بچوں کے نام کر دیا تھا۔ کبھی کبھی بچوں کو لے کر قریب کے گاؤں میں چلے جاتے اور دن بھر وہیں کھاتے پکاتے تھے۔ مارکس یہاں پہنچ کر بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتا تھا۔

یہ ادائے بے فکری شاید قسمت کو پسند نہ آئی۔ زندگی میں کچھ سکون پیدا ہوا تھا کہ ارتعاش آگیا۔ اس کا اکلوتا بیٹا بیمار ہوا اور چند روز کی بیماری کے بعد فوت ہوگیا۔ یہ صدمہ ایسا تھا کہ مارکس جیسا انسان بھی لرز کر رہ گیا۔

''میں نے بہت سے مصائب برداشت کیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اب تک یہ علم نہ تھا کہ مصیبت کیا ہوتی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ مصیبت اس کو کہتے ہیں۔''

مارکس کا یہ لڑکا نہایت ہونہار تھا۔ مارکس نے اس سے بہت سی امیدیں باندھ رکھی تھیں اور پھر اکلوتا تھا۔ اس سے پہلے ایک لڑکا مر چکا تھا۔ ایک بیٹی کی موت بھی مارکس کے دل پر قیامت ڈھا چکی تھی۔

مارکس حقیقت پسند تھا۔ موت کو اٹل حقیقت سمجھتا تھا لیکن اس بیٹے کی موت نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس کی بیوی کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہ اپنا غم بھلا کر بیوی کی دیکھ بھال میں لگ گیا کہ زندگی بھر کی ساتھی کہیں کسی المیے کا شکار نہ ہو جائے۔ اس نے اسے زندگی میں دیا کیا تھا کہ اب تسلی بھی نہ دیتا۔

یہ 1858ء کے آس پاس کی بات ہے۔ بیٹے کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے چند ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ جینی کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ شوہر جلاوطن تھا۔ ماں کے آخری دیدار کے لیے بھی نہیں جاسکتی تھی۔

زندگی بڑی سخت جان چیز ہے۔ مرنے والوں کو کب تک رویا جائے۔ زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں تو چلانے پڑتے ہیں خصوصاً ایسی حالت میں کہ زندہ بچ جانے والے بچے کھانے کو مانگ رہے تھے۔ مارکس نے بھی بیٹے کا ماتم کرنے والے ہاتھوں میں قلم پکڑ لیا۔ اسے علمی کام بھی کرنے تھے اور روزی بھی کمانی تھی۔ اس نے شیڈول بنالیا، دن بھر روزی کمانے کے لیے لکھتا اور رات میں علمی کام کرتا۔ وہ ان دنوں ''تنقید معاشیات'' نامی کتاب لکھ رہا تھا۔

اس کی بیوی نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا۔ ''امریکا کے اقتصادی آشوب کا ہماری جیب پر برا اثر پڑا ہے کیونکہ پہلے مارکس امریکا کے اخبار ٹریبون کے لیے دو مضمون لکھتے تھے، اب وہ اخبار صرف ایک مضمون خریدتا ہے۔

جب سے ہمارے لڑکے کا انتقال ہوا اس کے بعد سے اب کہیں جا کر مارکس کی جان میں جان آئی ہے۔ دن

میں تو وہ روزی کمانے کے لیے کام کرتے ہیں اور رات، تنقید معاشیات نامی ایک کتاب لکھنے میں گزرتی ہے۔ آج کل ایسی کتاب کی بہت ضرورت ہے اور گمان غالب ہے کہ اس کتاب کو کوئی نہ کوئی طبع کرا ہی دے گا۔"

کارل مارکس نے محنتِ شاقہ کے بعد جیسی کہ اس کی عادت تھی متواتر نو مہینے کام کرنے کے بعد تنقید معاشیات مکمل کر لی۔

اب تک تو جیسے اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا لیکن جیسے ہی کتاب ختم ہوئی اس نے دیکھا کہ بھوک اس کے آنگن میں ناچ رہی ہے۔ اس کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ کتاب کا مسودہ پریس کو بذریعہ ڈاک روانہ کر دے۔

اس نے اینگلز کو خط لکھا۔

"شاید ہی کوئی مصنف دنیا میں ایسا ہوگا جس نے دولت پر کتاب لکھی ہو اور خود دولت سے اتنا محروم رہا ہو جتنا کہ میں..... ٹکٹوں کے لیے پیسے بھیج دو تا کہ اسے ڈاک میں ڈال سکوں۔"

ٹکٹوں کے پیسے آ گئے۔ مسودہ پریس پہنچ گیا لیکن معقول آمدنی کے بغیر کہیں غربت دور ہوتی ہے۔ ایک ضرورت پوری ہوئی دس ضرورتیں سامنے کھڑی تھیں۔ اخبار ٹریبون بھی مضامین خریدنے میں لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ کتاب کو پبلشر بھی نہیں مل رہا تھا۔ اسے بھی اپنے پاس سے ہی چھپوانا تھا جس کے لیے پیسوں کا بندوبست کرنا تھا۔ کب تک دوستوں سے مانگ مانگ کر گزارہ کرتا۔

اگلے ایک دو سالوں میں غربت نے اسے اس بری طرح جکڑ لیا کہ اس کی سخت جانی جواب دے گئی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ خود کو دیوالیہ اعلان کر دے۔ دو بڑی لڑکیوں کو کسی امیر کے بچوں پر ملازم کرا دے اور خود بیوی سمیت کسی ایسے ادارے کی عمارت میں چلا جائے جہاں نادار لوگ رہتے ہیں۔

وہ شاید اس ارادے پر عمل پیرا ہو بھی جاتا لیکن اس کے دوست اینگلز نے سو پونڈ روانہ کر کے دوستی کی لاج رکھ لی۔ اسی دوران اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس نے جوڑ کر چھوڑا وہ مارکس کو مل گیا۔ کچھ اطمینان ہوا تو اسے اپنی کتاب "تنقید معاشیات" یاد آئی جسے ابھی تک کوئی پبلشر نہیں ملا تھا۔ اس نے یہ ترکہ اپنی کتاب کی اشاعت میں لگا دیا۔

مفلسی نے پھر دروازہ دیکھ لیا۔

☆☆☆

لندن کا سینٹ مارٹن ہال کئی دن سے مزدوروں کی آمد و رفت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لندن کے عام لوگ اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ یہاں بین الاقوامی مزدوروں کی پہلی کانفرنس منعقد ہونے والی تھی جس کے لیے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ پمفلٹ بھی تقسیم کیے جا رہے تھے۔

روزِ مقررہ پر اس کانفرنس میں یورپ کے بہت سے ملکوں کے مزدور نمائندے شریک ہوئے۔ جرمنی کی طرف سے کارل مارکس کو مدعو کیا گیا۔

اس نئی انجمن کے قواعد، اغراض اور مقاصد مرتب کرنے کے لیے مختلف ممالک کے پندرہ نمائندوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔

اس کمیٹی کے مصارف کے لیے جب چندے کی اپیل کی گئی تو صرف تین پونڈ چندہ جمع ہوا۔ تین پونڈ، جن کی مدد سے دنیا کے سرمایہ دارانہ نظام سے ٹکر لینے کا عزم کیا گیا تھا۔

اٹلی کے رہنے والے مائزنی نے اغراض و مقاصد مرتب کرنے کی ذمے داری لی تھی۔ اس نے یہ مقاصد مرتب بھی کیے اور کمیٹی کے سامنے پیش بھی کیے لیکن یہ دستور اس قابل نہیں تھا کہ کسی بین الاقوامی تنظیم کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا۔ کمیٹی نے اسے نامنظور کر دیا اور اب یہ کام کارل مارکس کے سپرد کیا۔ اس نے دستور العمل مرتب کیا اور ایک افتتاحیہ خطبے کے ساتھ کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔

اسی بین الاقوامی کانفرنس کے بطن سے مزدوروں کی "فرسٹ انٹرنیشنل" نے جنم لیا جس کا کام مختلف ملکوں کے مزدوروں کی تنظیم کرنا اور ان کو آپس میں منسلک کرنا تھا۔

فرسٹ انٹرنیشنل کا تمام کام کارل مارکس کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ مارکس اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے اس کی ترقی و تعمیر میں مشغول ہو گیا۔

تمام یورپ کے مزدور طبقے کی تنظیم کا کام کچھ آسان نہ تھا۔ دردسری تو خیر تھی ہی لیکن سب سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ اس کام میں پڑ کر وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکا جس سے کچھ آمدنی ہو جاتی۔

مفلسی اور بیماری پھر اس کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ وہ از سر نو دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوا۔ اس نے اینگلز کو لکھا۔

"یقین جانیے اگر حالات اس قدر مخدوش نہ ہوتے تو اس خط کے لکھنے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ وہ انگلیاں قلم کر دوں جو یہ حرف لکھ رہی ہیں۔ یہ ناقابلِ برداشت معلوم

ہوتا ہے کہ دوسروں کو تکلیف دے کر زندگی بسر ہو رہی ہے لیکن جو خیال مجھے زندہ رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ تم اور میں ایک بڑے کام میں شریک ہیں اور میرا صرف یہ کام ہے کہ پارٹی کے لیے عملی کام کرتا رہوں۔"

انٹرنیشنل کا پورا نام ورکنگ مین انٹرنیشنل ایسوسی ایشن تھا۔ اس کا پہلا اجلاس بروسلز کے مقام پر منعقد ہوتا تھا لیکن بیلجیم کی حکومت نے اس کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔ یہ اجلاس تو ہونا ممکن نہیں تھا، مارکس نے اس کی جگہ لندن میں جنرل کونسل کی ایک میٹنگ بلائی۔ اسی میٹنگ میں مارکس نے اپنی ایک تصنیف پیش کی تھی جس میں "مسئلہ قدر" کی وضاحت کی گئی تھی۔ یہ تصنیف بعد میں قدر، قیمت اور منافع کے نام سے ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوئی۔

اس کے اگلے سال انٹرنیشنل کا پہلا اجلاس جنیوا میں ہوا۔ ساٹھ ممالک کے نمائندے اس اجلاس میں شریک تھے۔ اس اجلاس میں یہ قرارداد پاس کی گئی کہ مزدوروں کو بین الاقوامی طور پر محنت کے لیے آٹھ گھنٹے کا مطالبہ کیا گیا۔

دوسرا اجلاس منعقد ہوا تو اس میں سوشلسٹ نظریہ کی تشکیل نے اور بھی واضح شکل اختیار کی۔ اس اجلاس نے کوآپریٹو انجمنوں کی ترقی کے لیے اور اجرتوں میں اضافہ کے لیے جدوجہد کو قابلِ تحسین امر تسلیم کیا۔

غربت کا عفریت پنجے گاڑے کھڑا تھا کہ بیماری نے بھی آ دبوچا۔ تخلیقی اور عملی کاموں کی بے پناہ کثرت نے اسے بیمار ڈال دیا۔ اسی بیماری میں ایک پھوڑا نکل آیا جس کی تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ اس تکلیف میں بھی وہ اپنی مشہور تصنیف "داس کیپٹل" پر کام کرتا رہا۔ اینگلز کو پتا چلا تو اس نے اسے کام کرنے سے روکنا چاہا۔ اس کا خط آیا۔

"تم اس پھوڑے کا علاج کرو اور خدا کے لیے کچھ دن کے لیے رات کو کام کرنا بند کر دو۔"

تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ "کل پھوڑے کی تکلیف میں تمام دن پڑا رہا۔ اگر جیب میں پیسے ہوتے اور میں اپنے گھر والوں کی بسر اوقات کا کچھ انتظام کر سکتا نیز کتاب کی طباعت ہو چکتی تو پھر یہی خواہش کرتا کہ مر جاؤں۔"

دوسرے لفظوں میں اس نے یہ کہہ دیا کہ رات میں کام نہ کروں تو کیا کروں۔ کتاب کی تکمیل تک تو زندگی کی تنظیم یہی رہے گی۔

تکلیف اور بڑھ گئی۔

"اس مرتبہ میری حالت بہت نازک ہو گئی ہے۔ اگر اسی طرح دو چار مرتبہ تکلیف عود کر آئی تو بچنے کی کوئی امید نہیں۔ صحت بہت خراب ہو گئی ہے۔ سر میں تو نہیں لیکن ٹانگوں ... میں بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں زیادہ کام کرنے سے بیماری عود کر آئے گی۔ ان کا کہنا درست لیکن میں ان سے یہ کیسے کہوں کہ میں متواتر کام کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر کام نہ کروں تو کہاں سے کھاؤں۔"

وہ ان تمام مصائب کے باوجود اپنی تصنیف "سرمایہ" (داس کیپٹل) کی تکمیل میں مصروف رہا۔ اس کتاب کے لیے اس نے اپنی صحت، اپنی مسرت اور اپنے بیوی بچوں کی مسرت کو قربان کر دیا۔ اس کے تین بچے سسک سسک کر دم توڑ گئے۔ تب جا کر تین جلدیں مکمل ہوئیں۔ اب ایک ایک جلد کو تصحیح و ترمیم کے بعد طباعت کے لیے دینا تھا۔

یہ ترمیم و تصحیح بھی آسان نہیں تھی بلکہ پیوند کاری اصل کام سے بھی مشکل ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نظریات، حالات اور وقت کی ضروریات تبدیل ہوئی تھیں۔ بہت سے علمی انکشافات سامنے آئے تھے۔ اعداد و شمار میں تبدیلیاں آئی تھیں۔ اسے ان سب باتوں کا خیال رکھنا تھا۔ اس نے عظیم ترمحنت کے بعد پہلی جلد کی تصحیح مکمل کر لی اور اپنے دوست اینگلز کو اطلاع بھی دے دی۔

پہلی جلد شائع ہوئی تو مخالفتوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تو بہت بعد میں ہوا کہ اس کے تراجم مختلف زبانوں میں نکلے اور اس کی عظمت کے گن گائے گئے۔ علم معاشیات میں مارکس کے نظریات کو اہمیت حاصل ہوئی۔

پہلی جلد کی اشاعت کے بعد اسے اصولاً باقی جلدوں کی طباعت کا اہتمام کرنا چاہیے تھا لیکن وہ تو بہ یک وقت دو محاذوں پر لڑ رہا تھا۔ انٹرنیشنل کی دیکھ بھال بھی تو اس کی ذمے داری تھی۔

ہر سال انٹرنیشنل کا ایک اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ اب تک وہ گھر میں بیٹھ کر تھک رہا تھا۔ اب سفر کی صعوبتیں تھکا رہی تھیں۔ اسے ان اجلاسوں میں شرکت کے لیے لندن سے باہر نکلنا پڑ رہا تھا۔

اینگلز نے تجارتی زندگی سے تنگ آ کر 1869ء میں اپنا حصہ کمپنی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اسے ایک معقول رقم حاصل ہو گئی۔ اس سے وہ اپنے دوست مارکس کی مدد کرتا رہا۔

مارکس کو اینگلز کی جانب سے ساڑھے تین سو پونڈ سالانہ

رہے تھے جس نے مارکس کا معاشی بوجھ کسی حد تک کم کردیا تھا۔

1870ء کے اجلاس کے لیے پیرس کو منتخب کیا گیا لیکن فرانس اور جرمنی میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ اجلاس کھٹائی میں پڑ گیا۔

دونوں ملکوں کی جنگ کے دوران کارل مارکس مصالحانہ رویہ اختیار کیے رہا۔ ایک طرف اس نے جرمن مزدوروں کو ہدایت کی کہ وہ اس جنگ کو جارحانہ جنگ ہونے سے روکیں۔ دوسری جانب فرانس کے مزدوروں سے التجا کی کہ وہ اپنے ملک کی عارضی حکومت کا ساتھ دیں اور ہرگز ان کوششوں میں شامل نہ ہوں جن کا مقصد حکومت ہٹا کر مزدوروں کا پنچایتی راج قائم کرنا ہو۔

کارل مارکس کی یہ رائے نہایت دور اندیشی پر مبنی تھی لیکن فرانس کے مزدوروں نے اس کی نصیحت نہ مانی۔ انہوں نے اپنے ملک کی عارضی حکومت کو میدانِ جنگ میں شکست دے کر حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی لیکن یہ راج چند ہفتوں ہی قائم رہ سکا۔ سرمایہ داروں نے ایک بڑی فوجی طاقت کے ساتھ قتلِ عام شروع کردیا صرف دس دنوں میں چھ ہزار سے زیادہ مزدور اور عام لوگ قتل کردیے گئے۔ مزدور پنچایت کا راج خون کے دریا میں ڈوب گیا۔

کارل مارکس کا اندازہ درست نکلا۔

1870ء کے ستمبر میں بیس سال کی مفارقت کے بعد اینگلز لندن آیا اور کارل مارکس سے دوبارہ ملا۔ دونوں کے سروں سے جوانی کی دھوپ رخصت ہوچکی تھی۔ عجیب ملاقات تھی۔ دونوں بیس سال کے بعد مل رہے تھے لیکن کوئی بات بھی تو نئی نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے حالات سے واقف تھے۔ اس واقفیت کے پیچھے خطوط کے وہ انبار تھے جو وہ ایک دوسرے کو لکھتے رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے سے پھر کبھی جدا نہ ہوئے۔ دونوں مل کر مقاصد کی تحصیل کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ کارل مارکس اقتصادی علوم کے نئے دستور مرتب کرتا رہا اور اینگلز ان کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بحث کرتا رہا۔

پیرس میں شکست کے بعد انٹرنیشنل کے لیے ناممکن ہوگیا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں یورپ میں جاری رکھ سکے۔ اندرونی جھگڑے بھی بڑھنے لگے تھے۔ ان سب باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مارکس نے تجویز پیش کی کہ انٹرنیشنل کا صدر مقام امریکا منتقل کردیا جائے۔

انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا لندن سے نیویارک منتقل ہونا فرسٹ انٹرنیشنل کے لیے خاتمے کی ابتدا ثابت ہوا۔ کچھ دن سسکتی رہی اور پھر خاموشی سے دم توڑ گئی۔

انٹرنیشنل کے خاتمے کے بعد مارکس کو جبری مشقت سے چھٹی مل گئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگیا یا یہ کہنا چاہیے کہ پوری طرح مشغول ہوگیا۔ اس کے سامنے سب سے بڑا چیلنج اپنی کتاب ''داس کیپٹل'' کے اگلے حصوں کو قابلِ اشاعت بنانے کے لیے ترمیم واصلاح کرنا تھا۔ وہ اس کام میں دل وجان سے لگ گیا۔ مسلسل بیماریوں اور ناسازگار حالات نے اس کام کو مکمل نہ ہونے دیا۔ اس کی وفات کے بعد اینگلز نے تالیف واشاعت کا بار اپنے کندھوں پر لیا۔

اس کا ذہن یک رخا نہیں تھا۔ ایک ہی وقت میں کئی کام اس کے ذمے لگے رہتے تھے۔ مختلف جسمانی تکالیف میں مبتلا تھا۔ وہ بیٹھ کر لکھنے کے قابل نہ رہا لیکن بستر پر لیٹے لیٹے مطالعہ تو کرسکتا تھا۔ اس نے روسی اور امریکی زراعت کے حالات کا گہرا مطالعہ کیا۔

تشنگی تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس نے اگلے دو چار برسوں میں ہندسہ، طبیعیات، حیاتیات اور کیمسٹری کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک علم دوسرے علم کا معاون ہوتا ہے۔ وہ اپنی تصنیفات کو جامع بنانے کے لے ان مددگاروں یعنی دوسرے علوم کو جمع کرتا رہا۔

سخت محنت نے اسے ایک مرتبہ پھر بیمار ڈال دیا۔ اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ آب وہوا کی تبدیلی کے لیے فوراً کاربساد نام کے ایک صحت افزا مقام پر چلا جائے۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک بار وہاں جاچکا تھا۔

وہ ابھی وہاں جانے کی تیاری کرہی رہا تھا کہ جرمن حکومت کو اس کے ارادوں کا علم ہوگیا۔ یہ علاقہ جرمن حکومت کے ماتحت تھا۔ جرمن حکومت نے اس پر پابندی عائد کردی اور یہ اعلان کیا کہ اگر وہ وہاں گیا تو اسے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا جائے گا۔

وہ وہاں جانے سے رہ گیا۔ ممکن تھا کسی اور تفریحی مقام پر چلا جاتا کہ انہی دنوں اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ ایسی بیمار پڑی کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ مارکس اپنی بیماری بھول کر اس کی تیمارداری میں لگ گیا۔ گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ رات میں کئی کئی مرتبہ اٹھ کر اسے دوا دینے کے لیے جاگتا رہتا۔ یہ سلسلہ چھ مہینے تک چلتا رہا۔ اس دوران وہ یہ بھول ہی گیا کہ وہ بیمار ہے۔ اسے تو اس وقت ہوش آیا جب اس پر نمونیہ کا شدید حملہ ہوا۔

ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ دو بیمار ایک کمرے میں نہیں رہ سکتے۔ مارکس نے اپنا بستر چھوٹے کمرے میں لگا دیا۔ اس کی بیوی دوسرے کمرے میں پڑی تھی۔ مارکس کی چھوٹی بیٹی ایلی نور ان دونوں میں رابطے کا ذریعہ تھی۔ مارکس کبھی کبھی اٹھ کر بیوی کو نیم غنودگی کی حالت میں دیکھ آتا تھا۔ ایلی نور کے لیے یہ دن بڑے کرب ناک تھے۔ وہ جانتی تھی کہ مارکس اور جینی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے رہے ہیں۔ مشکل سے مشکل وقت میں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے لیکن اب اتنے مجبور ہوگئے ہیں کہ ایک کمرے میں سو بھی نہیں سکتے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ جیسے مارکس کی ٹانگوں کی جان نکل گئی ہو۔ کبھی کبھی بیوی کے کمرے میں جھانک آتا تھا اس سے بھی گیا۔ وہ جینی کی خیریت دریافت کرتا تو اسے بتادیا جاتا کہ وہ ٹھیک ہے اور اس وقت سو رہی ہے۔ یہی جواب جینی کو بھی دیا جاتا جب وہ مارکس کے بارے میں پوچھتی۔

ایک روز مارکس کے پیروں میں اچانک جان آگئی۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے جینی کے کمرے کی طرف چل دیا۔ فاصلہ ہی کتنا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لیتا ہوا جینی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جینی بھی جیسے اس کا انتظار ہی کررہی تھی۔

''مارکس تم کہاں تھے اتنے دن سے۔''

''یہیں تمہارے سامنے والے کمرے میں۔''

''تم تو بڑے بے وفا نکلے۔ مجھے دیکھنے تک نہیں آئے۔''

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مجھے تو یہی جواب ملتا رہا کہ تم سو رہی ہو۔ میں نے تمہارے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔''

''وہاں کیوں بیٹھے ہو۔ میرے پاس آکر بیٹھو۔ دیکھو ہم کتنے دن بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔''

مارکس کرسی سے اٹھ کر اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔

''جب ہم ٹھیک ہوجائیں گے تو اپنی بیٹی جینی کے پاس پیرس چلیں گے۔''

''پہلے تو تم مجھے کوئی اچھی سی ڈش پکا کر کھلاؤ گی۔''

''اور تھیٹر دیکھنے بھی چلیں گے۔''

''میں تو ٹھیک ہوں بس تمہاری طبیعت ذرا سنبھل جائے۔''

''لو بھلا مجھے کیا ہوا ہے۔ بس ذرا کمزوری ہے۔ تم میرے پاس بیٹھ گئے اب یہ کمزوری بھی جاتی رہے گی۔''

کچھ دیر میں دونوں ایسے باتیں کرنے لگے جیسے دونوں میں سے کوئی بھی بیمار نہیں۔ جینی تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے مارکس کے ہاتھ کو تھام رکھا تھا۔

یہ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اس سے آخری بار مل رہا ہے۔

''اب ہمیں آرام کرنا چاہیے۔ رات بہت ہوگئی ہے۔ سردی بھی بڑھ گئی ہے۔''

''صبح جلدی اٹھ جانا۔ میں تمہارے لیے ناشتا بناؤں گی۔'' جینی نے کہا اور مارکس اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں آیا تو بے چینی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ کر جینی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی کہ جینی کے پاس جاکر بیٹھ جائے لیکن ٹانگوں کی جان پھر چلی گئی تھی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوسکا۔

اس گھر میں 2 دسمبر 1881ء کا سورج طلوع ہوا تو کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ مارکس کی محبوب بیوی اسے چھوڑ کر جاچکی تھی۔ وہ وعدہ خلاف نہیں تھی لیکن یہ وعدہ خلافی اس سے ہوگئی تھی کہ وہ مارکس کے لیے ناشتا نہیں بنا سکی تھی۔

خبر سنتے ہی اینگلز پہنچ گیا اور جینی کی تدفین کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ کچھ اور دوست بھی پہنچ گئے۔ مارکس اس قدر بیمار تھا کہ اس کے پاؤں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ جنازے کے ساتھ بیوی کی آخری آرام گاہ تک نہیں جاسکا۔

اینگلز نے رسم کے مطابق قبر پر تقریر کی۔

''اگر کوئی ایسی عورت ہوسکتی ہے جو دوسروں کی خوشی میں خوش رہتی ہو تو وہ یہ عورت تھی۔''

مارکس نے اپنی بیٹی کو جو پیرس میں تھی خط لکھ کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ ''ڈاکٹر نے منع کیا اور میں جنازہ کے ساتھ نہ گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انتقال سے چند روز قبل تمہاری ماں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ ان کے جنازے پر رسمی باتیں نہ ہوں۔ ہم ظاہری باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ اچھا ہوا کہ ان کی زندگی جلد ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ طاقت بہت جلد زائل ہوجائے گی۔ آخری لمحوں میں

بھی انہوں نے موت کے ساتھ کوئی جدوجہد نہیں کی۔ اس وقت ان کی آنکھیں معمول سے زیادہ بارونق تھیں اور وہ خاموشی سے بند ہوگئیں۔"

مارکس نے اپنی بیوی کے ساتھ جس طرح کی زندگی گزاری تھی اس کے بعد جینی کا بچھڑ جانا مارکس کے لیے قیامت سے کم نہیں تھا۔ وہ اکیلا تو ہمیشہ سے تھا اب تنہا رہ گیا تھا۔

اینگلز نے اس کی حالت دیکھ کر بڑا بیدرد جملہ کہا تھا۔ "جینی اکیلی نہیں مری اس کے ساتھ مارکس بھی مرگیا۔"

موت کو بھی معلوم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں۔ ابھی اسے ایک جھٹکے کی اور ضرورت ہے۔ ابھی جینی کی موت کو ایک مہینے سے کچھ ہی زیادہ گزرا تھا کہ اس کی پہلوٹھی کی بیٹی جو اسے بہت عزیز تھی اور پیرس میں رہتی تھی انتقال کرگئی۔ بیمار تو وہ چلی آرہی تھی لیکن مرجائے گی... یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ کوئی باپ یہ سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ ٹیلی گرام پڑھتے ہی وہ صرف اتنا کہہ سکا تھا۔ "اچھا، میری بیٹی دنیا سے رخصت ہوگئی!"

وہ اب بھی اتنا بیمار تھا کہ پیرس جانے کے لائق نہیں تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی بیٹی کو پیرس بھیج دیا کہ وہ جاکر بہن کے بچوں کو سنبھالے۔

اس دن کے بعد سے کسی نے مارکس کو کچھ لکھتے یا کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا خلاؤں میں تکتا رہتا تھا۔ شاید سوچتا رہتا ہو کہ اس کا آشیانہ کیسے تنکا تنکا ہوکر بکھر گیا۔ اسے اگر اطمینان تھا تو یہ کہ اگر وہ موت کی آغوش میں چلا بھی گیا تو دنیا کا تمام مزدور طبقہ، لاکھوں کروڑوں انقلابی ساتھی، سائبیریا کی کانوں سے لے کر کیلی فورنیا تک، یورپ اور امریکا کے ہر علاقے میں اس کا ماتم منانے کے لیے موجود ہوں گے۔ اس کی لازوال تخلیقات اس کی یاد دلاتے کے لیے موجود ہوں گی۔ اسی لیے کرب واذیت کی جگہ ایک اطمینان تھا جو اس کے چہرے سے جھلکتا رہتا تھا۔

اس کی چہیتی بیٹی کو مرے ہوئے دو ماہ ہوگئے تھے۔ چھوٹی بیٹی اپنے گھر تھی۔ بیوی پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ کوئی بیٹا زندہ نہیں بچا تھا۔ لے دے کر ایک گھریلو خادمہ ہیلن دی متھ تھی جو اس کے فاقوں میں اور اچھے دنوں میں شریک رہی تھی۔

14 مارچ 1883ء کی سہ پہر کو وہ اپنے سونے کے کمرے میں تھا۔ اینگلز اس سے ملنے آیا تھا جسے ملازمہ نے مطالعہ کے کمرے میں بٹھادیا۔ مارکس کو خبر ہوئی تو وہ بھی مطالعہ کے کمرے میں پہنچ گیا اور آرام کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ اینگلز کسی کام سے اٹھ کر باہر آیا اور بہ مشکل دو منٹ بعد ہی کمرے میں واپس آگیا۔ بس یہ دو منٹ مارکس کے لیے بہت تھے۔ وہ لمبے سفر پر جاچکا تھا۔ دوامی نیند سوگیا تھا۔

"دوست اگر بات نہیں کرنی تھی تو نہ کرتے مرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اینگلز نے کہا اور ملازمہ کی مدد سے اسے بستر پر لٹادیا۔

مارکس پرولتاری تھا۔ انقلاب کا حامی تھا اس لیے اپنے زمانے کی سب سے مطعون ہستی تھا۔ اس وقت کی حکومتیں اسے اپنے علاقے سے نکالنے کے مقابلے میں مبتلا رہیں لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آیا اور پھر زندگی کے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔

وہ اس عالم میں رخصت ہوا کہ کسی ملک کی شہریت کا احسان اس کے کندھے پر نہیں تھا۔ اسے لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

اینگلز نے اپنے دوست کی قبر پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"ڈارون نے نامیاتی عالم میں قانون ارتقا دریافت کیا تھا۔ مارکس نے بھی قانون انسان کی سماجی تاریخ میں دریافت کیا۔ اس نے موجودہ سرمایہ دارانہ دور اور سرمایہ دارانہ سماج کے محرکات بتائے۔ مارکس نے ایک سیدھی سی بات دریافت کی جو اب تک نظریاتی اور تصوری دھند کے میں پوشیدہ تھی کہ انسان کو سب سے پہلے کھانا، پینا، رہنے کو گھر اور کپڑا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ سیاست، علوم وفنون وغیرہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کرسکتا ہے۔

اینگلز نے ایک خط میں اپنے دوست کو یہ بھی لکھا۔

"محنت کش طبقے کی تحریک اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے راستے پر چلتی چلی جائے گی لیکن وہ قطب جس کی طرف مصیبت کی مشکل گھڑیوں میں ہر ملک کے باشندے خود بخود گھوم جایا کرتے تھے...... اب ہمیشہ کے لیے مفقود ہوگیا ہے۔

اینگلز ہی وہ شخص تھا جس نے مارکس کی موت کے بعد اپنی زندگی اپنے دوست کی تصانیف کے ترجموں، تالیف میں گزاردی اور 6 ستمبر 1895ء کو اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

تسخیر خلا

طارق عزیز خان

انسان کب سے یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ خلا کی سیر کرے اس کے لیے اس نے کیسی کیسی کوششیں نہیں کیں پھر وہ دن بھی آگیا جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ انسان کرۂ ہوائی سے بھی اوپر خلا کی وسعتوں میں جاپہنچا مگر اس کی شروعات کس نے کی۔ اسے کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

خلا کے اولین مسافر کی روداد پر لطف

20ویں صدی کا سورج جہاں دنیا میں سیاسی بیداری کا پیغام لے کر طلوع ہوا وہیں سائنس کے میدان میں نت نئی ایجادات سے انسانی زندگی کا کلی انداز انقلابی طور پر بدل گیا۔ اس وقت تک کرۂ ارض انسان کے آگے سرنگوں ہوچکا تھا اور اب بہادر اور پرعزم مہم جوؤں کو اپنے ارادے آزمانے کے لیے نئے جہانوں کی تلاش تھی۔ 9 ستمبر 1908ء کو دو امریکی بھائیوں اولیور رائٹ اور ولبر رائٹ نے امریکا میں دنیا کے پہلے ہوائی جہاز فلائیر ون کو اڑانے کا کامیاب تجربہ کیا۔ فلائیر ون کی ایک گھنٹا دو منٹ کی پرواز نے انسان کو زمین کی فضاؤں سے باہر خلا میں رسائی کی بنیاد فراہم کردی۔ گوکہ ہوائی جہاز کی ایجاد سے پہلے ہی یورپ میں راکٹ سازی کا کام شروع ہوگیا تھا۔ تاہم اس سلسلے کی پہلی نمایاں کامیابی

1931ء میں حاصل ہوئی جب جرمنی میں راکٹ کو فضا میں بلند کرنے کے لیے پہلا لیکوئیڈ فیول پاور انجن ڈیزائن کیا گیا۔ 3 اکتوبر 1942ء کو نازی جرمنی کے تیار کردہ V2 Rocket نے زمین سے 100 کلومیٹر کی بلندی پر پہنچ کر خلا کے دروازے پر دستک دی۔ جنگ عظیم دوئم (1939-1945) کے بعد دنیا میں طاقت کا توازن امریکا اور سویت یونین کی طرف منتقل ہوگیا۔ دونوں بڑے ممالک میں سرد جنگ کا آغاز خلائی دوڑ کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور ان کے سائنس داں ایک دوسرے سے پہلے خلا کو مسخر کرنے کے پروگرام ترتیب دینے لگے۔ 22 مئی 1946ء کو امریکا میں تیار کردہ پہلے راکٹ نے زمین سے فضاء میں 80 کلومیٹر کی بلندی تک پرواز کی۔ اسی سال 10 اکتوبر کے دن امریکی راکٹ V2 نے 62 کلومیٹر کی بلندی سے کرۂ ارض کی پہلی تصویر کھینچی۔ 1947ء میں امریکا نے V2 کے ذریعے چند مکھیوں کو خلاء میں بھیجنے کا تجربہ کیا۔ اگلے دس سال تک خلائی سائنس کے حوالے سے خاموشی چھائی رہی، یہاں تک کہ 21 اگست 1957ء کو سویت یونین کی طرف سے دنیا کے پہلے بین البراعظمی بلاسٹک میزائل R - 7 Semyorka/SS-6 Sapwood کے کامیاب تجربے نے امریکا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ امریکیوں کے کان اس میزائل کی گھن گرج سے سنسناتے رہے کہ سویت یونین نے 4 اکتوبر 1957ء کو دنیا کا پہلا مصنوعی سیارہ سپوٹ نک ون (Sputnik 1) خلا میں روانہ کردیا۔ سویت سائنس دانوں نے امریکا کو حیران کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور 3 نومبر 1957ء کے دن سپوٹ نک ٹو کے ذریعے لائیکا (Laika) نام کی کتیا کو خلا میں بھیجنے اور واپس زمین پر لانے کا کامیاب تجربہ کیا۔ 31 جنوری 1958ء کو امریکی فوج کے ادارے ABMA (آرمی بلاسٹک میزائل ایجنسی) نے اپنے پہلے مصنوعی سیارے Explorer 1 کو خلا میں بھیج کر اپنی موجودگی کا ثبوت دیا۔ اس دوران 29 جولائی 1958ء کو امریکا میں خلائی تحقیق کے ادارے NASA (National Aeronautics and Space Administration) کی بنیاد رکھی گئی۔ ناسا نے 7 اگست 1959ء کو امریکا کا دوسرا مصنوعی سیارہ Explorer 2 خلا میں روانہ کیا۔ جس نے خلا سے کرۂ ارض کی پہلی کامیاب تصویر کھینچ کر زمین پر بھیجی۔ اگلے دو سال تک دونوں ممالک کے سائنس دان خاموشی کے ساتھ خلا تک رسائی کے نئے منصوبوں پر کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اپریل 1961ء میں سویت یونین سے تعلق رکھنے والے ایک جواں ہمت شخص یوری گیگ رین (Yuri Gagarin) نے خلا میں پہلی کامیاب پرواز کر کے امریکا سمیت پوری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

یوری گیگ رین 9 مارچ 1934ء کو ماسکو سے 140 کلومیٹر مغرب میں واقع گاؤں کلوشی نو (Klushino) میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین ایک فارم ہاؤس پر کام کرتے تھے اور وہ ان کی چار اولادوں میں سے تیسرے نمبر پر تھا۔ گیگ رین نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے واحد اسکول سے حاصل کی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مغربی روس پر جرمنی کے قبضے کے دوران گیگ رین کی بڑی بہن اور بھائی کو قید کر کے جرمنی روانہ کردیا گیا اور پھر کبھی ان کا کچھ پتا نہ چلا۔ اس دوران ایک جرمن فوجی افسر نے گیگ رین کے گھر پر قبضہ جمالیا جس کے بعد اس کا بچا کھچا خاندان قریب ہی واقع شہر Gzhatsk ہجرت کرگیا۔ جنگ کے بعد گیگ رین نے اپنی ادھوری تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اس نے 1949ء میں ماسکو کے نواح میں واقع قصبے Lyubertsy کے مینو فیکچرنگ ٹریننگ اسکول سے مکینیکل کے شعبے میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ 1951ء میں گیگ رین نے ماسکو کے جنوب مشرق میں دریائے وولگا کے کنارے واقع شہر Saratov کے انڈسٹریل ٹیکنیکل اسکول سے میٹل ورکس میں ڈگری حاصل کی۔ ساراٹوو میں قیام کے دوران اس کی طبیعت ہوابازی کی طرف مائل ہوئی۔ اس نے ٹیکنیکل تعلیم کے ساتھ ساتھ مقامی فلائنگ کلب جوائن کیا اور ہوائی جہاز اڑانے کی ابتدائی تربیت حاصل کی۔ گیگ رین کی ہوابازی میں صلاحیت کو دیکھتے ہوئے فلائنگ کلب کے انسٹرکٹر نے اسے سویت ائیر فورس میں جانے کا مشورہ دیا۔ گیگ رین نے 1955ء میں ماسکو سے 1200 کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع اورن برگ (Orenburg) کے سویت ائیر فورس کیڈیٹ ٹریننگ اسکول میں داخلے کا امتحان دیا جس میں اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ 1957ء میں گیگ رین نے اپنی تربیت مکمل کی اور اسی سال Valentina Goryacheva نامی خاتون سے شادی کی۔

گیگ رین کی سویت ائیر فورس میں بطور جونیئر لیفٹیننٹ پہلی پوسٹنگ 5 نومبر 1957ء کو شمال مغربی روس میں ناروے کی سرحد کے قریب واقع لوستاری ائیر بیس میں

ہوئی۔ اس نے اگلے چند ماہ کے دوران MiG-15 لڑاکا ہوائی جہاز اڑانے کی تربیت مکمل کی۔ 6 نومبر 1959ء کو اس کی سینئر لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ہوگئی۔ اگست 1960ء میں پورے سویت یونین سے ''ووسٹک خلائی پروگرام'' میں شمولیت کے لیے کڑے امتحان کے بعد 20 بہترین پائلٹس کو منتخب کیا گیا جن میں یوری گیگ رین بھی شامل تھا۔ مزید چند ہفتے کی ٹریننگ کے بعد اس کا نام 12 اور پھر 6 بہترین افراد کی فہرست میں شامل ہوا۔ 5 اپریل 1961ء کو یوری گیگ رین اور گیرمن ٹی ٹوو (Gherman Titov) دونوں کو سویت یونین کے مصنوعی سیارے ووسٹک ون (Vostok 1) کے ذریعے خلاء میں بھیجنے کے لیے موزوں قرار دیا گیا۔

ووسٹک ون، سویت یونین کے ووسٹک خلائی پروگرام کے سلسلے کا پہلا مصنوعی سیارہ تھا۔ سیارے کا وزن 4725 کلوگرام، پورا نام Vostok 3KA اور ریڈیو نام CEDAR تھا۔ جبکہ اسے خلاء میں لیجانے کے لیے Vostok-K نام کا راکٹ تیار کیا گیا تھا۔ مصنوعی سیارے کا ڈیزائن روسی انجینئر سرگئی کورولوف (Sergey Korolyov) کی راہنمائی اور ملٹری آفیسر کیرم کریموو (Kerim Kerimov) کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے کاک پٹ میں ایک فرد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔

ووسٹک ون کا کنٹرول پینل لاک تھا اور اسے زمین سے کنٹرول کیا جاتا تھا، تاہم کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں یوری گیگ رین کے پاس ایک سیل بند لفافے میں کنٹرول پینل کھولنے کا کوڈ موجود تھا۔ ووسٹک ون کو خلاء میں مستقل نہیں رہنا تھا، بلکہ اسے اپنی لانچنگ کے بعد کرۂ ارض کے مدار (Orbit) میں ایک چکر پورا کرنا تھا جس کے بعد یہ اپنی مقررہ جگہ پر لینڈ کر جاتا۔ مصنوعی سیارے کو خلاء میں بھیجنے کا واحد مقصد اس بات کا جائزہ لینا تھا کہ کرۂ ہوائی سے باہر خلاء میں سفر کا انسانی جسم پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ ووسٹک ون کو خلاء میں روانہ کرنے کے لیے سابقہ سویت یونین (موجودہ قزاقستان) کے شہر بیکونور (Baikonur) کے نواح میں قائم'' بیکونور اسپیس ائیر فیلڈ سائٹ نمبر 1 '' کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یہ مقام خط استواء سے 45.92 ڈگری شمال اور 63.34 ڈگری کے خط پر واقع ہے۔

9 اپریل 1961ء کے دن یوری گیگ رین کو ووسٹک ون کا مرکزی پائلٹ جبکہ گیرمن ٹی ٹوو کو متبادل پائلٹ (Backup Pilot) قرار دیا گیا۔ 11 اپریل کی صبح ووسٹک ون کے ڈیزائنر سرگئی کورولوف نے مصنوعی سیارے کا باریک بینی سے معائنہ کیا۔ اس دن 10 بجے گیگ رین اور ٹی ٹوو کو لانچنگ پروگرام سے متعلق بریف کیا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ دونوں خلا میں جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیں۔ شام 6 بجے سویت ڈاکٹرز کی ایک ٹیم نے دونوں خلابازوں کے ٹیسٹ لیے۔ ڈاکٹر نے انہیں اگلے ایک گھنٹے کے دوران بلیرڈ کھیلنے، میوزک سننے اور اپنے بچپن کے خوشگوار لمحوں کو یاد کرنے کا مشورہ دیا۔ انہیں مخصوص ڈنر کروایا گیا۔ رات 9 بجکر 50 منٹ پر دونوں پائلٹس کو پُرسکون نیند کے لیے گولیاں کھانے کی پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ اس کے بعد دونوں کے جسموں سے حساس آلات منسلک کردیے گئے تاکہ اس بات کا جائزہ لیا جاسکے کہ ان میں کون بہتر نیند لے سکا ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس رات دونوں خلاباز ہیجان کی وجہ سے ٹھیک طرح نہ سو سکے، کچھ اسی قسم کے حالات کا سامنا ووسٹک ون کے ڈیزائنر سرگئی کورولوف کو بھی کرنا پڑا اور وہ بے چینی کی وجہ سے ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔

12 اپریل 1961ء کی صبح 5 بجکر 30 منٹ پر دونوں خلاباز بیدار ہوئے۔ 6 بجے وہ ناشتے سے فارغ ہوئے، جس کے بعد انہیں خلائی لباس پہنا کر لانچنگ پیڈ سے منسلک کمرے میں لے جایا گیا۔ 6 بجکر 45 منٹ پر خلا میں رسائی کے لیے یوری گیگ رین کا حتمی انتخاب کیا گیا۔ 7 بجے گیگ رین کو میجر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ 7 بجکر 10 منٹ پر گیگ رین، ووسٹک ون کے کاک پٹ میں سوار ہوا۔ فوراً ہی اس کی تصویر کنٹرول روم کی ٹیلی وژن اسکرین پر نمودار ہوگئی۔ گیگ رین سے مصنوعی سیارے کے ڈیزائنر سرگئی کورولوف اور سویت فوج کے چند افسران نے بات چیت کی جن میں نکولائی کامین نمایاں تھا۔ نکولائی نے ہلکے پھلکے انداز میں گیگ رین کو باور کروایا کہ امریکا ان کا دشمن نمبر ایک ہے اور یہ کہ ووسٹک ون خلا میں رسائی کے باوجود روسی میزائل کی پہنچ میں ہوگا۔

7 بجکر 50 منٹ پر ووسٹک ون کو مکمل طور پر سیل کردیا گیا۔ اس کا آخری ٹیسٹ لیا گیا جس سے پتا چلا کہ مصنوعی سیارے کے کچھ حصے مکمل طور پر سیل نہیں ہوئے۔ تمام نٹ بولٹ دوبارہ کھول کر کسے جانے لگے۔ اس دوران میں گیگ رین نے میوزک سننے کی فرمائش کی جسے پورا کیا گیا۔ لانچنگ پیڈ پر

افراتفری کے دوران سرگئی کورولوف کی گھبراہٹ بڑھ گئی اور اسے سینے میں درد محسوس ہونے لگا۔ 8 بجکر 37 منٹ پر گیگ رین کی نبض چیک کی گئی جو 64 بیٹس پر منٹ کے حساب سے چل رہی تھی۔

ماسکو کے وقت کے مطابق صبح 9 بجکر 6 منٹ ...... "سب کچھ ٹھیک ہے، ہمیں ایک اچھی پرواز کی اُمید ہے۔" کنٹرول روم نے گیگ رین کو آخری بار مخاطب کیا۔

"جانے دو۔" گیگ رین نے جواب دیا۔ جس کے ساتھ ہی الٹی گنتی شروع ہوگئی۔

صبح کے 9 بجکر 7 منٹ۔...... دنیا کا پہلا انسان بردار مصنوعی سیارہ ووسٹک ون فضاء میں بلند ہوا۔ سرگئی کورولوف کا ایک ہاتھ دل پر تھا اور نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ خوش قسمتی سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی اور ووسٹک ون ہر گزرتے لمحے کے ساتھ فضاء میں بلند ہونے لگا۔

9 بجکر 13 منٹ ...... "پرواز بہتر طریقے سے جاری ہے۔ میں زمین پر بادل دیکھ سکتا ہوں اور سب کچھ ٹھیک ہے۔" کنٹرول روم میں یوری گیگ رین کی آواز گونجی۔

9 بجکر 14 منٹ ...... گیگ رین نے ایک بار پھر سب کچھ ٹھیک ہونے کی رپورٹ کی۔......

9 بجکر 15 منٹ ...... ووسٹک ون سے منسلک آخری راکٹ جلنا شروع ہوا۔

9 بجکر 17 منٹ ...... راکٹ الگ ہونے کے بعد ووسٹک ون کرۂ ہوائی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے قریب 100 کلومیٹر کی بلندی پر زمین کے مدار میں پہنچ گیا۔ اب اس کا رخ مشرق میں سائبریا کی طرف تھا، جہاں دن کی روشنی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

9 بجکر 21 منٹ ...... ووسٹک ون بتدریج بلند ہوتے ہوئے مشرقی سائبریا میں جزیرہ نما کم چٹکا پر سے ہوتا ہوا بحرالکاہل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

9 بجکر 37 منٹ ...... ووسٹک ون جزائر ہوائی کے اوپر پہنچا۔ جہاں آدھی رات کا وقت تھا۔

9 بجکر 48 منٹ ..... ووسٹک ون نے 170 ڈگری مشرق کے خط پر جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے خط استواء پار کیا، جہاں شام ہو رہی تھی۔

9 بجکر 57 منٹ ...... جنوبی بحرالکاہل پر جنوب مشرق کی طرف جنوبی امریکا کی ٹِپ کے اوپر پرواز جاری تھی۔ اس وقت وہ زمین کے مدار میں 327 کلومیٹر کی بلندی پر تھا۔

گیگ رین نے سب اچھا کی رپورٹ پیش کی۔

10 بجے ...... آبنائے میگلن پر پرواز جاری تھی جہاں سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

10 بجکر 10 منٹ ...... ووسٹک ون جنوبی بحراوقیانوس کے وسط میں تھا جہاں سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سیارے کا رخ شمال مشرق میں افریقا کی طرف تھا۔

10 بجکر 25 منٹ ...... ووسٹک ون نے مغربی افریقا میں انگولا کے اوپر زمین کے مدار میں بتدریج نیچے آنے کا عمل شروع کیا۔ اس وقت وہ اپنے لینڈنگ پوائنٹ سے 8 ہزار کلومیٹر دور تھا۔

10 بجکر 35 منٹ ...... شمالی افریقا میں مصر کے اوپر۔ شمال کی طرف بڑھتے ہوئے بلندی بتدریج کم ہو رہی تھی۔

"میں بتدریج نیچے آرہا ہوں اور سب ٹھیک ہے۔" کنٹرول روم میں گیگ رین کی آواز گونجی۔

10 بجکر 54 منٹ 58 سیکنڈ ...... مغربی روس میں بحیرہ کیسپین کے قریب زمین سے 7 کلومیٹر اوپر ووسٹک ون میں سوار یوری گیگ رین نے سامنے پینل پر موجود سرخ رنگ کا بٹن دبایا۔ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ لوہے کے ایک خول میں بند سیارے کے کاک پٹ سے باہر نکلا، جہاں فوری طور پر اس کا پیراشوٹ کھل گیا۔

10 بجکر 55 منٹ ...... گیگ رین کے کاک پٹ سے نکلنے کے ٹھیک دو سیکنڈ بعد ووسٹک ون کا طاقتور پیراشوٹ بھی کھل گیا۔ مصنوعی سیارے اور گیگ رین کے زمین کی طرف بڑھنے کا منظر دو طالبات نے دیکھا۔

11 بجکر 5 منٹ ...... یوری گیگ رین اور ووسٹک ون نے مغربی روس میں دریائے وولگا کے کنارے اینگلز (Angels) شہر کے 26 کلومیٹر جنوب میں خط استواء سے 51.27 ڈگری شمال اور 45.99 ڈگری مشرق کے خط پر کامیاب لینڈنگ کی۔ اس منظر کے گواہ ایک کسان اور اس کی بیٹی تھے۔ دونوں باپ بیٹی نے گول گیند کا دروازہ کھلتے اور اس میں سے خلائی لباس پہنے ایک آدمی کو باہر نکلتے دیکھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

"ڈرو مت" گیگ رین ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "میں بھی تم لوگوں کی طرح سویت شہری ہوں، میں خلاباز ہوں اور مجھے ماسکو بات کرنے کے لیے ٹیلی فون کی تلاش ہے۔"

دوپہر ہوتے ہوتے سویت فوج نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے گیگ رین کو زمین پر خوش

آمدید کہا اور اسے ماسکو پہنچانے کے انتظامات میں جٹ گئے۔

یوری گیگ رین کے پہلے خلائی سفر نے انسان کو کرۂ ارض کی فضاؤں سے باہر نئی دنیا میں دریافت کرنے کی بنیاد فراہم کی۔ زمین کے مدار میں ووسٹک ون کی کامیاب پرواز سے سویت یونین کو اپنے حریف امریکا پر خلائی برتری حاصل ہوگئی۔ سویت یونین کے اس کامیاب تجربے سے یہ خیال پختہ ہوا کہ جدید ترین ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاکر انسان کو خلا میں بھیجا اور پھر زندہ سلامت واپس لایا جاسکتا ہے۔ ووسٹک ون ماسکو کے وقت کے مطابق صبح 9 بجکر 7 منٹ پر بیکونور ائیر اسپیس فیلڈ سے فضاء میں بلند ہوا تھا۔ اس نے مشرق کی طرف پرواز کرتے ہوئے زمین کے مدار میں کامیاب چکر پورا کیا تھا اور 10 بجکر 55 منٹ پر زمین سے 7 کلومیٹر اوپر اس کا آٹومیٹک پیراشوٹ کھل گیا تھا۔ (یاد رہے کہ سیارے کا پیراشوٹ کھلنے کا وقت ہی تکنیکی اعتبار سے اس کا لینڈنگ ٹائم کہلاتا ہے۔) ووسٹک ون نے کل 108 منٹ (ایک گھنٹا 48 منٹ) کی کامیاب پرواز کی تھی جس میں کرۂ ارض کے مدار میں 89.34 منٹ کی پرواز شامل ہے۔ زمین کے مدار میں چکر لگاتے ہوئے ووسٹک ون نے خلا میں زیادہ سے زیادہ 327 کلومیٹر اور کم از کم 169 کلومیٹر کی بلندی پر پرواز کی۔ کم و بیش پوری پرواز کے دوران گیگ رین نے بیکونور اسپیس فیلڈ کنٹرول روم کو اپنی خیریت، کاک پٹ کے حالات، پرواز کے معاملات، درجۂ حرارت، ہوا کے پریشر، اور ریڈیو سگنلز سے متعلق معلومات فراہم کیں۔ ووسٹک ون میں کوئی کیمرا نصب نہیں تھا۔ تاہم گیگ رین کی سیارے کے روٹ اور زمین کے مشاہدے سے متعلق فراہم کی گئیں معلومات سو فیصد درست تھیں۔ بعض ذرائع کے مطابق اس نے کاک پٹ میں کچھ کھایا پیا بھی، لیکن اس بات کے کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں ہیں۔ کچھ ویب سائٹس کے مطابق گیگ رین نے دوران پرواز زمین پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں نے یہاں کوئی خدا نہیں دیکھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ گیگ رین اور کنٹرول روم کی گفتگو کے ریکارڈ میں ایسا کوئی جملہ شامل نہیں ہے۔ خیال ہے کہ گیگ رین کی وفات کے بعد کچھ کمیونسٹ عناصر نے یہ بات اس کی طرف منسوب کردی تھی۔

یوری گیگ رین دنیا کی پہلی کامیاب خلائی پرواز کے بعد ماسکو پہنچا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف سویت یونین کے سربراہ نکی تا خروشیف (Nikita Khrushchev) (1953ء سے 1964ء تک) اور سویت صدر لیونڈ بریزنیف (Leonid Brezhnev) (1960ء سے 1964ء تک) نے یوری گیگ رین کو سویت یونین کا ہیرو قرار دیا۔ سویت حکومت نے اس کے لیے سب سے بڑا سویت فوجی اعزاز "آرڈر آف لینن" دینے کا اعلان کیا اور اسے سپریم سویت کا ڈپٹی مقرر کردیا۔ مزید براں Gzhatsk شہر کو گیگ رین کا نیا نام دیا گیا۔ اگلے چند روز کے دوران میں پوری دنیا نے سویت یونین کی کامیابی کو سراہا۔ امریکا کے صدر جون ایف کینیڈی نے سویت صدر کو مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ایڈلائی سٹیون سن نے کہا کہ روسی سائنس دان انسان کو خلاء میں لے گئے اور پھر زندہ واپس لائے، مجھے اُمید ہے کہ وہ اقوام عالم کو زندہ رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے۔ جاپانی وزیراعظم نے اُمید ظاہر کی کہ سویت یونین اور امریکا اپنی جدید خلائی ٹیکنالوجی کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کریں گے۔ جرمنی اور برطانیہ نے بھی سویت یونین کے کارنامے کی تعریف کی۔ سویت یونین کے سب سے بڑے اتحادی بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے سویت کامیابی کو انسان کی خلا پر فتح قرار دیا۔ پاکستانی وزارت خارجہ نے سویت کامیابی پر محتاط ردِعمل کا اظہار کیا۔

پوری دنیا کا ردِعمل ظاہر کر رہا تھا کہ یوری گیگ رین اپنے تاریخی کارنامے کی وجہ سے ایک مشہور بین الاقوامی شخصیت بن چکا تھا۔ سویت حکومت نے اسے اٹلی، جرمنی، کینیڈا، برازیل، جاپان اور فن لینڈ کے سرکاری دورے پر روانہ کیا۔ وہ اس دورے کے آخری مرحلے میں جولائی 1961ء میں برطانیہ پہنچا۔ اس نے لندن اور مانچسٹر کی سیاحت کی جس کے دوران اسے اپنی عوامی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔ مانچسٹر شہر میں برستی بارش میں عوام نے اس کی گاڑی کو گھیر لیا۔ گیگ رین گاڑی سے باہر نکلا۔ اسے چھتری پیش کی گئی لیکن اس نے یہ کہہ کر چھتری لینے سے انکار کردیا کہ وہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بھیگنا پسند کرے گا۔

7 اگست 1961ء کو سویت یونین نے یوری گیگ رین کی نگرانی میں اپنا دوسرا مصنوعی سیارہ ووسٹک ٹو خلاء میں روانہ کیا۔ اس سیارے کا پائلٹ گیگ رین کا سابقہ ساتھی اور ووسٹک ون کا متبادل پائلٹ گیرمین ٹی ٹووو تھا۔ ووسٹک ٹو نے 1 گھنٹا 18 منٹ کی پرواز کے دوران زمین کے مدار میں چکر لگایا اور اپنے مقررہ مقام پر کامیاب لینڈنگ مکمل کی۔

سویت روس کی اس دوسری کامیابی نے امریکا پر اس کی خلائی برتری پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ 12 جون 1962ء کو یوری گیگ رین کو سویت ایئر فورس کا لیفٹیننٹ کرنل اور 6 نومبر کو فل کرنل بنا دیا گیا۔ 1962ء کے آخر میں اسے ماسکو کے قریب اسٹار سٹی میں اُس کے نام سے منسوب خلائی تحقیقی ادارے کا ڈپٹی ٹریننگ ڈائریکٹر مقرر کردیا گیا۔ یوری گیگ رین بظاہر ایئر فورس میں تھا لیکن سویت حکام اسے آزادانہ طور پر لڑاکا طیارہ اڑانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ دراصل انہیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں وہ کسی حادثے کے نتیجے میں اپنے ہیرو کو کھو نہ دیں۔ گیگ رین کو روسیوں کی خود سے محبت کا اندازہ تھا، تاہم وہ ہوابازی کے اپنے جنون کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس نے اسٹار سٹی میں مصنوعی سیاروں کے ڈیزائن تیار کرنے کی نگرانی کے ساتھ ساتھ کسی ماہر کی نگرانی میں طیارہ اڑانے کا شوق بھی جاری رکھا۔ وہ 23 اپریل 1967ء کو سویت مصنوعی سیارے سویُز ون (Soyuz-1) کا متبادل پائلٹ تھا۔ بدقسمتی سے یہ مصنوعی سیارہ زمین کے گرد مدار میں چکر لگانے کے بعد لینڈنگ کے وقت تباہ ہوگیا۔ اس حادثے کے نتیجے میں گیگ رین کا دوست سیارے کا پائلٹ ”ولادی میر کومارو“ ہلاک ہوگیا۔ گیگ رین کو اس حادثے کا اتنا رنج ہوا کہ اس نے فوری طور پر اسٹار سٹی میں نئے خلائی مشن موخر کردیے۔ سویُز ون کے حادثے کے بعد گیگ رین نے ایک بار پھر ہوابازی کی طرف توجہ دی۔ یہ 27 مارچ 1968ء کا دن تھا۔ یوری گیگ رین اپنے فلائٹ انسٹرکٹر ولادی میر سیروگن (Vladimir Seryogin) کے ساتھ جنگی طیارے MiG-15UTI کے کاک پٹ میں بیٹھا۔ طیارے نے ماسکو کے چک لوسکی (Chkalovsky) ائیربیس سے پرواز کی، تاہم اسے دوبارہ زمین پر آنا نصیب نہ ہوا اور وہ پرواز کے کچھ دیر بعد ماسکو کے 50 کلومیٹر شمال مشرق میں واقع قصبے Kirzhach کے قریب گر کر تباہ ہوگیا۔ اس حادثے کے نتیجے میں فلائٹ انسٹرکٹر سمیت سویت یونین کے ہیرو یوری گیگ رین کی موت واقع ہوگئی۔ اس نے سوگواران میں بیوہ ویلین ٹینا اور دو بیٹیاں گیلیا (Galya) اور لینا (Lena) چھوڑیں۔ گیگ رین کی موت نے سویت یونین کو گہرے صدمے سے دوچار کردیا۔ اس کی میت کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ماسکو کے ریڈ اسکوائر میں کریملن وال کے قریب دفنایا گیا۔

ووسٹک ون کی کامیاب پرواز کو لے کر روسیوں سے بوکھلاہٹ میں کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ گوکہ ان غلطیوں سے گیگ رین کے کارنامے کی افادیت قائم رہی لیکن دنیا کو سویت روس پر ہنسنے کا موقع ملا۔ ووسٹک ون کی زمین پر لینڈنگ کے وقت سویت حکام نے جھوٹ بولا کہ یوری گیگ رین اپنے مصنوعی سیارے کے ساتھ زمین پر اترا تھا۔ انہوں نے گیگ رین پر دباؤ ڈال کر اسے بھی ایک پریس کانفرنس کے توسط سے یہ جھوٹ بولنے پر مجبور کیا۔ سویت حکام کے اس جھوٹ کی وجہ سوئٹزر لینڈ میں قائم ”فیڈریشن آف ایرونا ٹک انٹرنیشنل“ کے قوانین تھے، جن کے مطابق ایک کامیاب پرواز اسے ہی کہا جاسکتا ہے جس میں پائلٹ اپنی فلائنگ مشین کے ساتھ زمین پر لینڈنگ کرے۔

سویت حکام نے فیڈریشن کے تحت ووسٹک ون کی پرواز کو رجسٹرڈ کرواتے وقت گیگ رین اور سیارے کی الگ الگ لینڈنگ کے معاملے کی پردہ پوشی تو کی، ساتھ ہی ووسٹک ون کے لانچنگ اور لینڈگ کے مقامات سے متعلق بھی غلط بیانی کی۔ سویت حکام نے فیڈریشن کے کاغذات میں ووسٹک ون کی لانچنگ کا مقام 47.22 شمال اور 65.29 مشرق لکھا جو غلط تھا۔ 1971ء میں روسیوں نے سرکاری طور پر تسلیم کیا کہ ووسٹک ون اور یوری گیگ رین الگ الگ زمین پر اترے تھے۔ 1980ء میں انہوں نے اپنے پہلے مصنوعی سیارے کی لانچنگ اور لینڈنگ کے اصل مقامات سے بھی پردہ اٹھا دیا۔

سویت یونین میں ووسٹک ون کے خلائی سفر کی 20 ویں اور 30 ویں سالگرہ پر یوری گیگ رین کی تصویر والے ایک اور تین روبل کے سکے جاری کیے گئے۔ 2011ء میں روسی حکومت نے خلا کی تسخیر کی پچاسویں سالگرہ پر ایک ہزار روبل کا سونے کا سکہ اور تین روبل کا چاندی کا سکہ جاری کیا۔ اسی سال امریکا، روس اور اٹلی کے مشترکہ ”خلائی مشن 27“ کے عملے نے پوری دنیا کے عوام کے لیے جاری کیے ویڈیو پیغام میں یوری گیگ رین کے کارنامے کو خراج تحسین پیش کیا۔ آج روس کے دارالحکومت ماسکو کے آر کے انجینیرنگ میوزیم میں رکھا ووسٹک ون سیاحوں کے لیے کشش کا باعث ہے جبکہ اس کی لینڈنگ کی جگہ پر قائم پارک میں راکٹ کی شکل کی 120 فٹ اونچی یادگار، یوری گیگ رین کے پہلے کامیاب خلائی سفر کی یاد دلاتی ہے۔

*

نہایت پُراسرار انداز میں تباہ ہونے والے جہاز کی روداد

ہوائی حادثات عام ہیں۔ اڑتے ہوئے ٹکرا جانا، اترتے ہوئے کریش کرجانا، پرندوں کی ٹکر، ایندھن کا لیک کرجانا حادثوں کا موجب بنتے ہیں۔ ایام جنگ میں تو خطرات آسمان کو چھونے لگتے ہیں۔ دشمن کی گولہ باری تباہی کا باعث بن جاتی ہے مگر حالتِ امن میں کسی جہاز کا تباہ ہوتا حیران کن بات ہے، اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اب تک مذکورہ حادثے کے حقائق پر پردہ پڑا ہے۔

پُراسرار حادثہ

ابن کبیر

شام ڈھل چکی تھی۔ آسمان صاف تھا اور بحراوقیانوس خاموش۔

ولیم کی کشتی نیویارک کے مشرقی علاقے سے میلوں دُور سمندر کے سینے پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ نیوجرسی میں پیدا ہونے والا ولیم ایک ماہی گیر تھا۔ وہ کاؤچ پر دراز تھا۔ نظریں آسمان پر ٹکی تھیں۔ ستاروں کی روشنی مدھم پڑ رہی تھی۔

ولیم سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر، آسمان کے مشرقی حصے میں ایسٹ ونڈ ائرلائنز کا مسافر بردار جہاز محوِ پرواز تھا۔

کاک پٹ کیپٹن ڈیوڈ مکلائن نے سنبھالا ہوا تھا جس کی نظریں ونڈ اسکرین پر تھیں۔

یکدم ڈیوڈ کو اپنی بائیں جانب کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ روشنیاں جھلملائیں۔ پھر ایک شبیہ ابھری۔

وہ ٹی ڈبلیو اے کا طیارہ تھا جو اُس کے جہاز سے چند میل دُور سبک روی سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ڈیوڈ نے فوراً ائر ٹریفک کنٹرولر سے رابطہ کیا۔ اسے مطلع کیا گیا کہ سامنے سے گزرنے والا جہاز معمول کی پرواز پر نیویارک سے پیرس جا رہا ہے۔

''وہ آپ سے خاصا دور ہے۔'' آپریٹر نے کہا۔ ''اور اگلے چند سیکنڈز میں گزر جائے گا۔''

''اِس علاقے میں ہوائی ٹریفک خاصا بڑھ گیا ہے۔'' ڈیوڈ نے ساتھی پائلٹ کو مخاطب کیا۔ ''ہمہ وقت آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔''

جواب میں ساتھی مسکرایا۔

دونوں جہازوں سے ہزاروں فٹ نیچے ائر نیشنل گارڈز کا ایک ہیلی کاپٹر پرواز کر رہا تھا۔ سارجنٹ ڈینس رچرڈسن نے اسٹیرنگ سنبھال رکھا تھا۔ وہ نوجوان افسروں کے ساتھ ٹریننگ مشن پر نکلا تھا اور اِس وقت بحر اوقیانوس کے اوپر موجود تھا۔

ٹی ڈبلیو اے کا جہاز معمول کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا... کیپٹن ڈیوڈ کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں کہ اچانک ایک شعلہ لپکا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

ہزار فٹ نیچے ہیلی کاپٹر میں سوار سارجنٹ رچرڈسن نے اپنے دائیں جانب آسمان میں آگ کا قوی الجثہ گولا دیکھا۔

''وہ... کیا ہے؟'' جونیئر افسر کی آواز میں اندیشے تھے۔

سارجنٹ کی نظریں آسمان پر ٹکی تھیں۔ اُن میں خوف تھا۔ آسمان سے شعلے کا گولا نیچے آ رہا تھا۔ بے حد تیزی سے۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' وہ چلّایا۔ رفتار بڑھا دی۔ اب وہ آسمان سے برستے شعلوں کے درمیان محوِ پرواز تھے۔

عرشے پر موجود ولیم آنکھوں میں حیرت لیے آسمان کو تک رہا تھا جس کے مشرقی حصے میں چند سیکنڈ قبل اس نے بھیانک آگ کو جنم لیتے دیکھا تھا۔ یقینی طور پر وہ ایک ہوائی جہاز تھا جو دھماکے سے پھٹ گیا اور اب اس کا سلگتا ہوا ملبا سمندر کی سمت بڑھ رہا تھا۔

ولیم حیرت کے زیرِ اثر تھا، مگر اِس تحیر کا سبب نہ تو آسمان میں ہونے والا دھماکا تھا، نہ ہی سمندر میں گرنے والا ملبا... اس کا سبب تو وہ سفید رنگ کی تیز روشنی تھی جو اس نے چند سیکنڈ قبل مشرق کی سمت جاتے دیکھی تھی۔

''کیا وہ ایک میزائل تھا؟'' ولیم کے دل میں سرگوشی ہوئی۔

وہ 17 جولائی 1996ء کی رات تھی۔ ولیم کی کشتی سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی اور امریکی تاریخ کا پُراسرار ترین فضائی سانحہ رونما ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کمرے کی فضا میں تناؤ منجمد تھا۔

والٹر بیکر ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔ نیوز کاسٹر نیویارک کے جان ایف کنیڈی ائرپورٹ سے اُڑان بھرنے والے ایک بدقسمت جہاز کی کہانی سنا رہا تھا جو ٹیک آف کے فقط بارہ منٹ بعد بحر اوقیانوس کے عین اوپر دھماکے سے تباہ ہو گیا۔

''ٹی ڈبلیو اے کی فلائٹ 800 ایک بھیانک حادثے کا شکار ہو گئی ہے۔ اب تک ملنے والی اطلاعات کے مطابق...''

والٹر کے وجود میں خوف ٹھہر چکا تھا۔ اُس کی انیس سالہ بیٹی مشیل بیکر اِسی جہاز میں سوار ہونے کے لیے آج دوپہر گھر سے روانہ ہوئی تھی۔

مشیل ایک کالج اسٹوڈنٹ تھی۔ اِس برس کی چھٹیاں اُس نے پیرس میں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اُس کی دوست بیکی اولسن بھی ساتھ تھی۔

اولسن خاندان سے بیکر خاندان کی اچھی سلام دعا تھی اور دنوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ اُنھیں اپنی بیٹیوں کو موسم گرما کی چھٹیوں کا بہترین تحفہ دینا چاہیے۔ اِسی خیال کے تحت اُنھوں نے مشیل اور بیکی کے لیے فلائٹ 800 میں فرسٹ کلاس کی سیٹیں بک کروائی تھیں اور اب... فلائٹ 800 ایک المیہ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

''اوریلی۔'' بالآخر کمرے کے منجمد تناؤ میں والٹر کی آواز گونجی۔ ''ذرا اِدھر آنا۔''

''کیا ہوا؟'' اُس کی بیوی کچن سے برآمد ہوئی۔ ٹی وی اسکرین پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔

''مشیل کا فلائٹ نمبر کیا تھا؟'' والٹر نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔

''ٹی ڈبلیو اے فلائٹ 800!'' اوریلی نے دھیرے سے کہا۔ نظریں اسکرین پر گاڑے رکھیں، جہاں وہی الفاظ

سلگ رہے تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

اوریلی کو یاد آیا کہ چند گھنٹے قبل اُسے مشیل کی کال موصول ہوئی تھی جو اُس سے ائرلائن کی ایک پیشکش کی بابت مشورہ کرنا چاہتی تھی۔

''وہ... مشیل نے مجھے فون کیا تھا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''ٹی ڈبلیو اے نے مسافروں کو آفر کی تھی کہ اگر وہ اِس فلائٹ کے بجائے چند گھنٹوں بعد پیرس روانہ ہونے والی فلائٹ میں سوار ہونے پر راضی ہو جائیں، تو تین سو ڈالر بچا سکتے ہیں۔''

''تو... تم نے اُسے کیا مشورہ دیا؟'' باپ کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''میں...'' اوریلی نے ہچکی لی۔ ''میں نے اُسے یہی کہا کہ فلائٹ چھوڑنے کا رسک نہ لے۔ اسی جہاز میں...''

''ممکن ہے کہ وہ فلائٹ پر سوار ہی نہ ہوئی ہو۔'' والٹر فوراً کھڑا ہو گیا۔ ''کسی بھی اسٹوڈنٹ کے لیے تین سو ڈالر بہت معنی رکھتے ہیں۔ تم بیکی کے گھر فون کرو۔ شاید ڈونلڈ اِس بارے میں کچھ جانتا ہو۔''

چند پلوں بعد اوریلی بیکی کے باپ ڈونلڈ اولسن کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

تین بار بیل جانے کے بعد ڈونلڈ نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو ڈونلڈ... میں اوریلی بول رہی ہوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمھیں بیکی کی کال موصول ہوئی تھی؟''

''نہیں! کیوں کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟'' ڈونلڈ کی آواز میں پریشانی تھی۔

''تم نے ٹی وی دیکھا؟'' اس نے بمشکل خود پر قابو رکھا۔ ''فلائٹ 800 ایک حادثے کا شکار ہو گئی ہے...''

☆☆☆

جم ہرڈ گیراج بند کرنے کی تیاریوں میں تھا کہ جیب میں پڑا موبائل تھرکنے لگا۔ اسکرین پر ایک دوست کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

''ہیلو جارج کیسے ہو؟ کیا ادھار مانگنے کے لیے فون کیا ہے؟'' اس کی آواز میں شوخی تھی۔

''کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔'' دوسری طرف سے جارج کی آواز سنائی دی جو توقع کے برخلاف خاصی بجھی ہوئی تھی۔

''خیریت تو ہے، کیا بیگم سے جھگڑا ہوا ہے؟'' اس نے پھر پھلجھڑی چھوڑی۔

''نہیں... سب خیریت ہے۔ میں...'' جارج نے ایک لحہ کا توقف کیا۔ ''میں جیمی سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

''جیمی؟'' لہجے میں حیرت تھی۔ ''کمال کرتے ہو دوست۔ تمھیں کل ہی تو بتایا تھا کہ وہ آج پیرس جا رہا ہے، اپنی گرل فرینڈ سے ملنے۔ یورپ کا پہلا دورہ ہے اس کا۔ بڑی تیاری کی تھی۔ اب تو تک تمھارا بھتیجا خاصا سفر طے کر چکا ہوگا۔''

جارج نے گہرا سانس لیا۔ ''جم... کیا تم نے ٹی وی دیکھا؟''

''کیوں، کیا ہوا؟'' پہلی بار اندیشہ اُس کی آواز میں لرزا۔

''نیویارک سے پیرس جانے والا جہاز... ایک حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔'' جارج نے بہ مشکل کہا۔

جس وقت یہ وحشت ناک خبر جم کے کانوں سے ٹکرائی، خوف میں گھرے بیکی کے والدین گاڑی میں سوار بیکر خاندان کے مکان کی سمت بڑھ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ چاروں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھے تھے، جس پر پیش کیے جانے والے مناظر تباہی کی کہانی بیان کرتے تھے۔

''بیکی اور مشیل بہت اچھی تیراک ہیں۔'' خاموشی میں والٹر کی آواز تھرتھرائی۔ ''وہ تیرتے تیرتے ساحل تک پہنچ جائیں گی۔ مجھے... یقین ہے۔''

باقی تین افراد چپ رہے۔ بالکل چپ!

☆☆☆

17 جولائی 1996 کی رات پیش آنے والے واقعے نے امریکا کو دہلا دیا۔ حکمران لرز اٹھے۔ عوام میں سراسیمگی پھیل گئی اور قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آ گئے۔

اور یہ ہی متوقع تھا، کیونکہ امریکا خوف زدہ تھا۔ شدید خوف زدہ۔

1993ء میں دنیا پر حکمرانی کرنے والی اِس ریاست کے باسی ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہونے والے ایک مہلک حملے کا کرب سہہ چکے تھے، اِس واقعے کے ٹھیک دو برس بعد گیارہ امریکی ہوائی جہازوں کو بارودی مواد سے اڑانے کے خوفناک منصوبے کا انکشاف ہوا جس کے بعد تمام ہوائی اڈوں پر سیکیورٹی بڑھا دی گئی۔

ٹریڈ سینٹر پر ہونے والے حملے کے الزام میں کویتی

باشندے رمزی یوسف کو گرفتار کیا گیا۔ ہوائی جہازوں کو اُڑانے کے منصوبے میں بھی امریکی حکومت نے اُسے ملوث قرار دیا۔ اور اِسی رمزی یوسف کی وجہ سے 17 جولائی کو ایف بی آئی، نیویارک برانچ کے افسران ہائی الرٹ تھے کیونکہ رمزی کا کیس مین ہٹن کی عدالت میں چل رہا تھا۔

جن ہوائی اڈوں پر سیکیورٹی انتظامات بڑھائے گئے تھے، اُن میں نیویارک کا جون ایف کینیڈی ائرپورٹ سرِفہرست تھا۔ یہ امریکا کا مصروف ترین ہوائی اڈا تھا۔ روز ہی لاکھوں افراد یہاں سے اڑان بھرنے والی پروازوں کے ذریعے اندرون اور بیرونِ ملک سفر کیا کرتے تھے۔ اور آج دوپہر اس مصروف ائرپورٹ کا رخ کرنے والوں میں مشیل اور بیکی بھی شامل تھے۔ اُن کی منزل فرانس کا دل تصور کیا جانے والا شہر پیرس تھا۔ اِس سفر کا ایک سبب تو دوست کی منگنی میں شرکت کرنا تھا مگر اصل مقصد یورپ دیکھنے کی خواہش تھی۔

دونوں بے حد پُرجستس تھیں۔ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی وہ ائرپورٹ پہنچ گئیں۔

4 بج کر 41 منٹ پر ٹی ڈبلیو اے کا بوئنگ 747 جان ایف کینیڈی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اِسی جہاز کو چند گھنٹوں بعد پیرس کے لیے روانہ ہونا تھا۔

گو جہاز پچیس برس پرانا تھا مگر خاصی اچھی حالت میں تھا۔ ماضی میں یہ سولہ سو بار اُڑان بھر چکا تھا اور کمپنی کے انجینئروں کو یقین تھا کہ ابھی اس کی بہت زندگی باقی ہے۔

28 سالہ کمپیوٹر انجینئر جیمی ہرڈ بھی وقت پر ائرپورٹ پہنچ گیا۔ وہ خاصا مسرور تھا۔ فقط آٹھ گھنٹے کی مسافت جس کے اختتام پر اس کی گرل فرینڈ اس کی بانہوں میں ہوگی۔

جہاز کے لینڈ کرتے ہی انجینئروں کی ٹیم اس کی جانب دوڑ پڑی۔ معمول کے مطابق اس کی جانچ کی گئی۔ آلات کو چیک کیا گیا۔

بوئنگ 747 ایک بڑا جہاز تھا۔ فیول ٹینک چھ ٹنکیوں پر مشتمل تھا، جس میں ہزاروں لیٹر فیول سما سکتا تھا مگر پیرس تک سفر کے لیے زیادہ فیول درکار نہیں تھا۔ ڈیڑھ ہزار لیٹر فیول بہت تھا۔

فیول کی یہ مقدار جہاز کی پانچ چھوٹی ٹنکیوں ہی میں جگہ بنا پائی، مرکزی ٹنکی لگ بھگ خالی رہی۔

جہاز کا کپتان اسٹیون شنائڈر نامی ایک تجربہ کار پائلٹ تھا۔ اِس کا شمار کمپنی کے ماہر ترین افراد میں ہوتا تھا۔ اُس کا ساتھی کیپٹن راؤلف بھی ہزاروں فٹ بلندی پر پرواز کا ٹھیک ٹھاک تجربہ رکھتا تھا۔ اسٹیون اور راؤلف کے تعلقات دوستانہ تھے۔ پہلے بھی وہ ساتھ جہاز اُڑا چکے تھے۔

جب مشیل اور بیکی ٹکٹ لے کر بورڈنگ کاؤنٹر پر پہنچیں، آفیسر نے انہیں ٹی ڈبلیو اے کی پیشکش سے آگاہ کیا جسے قبول کر کے وہ معقول رقم بچا سکتی تھیں۔

مشیل نے مشورہ کرنے کے لیے اپنی ماں اور یلی کو فون کیا۔ اور یلی نے یہی کہا کہ انہیں فلائٹ نہیں چھوڑنی چاہیے۔ ”اگر اگلی فلائٹ لیٹ ہوگئی، تو تمہیں پیرس کے لیے روانہ ہونے کے لیے کل صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ اسی جہاز میں سوار ہو جاؤ۔“

فون رکھنے کے بعد مشیل اور بیکی کے درمیان اس بابت مختصر گفتگو ہوئی، جس کے آخر میں وہ اِس پیشکش کو رد کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

یہ اُن کی زندگیوں کا آخری فیصلہ ثابت ہوا!

☆☆☆

درجہ حرارت 28 سینٹی گریڈ تھا مگر سمندری ہواؤں کی وجہ سے گرمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

سوئی کے کانٹے چھ کا ہندسہ عبور کرنے کو تھے۔ گو فلائٹ 800 کی روانگی میں لگ بھگ ایک گھنٹا باقی تھا، مگر بیشتر مسافر جہاز میں سوار ہو چکے تھے اور اب وقت گزارنے کے لیے میگزین اور کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔

سات بجے تک جہاز بھر چکا تھا۔ کاک پٹ میں موجود کیپٹن اسٹیون پرواز کے لیے تیار تھے کہ کنٹرول ٹاور سے انہیں ایک پریشان کن اطلاع موصول ہوئی۔

فہرست کے مطابق ایک مسافر تاحال جہاز میں سوار نہیں ہوا تھا۔

بہ ظاہر تو یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار مسافرین وقت پر سفر ملتوی کر دیتے ہیں، مگر گمبھیر بات یہ تھی کہ اُس لاپتا مسافر کا سامان جہاز میں ”لوڈ“ کیا جا چکا تھا۔

اِس صورتِ حال سے نہ صرف کاک پٹ، بلکہ پورے ائرپورٹ میں اندیشے پھیل گئے۔

پریشانی کی اس لہر کا سبب آٹھ برس قبل پیش آنے والا ایک فضائی حادثہ تھا۔

دراصل 1988ء میں پین ایم کا ایک جہاز دورانِ پرواز دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ تفتیش کے بعد اس سانحے کو دہشت گردی کی کارروائی قرار دیا گیا۔ ایف بی آئی نے دعویٰ کیا کہ دھماکا خیز مواد سامان میں رکھا گیا تھا اور جن مسافروں کا

سامان تھا، وہ خود جہاز میں سوار نہیں ہوئے۔

اُس وقت حالات نسبتاً بہتر تھے۔ انتظامیہ ہائی الرٹ نہیں تھی، سو ان مسافروں کو نظرانداز کرتے ہوئے جہاز فضاؤں میں بلند ہو گیا اور یہ غلطی مہلک ثابت ہوئی۔ دو سو سے زائد مسافر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس واقعے کے بعد قانون نافذ کر دیا گیا کہ کوئی جہاز اس وقت تک اڑان نہیں بھرے گا، جب تک وہ تمام مسافر جن کا سامان جہاز میں لوڈ کر دیا ہے، خود جہاز میں سوار نہیں ہو جاتے۔

جان ایف کینیڈی ائرپورٹ کی انتظامیہ اُس لاپتا مسافر کی تلاش میں مصروف تھی اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، شک و شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔

جہاز میں بیٹھے مسافر بھی اب بے آرامی محسوس کرنے لگے تھے۔ تازہ ہوا کی کمی اور گرمی کی وجہ سے بے چینی بڑھ رہی تھی، جس کے پیشِ نظر کیپٹن نے ائرکنڈیشنر چالو کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

ائرکنڈیشنر نے رن وے پر کھڑے جہاز کے اندرونی ماحول کو تو ٹھنڈا دیا، مگر بیرونی حصہ دھیرے دھیرے گرم ہونے لگا۔

مسافر تاحال لاپتا تھا... ایک ایک لمحہ صدی کے مانند گزر رہا تھا۔

بیکی اور مشیل بھی میگزین پڑھتے پڑھتے اوب گئی تھیں اور اب موسیقی سے دل بہلا رہی تھیں۔

بالآخر آٹھ بج گئے اور تب کنٹرول ٹاور سے ایک اچھی خبر موصول ہوئی۔

”فلائٹ 800، تاخیر کے لیے معذرت۔ ریکارڈ چیک کیا گیا ہے، جس مسافر کو تلاش کیا جا رہا تھا، وہ جہاز ہی پر موجود ہے۔ وہ ساڑھے چھ بجے ہی سوار ہو گیا تھا۔ آپ اُڑان بھر سکتے ہیں۔“

”دھت تیرے کی۔“ جیمی نے ران پر ہاتھ مارا۔ ”پورا ایک گھنٹا ضائع کیا۔“

کلیرنس مل چکی تھی۔ جہاز کے پہیے حرکت میں آنے کو تھے۔ وہ اُڑان بھرنے والا تھا... اپنی آخری اُڑان۔

☆☆☆

فلائٹ 800 ایک گھنٹے تاخیر سے جان ایف کینیڈی سے روانہ ہوئی۔ چند منٹ بعد وہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھی۔ بحراوقیانوس پر پرواز کرتے ہوئے اُسے امریکی بحریہ کی حدود میں آنے والے ممنوعہ علاقے کے انتہائی نزدیک سے گزرنا تھا مگر خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ سمجھ دار کپتان اور ائر ٹریفک کنٹرول کے چوکس عملے کی موجودگی میں اس علاقے کے نزدیک سے جہازوں کا گزر معمول تھا۔

جہاز فضا میں تھا۔ اُڑان بھرے لگ بھگ گیارہ منٹ گزر چکے تھے۔ مسافروں کی بے چینی گھٹ چکی تھی۔ کاک پٹ میں بھی اطمینان تھا۔ تمام آلات کام کر رہے تھے۔ کنٹرول روم بھی شانت تھا۔ آپریٹر ریڈار پر جہاز کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ بہ ظاہر کسی سانحے کا دور دور تک امکان نظر نہیں آتا تھا مگر یہ پوری صورتِ حال حقیقت کی عکاس نہیں تھی۔ قطعی نہیں۔

تاریخ کے چند بدترین فضائی حادثات

فضائی حادثات کی تاریخ پر نظر رکھنے والے ماہرین 1977 میں ٹینیرف ائرپورٹ، اسپین کے رن وے پر ہونے والے دو طیاروں کے تصادم کو بدترین واقعہ تصور کرتے ہیں، جس میں 583 افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ تصادم ایمسٹرڈیم سے آنے والی فلائٹ 4805 اور نیویارک سے آنے والی فلائٹ 1736 کے درمیان ہوا۔ ٹکراؤ کا سبب کہرے اور پائلٹوں کے غلط فیصلے کو قرار دیا جاتا ہے۔

اس فہرست میں 1985 میں تباہی کا شکار بننے والا جاپانی جہاز بھی شامل ہے۔ حادثے میں 520 افراد زندگی کی بازی ہار گئے۔ صرف چار خوش قسمت ہی زندہ بچے۔ یہ بدبخت جہاز اگست کی ایک شام ٹوکیو سے اوساکا کے لیے روانہ ہوا تھا اور اُڑان کے 45 منٹ بعد ٹوکیو سے 62 میل دور جنگل میں گر گیا۔

اسپین کے ٹینیرف ائرپورٹ جیسا حادثہ نومبر 1996 میں نئی دہلی کے اندرا گاندھی ائرپورٹ پر بھی پیش آیا، جب 312 مسافروں کو سعودی عرب لے جانے والا جہاز پرواز کے صرف سات منٹ بعد فضا میں قازقستان کے باربردار طیارے سے ٹکرا گیا اور 350 افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ہندوستانی حکومت نے اس کی ذمے داری پائلٹوں پر عائد کی، مگر ماہرین اس کی وجہ اندرا گاندھی ائرپورٹ پر نصب پرانے ریڈار سسٹم کو قرار دیتے ہیں۔

سیکڑوں مسافر ملبے کے دہانے پر پہنچ چکے تھے۔
جب فلائٹ 800 کی اُڑان کا سفر بارہویں منٹ میں داخل ہوا، گھڑیوں نے رات کے ساڑھے آٹھ بجے کا اعلان کیا، ٹھیک تب پاس سے گزرتے ایک ہوائی جہاز کے کپتان ڈیوڈ مکلائن کی اُس پر نظر پڑی۔ سارجنٹ رچرڈسن کا ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا ٹھیک اُس بدقسمت جہاز کے نیچے آگیا اور سمندر میں موجود ولیم نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا۔
اور ٹھیک تب... فضا دھماکے سے لرز اٹھی۔
ولیم نے آسمان پر پُراسرار روشنی دیکھی... کیپٹن ڈیوڈ کی آنکھوں کے سامنے آگ کے قوی الجثہ گولے نے جنم لیا... سارجنٹ نے آسمان سے برستے دوزخی ملبے سے بچنے کے لیے رفتار بڑھادی اور کنٹرول روم میں بیٹھے آپریٹر کو حیرت نے آلیا... جہاز ریڈار سے غائب ہو چکا تھا۔ اب وہاں پُراسرار خاموشی تھی۔
”فلائٹ 800، کیپٹن اسٹیون کیا آپ مجھے سن سکتے ہیں؟“ اُس نے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو ناکام گئی۔ اُس نے ایک اور کوشش کی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ تیسری کوشش.... جواب ندارد!

☆☆☆

”ہم سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں... سامنے سے گزرنے والے جہاز میں دھماکا ہوا ہے... اس کا ملبا...“
ائر ٹریفک کنٹرول کو موصول ہونے والا پہلا پیغام ایسٹ ونڈ ائر لائنز کے کپتان ڈیوڈ مکلائن کا تھا، جس کی آنکھوں نے فقط تین سیکنڈ قبل ایک جمبو جٹ کی تباہی کا ہیبت ناک منظر دیکھا تھا۔
کنٹرول روم میں سراسیمگی پھیل گئی۔ فوراً ریسکیو ٹیموں سے رابطہ کیا گیا۔
انٹرنیشنل گارڈز کو یہ اطلاع پہلے ہی پہنچ گئی تھی، جس کا ماخذ سارجنٹ رچرڈسن تھا، جو اپنا ہیلی کاپٹر بہ مشکل شعلوں میں سے نکال کر لایا تھا۔
بیس پر موجود جوان فوراً حرکت میں آگئے۔ ریسکیو مشن کی ذمّے داری میجر مائیک نوئس کے کاندھوں پر تھی جس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔
”ہمارا مقصد زندہ بچنے والوں تک رسائی ہے... سمندر کا درجہ حرارت 18 سینٹی گریڈ ہے... زخمی آٹھ گھنٹے پانی میں زندہ رہ سکتے ہیں...“ میجر نے ماتحت عملے کو ہدایات جاری کیں۔
کچھ ہی پلوں بعد دو ہیلی کاپٹرز سمندر کے اُس کے حصے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں تباہی کے نشان پھیلے تھے۔
قریبی بندرگاہوں پر تعینات عملہ بھی حرکت میں آچکا تھا۔ لونگ آئرلینڈ کے ساحل سے روانہ ہونے والی درجنوں کشتیاں پانی کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔
سب سے پہلے میجر مائیک کا ہیلی کاپٹر جائے وقوعہ پر پہنچا۔ اور جو کچھ اُس نے دیکھا، وہ امیدیں خاک میں ملانے کے لیے کافی تھا۔
پانی پر آگ تیر رہی تھی۔ ملبے سے اٹھنے والے شعلے دس فٹ بلند تھے، جنہیں امدادی کشتیاں دور ہی سے دیکھ سکتی تھیں۔
یہی وہ لمحہ تھا، جب اس سانحے کی خبر ٹی وی چینلز تک پہنچی اور اگلے چند لمحوں میں پورے ملک میں پھیل گئی۔ جہاز کے بدقسمت مسافروں کے اہلِ خانہ اندیشوں میں اتر گئے۔
ائرپورٹ پر ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ ہر کوئی اپنے پیاروں کی خیریت جاننا چاہتا تھا، مگر انتظامیہ کچھ بتانے سے قاصر تھی۔ ان کی کُل امیدیں ریسکیو ٹیموں سے وابستہ تھیں جو اس وقت شدید مشکل کا شکار تھیں۔
تین گھنٹے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود امدادی ٹیمیں ایک بھی زندہ مسافر تک رسائی نہیں حاصل کرسکیں۔ انہوں نے سمندر کا بڑا حصہ کھنگال ڈالا، مگر سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا، جس کا بار اٹھائے بالآخر انہیں واپس لوٹنا پڑا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے موت نے جہاز کے ہر مسافر کو نگل لیا ہو۔
پانی سیاہ تھا اور رات گہری... بحرِ اوقیانوس پر اندیشوں کا ملبا تیر رہا تھا۔

☆☆☆

18 جولائی کی صبح نیویارک کی تاریخ کی اداس ترین صبح تھی۔
سورج کی کرنوں نے منظر کی ہیبت ناکی دوچند کر دی۔ پانی پر تیرتی جہاز کی باقیات یہ واضح پیغام دے رہی تھیں کہ تمام مسافر موت کی وادی میں اتر چکے ہیں۔
ایک جانب امدادی کارروائیاں جاری تھیں، دوسری جانب قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آچکے تھے جس کی کمان ایف بی آئی نیویارک آفس کے سربراہ جیمس کالاسٹروم نے سنبھالی ہوئی تھی۔
گزشتہ چند برسوں میں پیش آنے والے واقعات کے پیشِ نظر کالاسٹروم کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ

فلائٹ 800 کسی حادثے کا نہیں بلکہ دہشت گردوں کا شکار بنی ہے اور پریس کو دی جانے والی پہلی ہی بریفنگ میں اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار کر دیا۔
”مجھے اندیشہ ہے کہ دہشت گرد مزید کارروائیاں کریں گے اور ہوائی اڈے ان کا خاص نشانہ ہوں گے۔“
کالاسٹروم کے بیان سے پورے امریکا میں کھلبلی مچ گئی۔ لاکھوں شہریوں نے اپنی فلائٹ کینسل کروا دی۔ فضائی نظام مفلوج ہونے لگا۔
دوپہر تک بھرپور کوششوں کے باوجود فقط 73 لاشیں ہی سمندر سے نکالی جاسکیں۔ صورتِ حال دیکھتے ہوئے امدادی کاموں کو تیز کر دیا گیا۔ سانحے کے بارہ گھنٹے بعد جدید ترین آلات سے لیس، تیز رفتار آبدوزوں اور ماہر غوطہ خوروں کے ہمراہ امدادی ٹیمیں جائے وقوعہ پر پہنچ گئیں۔ اس مشن کا مقصد فقط لاشوں اور زخمیوں کو تلاش کرنا نہیں تھا۔ اس کا ایک مقصد جہاز کا ملبا اکٹھا کرنا بھی تھا کیونکہ اب ملبا ہی تباہی کے اس ہولناک راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔
کالاسٹروم نے بھی جائے وقوعہ کا دورہ کیا.... وہاں پھیلی تباہی نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔
”ملبے کو دیکھ کر بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہاز کا کیا حال ہوا ہوگا۔“ وہ اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب تھا۔ ”یقینی طور پر اس کے پرخچے اُڑ گئے ہوں گے۔ لاکھوں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے... ہمیں ہر ٹکڑے تک رسائی حاصل کرنی ہے، خصوصاً بلیک باکس اور ڈیٹا ریکارڈ تک۔“
سہ پہر کے وقت ریڈیو اور ٹیلی وژن سے ایف بی آئی کا ایک پیغام نشر ہوا۔ ”ہم تمام عینی شاہدین سے سامنے آنے کی درخواست کرتے ہیں، ان کا تعاون ہمارے لیے انتہائی معاون ہوگا۔“
پیغام نشر ہوتے ہی ٹیلی فون کالز کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تب اس کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آیا۔

☆☆☆

”اچانک دھماکا ہوا... جہاز میں آگ لگ گئی... وہ بھیانک منظر تھا... پہلے جہاز اوپر کی سمت اٹھا... پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا... اور دونوں ہی حصے سمندر میں جا گرے!“
شاید ہی کسی نے اس حادثے کو اتنے نزدیک سے دیکھا ہو، جتنے قریب سے کیپٹن ڈیوڈ نے دیکھا تھا۔ اُس کا بیان سب سے اہم تھا۔
ڈیوڈ کے ساتھی پائلٹ کا بیان بھی لگ بھگ یہی تھا جو

میڈیا، معلومات کا ذریعہ
یا پروپیگنڈے کا ہتھیار

دنیا بھر میں میڈیا کو معلومات تک رسائی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، ریاست کا چوتھا ستون قرار دیا جاتا ہے، مگر امریکا نے اسے ہمیشہ پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا۔
سب سے واضح مثالیں 9/11 اور ممبئی حملوں کے واقعات ہیں، جن پر بننے والی ڈاکومینٹری فلموں اور رپورٹس میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ من مانی تشریح کی گئی۔
فلائٹ 800 بھی اسی رویّے کی ایک مثال ہے۔ امریکی میڈیا کے مؤقر اداروں نے ہمیشہ حکومتی موقف کی حمایت کی۔ نیشنل جیوگرافک سے نشر ہونے والی مشہور زمانہ ڈاکومینٹری سیریز Seconds From Disaster اس کی ایک مثال ہے۔ اس سانحے کو موضوع بناتے ہوئے میزائل تھیوری کے حامیوں کو نظرانداز کرنا دشوار تھا، ڈاکومینٹری تیار کرنے والوں نے ان افراد کے بیانات اور آرا کو جگہ ضرور دی، مگر جدید ٹیکنالوجی اور انسانی جذبات کو بڑی مہارت سے برتتے ہوئے آخر میں حکومتی موقف ہی کو دُرست ثابت کیا۔ اور ٹھیک ایف بی آئی کے مانند اسے امریکی جھنڈے میں لپیٹ کر سمندر بُرد کر دیا۔

اچانک ہونے والے دھماکے کے گرد گھومتا تھا۔
زمین سے اس بدقسمت جہاز کی تباہی کے گواہ بننے والے بیش تر افراد کا مشاہدہ بھی آسمان میں جنم لینے والے شعلے تک ہی محدود تھا، مگر کچھ افراد کا مشاہدہ یکسر مختلف تھا... اُنہوں نے دھماکے کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھا تھا۔
جن سیکڑوں افراد نے ایف بی آئی سے رابطہ کیا، ان میں لو ڈیلیرون نامی ایک شخص بھی شامل تھا جس نے ایک پریشان کن بیان دیا:
”دھماکے سے قبل میں نے ایک بھڑکتا ہوا شعلہ آسمان کی سمت جاتے دیکھا... ایسا لگتا تھا جیسے اُسے سمندر میں موجود کسی کشتی سے چھوڑا گیا ہے...“
ایک اور شخص ٹام ڈوگہرتی بھی عینی شاہد کے طور پر سامنے آیا، جس کا کہنا تھا:

”مجھے بادلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھایا۔ ٹھیک تب سمندر سے آسمان کی سمت روشنی بلند ہوئی۔۔۔اور اوپر جا کر کسی شے سے ٹکرا گئی۔۔۔اور تب آسمان میں دھماکا ہوا۔“

اس طرح کی پریشان کن فون کالز فقط ایف بی آئی کو موصول نہیں ہوئیں، کئی عینی شاہدین نے ٹی وی چینلز سے بھی رابطہ کیا جن میں اس واقعے کا گواہ بننے والا ولیم گیلی بھی شامل تھا جو اُس رات اپنی بوٹ کے عرشے پر موجود تھا۔ اُس نے ان الفاظ میں واقعہ بیان کیا۔ ”میں نے سفید رنگ کی روشنی اوپر جاتے ہوئے دیکھی۔۔۔کوئی شے جہاز کے دائیں حصے سے ٹکرائی۔۔۔جس کے بعد آسمان میں آگ کے گولے نے جنم لیا۔۔۔جو چند سیکنڈ بعد دو حصوں میں بٹ گیا۔“

ولیم جیسے اور بھی کئی افراد نے میڈیا میں بیانات دیے، جس کے بعد ”میزائل تھیوری“ نے جنم لیا اور یہ اندیشہ قوی ہونے لگا کہ یہ دہشت گردی ہی کی واردات ہے۔

یہ خیال اس وقت یقین کی شکل اختیار کر گیا جب انٹرنیٹ پر دو تصاویر اپ لوڈ کی گئیں۔

دونوں ہی تصاویر اُس رات ساحلِ سمندر پر ہونے والی تقریبات میں اتاری گئی تھیں۔

ایک تصویر میں فوٹوگرافر کو دیکھ کر مسکرانے والے افراد کے پیچھے آسمان میں سفید رنگ کا دھاگے نما دھواں نظر آ رہا تھا۔

دوسری تصویر میں پارٹی کے شرکا کے سروں کے اوپر ایک دھندلی سی شبیہ تھی جو قریب سے دیکھنے پر میزائل معلوم ہوتی تھی۔

ان تصاویر نے اِس خیال پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی کہ یہ دہشت گردی ہی کا واقعہ ہے۔۔۔ جہاز پر میزائل داغا گیا تھا۔

بل کلنٹن کے مخالفین نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں خصوصاً ایف بی آئی کی کارکردگی پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔ ریاست کی حدود میں ہونے والے اس واقعے کا صاف مطلب تھا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں یکسر ناکام رہے ہیں۔

کالاسٹروم مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر تنقید کی بوچھاڑ نے اسے بھی پریشان کر دیا۔ نیویارک سے چند کلومیٹر دُور پیش آنے والا یہ واقعہ سیکیورٹی پر ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔

ایف بی آئی نے کمر کس لی۔ دہشت گردوں تک رسائی کے علاوہ اُنھیں یہ عقدہ بھی حل کرنا تھا کہ حملہ آوروں نے اس مذموم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے آخر کیا طریقہ اختیار کیا۔

اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے جو پہلی تھیوری پیش کی گئی وہ اسٹرنگر میزائل کے گرد گھومتی تھی۔

جدید نوعیت کا یہ مہلک ہتھیار امریکا کی ایجاد تھی جو ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹرز کے لیے سمِ قاتل تصور کیا جاتا تھا۔ انجن سے پیدا ہونے والے دھوئیں کا تعاقب کرنے والا یہ میزائل ہوا میں اپنا رخ بدلنے کی قوت رکھتا تھا۔ یہی سبب ہے وہ ٹارگٹ تک پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔

امریکا سوویت، افغان جنگ کے دوران اِس کا کامیابی سے تجربہ کر چکے تھا۔ جب وہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگانے کے بعد افغانستان سے نکلا، تو کئی اسٹرنگر میزائل وہیں رہ گئے تھے اور فلائٹ 800 کی تباہی کے بعد یہ خیال زور پکڑنے لگا تھا کہ ان میں سے چند دہشت گردوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔

اِس تھیوری نے امریکا میں سنسنی ضرور پھیلائی مگر دلائل کے میدان میں یہ زیادہ پُرقوت ثابت نہیں ہوئی۔

اسٹرنگر میزائل کی رینج فقط آٹھ کلومیٹر تھی جب کہ حادثے کا شکار بننے والا جہاز سمندر پر پرواز کر رہا تھا اور خشکی سے لگ بھگ تیرہ کلومیٹر دور تھا۔ یعنی زمین پر موجود حملہ آور کے لیے اسے نشانہ بنانا لگ بھگ ناممکن تھا۔

”تو کیا میزائل سمندر سے داغا گیا تھا؟“ اِس سوال کے جنم لیتے ہی ایف بی آئی نے اپنی تفتیش کا رخ سمندر کی سمت موڑ دیا۔

یہ عمل آسان نہیں تھا۔ سمندر بے حد وسیع تھا۔ وہاں سیکڑوں چھوٹے بڑے جزیرے تھے۔ پھر یہ امکان بھی تھا کہ حملہ آوروں نے کسی جزیرے کے بجائے کسی کشتی سے میزائل فائر کیا ہو۔

ایف بی آئی کو ایک بڑی ٹیم تشکیل دینی پڑی، جس نے نیویارک کی حدود میں آنے والے تمام جزیروں کو کھنگال ڈالا۔ حادثے کی رات سمندر میں اترنے والی کشتیوں کی باریک بینی سے جانچ ہوئی۔ اُن لوگوں سے تفتیش کی گئی جو اس رات اُن کشتیوں پر سوار تھے۔

تفتیشی ٹیم نے خود کو محدود نہیں رکھا۔ اُنھوں نے مخبروں کی بھی مدد لی۔ منصوبہ سازوں تک پہنچنے کے لیے دیگر ممالک میں موجود اپنے کانڈروں کو حرکت دی۔ سیٹلائٹ ٹیکنالوجی کو برتا گیا۔ ساتھ ہی دہشت گردی کے کیس میں

گرفتار ہونے والے کئی مجرموں سے بھی پوچھ گچھ کی۔۔۔ مگر تمام کوششیں لاحاصل ثابت ہوئیں۔

ایف بی آئی کسی ایسے گروہ یا شخص تک نہیں پہنچ سکی جسے اس سانحے کا ذمّے دار ٹھہرایا جا سکے۔ پھر ماضی کی طرح کسی انتہا پسند تنظیم نے بھی اِس کی ذمّے داری قبول نہیں کی، بلکہ امریکی استعماریت کے خلاف برسرِ پیکار چند گروہوں نے تو اس واقعے سے یکسر لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔

کسی بیرونی دشمن کی تلاش میں ناکامی ایف بی آئی کے لیے ایک بڑا دھچکا ثابت ہوئی کیونکہ اب اُنھیں تفتیش کا رخ اندر کی سمت موڑنا تھا جہاں ایک تنازعہ اُن کا منتظر تھا۔

☆☆☆

آغاز انٹرنیٹ سے ہوا۔

ایف بی آئی کی ابتدائی ناکامیوں کے بعد سماجی رابطے کی سائٹس پر یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ اگر اس واقعے میں بیرونی قوتیں ملوث نہیں، تو کیا اندرونی قوتیں اس کی ذمّے دار ہیں؟

اس معمولی سوال نے جلد ہی گرما گرم بحث کی شکل اختیار کر لی جس کے نتیجے میں سمندری حدود کی حفاظت پر مامور امریکی بحریہ پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔

چند حکومت مخالف تجزیہ کاروں نے تو یہ الزام بھی عائد کر دیا کہ یہ میزائل کسی بحری جہاز سے داغا گیا تھا۔

ابتدا میں تو حکومت کی جانب سے اِس خیال کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، اِسے دیوانے کی بڑ قرار دیا گیا مگر وہ اِس کے حیرت انگیز پھیلاؤ کو نہیں روک سکی۔ کسی متعدی مرض کی طرح یہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شخص تک پہنچ گیا اور چند ہی دنوں میں پورے امریکا میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ کی وجہ سے وائٹ ہاؤس نے خصوصی احکامات جاری کیے۔ کالاسٹروم کو حرکت میں آنا پڑا اور تفتیش کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے امریکی بحریہ جیسی مقدس گائے کو اس میں شامل کر لیا گیا۔

اب معلومات اکٹھی کرنے کا عمل شروع ہوا۔ دستاویزات کے مطابق جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا، اُس کے پانچ سو کلومیٹر کے دائرے میں اُس شام آٹھ آبدوزیں اور آٹھ بحری جہاز موجود تھے۔ بحریہ کے پانچ ہوائی جہاز بھی آسمان میں تھے۔

یہ معلومات پریشان کن تھی۔ جنگی جہازوں کی موجودگی اِس جانب اشارہ تھی کہ اس شام امریکی بحریہ جنگی مشقیں کر رہی تھی۔

بحریہ کے اعلیٰ افسران کو شاملِ تفتیش کرنا، آبدوزوں اور جہازوں کی جانچ کرنے کا فیصلہ آسان نہیں تھا۔ سول انتظامیہ کو شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا مگر عوامی دباؤ زیادہ شدید تھا، بادلِ ناخواستہ ہی سہی مگر کالاسٹروم کو یہ قدم اٹھانا پڑا۔

ایف بی آئی ایجنٹس نے بحریہ کے سیکڑوں اکتائے ہوئے اہل کاروں سے پوچھ گچھ کی۔ آبدوزوں، بحری جہازوں اور طیاروں کی جانچ کے اجازت نامے حاصل کیے گئے۔ ایک بار پھر سیٹلائٹ ٹیکنالوجی کی مدد لی گئی مگر یہ پوری مشق لاحاصل ثابت ہوئی۔ کسی میزائل کے داغے جانے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ امریکی بحریہ بے داغ تھی۔

دوسرے روز شائع ہونے والے اخبارات کی سرخی تھی:

”بحریہ، میزائل کیس سے بری!“

☆☆☆

”اگر اندرونی قوتیں ملوث نہیں، دہشت گردوں کا بھی ہاتھ نہیں، تو فلائٹ 800 کو آخر کس نے مار گرایا؟“

ایف بی آئی کو اِس پیچیدہ سوال کا جواب دینا تھا جو کسی طور آسان نہیں تھا۔

فوجی اور سول انتظامیہ نے بند دروازوں کے پیچھے کئی میٹنگز کیں جس کے بعد کالاسٹروم میڈیا کے سامنے آیا جس کے بیان نے امریکا میں کھلبلی مچا دی۔

”فلائٹ 800 دہشت گردی کا شکار نہیں بنی۔۔۔“ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ”سانحے کا سبب تکنیکی خرابی تھی!“

مارچ 1974 میں استنبول سے لندن کے لیے روانہ ہونے والا ڈی سی 10 بھی ایک بدقسمت جہاز تھا، جس میں سوار 346 افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ یہ جہاز 375 میل فی گھنٹے کی رفتار سے پیرس کے شمال مشرق میں زمین سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔

1988 میں پین ایم کا نیویارک کی سمت جانے والا ایک بدقسمت طیارہ دہشت گردی کا شکار بنا اور تیس ہزار فٹ کی بلندی پر دھماکے سے پھٹ گیا۔ یہ واقعہ لاکربی کے علاقے میں پیش آیا۔ ہلاکتوں کی کل تعداد 270 تھی۔ تحقیقات کے مطابق دھماکا خیز مواد سے بھرا سوٹ کیس فرینکفرٹ، جرمنی میں جہاز میں رکھا گیا تھا۔

امریکیوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہی کالاسٹروم جس نے واقعے کے فوراً بعد کہا تھا کہ یہ دہشت گردی کا واقعہ ہے، اب اِسے تکنیکی خرابی کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ حیرت انگیز!

میڈیا نے کالاسٹروم پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی جن میں سے بیش تر کا تعلق اُن عینی شاہدین کے بیانات سے تھا جنھوں نے جہاز کی تباہی سے قبل میزائل کو آسمان کی سمت جاتے دیکھا تھا۔

مضبوط اعصاب کے مالک کالاسٹروم نے گہرا سانس لیا۔ ”ہم تمام بیانات کا پھر جائزہ لیں گے۔“

عینی شاہدین سے پھر رابطہ کیا گیا مگر اِس بار ماضی کے برعکس اس پورے عمل میں اتنی احتیاط برتی گئی کہ شبہات سر اٹھانے لگے، جس کے پیشِ نظر ایک موقر امریکی اخبار نے سرخی لگا دی:

”کیا ایف بی آئی میزائل تھیوری کو دفن کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

اخبار کی خصوصی رپورٹ میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ عوام کی بے پناہ دلچسپی کے باوجود اس پورے مرحلے کو اس حد تک خفیہ رکھنے کا آخر کیا سبب ہے۔

ایف بی آئی نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اُن کے 80 کارندوں نے آنے والے دو دنوں میں سیکڑوں عینی شاہدین سے انٹرویوز کیے۔ میڈیا کو اس پورے عمل سے دُور رکھا گیا۔ کارندوں نے اپنی رپورٹ بھی عجیب ڈھنگ سے مرتب کی۔ انہوں نے شاہدین کے بیانات لفظ بہ لفظ محفوظ کرنے کے بجائے فقط ان کا خلاصہ اپنی رپورٹ میں شامل کیا۔ عینی شاہدین کو اُس دستاویز کو پڑھنے اور درست کرنے کا بھی موقع فراہم نہیں کیا گیا۔

اس عمل سے زچ ہو کر ایک دفاعی تجزیہ کار کو کہنا پڑا۔ ”ایف بی آئی عینی شاہدین کے بیانات قلم بند نہیں کر رہی، بلکہ اُنہیں زبان بند رکھنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ یہ پوری مشق لاحاصل ثابت ہوگی۔“

اندیشے دُرست ثابت ہوئے۔ ایف بی آئی کی جانب سے میزائل تھیوری کے خلاف پہلا بیان آ گیا۔

”اب تک اس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا ہے!“ یہ کالاسٹروم کے الفاظ تھے۔

”اور ان تصاویر کی بابت آپ کی کیا رائے ہے جناب؟“ ایک رپورٹر نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

”ہم ان کا بھی جائزہ لے رہے ہیں۔“ کالاسٹروم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس پریس کانفرنس کے بعد ایف بی آئی پر گہری نظر رکھنے والے ماہرین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ تصاویر کی جانچ پڑتال کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا... اور ایسا ہی ہوا۔

جس تصویر میں میزائل نما شے نظر آ رہی تھی، اُسے ایف بی آئی کے فارنسک ماہرین نے یہ کہتے ہوئے بہ آسانی رد کر دیا کہ جس زاویے سے یہ تصویر اتاری گئی ہے، حادثے والی شام فلائٹ 800 اُس کے بالکل مخالف سمت میں تھی۔

اب دوسری تصویر زیرِ بحث آئی، جس میں گچھے دار دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے رد کرنا تو اور بھی آسان رہا۔ گچھے کو لینس کی خرابی قرار دے دیا گیا۔

ایف بی آئی نے اپنے تئیں یہ مسئلہ حل لیا۔

میزائل تھیوری کو خام قرار دے دیا گیا، مگر لاکھوں امریکی اِس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے، جس میں جان ایف کنیڈی کا سابق پریس سیکریٹری پیری شیلنجر بھی شامل تھا، جو 72 برس کی عمر میں ایک نئی جنگ لڑنے کو تھا۔

☆☆☆

”فلائٹ 800 امریکی بحریہ ہی کے میزائل کا نشانہ بنی۔ میرے پاس ثبوت موجود ہیں!“ یہ پیری شیلنجر کے الفاظ تھے۔

امریکا چونک اٹھا۔ دعوے کی اہمیت کا ایک سبب تو دعوے دار کی سیاسی و سماجی حیثیت تھی اور پھر وہ ثبوتوں کی بھی بات کر رہا تھا۔

پیری شیلنجر کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ سول اور ملٹری انتظامیہ میں اس کے گہرے تعلقات تھے۔ سیاسی محاذ سے ریٹائرمنٹ کے بعد اُس نے اے بی سی نیوز کے مراسلہ نگار کی حیثیت سے ذرائع ابلاغ میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔ 1979 میں ایران میں امریکی سفارت خانے پر ہونے والے حملے اور 1988 میں تباہ ہونے والے پین ایم کے ہوائی جہاز کے متعلق سنسنی خیز رپورٹس کی وجہ سے وہ عوام میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ لوگ اس کی بات توجہ سے سنتے تھے۔ اور اب... وہ پُراسراریت کی دھند میں لپٹی فلائٹ 800 کی کہانی بیان کرنے کی سعی کر چکا تھا۔

شیلنجر کے اس بیان سے وہ تمام افراد جو یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ ایف بی آئی نے اس واقعے کو دفن کر دیا ہے، پھر جاگ گئے۔ میزائل تھیوری پھر زندہ ہو گئی۔ میڈیا بھی حرکت میں آ گیا۔

جس وقت نیویارک میں شیلنجر کے دعووں نے کھلبلی مچائی ہوئی تھی، ساحل سے تیرہ کلومیٹر دور غوطہ خور بحرِ اوقیانوس کی گہرائیوں میں جہاز کی باقیات تلاش کر رہے تھے جو لگ بھگ ایک سو چار کلومیٹر کے طویل علاقے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ کام واقعی وقت طلب تھا۔ مگر شیلنجر حکومت کو وقت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ تیاری مکمل کر چکا تھا۔

اسی شام اس نے ایک تہلکہ خیز پریس کانفرنس کی، جس میں اس نے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو ایک ویڈیو دکھائی۔

یہ ویڈیو جان ایف کنیڈی ائرپورٹ کے ڈیٹا بیس سے حاصل کی گئی تھی جو اُس ریڈار سے متعلق تھی جس پر بارہ منٹ تک دکھنے کے بعد ٹی ڈبلیو اے کا بدقسمت جہاز اچانک غائب ہو گیا تھا۔

اس ویڈیو کو دیکھ کر ہر شخص ششدر رہ گیا۔

ریڈار پر فلائٹ 800 دکھائی دے رہی تھی... وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی... اچانک اس کے بائیں جانب پُراسرار نیلی روشنی ظاہر ہوئی... جس کی شبیہ کسی جہاز کے مانند تھی... اور پھر یہ روشنی بدقسمت جہاز کی سمت بڑھنے لگی۔

”آپ دیکھ سکتے ہیں صاحبان کہ وہاں ایک اور جہاز تھا۔“ شیلنجر کی آواز کانفرنس ہال میں گونجی۔ ”میرے خیال میں یہ ایک جنگی جہاز تھا، غالب امکان ہے کہ یہ امریکی بحریہ ہی کا جہاز ہو۔ کیونکہ اس روز نیوی جنگی مشقیں کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اسی جہاز نے مسافر طیارے کو نشانہ بنایا۔“

پریس کانفرنس کے بعد میزائل تھیوری پر یقین رکھنے والے لاکھوں امریکی جوش سے بھر گئے۔ وہ سڑکوں پر نکل آئے۔ ایف بی آئی اور امریکی بحریہ کے خلاف ریلیاں نکالی جانے لگیں۔ اس پورے عمل کو شیلنجر کے جارحانہ اقدامات نے بھی مہمیز کیا جو ہر دوسرے روز کسی نہ کسی شہر میں پریس کانفرنس کرتا۔

”اس جہاز کو تلاش کیا جائے۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہتا۔ ”اُس کی جانچ ایک منٹ میں یہ ثابت کر دے گی کہ میزائل اسی سے فائر ہوا تھا۔“

کالاسٹروم کے لیے صورتِ حال خاصی پیچیدہ تھی۔ اس کی ٹیم امریکی بحریہ کے افسران سے خاصی تفتیش کر چکی تھی جس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ مگر ریڈار ویڈیو سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

افسران پھر معلومات اکٹھا کرنے میں جت گئے، جس کے نتیجے میں ایک حیران کن انکشاف ہوا۔

ہاں... اُس رات، ٹھیک اس وقت جب فلائٹ 800 پر تباہی کے عفریت نے حملہ کیا، امریکی بحریہ کا ایک جہاز آسمان پہ محوِ پرواز تھا۔

کالاسٹروم نے اس خبر کو عام کرنے سے قبل مزید چھان بین کا فیصلہ کیا۔ طیاروں، آبدوزوں اور بحری جہازوں کو پھر چیک کیا گیا۔ کئی افراد سے دوبارہ تفتیش ہوئی۔

چند روز بعد جب وہ میڈیا کے سامنے آیا، چہرے پر

14 اگست 2005 کو جزیرے قبرص کے شہر لارناکا سے (براستہ ایتھنز) پراگ روانہ ہونے والی ہیلوئس ائرلائن کی فلائٹ 522 بھی عجیب حالات کا شکار ہو کر تباہی کے منہ میں چلی گئی تھی۔ 121 افراد اس سانحے کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یہ جہاز اُڑان کے لگ بھگ دو گھنٹے بعد یونان کے قصبے غراماتیکو کے نزدیک ایک پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہوا تھا۔ واقعے کا پُراسرار ترین پہلو یہ ہے کہ پرواز کے کچھ دیر بعد ائر ٹریفک کنٹرولر کا جہاز کے کپتان سے ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو گیا، جس کے باوجود جہاز نے منزل کی سمت سفر جاری رکھا۔ اس صورتِ حال نے پورے یونان میں سراسیمگی پھیلا دی۔ یہ خیال پنپنے لگا کہ اِسے اغوا کر لیا گیا ہے اور اب 9/11 کے طرز پر استعمال کیا جائے گا۔ ایک ایف 16 نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اُڑان بھری، جس کا پائلٹ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ جہاز کا کاک پٹ خالی تھا۔ بعد میں عملے کے ایک شخص نے کمان سنبھالنے کی کوشش کی، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ عام خیال ہے کہ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے عملہ بے ہوش ہو گیا۔ اصل وجہ جو بھی ہو، مگر پُراسراریت کے باعث آج اُسے ”آسیبی جہاز“ کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

پُراسرار فضائی حادثات کی بات ہوئی، تو برامو ٹرائی اینگل کو کیسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے جہاں اب تک سیکڑوں فضائی جہاز پُراسرار طور پر غائب ہو چکے ہیں۔ کئی عجیب و غریب حالات کا شکار ہو کر تباہ بھی ہوئے، جن کی سائنس داں کبھی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکے۔

اطمینان تھا۔

”بے شک اس رات بحریہ کا ایک جہاز آسمان پہ تھا مگر...“ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”وہ لونگ آئرلینڈ کے جنوب میں تھا۔ فلائٹ 800 سے لگ بھگ تین سو کلومیٹر دور۔ اور اتنے فاصلے سے مسافر بردار جہاز پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ قطعی نہیں!“

”تو پھر ریڈار پر نظر آنے والا پُراسرار جہاز کون سا تھا؟“ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

”یہ عقدہ بھی حل ہو چکا ہے۔“ کالاسٹروم مسکرایا۔ ”ریڈار پر نظر آنے والی پُراسرار روشنی ایک طیارے کی نشان دہی کرتی ہے مگر یہ کوئی جنگی جہاز نہیں، بلکہ مسافر طیارہ تھا۔“ لہجہ پُراعتماد تھا۔ ”ائر ٹریفک کنٹرول کے مطابق جس مقام پر یہ روشنی ظاہر ہوئی تھی، وہاں اس وقت ایک مسافر بردار جہاز موجود تھا۔“

اُس نے چند دستاویزات لہرائیں۔ ”ہم نے فضائی ماہرین اور سائنس دانوں سے رائے لی ہے۔ انہوں نے تصدیق کی ہے کہ کبھی کبھار کوئی مسافر بردار طیارہ اچانک کنٹرول روم کے کسی اور ریڈار پر بھی ظاہر ہو سکتا ہے اور اس معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں اُن کی آرا پر مبنی یہ رپورٹ کانفرنس کے بعد آپ میں تقسیم کروں گا۔“

☆☆☆

سانحے کو رونما ہوئے پانچ دن گزر چکے تھے اور نیویارک متذبذب تھا۔

عینی شاہدین کے بیانات نظر انداز کر دیے گئے... تصاویر کو جعلی قرار دے دیا گیا... شیلنجر کی پیش کردہ ویڈیو رد ہو گئی... سچ تو یہ ہے کہ ایف بی آئی اور حکومت میزائل تھیوری کو پوری طرح دفن کر چکے تھے۔

”اب تک ملنے والے شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو یہ دہشت گردی کا واقعہ تھا، نہ ہی امریکی بحریہ کی غفلت کا نتیجہ۔“ وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے اپنے ایک بیان میں کہا۔ ”اب ہم نئے خطوط پر کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر تکنیکی خامی اور عملے کی غفلت کا معاملہ ہے۔ اس سلسلے میں جہاز کی باقیات ملنے کے بعد ہی حتمی طور پر کچھ کہا جا سکے گا۔“

جہاز کے بیشتر حصے مل گئے تھے، مگر ایک مسئلہ تھا... سمندر کا بڑا حصہ کھنگالنے کے باوجود اہم ترین حصے یعنی بلیک باکس اور فلائٹ ریکارڈر اب تک ہاتھ نہیں آئے تھے اور یہ خیال جڑ پکڑنے لگا تھا کہ وہ اتھاہ گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئے ہیں۔

مایوس ہونے کے بجائے ریسکیو ٹیموں نے کام جاری رکھا اور ان کی محنت رائگاں نہیں گی۔ ساتویں دن انہیں ایک خوش خبری ملی۔

انتہائی گہرائی میں چٹانوں کے درمیان غوطہ خوروں کو جہاز کا فلائٹ ریکارڈر مل گیا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بلیک باکس بھی قریب ہی ایک چٹان کی دراڑ میں پھنسا ہوا تھا۔

یہ بڑی کامیابی تھی۔ تمام ٹی وی چینلو نے اپنی نشریات روک کر یہ خصوصی خبر دی۔ ساتھ ہی امید ظاہر کی کہ اب اس راز سے پردہ اٹھنے کو ہے۔ مگر میڈیا کے برعکس تکنیکی ماہرین کی آرا ذرا مختلف تھیں۔

یہ اندیشہ موجود تھا کہ جہاز کی تباہی سے بلیک بکس کو بھی شدید نقصان پہنچا ہوگا۔

خدشات اور امیدوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے ماہرین نے ٹوٹ پھوٹ کے شکار بلیک باکس کو کھولا۔

حیرت اُن سے ٹکرائی۔ ریکارڈنگ ریل سالم حالت میں تھی۔

بڑی احتیاط سے اُسے بلیک باکس سے الگ کیا گیا۔ ریکارڈر پر چڑھایا گیا اور چند سیکنڈز بعد ایک اور خوشگوار حیرت کا نزول ہوا۔

آوازیں محفوظ تھیں۔ حادثے والے روز کنٹرول روم اور کیپٹن اسٹیون کے درمیان ہونے والی گفتگو بہ آسانی سنی جا سکتی تھی۔

ماہرین نے پوری ریکارڈنگ سنی، شروع سے آخر تک۔ مگر اُن کی دلچسپی کا محور آخری لمحات کی گفتگو تھی ــــ جوں جوں وہ لمحات قریب آتے جا رہے تھے، ماہرین کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔

بالآخر وہ وقت آن پہنچا۔ ریکارڈنگ بارہویں منٹ میں داخل ہوئی تھی اور پھر... سناٹا چھا گیا۔

کنٹرول روم اور کاک پٹ کے درمیان رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ ریکارڈ چپ تھا اور ریل خاموش۔

ماہرین مایوسی میں گھر گئے۔ انہوں نے دوبارہ ریکارڈنگ سنی، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ واضح تھا کہ اگر کوئی تکنیکی خرابی رونما ہوئی تھی تو جہاز کا عملہ اُس سے یکسر لاعلم تھا۔

☆☆☆

بلیک باکس معلومات فراہم کرنے میں ناکام رہا تھا۔

اب جہاز کی باقیات کالاسٹروم کی توجہ کا مرکز تھیں۔

”ہمیں کیا چیز تلاش کرنی ہے؟“ ماتحت نے اس سے سوال کیا۔

”بارود!“ کالاسٹروم نے سگار کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر...“ ماتحت کی آنکھوں میں تذبذب تھا۔ ”میزائل تھیوری کو ہم رد کر چکے ہیں؟“

”اور اگر شواہد نے اُسے ثابت کر دیا۔“ اُس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ ایک ایک انچ کو چیک کرو۔“

چند گھنٹوں بعد جدید آلات سے لیس نیشنل ٹرانسپورٹیشن سیفٹی بورڈ (این ٹی ایس بی) کی ٹیم ملبے کا معائنہ کرنے میں مصروف تھی، جس کا انچارج لیبارٹری ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ جم وائلڈلی تھا جو دھاتوں کا ماہر تصور کیا جاتا تھا۔

یہ ایک سست رفتار عمل تھا۔ ملبا ہزاروں ٹکڑوں پر مشتمل تھا ـ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، یہ اندیشہ قوی ہوتا جا رہا تھا کہ شاید اس راز سے کبھی پردہ نہیں اٹھ سکے، مگر پھر... ایک شام کالاسٹروم کو جم وائلڈلی کی کال موصول ہوئی جس نے اُس کے خون کی گردش تیز کر دی۔

کچھ گھنٹوں بعد وہ میڈیا کے سامنے کھڑا تھا۔

”جہاز کے کچھ حصوں پر معمولی نوعیت کے بارودی اثرات ملے ہیں!“ اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب! کیا جہاز میں دھماکا خیز مواد رکھا گیا تھا؟“ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔ ”کس قسم کا بارود تھا یہ؟“

کالاسٹروم نے گہرا سانس لیا۔ ”آر ڈی ایکس۔ چند حصوں پر ہمیں آر ڈی ایکس کے ذرات ملے ہیں۔“

”تو آپ کے خیال میں یہ دہشت گردی کی کارروائی ہے؟“

کالاسٹروم کے چہرے پر الجھن ظاہر ہوئی، مگر جلد ہی وہ نارمل ہو گیا۔ ”اب تک کی معلومات میں آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ مزید جو معلومات ملے گی، اُسے بھی عوام کے سامنے لایا جائے گا۔“

عوامی نقطۂ نگاہ سے تو جہاز پر بارودی ذرات ملنا بڑی کامیابی تھی، مگر کالاسٹروم تذبذب کا شکار تھا۔ اسے پورے معاملے میں کوئی ترتیب نظر نہیں آ رہی تھی۔ بارودی مواد کے اثرات بے حد معمولی تھے۔ ماہرین کو کسی دھماکے کے نشانات نہیں ملے تھے۔ اور پھر روانگی سے قبل جہاز کو اچھی طرح چیک کیا گیا تھا تمام مسافر جہاز میں سوار ہوئے تھے۔

اکثر فضائی حادثات کے اسباب تک ماہرین نے رسائی حاصل کر لی اور اُن کی پیش کردہ توجیہات کو قبول بھی کر لیا گیا مگر چند واقعات ٹی ڈبلیو اے فلائٹ 800 کے مانند اتنے پُراسرار تھے کہ عوام کی اکثریت نے حکومتی رپورٹس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں سرفہرست تو 9/11 کو ورلڈ ٹریڈ سینٹرز اور پینٹا گون سے ٹکرانے والے تین طیارے ہیں جن کے اغوا کی کہانی میں اتنے جھول ہیں، حکومتی رپورٹ میں اتنے نقائص ہیں کہ اکثریت کا اُن پر متفق ہونا لگ بھگ ناممکن ہے۔

”کچھ تو گڑبڑ ہے۔“ کالاسٹروم نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ پھر انٹر کام پر اپنے اسسٹنٹ کا نمبر ڈائل کیا۔ ”ذرا معلوم تو کرو۔ کیا یہ جہاز عام پروازوں کے علاوہ کسی اور کے استعمال میں بھی رہا تھا۔ مثلاً قانون نافذ کرنے والا کوئی ادارہ، یا کوئی کمپنی؟“

اسسٹنٹ نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں خاصا وقت لیا، مگر اس کے جواب نے کالاسٹروم کی الجھن دور کر دی۔

”آپ کا اندازہ دُرست ہے سر۔“ اسسٹنٹ کی آواز میں جوش تھا۔ ”ایک ماہ قبل یہ جہاز نیویارک پولیس کو کرائے پر دیا گیا تھا، جہاں اسے کتوں کو بارودی مواد ڈھونڈنے کی تربیت کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔“

”دورانِ تربیت انہوں نے کس قسم کا بارود استعمال کیا تھا؟“ کالاسٹروم نے سوال کیا۔

”پی ای ٹی این اور آر ڈی ایکس۔“ جواب ملا۔ ”انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ٹریننگ کے دوران بارود کا ایک ڈبا پھٹ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جم وائلڈلی کو اُسی کے ذرات ملے ہیں۔“

کالاسٹروم نے گہرا سانس لیا۔ ”یعنی جہاز میں کوئی بم نہیں تھا۔ میزائل تھیوری پہلے ہی رد کی جا چکی ہے۔ اب فقط ایک پہلو رہ گیا ہے۔ تکنیکی خرابی۔“

☆☆☆

چھ ماہ بیت گئے، مگر فلائٹ 800 کی تباہی تاحال

معمانی ہوئی تھی۔
اور یہ طے ہونے کے بعد کہ جہاز میں کوئی بم نہیں تھا معاملات مزید الجھ گئے تھے۔
اب ایک ایسی تکنیکی خرابی کی تلاش شروع ہوئی، جس نے دو سو سے زائد افراد کی جان لے لی۔
جہاز کے دس لاکھ ٹکڑوں کو پھر سے جوڑنا آسان نہیں تھا۔ اور این ٹی ایس بی کو یہ صبر طلب کام سر انجام دینا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ پہلی دراڑ کہاں پڑی تھی، تین ماہ صرف کر کے جہاز کا ڈھانچا کھڑا کیا گیا۔
ڈھانچے کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد انکشاف ہوا کہ اس مہلک سانحے کا آغاز طیارے کے نچلے حصے سے ہوا تھا۔
جم نے ابتدائی رپورٹ کالاسٹروم کو روانہ کر دی، جس کے مطابق دورانِ پرواز جہاز کے نچلے حصے میں ایک دھماکا ہوا تھا، جس سے ایک دراڑ نے جنم لیا، جس نے اگلے چند سیکنڈز میں دائرے کی شکل میں حرکت کی اور یوں جہاز کا اگلا حصہ پچھلے حصے سے یکسر الگ ہو گیا۔
رپورٹ میں اس بات کی بھی نشان دہی کی گئی کہ دھماکے کے فوراً بعد جہاز اوپر کی سمت اٹھا تھا، جس کے بعد وہ دو حصوں میں تقسیم ہوا۔
رپورٹ فوراً میڈیا تک پہنچ گئی۔
”رپورٹ کے مندرجات اُن عینی شاہدین کے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں، جنھوں نے آگ کے گولے کو دو حصوں میں تقسیم ہوتے دیکھا تھا۔“ وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے کہا۔ ”اور غالب امکان ہے کہ جب شعلے میں لپٹا جہاز اوپر کی سمت اٹھا، تو دیکھنے والے اسے میزائل سمجھ بیٹھے۔“
دھماکے کے مقام کا تعین ہونے کے بعد این ٹی ایس بی کی ٹیم اس کا سبب جاننے میں جٹ گئی۔ ان کی نظریں فیول ٹینک پر جا کر ٹھہریں، جس میں پڑنے والے ”ڈینٹ“ واضح طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔
فیول ٹینک مجموعی طور پر چھ ٹنکیوں پر مشتمل تھا۔ مرکزی ٹنکی کے معائنے کے بعد یہ خیال ابھرنے لگا کہ تباہی کا آغاز اسی مقام سے ہوا تھا۔
رپورٹ کے مطابق جان ایف کینیڈی ائرپورٹ سے روانگی سے قبل ٹینک میں فیول ضرور ڈالا گیا تھا، مگر وہ پوری طرح بھرا نہیں تھا۔ مرکزی ٹنکی تو خالی تھی۔
جہازوں میں بھرا جانے والا فیول خاص نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ مائع حالت میں آگ نہیں پکڑتا۔ ہاں اگر گرم ہونے پر گیس کی شکل اختیار کر لے تو دھماکے کا باعث بن سکتا ہے۔
جم وائلڈلی کا خیال تھا کہ کسی وجہ سے جہاز کا فیول ٹینک انتہائی گرم ہو گیا، اور فیول دھیرے دھیرے گیس میں تبدیل ہونے لگا۔
مگر فیول ٹینک کے گرم ہونے کا سبب کیا تھا؟
تحقیقاتی ٹیم کا پہلا شک ائرکنڈیشنر سسٹم کی جانب گیا۔ سانحے والے روز جہاز لگ بھگ ایک گھنٹے رن وے پر کھڑا رہا تھا اور اِس پورے عرصے میں اُس کا ائرکنڈیشنر چالو رہا۔ ائرکنڈیشنر کے پائپ فیول ٹینک کے عین نیچے سے گزرتے تھے۔ یہ امکان موجود تھا کہ ان کی حدت نے فیول ٹینک کے درجہ حرارت کو بڑھا دیا ہو۔
اِس مفروضے کو عملی تجربے ہی سے ثابت کیا جا سکتا تھا، جس میں بے پناہ خطرہ تھا، مگر جم کی ٹیم اِس خطرے سے گزرنے کے لیے تیار تھی۔
انھوں نے ٹھیک ویسے ہی جہاز لیا۔ اس کے ٹینک میں اتنا ہی فیول بھرا، جتنا ٹی ڈبلیو اے کے ٹینک میں بھرا گیا تھا۔ ٹینک میں آلات نصب کر دیے۔ اس مرحلے کی تکمیل کے بعد ائرکنڈیشنر چالو کیا گیا۔ اگلے ایک گھنٹے تک جہاز رن وے پر کھڑا رہا، جس کے بعد اس نے اُڑان بھری۔
ٹیک آف کے ٹھیک گیارہ منٹ بعد آلات نے خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ فیول ٹینک کا درجہ حرارت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔
جہاز کو فوراً نیچے اتار لیا گیا۔
اس تجربے کی کامیابی سے فیول ٹینک کے گرم ہو کر دھماکے سے پھٹنے کے مفروضے کو تقویت ملی۔ اب اسی تجربے کو نسبتاً محفوظ طریقے سے زمین پر آزمایا گیا۔ کئی گھنٹے تک ائرکنڈیشنر چالو رکھا گیا، جس سے فیول ٹینک نے ایک بم کی شکل اختیار کر لی۔
متوقع نتائج کے حصول کے بعد جم رپورٹ لے کر کالاسٹروم کے دفتر پہنچ گیا۔
”فیول ٹینک کے پھٹنے کا قوی امکان موجود ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ماضی میں فیول ٹینک میں دھماکے کے سات واقعات پیش آ چکے ہیں مگر...“
”مگر... مگر کیا؟“ کالاسٹروم اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
جم کے لہجے میں تذبذب تھا۔ ”اس دھماکے کا سبب فقط فیول ٹینک کا درجہ حرارت نہیں ہو سکتا۔ بے شک ائرکنڈیشنر کی حدت ٹینک کو گرم کر سکتی ہے، مگر اس مقام تک پہنچنے کے لیے جہاں وہ دھماکے سے پھٹ پڑے، کئی گھنٹے درکار ہیں، جب کہ فلائٹ 800 اُڑان کے فقط بارہ منٹ بعد موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔“
”تو کیا تمہارے پاس بھی کوئی تھیوری ہے؟“ کالاسٹروم نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
جم نے اس کا طنز نظر انداز کر دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔
”میرے خیال میں یہ فقط فیول ٹیم کے گرم ہونے کا معاملہ نہیں۔“ بالآخر اس نے کہا۔ ”ہمیں شارٹ سرکٹ کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے مزید تحقیق کرنا ہوگی۔“
”جم وائلڈلی۔“ کالاسٹروم نے سگار سلگایا۔ ”ہم ان تجربات پر کروڑوں ڈالرز صرف کر چکے ہیں اور آپ مزید تجربات کی بات کر رہے ہیں؟ آپ جانتے ہیں ناں کہ مجھ پر دباؤ بڑھ رہا ہے، اپوزیشن پارٹی یہ مسئلہ سینیٹ میں اٹھا چکی ہے۔“
”مجھے اندازہ ہے سر۔ بس مجھے تھوڑا وقت اور دیجیے۔“
”جیسے تمہاری مرضی۔“ کالاسٹروم نے کاندھے اچکائے۔ ”مگر مجھے نتیجہ چاہیے۔“

☆☆☆

وائرنگ کے ابتدائی جائزے نے جم وائلڈلی کے اندیشے دُرست ثابت کر دیے۔
اس کی ٹیم نے فیول ٹینک سے گزرنے والا ایک ننگا تار کھوج نکالا، جو شعلہ پیدا کر سکتا تھا۔ مگر ایک مسئلہ تھا... ”اسپارک“ کے خطرے کے پیشِ نظر تمام جہازوں کے فیول ٹینک میں نصب تاروں سے انتہائی کم وولٹیج کا بے ضرر کرنٹ گزرا جاتا ہے۔
جم کو اس بات کا اندازہ تھا، سو فیول ٹینک کے بیرونی حصے کی جانچ شروع ہوئی، جہاں سے ہائی وولٹیج تار گزرتے تھے... اور وہ تار ایک ہیبت ناک کہانی سناتے تھے۔
بیرونی حصے میں کئی ننگے تار تھے، جو انتہائی ناقص طریقے سے جوڑے گئے تھے۔ چند بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ الغرض وہ شعلہ پیدا کرنے کی پوری قوت رکھتے تھے۔
”ہمارا اندازہ ہے کہ بیرونی حصے میں پیدا ہونے والا ”اسپارک“ کسی تار کے ذریعے اندرونی حصے میں پہنچ گیا، جس کی وجہ سے فیول ٹینک میں جو گیس سے بھر چکا تھا،

امریکا، انسانی حقوق کے لبادے میں چھپا دہشت گرد

پوری دنیا کو انسانیت کا سبق پڑھانے والے امریکا کے اپنے کردار پر نظر ڈالی جائے تو تضادات کی ایسی کہانیاں سامنے آتی ہیں، جو خود کو امن کا علم بردار قرار دینے والی اس ریاست کے چہرے سے نقاب نوچ دیتی ہیں۔ دُور کیوں جائیں، افغانستان اور عراق میں بربریت کا جو کھیل کھیلا گیا، وہ سب کے سامنے ہے۔ برسوں قبل ایران ائر کی فلائٹ 655 بھی امریکا کی اسی جنونیت کا نشانہ بنی تھی۔ یہ سانحہ 3 جولائی 1988 کو پیش آیا، جو پوری دنیا کو سوگوار کر گیا۔ تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ اس روز 274 مسافروں سے بھرے ایران ائر کے طیارے نے بندر عباس سے 10 بج کر 17 منٹ پر دبئی کے لیے اُڑان بھری۔ فلائٹ مقررہ وقت سے 28 منٹ لیٹ تھی مگر یہ کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔ سفر خاصا مختصر تھا اور عملہ چوکس۔ یہ عراق، ایران جنگ کے آخری ایام تھے۔ فضاؤں میں تناؤ کی کیفیت تھی، مگر کسی نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ امریکی بحریہ کسی مسافر جہاز کو بھی نشانہ بنا سکتی ہے۔
فلائٹ معمول کے راستے گزر رہی تھی۔ اس کے کپتان نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی تھی، مگر آبنائے ہرمز میں موجود امریکی بحریہ کے میزائل بردار بحری جہاز یو ایس ایس ونسینس کے عملے کو معصوموں کی جان لینے کے لیے اس دوپہر کسی جواز کی ضرورت نہیں تھی۔ مسافر طیارے کو ایک مہلک میزائل داغ کر مار گرایا گیا۔ اس بربریت نے 290 افراد کی جان لے لی۔ ہلاک ہونے والوں میں 38 غیر ملکی، 66 بچے اور ایک حاملہ خاتون شامل تھیں۔ 6 پاکستانی بھی اس بدقسمت جہاز میں سوار تھے۔
اس واقعے نے پوری دنیا کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ابتدا میں تو امریکا نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا، مگر ثبوت اتنے واضح تھے کہ انکار ممکن نہیں تھا۔ امریکی حکومت نے یہ عذر پیش کیا کہ امریکی بحریہ کا عملہ مسافر جہاز کو غلطی سے ایف 14 ٹام کیٹ لڑاکا طیارہ سمجھ بیٹھا۔ ایرانی حکومت نے اس جواز کو رد کر دیا۔ اُس روز آسمان صاف تھا، جدید آلات سے لیس امریکی بحریہ کے لیے اُسے شناخت کرنا مشکل نہیں تھا، پھر جہاز سمندر کے اُس حصے سے گزر رہا تھا، جو ایران کی حدود میں آتا تھا۔ ایرانی حکومت نے الزام عائد کیا کہ میزائل بردار بحری جہاز نے جان بوجھ کر مسافر طیارے کو نشانہ بنایا۔ واضح رہے کہ اس صبح امریکی بحریہ کا جہاز ایرانی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے ہیلی کاپٹر پر ”وارننگ“ کے لیے ایک فائر بھی کیا گیا تھا۔ شاید اسی کا انتقام لینے کے لیے مسافر بردار طیارہ مار گرایا گیا۔
ایران نے یہ معاملہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں اٹھایا۔ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ بالآخر طویل قانونی جنگ کے بعد 1996 میں تصفیہ ہو گیا۔ امریکا نے 61.8 ملین ڈالرز کی ادائیگی پر رضامندی ظاہر کر دی۔ مگر اہم نقطہ یہ ہے کہ انسانیت کے اس علم بردار نے نہ تو اس کی کبھی ذمے داری قبول کی، نہ ہی کبھی معافی مانگی۔
ایران ائر کی فلائٹ 655 اب بھی تہران سے براستہ بندر عباس دبئی جاتی ہے۔ اور اسی مقام سے گزرتی ہے، جہاں 1988 میں ایک بدترین سانحہ رونما ہوا تھا جس کا شمار فضائی تاریخ کے بدترین حادثوں میں ہوتا ہے۔

موتمر عالم اسلامی

(ورلڈ مسلم کانگرس) مسلمانانِ عالم کی ایک عالمگیر تنظیم۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ 1926ء میں اسلامیانِ عالم کی موتمر (کانگرس) شاہ عبدالعزیز ابن مسعود کی دعوت پر مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی۔ انڈونیشیا سے عمر سوکرومینوتو، ہندوستان سے مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی، مفتی کفایت اللہ، علامہ سید سلیمان ندوی، فلسطین سے مفتی اعظم سید محمد امین الحسینی، لبنان سے علامہ رشید رضا، الحاج شیخ اسماعیل الحافظ، مصر سے شیخ ازہر محمد الظواہری، ترکی سے جناب ثروت بے جیسے اہم قائدین نے شرکت کی اور اسلامیانِ عالم کے مسائل پر غور و خوض کیا۔

دوسری موتمر 1931ء میں مفتی اعظم سید محمد امین الحسینی کی دعوت پر بیت المقدس میں منعقد ہوئی۔ اس موتمر میں عراق سے مشہور مجتہد اکبر آیت اللہ کاشف الخطا۔ ایران سے ضیاء الدین طباطبائی، شام سے شکری القوائلی، لبنان سے ریاض الصلح، مصر سے صوبہ پاشا، جارجیا سے سعید شامل، ترکستان سے ایاز بے الحاقی، ہندوستان سے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داودی اور مولانا غلام رسول مہر جیسے اکابرین نے شرکت کی۔ اس موتمر کے بعد مفتی اعظم کی نگرانی میں موتمر عالم اسلامی کا ایک باقاعدہ سیکریٹریٹ بیت المقدس میں قائم ہوا اور ضیاء الدین طباطبائی سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔

9 تا 11 فروری 1949ء کو تیسری موتمر کراچی میں منعقد ہوئی۔ مدعوین میں علامہ شبیر احمد عثمانی، پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، خواجہ شہاب الدین اور عبداللطیف بادانی کے نام سرفہرست ہیں۔ افتتاح گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس کو مکہ شریف والی پہلی موتمر عالم اسلامی، کے نام پر "موتمر العالم الاسلامی" کے نام سے موسوم کیا جائے۔

دو سال بعد فروری 1951ء میں چوتھی موتمر بھی کراچی ہی میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح شہید ملت لیاقت علی خان نے کیا۔ عالم اسلام کے زعمانے شرکت کی۔ موتمر کے اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کی قیادت میں ایک دستوری کمیٹی تشکیل دی گئی۔ 1962ء میں موتمر کا پانچواں اجلاس بغداد میں منعقد ہوا۔ اس کا دستور اجلاسِ عام میں منظور ہوا۔

اب تک موتمر ایک طاقت ور تحریک کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ منظور شدہ دستور کے مطابق باقاعدہ سیکریٹریٹ قائم کیا گیا۔ عالمی مرکزی دفتر کراچی ہی میں رہا۔ بیروت میں صدارتی دفتر اور مشرق وسطیٰ میں علاقائی دفتر رہا۔ اقوامِ متحدہ سے رابطہ رکھنے کے لیے ایک دفتر رابطہ نیویارک میں بھی قائم کردیا گیا۔

موتمر کا چھٹا اجلاس صومالیہ کے دارالسلطنت موگودیشو میں 24 دسمبر 1964ء سے 2 جنوری 1965ء تک جاری رہا۔ براعظم افریقہ میں یہ پہلا عالمی اجلاس تھا۔ اس موتمر میں پہلی بار یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ افریقہ مسلمانوں کا براعظم ہے۔" کیونکہ افریقہ ہی دنیا کا واحد براعظم ہے جہاں کی 62 فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

موتمر کا ساتواں اجلاس ستمبر 1967ء اس وقت کے حالات کے مطابق بیت المقدس کے قریب ترین شہر عمان میں منعقد ہوا۔ یہ موتمر عربوں پر اسرائیلی جارحیت کے خلاف منعقد ہوئی تھی۔ موتمر عالم اسلامی نے اسلامایانِ عالم کے بنیادی سیاسی ثقافتی، تمدنی، اقتصادی قانونی غرض ہر نوعیت کے مسائل کے ضمن میں خاصی پیش رفت کی ہے۔ موتمر کے موجودہ صدر ڈاکٹر معروف الدوالبی ہیں جو اسلامیات کے فاضل ہیں۔ موتمر کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر انعام اللہ خان ہیں۔ جن کی فعال قیادت میں موتمر کامیابی سے ہمکنار ہے۔ ڈاکٹر صاحب پرانے صحافی اور اعلیٰ پائے کے منتظم ہیں۔ انہوں نے برما میں آل برما مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی تھی اور مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں وہاں تحریک چلائی تھی۔ اپنا روزنامہ "برما مسلم ڈیلی" اس مقصد کے لیے وقف کردیا تھا۔ آل برما مسلم چیمبر آف کامرس بھی ڈاکٹر صاحب نے قائم کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد 1948ء میں کراچی آئے۔ اپنی زندگی اسلامیان عالم کے اتحاد اور بالخصوص موتمر کے لیے وقف کررکھی تھی۔ نومبر 1950ء میں ان کی ذاتی کاوشوں سے موتمر نے کوئی ایک میل لمبا خریطہ کشمیر کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کو پیش کیا تھا جس پر تقریباً دس لاکھ دستخط ثبت تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی توجۂ خلوص محنت اور ثابت قدمی کی وجہ سے موتمر ایک موثر عالمی آواز بن گیا ہے۔

مرسلہ: عابد علی خان، سرگودھا

زوردار دھماکا ہوا۔" جم نے کالاسٹروم سے کہا۔

"گڈ۔" فون کی دوسری طرف موجود ایف بی آئی نیویارک مرکز کے ڈائریکٹر نے کہا۔ "تو اس کا ثبوت تلاش کرو، تاکہ میں سینیٹ میں کروڑوں ڈالرز کی تحقیق کا کوئی جواز پیش کرسکوں۔"

"بے شک جہاز میں شارٹ سرکٹ ہوا تھا۔" کچھ دیر بعد جم اپنی ٹیم سے مخاطب تھا۔ "اور اب ہمیں اس کا ثبوت ڈھونڈنا ہے۔"

ایک بار پھر جہاز کا معائنہ شروع ہوا۔ ہر حصے کی جانچ ہوئی، مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

ناکامی نے جم پر جھنجلاہٹ طاری کردی۔ وہ الجھنے لگا، مگر پھر... اُسے ایک سراغ ملا۔ اور یہ سراغ جہاز کے ایک ایسے حصے سے ملا تھا، جو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کردیا گیا تھا۔

یہ جہاز کا بلیک باکس تھا۔

اس ڈبے میں فقط تیرہ منٹ کی ریکارڈنگ محفوظ تھی، جسے ماہرین متعدد بار سن چکے تھے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اسی میں وہ سراغ چھپا ہوگا جو شارٹ سرکٹ تھیوری پر تصدیق کی مہر ثبت کردے گا۔

اس ریکارڈنگ کو ایک بار پھر سنا گیا۔ اور یہ انکشاف ہوا کہ بہ ظاہر رواں معلوم ہونے والی گفتگو حقیقتاً اتنی بھی رواں نہیں تھی۔

ریکارڈنگ ٹیپ کے ایک خاص حصے میں انتہائی خفیف سے دو وقفے تھے۔ لمحے کے دسویں حصے میں آواز منقطع ہوئی اور پھر لوٹ آئی، جو اس جانب اشارہ تھا کہ بلیک باکس کو ملنے والے کرنٹ میں کہیں، لمحے کے کسی حصے میں خلل آیا تھا۔

جم نے تیزی سے کام کیا۔ اگلے چند روز میں رپورٹ مکمل کرکے ایف بی آئی دفتر پہنچا دی، جسے ہاتھ میں لیے کالاسٹروم میڈیا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

"بے شک ہمیں حقائق تک پہنچنے میں وقت لگا، مگر اہم بات یہ ہے کہ ہم نے سچ تک رسائی حاصل کرلی۔" اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "اور سچ یہ ہے کہ جہاز میں شارٹ سرکٹ ہوا تھا۔ بلیک باکس کی ریکارڈنگ میں آنے والے وقفے اس کا ثبوت ہیں۔ اِس شارٹ سرکٹ کا سبب فیول ٹینک کے بیرونی حصے میں موجود تاریں تھیں، جنہیں جوڑتے ہوئے احتیاطی تدابیر کو نظر انداز کردیا گیا۔ ائر کنڈیشنر کی

حدت کی وجہ سے فیول ٹینک گرم ہوچکا تھا، انتہائی گرم۔ دھماکا خیز گیس جنم لے چکی تھی بس ماچس دکھانے کی دیر تھی۔ اور یہ کام شارٹ سرکٹ نے کیا، جس کے نتیجے میں کرنٹ فیول ٹینک کی اندرونی تاروں میں سرایت کرگیا، جس کے بعد"

اُس نے سامنے بیٹھے صحافیوں پر نظر ڈالی، جن کے چہرے پر بے زاری تھی، جو اس جانب اشارہ تھی کہ وہ ایک پُراسرار کہانی کے اتنے سیدھے سادے انجام پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔

اس کی آواز لرز گئی۔ ذہن میں عینی شاہدین کے بیانات چلنے لگے۔ وہ شواہد گھومنے لگے، جو میزائل تھیوری کو سچ ثابت کرسکتے تھے، مگر ایک حقیقی سرکاری افسر کی طرح جلد ہی اس نے اپنی کیفیات پر قابو پالیا۔ "جس کے بعد ایک زوردار دھماکا ہوا... جہاز اوپر کی سمت اٹھا... دو حصوں میں تقسیم ہوا... اور سمندر میں جاگرا۔"

"اس واقعے میں 230 افراد ہلاک ہوئے مسٹر کالاسٹروم۔ چار ہزار مرتبہ سمندر میں غوطہ لگایا گیا۔ آپ کے خیال میں مرنے والوں کے لواحقین اِس بچکانہ کہانی پر یقین کرلیں گے؟" ایک حکومت مخالف صحافی نے سوال کیا۔

"مجھے امید ہے کہ وہ ایسا کریں گے۔" کالاسٹروم کو اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی۔ "کیونکہ... یہی سچ ہے۔"

☆☆☆

"میں جانتا ہوں کہ میں نے کیا دیکھا۔ بے شک ایک دھماکا۔ مگر وہ کسی اندرونی خامی کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ... اس دھماکے سے قبل بھی میں نے کچھ دیکھا تھا۔ کچھ ایسا جس نے تباہی کے عفریت کو جنم دیا۔"

یہ الفاظ نہ تو کسی ماہی گیر کے تھے، نہ ہی کسی گھریلو خاتون کے۔ یہ الفاظ کسی دکان دار یا طالب علم کی زبان سے ادا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ یہ ایک ایسے فوجی اہلکار کا بیان تھا، جو اُڑان کا وسیع تجربہ رکھتا تھا۔

یہ بیان فریڈرک میئر نے دیا تھا، جو انٹرنیشنل گارڈز میں ہیلی کاپٹر پائلٹ کی حیثیت سے تعینات تھا اور واقعے کے وقت بیس پر موجود تھا۔

اگر ہم فریڈرک کے بیان کو غلط فہمی قرار دے کر رد کر بھی دیں، تب بھی برٹش ائرویز کے اس جہاز سے موصول ہونے والے پیغام کو تو قطعی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جس نے 17 جولائی کو فلائٹ 800 کے چند منٹ بعد جان ایف کینیڈی

ائرپورٹ سے اُڑان بھری تھی۔

جہاز کے کاک پٹ سے جو الفاظ کنٹرول روم کو موصول ہوئے، وہ کچھ یوں تھے ”خدایا کوئی سامنے والے جہاز پر گولیاں برسا رہا ہے!“

یہ تو فقط دو بیانات ہیں، اس طرح کی درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ خصوصاً وہ فیکس تو انتہائی اہم ہے، جو اس سانحے کے ایک برس بعد خبروں کا موضوع بنا۔

یہ فیکس لونگ آئرلینڈ کی مکین مس موما کو موصول ہوا تھا، جو سین ڈیگو کی ایف بی آئی برانچ کی جانب سے لونگ آئرلینڈ کے ایف بی آئی دفتر کو روانہ کیا گیا تھا، مگر تکنیکی غلطی کی وجہ مس موما تک پہنچ گیا۔

فیکس نے مس موما کو چونکا دیا، کیونکہ اس کا موضوع ”ٹی ڈبلیو اے فلائٹ 800“ تھا، مگر اس سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اس میں ایک ڈرون طیارے کا خاکہ بنا ہوا تھا۔

اس فیکس کے مانند عینی شاہد نمبر 649 کے بیان کو بھی قطعی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جو اس رات لانگ آئی لینڈ کے علاقے ویسٹ ہیمپٹن میں واقع اپنے گھر سے چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ ٹھیک 8 بج کر 31 منٹ پر جب وہ ایک اسکول کے پارکنگ لاٹ میں کھڑا تھا، اس نے زمین سے ایک سرخ شے اوپر جاتے دیکھی۔ پھر آسمان پر سفید روشنی شمال مشرقی حصے میں حرکت کرتی نظر آئی۔ اور پھر اس نے دیکھا... سرخ روشنی سفید روشنی سے جا ملی اور آسمان پر ایک دھماکا ہوا۔

اس کیس میں بحریہ کے ریٹائرڈ پائلٹ کمانڈر بل ڈونلڈسن کی رپورٹ سب سے زیادہ زیرِ بحث آئی۔ اس افسر نے لگ بھگ پندرہ ماہ اس کیس پر کام کیا۔ اُس کی مرتب کردہ رپورٹ آج بھی مختلف ویب سائٹس پر موجود ہے، جو میزائل تھیوری کا ایک نئے زاویے سے جائزہ لیتی ہے۔

بل کی رپورٹ کے مطابق اس بدقسمت جہاز پر ایک نہیں، بلکہ دو میزائل داغے گئے تھے، مگر اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کا مقصد جہاز کو براہِ راست نشانہ بنانا نہیں تھا، بلکہ اُس کے بے حد نزدیک پہنچ کر پھٹنا تھا، تاکہ تفتیش کار کسی قسم کا نشان تلاش نہیں کر پائیں۔

رپورٹ کے مطابق یہ میزائل تجرباتی طور پر ایک اینٹی کرافٹ گن سے داغا گیا تھا، ایک ایسے جہاز سے جو لونگ آئرلینڈ سے تین میل دور تھا۔

توقع کے عین مطابق اس رپورٹ کو رد کر دیا گیا۔ اعلیٰ حکومتی افسران نے اسے خاموشی سے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

امریکی حکومت اور ایف بی آئی اپنے تئیں فلائٹ 800 کا معما حل کر چکے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا اکلوتا سبب شارٹ سرکٹ تھا، مگر امریکا میں آج بھی ایسے افراد لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں، جو یقین رکھتے ہیں کہ اس بدقسمت جہاز کے کیس کو ایف بی آئی اور امریکی جھنڈے میں لپیٹ کر سمندر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایف بی آئی نے آخر ایسا کیوں کیا؟

اس کے جواب میں میزائل تھیوری پر یقین رکھنے والے دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی دلیل کے مطابق اگر اس واقعے کو دہشت گردی کی کارروائی تسلیم کر لیا جاتا تو ایف بی آئی کی ناکامی اور غفلت کی قلعی کھل جاتی۔ دوسری دلیل کے مطابق اگر امریکی بحریہ کے اس میں ملوث ہونے پر تصدیق کی مہر ثبت ہو جاتی تو سرحدوں کی حفاظت کرنے والا ادارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا وقار کھو بیٹھتا۔ اِس لیے مناسب یہی سمجھا گیا کہ اسے تکنیکی خامی کا نتیجہ قرار دے دیا جائے۔

واضح رہے کہ فلائٹ 800 کے حوالے سے کئی دستاویزی فلمیں تیار ہوئیں، کتابیں لکھی گئیں، رپورٹس مرتب ہوئیں، مقدمے دائر ہوئے۔ اگست 2000ء میں واشنگٹن پوسٹ میں پورے صفحے کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا، جس کی سرخی تھی: ”ہم نے ٹی ڈبلیو اے فلائٹ 800 کو میزائل سے تباہ ہوتے دیکھا ہے اور اب ہم مزید خاموش نہیں رہیں گے۔“

اشتہار دینے والوں کا کہنا تھا کہ تمام تفتیشی افسران، ایف بی آئی، سی آئی اے اور حکومت نے جھوٹ کی زمین پر، مبالغے کے گارے سے اِس حادثے کا مقبرہ تعمیر کیا ہے۔

اور مقبرہ تو واقعی تعمیر ہوا ہے... آج اس سانحے میں ہلاک ہونے والے 230 مسافروں کا میمورل نیویارک کے اسمتھ پوائنٹ کنٹری پارک میں دو ایکڑ کے رقبے پر قائم ہے۔ اس میمورل کو 2004ء میں مکمل کیا گیا— اِسے تعمیر کرنے کے لیے مرنے والوں کے لواحقین نے فنڈ اکٹھا کیا تھا۔

کیا یہ مقبرہ واقعی جھوٹ کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے؟

شاید اِس سوال کا جواب ہمیشہ ایک راز ہی رہے۔

☆

موت کے سائے

آصف ملک

موت ہم رکاب تھی۔ آہستہ آہستہ قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی، موت کی صورت میں بپھرے ہوئے ہاتھی بڑھتے چلے آرہے تھے۔ اس لیے کہ انہیں انتقام لینا تھا۔ چوروں کا انتقام، دانت کے چوروں کا انتقام۔ ایسے وقت میں وہ بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت اس میں نہ تھی پھر بھی......

موت سے نبرد آزما لمحوں کا تذکرہ، سنسنی خیز کتھا

جنوبی افریقا کا شمال مشرقی حصہ فطری حیات سے مالا مال ہے۔ یہاں بے شمار نیچرل پارک اور ریزرو ہیں جہاں جنگلی حیات کو مکمل تحفظ حاصل ہے۔ ہر سال لاکھوں سیاح ساری دنیا سے یہاں فطری حیات کو ان کے اصل ماحول میں دیکھنے آتے ہیں اور جنوبی افریقا ان سے اربوں ڈالرز کا زرِمبادلہ کماتا ہے۔ ان میں سب سے مشہور گروٹ واٹر نیچر ریزرو ہے۔ اس ریزرو میں بے شمار اقسام کے جانور پائے جاتے ہیں۔ جن میں شیر، چیتے، گینڈے اور ہاتھی جیسے بڑے جانور بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہاں پانی کی بہتات ہے کیونکہ اس علاقے میں کئی ندیاں اور دریا بہتے ہیں۔ جھیلیں ہیں اور بارش بھی زیادہ ہوتی ہے اس لیے پانی بہت ہے اور جہاں پانی ہوتا ہے وہاں جانور بھی ہوتے ہیں۔ جب افریقا کے جنوبی حصے میں خشک سالی ہوتی ہے تو دور دور سے جانور صرف پانی کی خاطر گروٹ واٹر ریزرو تک آتے ہیں۔ یہاں سے کچھ دور ایک بہت بڑا ڈیم بھی بنا ہے۔

میرا نام سام کاشامین ہوور ہے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ یہ کیسا نام ہے۔ میں سفید فام نسل سے ہوں لیکن میرے دادا نے ایک سیاہ فام خاتون سے شادی کی۔ وہ نسل پرستی کے شدید مخالف تھے، نتیجے میں وہ خاندان، کمیونٹی اور حکومت کے زیرِ عتاب آگئے۔ خاندان اور کمیونٹی نے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ وہ جو ہانسبرگ یونیورسٹی میں ملازم تھے۔

انہیں ملازمت سے جواب دے دیا گیا اور انہیں شہر کے سفید فاموں کے۔۔۔ مخصوص علاقوں میں رہائش کی اجازت بھی نہیں ملی اس لیے وہ دادی سمیت سیاہ فاموں کے۔۔۔ مخصوص علاقے میں جا کر رہنے لگے۔ انہوں نے سیاہ فاموں کے۔۔۔ مخصوص کالج میں نوکری کر لی۔ میرے والد نے اسی علاقے میں جنم لیا اور وہیں پلے بڑھے تھے۔ دادا نیشنل کانگریس کے حامی اور کارکن تھے۔ میرے والد نے بھی نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور جب میں صرف تین سال کا تھا وہ ایک مظاہرے کے دوران پولیس کی چلائی گولی کا نشانہ بن گئے۔ میری والدہ اس سے پہلے ہی ان سے الگ ہو چکی تھیں۔ میری پرورش میری دادی اور دادا نے کی۔ خوش قسمتی سے چند سال بعد ہی جنوبی افریقا سے نسل پرستی کا خاتمہ ہو گیا اور نیلسن منڈیلا نے ملک کی تقدیر بدل دی۔ وہ میرا ہیرو تھا اور جب اس نے ماضی کو بھول جانے اور سفید فاموں سے انتقام نہ لینے کا اعلان کیا تو یہ سچ مچ ہمارے لیے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں نے جوہانسبرگ کے ایک کالج سے گریجویشن کر کے نیچر ریزرو گارڈ کی ٹریننگ پروگرام میں شمولیت اختیار کی اور ایک سال بعد مجھے گروٹ واٹر نیچر ریزرو میں تعینات کر دیا گیا۔ یہ علاقہ پریٹوریا سے تقریباً ایک سو بیس میل ٹھیک شمال میں ہے۔ کیونکہ میں دادا اور دادی سے دور نہیں رہ سکتا تھا اس لیے میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلیں اور وہ مان گئے۔ ہم گروٹ واٹر نیچر ریزور کے نزدیک چھوٹے سے شہر موکوپانے میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اتفاق سے یہ میری دادی کا آبائی علاقہ ہے اور یہاں ان کے بے شمار رشتے دار اور جاننے والے ہیں۔ مجھے بہت سارے کزنز مل گئے۔ ان میں سے کئی میرے ساتھ ہی جاب کرتے تھے۔ ان میں سب سے قریبی ساتھی جرمی بھی تھا۔ ان دنوں اس کی ڈیوٹی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد جرمی سے تعلق دوستی میں تبدیل ہوا اور پھر یہ انتہائی گہرا ہوتا چلا گیا۔

گیم آفیسرز کی جاب آسان نہیں ہوتی ہے۔ اس میں کئی طرح کے خطرات ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ تو خود جنگلی جانور ہوتے ہیں کیونکہ انسان ان کے علاقے میں ہوتا ہے۔ شیر چیتے، لکڑ بگھے، گینڈے، ہاتھی.. حتیٰ کہ نیل گائے بھی بعض اوقات خطرناک ہو جاتی ہیں۔ پھر سانپ، اژدہے اور مگرمچھ بھی ہیں۔ ایسے کیڑے مکوڑے ہیں جو کاٹ لیں تو اچھا بھلا آدمی شدید بیمار پڑ جاتا ہے اور مناسب علاج نہ کیا جائے تو موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں سے بھی خطرہ ہوتا ہے جو غیر قانونی شکار کے چکر میں آتے ہیں اور اگر ان کا سامنا گیم آفیسرز سے ہو جائے تو وہ ان پر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔ خاص طور سے ہاتھی دانت کے شکاری بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے پاس خودکار اسلحہ ہوتا ہے۔ وہ کلاشنکوف یا ایم سولہ رائفل سے ہاتھی کو مارتے ہیں اور اگر ہم سے سامنا ہو تو ہم پر بھی انہی ہتھیاروں سے حملہ کرتے ہیں۔ ملازمت کے آغاز میں میں ان خطروں سے اتنا واقف نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ سیکھتا چلا گیا۔

گزشتہ سال جنوری میں میری ملازمت کو پانچ سال پورے ہو گئے۔ اس خوشی میں دادا جان نے مجھے اپنی ایک جیکٹ گفٹ کی۔ یہ جیکٹ دادی نے اس وقت اپنے ہاتھ سے سی تھی جب دادا جان بے روزگار تھے اور شدید سردی میں ان کے پاس پہننے کے لیے گرم کپڑے نہیں تھے۔ تب دادی جان نے بازار سے ٹکڑے لا کر اور ان کے درمیان میں پولیسٹر رکھ کر یہ جیکٹ سی تھی۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ہاتھ سے سلی ہوئی اور تقریباً تیس سال پرانی ہے یعنی میری پیدائش سے بھی پہلے کی۔ دادا جان نے اسے بہت سنبھال کر رکھا تھا اور خاص خاص مواقع پر ہی پہنتے تھے۔ اس لیے جب انہوں نے یہ جیکٹ مجھے گفٹ کی تو مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے اپنی محبت مجھے منتقل کر دی تھی اور میرا فرض تھا کہ میں اسے سنبھال کر رکھتا۔

جنوبی افریقا میں جنوری کا موسم گرمی کا ہوتا ہے۔ یہاں مئی، جون، جولائی اور اگست میں شدید سردی پڑتی ہے۔ اس لیے مجھے کہیں مئی میں جا کر جیکٹ پہننے کا موقع ملا۔ یہ آخر اگست کی ایک سرد صبح تھی جب میں دو دن کی ڈیوٹی پر گھر سے نکلا۔ گیم آفیسرز عام طور سے دو دن ڈیوٹی دیتے تھے اور پھر انہیں دو دن کی چھٹی مل جاتی تھی، اس لیے وہ روز آنے جانے کی زحمت سے بچ جاتے تھے۔ ریزرو میں ہمارا دفتر تھا جہاں تمام سہولیات تھیں۔ وہاں سو بھی سکتے تھے اور کھانے کے لیے ایک چھوٹی سی کینٹین تھی۔ میں جانے لگا تو دادا جان نے یاد دلایا۔ ”آج سردی ہے اس لیے تم جیکٹ پہن لو۔“

سردی اتنی نہیں تھی بلکہ دن خاصا گرم ہو جاتا تھا لیکن دادا جان کے کہنے پر میں نے جیکٹ پہن لی اور ریزرو کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے پاس ایک چھوٹی جیپ تھی۔ جرمی کا گھر راستے میں آتا تھا اور اس کی ڈیوٹی بھی میرے ساتھ

تھی اس لیے میں اسے ساتھ لیتے ہوئے جاتا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے رک کر ہارن دیا تو اس سے پہلے اس کی دو بچیاں دوڑتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ وہ مجھ سے بہت فرینک تھیں اور یقیناً میرا وعدہ یاد دلانے آئی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی جلدی سے کہا۔ ”آج بھول گیا لیکن اگلی بار تم لوگوں کے لیے بلی کا بچہ ضرور لاؤں گا۔“

دادا جان نے ایک سامی نسل کی بلی پالی ہوئی تھی۔ اس نے ایک مہینا پہلے بچے دیے تھے۔ وہ اب تک ماں کا دودھ پی رہے تھے۔ جرمی کی بیٹیوں نے جب سے ان بچوں کو دیکھا تھا تب سے میری جان کو آئی ہوئی تھیں اور مجھے ان سے وعدہ کرنا پڑا تھا کہ جیسے ہی بچوں نے دودھ پینا چھوڑا میں ان سے ایک بچہ انہیں لا کر دوں گا۔ انہوں نے منہ بسورا لیکن پھر اسی طرح دوڑتی ہوئی چلی گئیں۔ ان کو اسکول جانا تھا اور ان کی بس آنے والی تھی۔ جرمی اور اس کی بیوی ماریشا باہر آئے۔ ماریشا نے شکوہ کیا کہ اس نے جو پارٹی دی تھی میں اس میں نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے کسی سے ملوانا چاہتی تھی۔ ماریشا کی کوشش اور خواہش تھی کہ اب میں شادی کر لوں۔ دراصل یہ کوشش اور خواہش دادی اور دادا جان کی تھی مگر میں انہیں ٹال رہا تھا۔ ان کے کہنے پر ماریشا مجھے لڑکیوں سے ملوا رہی تھی۔ میرے ٹال مٹول کی وجہ ریزرو کی ایک گیم آفیسر ایرن تھی۔ ایرن بہت خوب صورت تو نہیں تھی لیکن مجھے وہ دنیا کی ہر لڑکی سے زیادہ خوب صورت لگتی تھی۔ میں پہلی نظر میں اسے پسند کر بیٹھا تھا اور اب یہ پسند دل میں جڑ پکڑ چکی تھی۔ میں اسے راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب مجھے کچھ کچھ امید ہو چلی تھی۔

میں اور جرمی ریزرو کی طرف روانہ ہوئے۔ جرمی نے کہا۔ ”میں نے ماریشا کو بتا دیا ہے کہ تم کس چکر میں ہو۔“

میں نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”ایک تو کوئی بات تمہارے پیٹ میں نہیں ٹکتی ہے۔“

”وہ میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔“ جرمی نے ندامت سے کہا۔ ”وہ تمہارے انکار کی وجہ پوچھ رہی تھی۔“

”اب وہ دادی جان کو بتا دے گی اور وہ مجھ سے پوچھیں گی تو میں کیا بتاؤں گا ابھی تک ایرن کہاں مانی ہے۔“

”مجھے یقین ہے وہ مان جائے گی۔“ جرمی نے یقین سے کہا۔ ”تمہیں مسترد کرنے کی ایک بھی وجہ نہیں ہے۔“

میں محسوس کرتا تھا کہ ایرن کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چلا ہے لیکن خطرہ تو تھا کہ وہ انکار کر دے۔ ممکن ہے اس کا کوئی امیدوار اور بھی ہو یا اس کا ابھی شادی کا ارادہ ہی نہ ہو۔ گیم جاب ایرن کی سب سے بڑی خواہش تھی اور وہ صرف اس ملازمت کی خاطر کیپ ٹاؤن سے یہاں آئی تھی۔ میں اور جرمی دفتر پہنچے تو اتفاق سے ایرن بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ ”ہائے۔“

”ہائے، کیسی ہو تم؟“

”فائن اور تم؟“

ایرن سے بات کر کے میں اپنے دفتر میں آیا۔ ابھی بیٹھا تھا کہ جرمی نے اندر جھانکا۔ ”باس نے طلب کیا ہے۔“

ہمارا سپروائزر سیگل واروک اچھا آدمی تھا لیکن کام کے معاملے سخت تھا اور کوئی کوتاہی برداشت نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے دفتر میں تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ ”شمال والی سمت کوئی مسئلہ ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”ایک رضا کار نے اطلاع دی ہے کہ ہاتھیوں کا ایک جھنڈ گروٹ واٹر کی طرف بڑھ رہا ہے۔“

میں نے حیرت سے سنا۔ ”اس موسم میں؟“

”ہاں اسی سے مجھے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ تم اور جرمی روانہ ہو جاؤ اور مجھے رپورٹ کرو۔“

گروٹ واٹر نیچر ریزرو کا شمالی حصہ وِنڈرکوپ نیچر ریزرو سے ملتا تھا۔ میں نے سیگل سے کہا۔ ”آپ نے وِنڈرکوپ والوں سے پوچھا ہے؟“

”ہاں لیکن ان کے ہاں مسئلہ چل رہا ہے۔ گیم آفیسر اسٹرائک پر ہیں اس لیے ان کو کچھ پتا نہیں ہے۔“

”رضا کار نے کس جگہ سے اطلاع دی ہے؟“ جرمی نے پوچھا۔

سیگل نے علاقے کے نقشے پر انگلی رکھی۔ ”اس جگہ سے اطلاع آئی ہے۔“

یہ وِنڈرکوپ نیچر ریزرو کا مغربی حصہ تھا۔ یہاں جنگل تھے اور بے شمار چھوٹے چھوٹے دیہات تھے۔ ان دیہات میں بعض لوگ رضا کار کے طور پر کام کرتے تھے۔ یہ لوگ خاص طور سے شکاریوں پر نظر رکھنے کا کام کرتے تھے۔ انہیں معمولی معاوضے کے علاوہ رابطے کے لیے آلات بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ اطلاع ایسے ہی ایک رضا کار کی طرف سے آئی تھی۔ یہ بات حیرتناک تھی کیونکہ ہاتھی عام طور سے ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے شروع میں جنوب کی طرف آتے تھے۔ بہت غیر معمولی حالات میں ہاتھی اگست میں جنوب کا

رخ کرتے تھے۔ صرف ہاتھی ہی نہیں بلکہ ریزرو کے اکثر جانور سردیوں میں شمال کی طرف چلے جاتے تھے جہاں موسم ان دنوں معتدل ہوتا تھا اور جب جنوب میں گرمیوں کا آغاز ہوتا تو جانوروں کی واپسی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد میں اور جرمی ایک گاڑی میں نکل رہے تھے۔ یہ دو نشستوں والی طاقتور جیپ تھی جو ناہموار راستوں پر چلنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کی چھت نہیں تھی اور پائپوں کی مدد سے اینگلز بنائے گئے تھے جن پر ضرورت کے وقت کینوس چڑھا کر چھت بنالی جاتی تھی۔

توقع کے عین مطابق سورج بلند ہوتے ہی موسم خوشگوار ہوگیا تھا اور اب سردی نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے جیکٹ گرم لگنے لگی اس لیے اتار کر پیچھے سامان کے لیے مخصوص خانے میں رکھ دی۔ میں اسے دھول مٹی سے بچانا چاہتا تھا۔ جرمی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں نقشہ لیے اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ دوپہر تک ہم ریزرو کے شمالی حصے کے پاس تھے۔ یہ کوئی بیس میل دور تھا۔ اس علاقے کے بارے میں ہمیں بہت کم پتا تھا کیونکہ یہاں آنا جانا کم ہوتا تھا۔ سرما کی بارش سے سیراب گھاس اور پودے بہت تر و تازہ لگ رہے تھے اور درخت ہری پتیوں سے لد گئے تھے مگر اس سبزے کو چرنے والے اور ان چرندوں کو کھانے والے درندے ابھی یہاں نہیں آئے تھے۔ دور گھاس میں کہیں اِکّا دُکّا چھوٹی نسل کے ہرن تھے جو کہیں نہیں جاتے ہیں اور ان کے چکر میں بعض چیتے بھی یہیں قیام کرتے ہیں مگر چیتے بہت کم تھے۔ کیونکہ یہاں درخت بہت گھنے اور پاس پاس تھے۔ چیتے ایسی جگہوں پر رہتے ہیں جہاں درخت اِکّا دُکّا اور کھلا میدان ہوتا کہ انہیں دور سے اپنا شکار یا دشمن دیکھنے میں مشکل نہ پیش آئے۔ میں نے جرمی سے کہا۔ ”یہاں ہاتھیوں کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔“

یہاں دور تک نظر آنے والی تر و تازہ گھاس سیدھی کھڑی تھی اور چھوٹے پودے اور جھاڑیاں بھی اپنے قدموں پر کھڑی تھیں اگر یہاں سے ہاتھیوں کا گزر ہوا ہوتا تو یہ سب کچل اور مسل جاتے۔

”کیا خیال ہے کسی بلند درخت پر چڑھ کر دیکھوں۔“ جرمی نے کہا۔

جرمی اس کام میں ماہر تھا۔ میں نے سر ہلایا تو اس نے اپنے جوتے اتارے اور دوربین لے کر ایک بلند درخت پر چڑھنے لگا۔ میں نے ریڈیو پر دفتر سے رابطہ کیا اور سیگل کے لیے پیغام بھیجا کہ ابھی تک گروٹ واٹر میں ہاتھیوں کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے ہیں۔ سیگل خود ریڈیو پر آگیا اس نے پوچھا۔ ”تم دونوں کہاں ہو؟“

”گروٹ واٹر اور ونڈر کوپ کے نقطۂ اتصال پر۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر یہاں ہاتھیوں کے آثار نہ ملیں تو ونڈر کوپ جانا۔“ سیگل نے حکم دیا۔

”لیکن وہ ہماری حد سے باہر ہے۔“

”میں نے ونڈر کوپ کے سپروائزر سے بات کی ہے اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ سیگل نے کہا۔ ”تم بے فکری سے وہاں جاؤ۔“

اس وقت سیگل کو خیال نہیں آیا تھا اور نہ میرے ذہن میں آیا کہ میرے پاس جو ریڈیو تھا وہ تقریباً تیس میل کے فاصلے تک کارآمد تھا اس سے زیادہ فاصلے پر یہ کام نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ ریڈیو گروٹ واٹر کی حد کو مدِنظر رکھ کر لیا گیا تھا اور ونڈر کوپ کا فاصلہ تیس میل سے خاصا زیادہ تھا۔ بلکہ ونڈر کوپ کا شمالی حصہ تو ہمارے دفتر سے پچاس میل سے بھی زیادہ دور ہو جاتا۔ ونڈر کوپ کا عملہ ہڑتال پر تھا اور اس کا ریڈیو کا انتظام بھی یقیناً بند ہوگا مگر یہ بات اس وقت ذہن میں نہیں آئی تھی۔ سیگل سے بات کر کے میں جیپ سے نیچے آیا اور جرمی کا جائزہ لیا جو زمین سے تقریباً چالیس فٹ کی اونچائی پر ایک شاخ سے ٹکا ہوا دوربین سے شمالی سمت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے چلّا کر پوچھا۔ ”کچھ نظر آیا؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا اور چند منٹ بعد نیچے اتر آیا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں آگے جانا ہوگا۔“

سیگل کا بھی یہی کہنا ہے۔“

”مگر آگے ونڈر کوپ کی حدود شروع ہو جائے گی؟“

”وہاں عملہ ہڑتال پر ہے اس لیے ریزرو میں کوئی نہیں ملے گا ویسے بھی سیگل نے ونڈر کوپ کے سپروائزر سے بات کرلی ہے۔ اسے ہماری آمد پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”کیا خیال ہے آگے جانے سے پہلے لنچ نہ کر لیا جائے۔“ جرمی نے ہاٹ پاٹ کی طرف دیکھا۔ ”دیر کی تو سینڈوچز ٹھنڈے ہو جائیں گے۔“

میں نے جرمی سے اتفاق کیا۔ ہم نے وہیں لنچ کیا اور پھر کافی پی کر آگے روانہ ہوئے۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ دھوپ میں تیزی آگئی تھی۔ ہم ونڈر کوپ نیچر ریزرو میں داخل ہوئے۔ یہ گروٹ واٹر کی نسبت کہیں گھنے جنگل والا

نیچرل پارک ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ پھر ہم یہاں کے راستوں سے واقف بھی نہیں تھے۔ اس لیے بھٹک کر ایک نالے میں جا نکلے۔ بارش کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے نالا خشک تھا۔ جرمی نے کہا۔ ”کیا خیال ہے نالے میں سفر کرتے ہیں۔ یہ بھی شمال سے آرہا ہے۔“

”کہیں آگے کوئی رکاوٹ نہ آجائے؟“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اگر آئی تو واپس آجائیں گے۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”یہ جنگل میں بھٹکنے سے بہتر ہی ہوگا۔“

جنگل میں کئی جگہوں پر راستہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں جیپ واپس لانی پڑی تھی۔ ایک دو راستے دکھائی دیے تو وہ شمال کے بجائے دیگر سمتوں میں جا رہے تھے۔ شمال کی طرف جانے والا راستہ تلاش کرنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ اس طرف جنگل گھنا اور دشوار تھا میرا تجربہ تھا کہ ہاتھی بھی ایسی جگہوں کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ ان کے بڑے جثے کی وجہ سے انہیں گھنے جنگل میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس کے بجائے ہاتھی کم گھنے جنگل اور کھلی جگہوں پر جانا پسند کرتے ہیں۔ جرمی کے اصرار پر میں مان گیا اور اس نے جیپ نالے میں اتار دی۔ نالا بہت گہرا نہیں تھا زمین سے دس بارہ فٹ گہرا تھا لیکن اندر سے صاف ستھرا تھا۔ جیپ اس پر یوں آسانی سے دوڑنے لگی جیسے کسی پختہ سڑک پر سفر کر رہی ہو۔ کہیں کہیں پتھروں کے ڈھیر آتے تھے۔ جیپ کسی نہ کسی طرح ان پر سے گزر رہی تھی۔ ایک جگہ یہ ڈھیر کچھ زیادہ تھا اور ہمیں اتر کر پتھر ہٹا کر راستہ بنانا پڑا تھا۔

دو بجے ہم اندازے سے ونڈر کوپ نیچر ریزرو کے شمالی حصے میں تھے۔ یہاں نالے کے دونوں طرف خاصا گھنا جنگل تھا۔ درخت اونچے اور پھیلے ہوئے تھے اس لیے دھوپ کی رسائی بہت کم تھی اور یہاں عملاً نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایک مناسب جگہ سے جرمی نے جیپ نالے سے باہر نکالی۔ کیونکہ ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گئے تھے اس لیے میں نے جرمی سے کہا۔ ”اب ہمیں پیدل سفر کرنا ہے۔“

اس نے اتفاق کیا۔ ہم نے اپنا سامان اور ہتھیار اٹھائے۔ ہمارے پاس شاٹ گن تھیں۔ ان سے ہم تین طرح کے کارتوس فائر کر سکتے تھے۔ ایک صرف دھماکا کرتے تھے اور ان سے کوئی گولی یا چھرا نہیں نکلتا تھا۔ یہ جانوروں کو ڈرانے کے لیے تھے۔ دوسرے چھرّے والے کارتوس تھے اور تیسرے بلٹ والے کارتوس تھے ان کا استعمال صرف اسی وقت کیا جاتا جب ہماری جان کو کسی بڑے جانور سے خطرہ لاحق ہو جاتا۔ چھرّے والے بھی جان لیوا نہیں تھے۔ ان سے جانور کو زخمی کر کے پسپا ہونے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ریڈیو پر دفتر اطلاع کر دوں مگر جب کوشش کی تو پتا چلا کہ ہم حد سے باہر تھے۔ میں فکر مند ہو گیا۔ ”اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہم دفتر سے رابطہ کیسے کریں گے؟“

”سینٹرل کمانڈ کو پیغام دے سکتے ہیں۔“ جرمی نے کہا۔ ہمارے ریڈیو سیٹس کی فریکوئنسی آرمی کی سینٹرل کمانڈ سے منسلک تھی اگر ہم اپنے مواصلاتی نظام کی حد سے باہر نکل جاتے تو اس کی مدد سے پیغام دے کر مدد طلب کر سکتے تھے۔ سینٹرل کمانڈ سسٹم ہمارا پیغام وصول کر کے آگے روانہ کر سکتا تھا البتہ وہ ہم سے رابطہ نہیں کر سکتا کیونکہ سسٹم میں اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں اور جرمی اوپر آئے۔ یہاں خاموشی تھی۔ دن میں عام طور سے جنگل خاموش ہوتا ہے کیونکہ اکثر جانور رات کو اپنے ٹھکانوں سے نکلتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں یہ خاموشی مجھے ضرورت سے زیادہ ہی لگی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے اور ہمیں اس کا سراغ لگانا تھا۔

ان دنوں زمبابوے اور بوٹسوانا کی طرف سے ہاتھی اور گینڈوں کا غیر قانونی شکار کرنے والے جنوبی افریقا کی حد میں گھس آتے تھے۔ ان غیر قانونی شکاریوں نے گزشتہ سال کم سے کم سو ہاتھی اور دو درجن گینڈے مار دیے تھے۔ یہی نہیں بلکہ شکار کے دوران مداخلت پر انہوں نے چار گیم آفیسرز کو ہلاک اور دو کو زخمی بھی کیا تھا۔ وہ جدید ترین اسلحے اور تیز رفتار گاڑیوں سے لیس ہوتے تھے۔ وہ شکار کرتے اور ایک گھنٹے کے اندر سرحد پار جا چکے ہوتے تھے۔ ہماری حکومت کے پاس اتنا عملہ نہیں تھا جو سرحدوں کی پوری طرح نگرانی کرتا۔ اس میں جگہ جگہ رخنے تھے اور غیر قانونی شکاری ایسے تمام رخنوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس طرح سرحد پار شکار کرنے کا انہیں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ہم ان کے ملکوں سے ان کی گرفتاری اور حوالگی کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جانوروں کا غیر قانونی شکار بہرحال سنگین جرائم میں نہیں آتا تھا۔ میں اور جرمی سست روی سے جنگل کا معائنہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک جرمی رک گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے ہاتھیوں کی بو آرہی ہے۔“

مگر وہاں ہاتھی نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے ان کا گوبر پڑا ہو۔“

"نہیں بو بہت زیادہ ہے۔" جرمی بولا، اس کے سونگھنے کی حس خاصی تیز تھی۔ "مجھے لگ رہا ہے پاس کہیں ہاتھی ہیں۔"

"اگر پاس کہیں ہاتھی ہوتے تو اتنی خاموشی نہ ہوتی اور نہ یہاں یہ چھوٹے پودے اور گھاس صحیح سلامت نظر آ رہی ہوتی۔"

"ممکن ہے ہاتھی کہیں آ گے ہوں۔" جرمی نے کہا اور زمین سے کچھ مٹی اٹھا کر ہاتھ ہوا میں بلند کر کے اسے تھوڑا تھوڑا گرانے لگا۔ "ہوا بھی اسی رخ سے چل رہی ہے۔"

اگر جرمی کا خدشہ درست تھا تو ہمیں محتاط ہو جانا چاہیے تھا۔ ہم نے اپنی شاٹ گن سنبھال لیں۔ جانوروں کو بھگانے کے لیے ہمارے پاس ایک اور چیز تھی۔ یہ گیس پریشر والا سائرن تھا۔ چھوٹا سا باڈی اسپرے کی شکل والا سائرن اتنی اونچی آواز میں بجتا تھا جو کسی بھی جانور کو خوفزدہ اور بدحواس کرنے کے لیے کافی ہوتا۔ اب ہم دبے قدموں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہوا اسی رخ سے آ رہی تھی اس لیے اس کا امکان تو نہیں تھا کہ ہماری بو ہاتھیوں تک جائے گی لیکن ان کے سننے کی حس بھی بہت تیز ہوتی ہے اور ذرا سی آہٹ ہاتھیوں کو ہماری آمد کی اطلاع دے سکتی تھی۔ یہاں درخت بڑے اور گھنے مگر کسی قدر فاصلے پر تھے اور ان کے درمیان سے ہاتھیوں کی آمد و رفت ممکن تھی لیکن زمین پر ان کے قدموں کے نشانات نہیں تھے۔ اگر ہاتھی اتنے دن پہلے آئے تھے کہ ان کے پیروں کے نشانات مٹ گئے تھے تب ان کی بو کا جواز نہیں بنتا تھا۔ ایک چھوٹا سا میدان جو اونچی گھاس سے ڈھکا ہوا تھا اسے عبور کر کے ہم جنگل کے اگلے حصے میں داخل ہوئے۔ ہم اس جگہ سے کوئی نصف کلومیٹر آگے نکل آئے تھے جہاں ہم نے اپنی جیپ چھوڑی تھی۔ جرمی نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"بو بہت تیز ہو گئی ہے ہاتھی یقیناً آس پاس ہیں۔"

بدقسمتی سے میری سونگھنے کی حس نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے مجھے ہاتھیوں کی بو نہیں آئی تھی۔ مگر مجھے جرمی پر بھروسا تھا۔ کھلی جگہ کچھ دیر رہنے کے بعد ہم دوبارہ تاریک جنگل میں داخل ہوئے تھے، کچھ دیر کے لیے نظر بیکار ہو گئی تھی۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک کہیں ٹہنی چٹخنے کی آواز آئی۔ میں اور جرمی رک گئے تھے۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ ٹہنی کسی وزنی چیز تلے آ کر ٹوٹی ہے۔ اتنی دیر میں میری نظر دوبارہ کام کرنے لگی تھی اور میں نے سامنے دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ درختوں کے درمیان کم سے کم تین ہاتھی ساکت کھڑے تھے۔ وہ اتنے ساکت تھے کہ ان پر مجسموں کا گمان ہو رہا تھا اور وہ اپنے بڑے کان بھی نہیں ہلا رہے تھے جو عام طور سے سوتے میں بھی حرکت میں رہتے ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان مشکل سے بیس گز کا فاصلہ تھا۔ اگر کچھ دیر کے لیے ہماری آنکھیں کام کرنا نہ چھوڑتیں تو ہم انہیں خاصا پہلے دیکھ چکے ہوتے مگر اب ہم ان کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے۔ جرمی نے بھی ہاتھی دیکھ لیے تھے اور یقیناً اس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ ہاتھی اتنی خاموشی سے اور اتنے پُراسرار سے انداز میں کیوں کھڑے ہیں۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی مگر فی الحال تو ہمیں ہاتھیوں سے دور جانا تھا پھر ان کے رویے کی وجہ بھی معلوم کی جا سکتی تھی۔ میں نے ہاتھ کی انگلیوں سے جرمی کو اشارہ کیا اور وہ سمجھ گیا کیونکہ اس نے آہستہ سے سر ہلایا تھا۔ ہم بہت احتیاط سے پیچھے ہٹنے لگے۔ یہ تو طے تھا کہ ابھی تک ہاتھیوں کو نہ ہماری بو آئی تھی اور نہ کوئی آہٹ ان کے کانوں تک پہنچی تھی ورنہ وہ اتنے خاموش نہ رہتے بلکہ کوئی نہ کوئی ردِعمل سامنے آتا۔ ہاتھی کی نظر بہت کمزور ہوتی ہے اور وہ سو فٹ کے فاصلے سے انسان اور درخت کے تنے میں فرق محسوس نہیں کر سکتا ہے پھر یہاں تاریکی بھی تھی اس لیے ہاتھی ہمیں نہیں دیکھ سکے تھے۔

ہم بہت آہستگی سے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ کیونکہ جلدی نہیں تھی بس فکر اس بات کی تھی کہ کہیں ہاتھی ہماری موجودگی سے واقف نہ ہو جائیں۔ اس لیے ہم بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ یہاں جا بہ جا لکڑیاں پڑی تھیں۔ اگر ہمارا پاؤں کسی خشک ٹہنی پر آتا اور وہ آواز سے ٹوٹتی تو ہاتھی جان جاتے۔ ہم الٹے چلتے ہوئے درختوں کے آخری حصے میں پہنچ گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے میں جلد بازی کر گیا۔ میں نے پاؤں دیکھ کر رکھا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ گھاس تلے کوئی شاخ پڑی ہے جیسے ہی میرے پاؤں کا زور آیا وہ بلند آواز کے ساتھ چٹخی۔ ابھی یہ آواز معدوم نہیں ہوئی تھی کہ جیسے زلزلہ آ گیا۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑیں بلند ہوئی تھیں اور یہ آوازیں غصے سے لبریز تھیں۔ میں نے جرمی کی طرف دیکھا میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا مگر اس نے دیکھا ہی نہیں اور چیخا۔ "سام بھاگو..... یہ غصے میں ہیں۔"

رہی سہی کسر اس کی آواز سے پوری ہو گئی۔ زمین لرزنے لگی۔ ہاتھی ہماری طرف آ رہے تھے اور وہ ہم سے پچاس گز کے فاصلے پر بھی نہیں تھے۔ میں اور جرمی پلٹ کر بھاگے مگر جب ہم گھاس کے وسط میں پہنچے تو جرمی کا پاؤں کسی پوشیدہ گڑھے میں گیا اور وہ چیخ مار کر گرا۔ میں اس سے آگے تھا اس کی چیخ سن کر پلٹ آیا۔ "کیا..... ہوا؟"

"میرا ٹخنا....." جرمی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "شاید یہ ٹوٹ گیا ہے۔"

میں نے دیکھا تو میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی کیونکہ ٹخنا واضح طور پر ٹوٹ گیا تھا۔ ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور پاؤں کھال اور نسوں کے سہارے لٹک رہا تھا۔ جرمی کے چہرے پر تکلیف اور خوف کے آثار تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اب وہ چل نہیں سکتا تھا اور ہاتھی موت کے ہرکاروں کی طرح پیچھے لپک رہے تھے۔ اسی لمحے چنگھاڑتے ہاتھی درختوں سے برآمد ہونے لگے۔ انہیں دیکھتے ہی میرے جسم میں جیسے بجلی کوند گئی تھی۔ میں نے اپنی اور جرمی کی رائفلیں شانوں سے لٹکائیں اور پھر جھک کر جرمی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے کہا۔ "سام مجھے چھوڑ دو..... اپنی جان بچاؤ۔"

"خاموش..... خاموش رہو۔" میں نے کہا اور اسے لے کر آگے بڑھنے لگا۔ جرمی ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا مگر اس کا ٹوٹا پاؤں جب زمین سے لگتا تو ضبط کے باوجود اس کی کراہ نکل جاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہم جتنا خاموش رہیں گے اتنا ہی محفوظ رہیں گے کیونکہ ایک بار درختوں میں داخل ہو جاتے تو ہاتھیوں کی نظروں سے بچ جاتے۔

شدید تکلیف کے باوجود جرمی میرا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کسی صورت اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا اور اب یہ اس کے ساتھ میری زندگی کا بھی سوال تھا۔ ہاتھی ہم تک پہنچ جاتے تو بچنے کا امکان بہت کم رہ جاتا۔ میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا تھا اور مجھے ہاتھیوں کی تعداد کہیں زیادہ لگی تھی۔ اس کا مطلب وہاں اتنے ہاتھی نہیں تھے جتنے ہمیں دکھائی دے رہے تھے بلکہ اس سے کہیں زیادہ تھے۔ اتنے ہاتھی اس گھنے جنگل میں خاموشی سے کیا کر رہے تھے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر اس وقت اس کا موقع بھی نہیں تھا۔ ابھی تو جان کے لالے پڑے تھے یہ کہاں سے سوچتے کہ ہاتھی وہاں کیوں آئے تھے اور کیا کر رہے تھے؟

جرمی کا وزن تقریباً ایک سو چالیس پونڈ تھا۔ یہ زیادہ نہیں تھا مگر دو عدد شاٹ گنوں کے ساتھ اسے سنبھالنا مشکل کام تھا اور پھر پوری رفتار سے دوڑنا بھی پڑ رہا تھا۔ کھلی جگہ ہاتھیوں کی رفتار بہت بڑھ جاتی ہے اور یہ تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی دوڑ سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی اس کھلی جگہ ہاتھی ہمارے قریب آتے جا رہے تھے۔ جرمی کے پاؤں کی وجہ سے ہماری رفتار آدھی بھی نہیں تھی۔ میری کوشش اور خواہش تھی کہ کسی طرح ہم درختوں میں داخل ہو جائیں اس طرح ہاتھیوں کی رفتار ٹوٹ جاتی اور ہم اسی رفتار سے آگے بڑھتے رہتے تو بالآخر جیپ تک پہنچ جاتے یا کم سے کم اس کا امکان ہوتا۔ مگر جب میں نظر اٹھا کر درختوں کی طرف دیکھتا تو وہ مجھے بہت دور دکھائی دیتے۔ اس وقت مجھے امید نہیں تھی کہ ہم درختوں تک پہنچ سکیں گے اور میرا خیال تھا کہ اس سے پہلے ہاتھی ہمیں آلیں گے۔ بدقسمتی سے شاٹ گنیں خالی تھیں۔ ہم عام حالات میں انہیں ان لوڈ رکھتے تھے۔ اگر میں رک کر شاٹ گن لوڈ کرنے کی کوشش کرتا تو اتنی دیر میں ہاتھی ہم تک پہنچ جاتے۔ اس کا امکان تھا کہ وہ فائر کا دھماکا سن کر فرار ہو جاتے لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ وہ ہم پر حملہ کر دیتے اور اس صورت میں ہمارے بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔ اس لیے میں نے شاٹ گن لوڈ کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے بھاگتے رہنے کا فیصلہ کیا۔

بالآخر ہم جنگل میں داخل ہو گئے اور میں آج بھی نہیں سمجھ سکا کہ ہم اس دن کس طرح ہاتھیوں سے بچ کر جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ جرمی کی جو حالت تھی اس میں تو مجھے یہ معجزہ ہی لگ رہا تھا۔ اس کا حوصلہ اور صبر قابلِ داد تھا کہ اس نے ایک بار بھی منہ سے ایسی آواز نہیں نکالی جسے ہاتھی سن لیتے اور شاید اسی وجہ سے ہم بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ ہاتھی ہمارے پیچھے ضرور تھے لیکن وہ سیدھے نہیں آئے تھے ورنہ وہ ہم تک پہنچ جاتے۔ بہرحال اب بھی وہ ہمارے تعاقب میں تھے۔ درختوں میں داخل ہوتے ہی جرمی نے کراہ کر کہا۔ "اب تکلیف برداشت نہیں ہو رہی۔"

"حوصلہ کرو..... ہم درختوں میں آ گئے ہیں۔ بس کچھ دور اور جانا ہے۔"

مگر یہ کچھ دور نہیں تھا ہمیں تقریباً نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ ہم کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ہاتھی درختوں میں داخل ہو گئے۔ وہ راہ میں آنے والی شاخوں سے ٹکرا رہے تھے۔ پودوں اور جھاڑیوں کو کچل رہے تھے۔ جو ذرا کمزور درخت تھے ان کو اکھاڑ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے جیسے طوفان آیا تھا۔ ممکن ہے اگر ہم کمزور دل یا عام لوگ ہوتے تو صرف ان آوازوں اور دل ہلانے

والی دھمک کو سن کر ہی ہمت ہار جاتے۔ مگر گیم آفیسر کی حیثیت سے ہمیں جانوروں کا سامنا کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ ممکن ہے اگر ہم غیر متوقع طور پر ہاتھیوں کے اتنے قریب نہ جا نکلتے اور پھر جرمی کا پاؤں نہ ٹوٹتا تو ہم اس معاملے کو ہینڈل کر لیتے۔ مگر اس حادثے نے حالات کو یک دم سنگین بنا دیا تھا۔

اس وقت ہم جان بچانے کے لیے بھاگتے رہنے پر مجبور تھے۔ درختوں میں آنے کے بعد بھی ہاتھیوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کو روندتے ہوئے ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میرا ہاتھیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ ہاتھی عام حالات میں ایک شریف اور ذرا سی دھمکی سے پسپائی اختیار کرنے والا جانور ہے۔ ایک فائر اس چھ سات ٹن وزنی جانور کو رخ پھیر کر بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہاتھی غصے میں آجاتا ہے۔ خاص طور سے جب یہ کھائی رہا ہو اور کوئی اس کے علاقے میں آنے یا ہاتھیوں کے غول میں کوئی حاملہ مادہ ہو اور اس دوران میں کوئی دوسرا جانور یا انسان ان کے نزدیک جائے تو ہاتھی کو غصہ آجاتا ہے مگر یہ غصہ بھی اس وقت اتر جاتا ہے جب مداخلت کرنے والا پسپائی اختیار کرتا ہے۔ ہاتھی کا غصہ عام طور سے دکھاوے کا ہوتا ہے۔ اگر اس سے کام نکل جائے تو وہ بچ بچ حملہ کرنے سے گریز ہی کرتا ہے۔

مگر اس وقت ہاتھی جس طرح باجماعت ہمارا پیچھا کر رہے تھے یہ غیر معمولی صورتِ حال تھی، کم سے کم اپنی ملازمت کے دوران میں نے کبھی ہاتھیوں کو یوں حملہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جس طرح چنگھاڑ رہے تھے اور راہ میں آنے والے درختوں اور جھاڑیوں کو کچل اور جڑ سے اکھاڑ رہے تھے، اس سے لگ رہا تھا وہ بہت زیادہ اشتعال میں تھے مگر ان کے غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مسلسل حرکت میں رہنے سے جرمی کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کا ٹوٹ جانے والا ٹخنا شدید اذیت کا باعث بن رہا تھا۔ اس نے گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھ ..... سے اور ..... نہیں چلا جا رہا۔''

''ہمت کرو دوست۔'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جھوٹ بولا۔ ''بس کچھ دور رہ گیا۔''

''نہیں میں وہاں نہیں پہنچ سکوں گا تم جاؤ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔''

اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں رک کر ہاتھیوں کو دھمکا کر فرار پر مجبور کرنے کی کوشش کروں۔ مگر اس میں خطرہ تھا کہ ہاتھی نہ رکتے تو جرمی لازمی مارا جاتا۔ میں فرار کی کوشش کر سکتا تھا۔ میں ٹھیک تھا اور اسلحہ بھی تھا۔ مگر جرمی کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ وہ میرا بہترین دوست ہی نہیں وادی کی طرف سے میرا کزن بھی تھا۔ مگر ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کی حالت ہر گزرتے لمحے خراب ہو رہی تھی اور چلنے کے دوران اس کا ٹوٹا پاؤں زمین سے رگڑ کھاتا تو وہ تکلیف سے نیم بے ہوش ہونے لگتا تھا۔ اگر وہ بے ہوش ہو جاتا تو میرے لیے اسے اٹھا کر نالے تک جانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ ہاتھی بدستور ہمارے پیچھے تھے اور خاصے نزدیک آچکے تھے۔ ایک بار میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک عظیم الجثہ ہاتھی کو صرف بیس پچیس فٹ کی دوری پر پایا تھا۔ شکر ہے وہ براہِ راست نہیں دوڑ رہا تھا بلکہ کسی قدر سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اگر وہ بھاگتا تو یہ فاصلہ چند قدموں میں ختم ہو جاتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ میری نظر ایک طرف درختوں کے گھنے جھنڈ کی طرف گئی۔ یہاں بڑے تنے والے درخت نزدیک تھے اور ان کے تنوں کے درمیان گنجائش اتنی نظر نہیں آرہی تھی کہ ہاتھی اندر داخل ہو سکیں۔ میں نے اپنا رخ اس طرف کر لیا اور اسی لمحے جرمی بے ہوش ہو کر جھول گیا تھا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ میں نے بہ مشکل اسے اور خود کو سنبھالا۔ چلنے کے دوران ہی میں نے کسی طرح اسے شانے پر لادا اور تیزی سے اس جھنڈ کی طرف بڑھا۔ عظیم الجثہ ہاتھی خاصا نزدیک آگیا تھا مگر قسمت نے ساتھ دیا اور ایک جگہ دو درخت یوں راہ میں حائل ہوئے کہ اس کے پاس گھوم کر آنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا اور یوں مجھے مہلت مل گئی کہ میں اس گھنے جھنڈ میں داخل ہو سکتا۔ یہ شاہ بلوط کی نسل کے مضبوط تنوں والے درخت تھے اور اس طرح لگے تھے کہ ان کے تنوں میں چار پانچ فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ ہاتھی اتنی جگہ میں نہیں گھس سکتے تھے۔ تقریباً درجن بھر درخت اس طرح لگے تھے کہ کوئی بیس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا حصہ ہاتھیوں کی زد سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے ہانپتے ہوئے جرمی کو اس کے عین وسط میں ایک تنے سے ٹکا کر لٹا دیا۔ عقب سے عظیم الجثہ ہاتھی نے درخت کو ٹکر ماری اور پھر پوری آواز سے چنگھاڑا تھا۔ اس کی آواز میں رونگٹے کھڑے کر دینے والا غصہ تھا۔ غالباً ہاتھی نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ ہم اس کی پہنچ سے باہر تھے اور یہی اس کے غصے کی وجہ تھی۔ ذرا سی دیر میں کوئی نصف درجن ہاتھی وہاں آگئے اور انہوں نے اس جھنڈ کو گھیر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی تعداد اس سے زیادہ ہی تھی مگر باقی ہاتھی ابھی دور تھے۔

اس موسم میں ہاتھیوں کے اس جھنڈ کی ونڈر کوپ نیچر ریزرو میں موجودگی بتا رہی تھی کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی تھی کیونکہ اس وقت ہاتھی بوٹسوانا یا زمبابوے میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی قدرتی مسئلہ نہیں تھا تو اس کا امکان تھا کہ ہاتھی دانت کے شکاریوں کا کوئی گروہ ان کے پیچھے ہو اور ان سے بچنے کے لیے وہ وقت سے پہلے جنوبی افریقا میں داخل ہو گئے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ انسانوں سے ناراض تھے۔ وہ اس جنگل میں چھپے ہوئے تھے اور جب ہم غیر متوقع طور پر ان کے سامنے جا پہنچے تو ہمیں شکاری سمجھے اور غصے میں حملہ کر دیا۔ اب بھی وہ بپھرے ہوئے تھے اور ان کے رویے کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔ مگر ضروری نہیں تھا وہ کسی اور وجہ سے بھی بپھر سکتے تھے اور ہم پر حملہ کر سکتے تھے۔ صرف اس طرح باجماعت حملہ مجھے شک میں ڈال رہا تھا کہ اس کے پیچھے ہاتھی دانت کے شکاریوں کا چکر تھا۔

خود کو محفوظ پا کر میں نے پہلے جرمی کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ ذرا سی دیر میں اس کا ٹخنا سوج کر تین گنا ہو گیا تھا اور اس کی پنڈلی سے بھی موٹا ہو رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کا جوتا اتارا کیونکہ یہ لانگ بوٹ تھا۔ سوجن کی وجہ سے اس کا اوپری حصہ پھنس رہا تھا۔ پھر اس کے پاؤں کے لحاظ سے چھوٹی لکڑیاں تلاش کیں اور ان کو پاؤں پر رکھ کر جوتے کے تسمے سے اچھی طرح باندھ دیا۔ اب وہ ہلنے جلنے سے محفوظ تھا اور امید تھی کہ ٹوٹی ہڈی اور ٹشوز کو مزید نقصان نہیں ہوگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھیوں کا معائنہ کیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس جھنڈ میں نہیں گھس سکتے تھے اور خود کو نقصان پہنچائے بغیر ان درختوں کو بھی نہیں گرا سکتے تھے اس لیے فی الحال وہ پُرامن ہو گئے تھے۔ مگر وہاں سے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بلکہ اس طرح گھیرا ڈال لیا تھا کہ ہم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہم ہمیشہ کے لیے یہاں نہیں رہ سکتے تھے اور ہمیں نکلنا ہی پڑتا۔

میرے اور جرمی کے پاس کارتوس کے پاؤچ تھے جو ہماری کمر میں بیلٹ سے اٹکے ہوئے تھے۔ میرا پاؤچ موجود تھا مگر جب میں نے جرمی کا پاؤچ دیکھنا چاہا تو وہ غائب تھا۔ شاید بھاگتے ہوئے گر گیا تھا۔ یہ بڑا نقصان تھا کیونکہ اب میرے پاس صرف میرے کارتوس تھے۔ بیگ میں ایک درجن بلٹ والے، ایک درجن چھرّوں والے اور ایک درجن آواز والے کارتوس تھے۔ میں نے پہلے آواز والے کارتوس آزمانے کا فیصلہ کیا۔ شاٹ گن میں کارتوس ڈال کر میں نے عظیم الجثہ ہاتھی کے کسی قدر نزدیک جا کر فائر کیا۔ دھماکے سے بھڑک کر اس نے چنگھاڑ ماری اور پیچھے ہٹا۔ مگر فوراً ہی آگے آکر اس نے درخت کو ٹکر ماری۔ اس ٹکر میں اتنی قوت تھی کہ تنے سے چرچرانے کی آواز آئی۔ ہاتھی کا یہ ردِعمل بالکل مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھاگے گا مگر اس نے الٹا حملہ کر دیا تھا۔ پہلے حملے کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور دوڑ کر دوسری ٹکر زیادہ قوت سے ماری تھی۔ اس بار درخت چرچرا کر جھکا تھا۔ میں بوکھلا کر پیچھے آیا۔ اگر ہاتھی درخت گرانا شروع کر دیتے تو ہم ان کے تلے دب کر ہی مارے جاتے۔ دوسرے ہاتھیوں کا ردِعمل فطری تھا یعنی وہ ڈر کر بھاگے مگر عظیم الجثہ ہاتھی کی چنگھاڑ اور پھر اس کے حملے پر لوٹ آئے۔ تیسری ٹکر پر درخت چرچرا کر جھک گیا اور رفتہ رفتہ اتنا جھک گیا کہ اگلے درخت سے نہ ٹک گیا ہوتا تو گر ہی جاتا۔ شاہ بلوط کی مضبوطی ہاتھیوں کی قوت کے سامنے کم پڑ گئی تھی۔ خاص طور سے عظیم الجثہ ہاتھی بہت طاقتور تھا۔

میں نے دوبارہ فائر نہیں کیا کیونکہ تیسری ٹکر کے بعد ہاتھی کا اشتعال کم ہو گیا تھا اور وہ دوبارہ پیچھے ہٹ کر پہرا دینے کے انداز میں کھڑا ہو گیا تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ اگر میں ان کو ڈرانے کے لیے دوبارہ فائر کرتا تو اس کا امکان تھا کہ وہ مشتعل ہو کر بیک وقت حملہ کرتے اور یہ سارے درخت گرانے کی کوشش کرتے۔ ایک بار درخت گرا دیتے تو ان پر چڑھ کر وہ ہمیں بھی روند سکتے تھے۔ میں پیچھے آگیا اور جرمی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ نیم غشی میں تھا۔ میں نے ..... بوتل سے پانی اس کے حلق میں ٹپکایا تو وہ ہوش میں آگیا اور تھوڑا پانی پی کر اس کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ اس نے پہلا سوال کیا۔ ''ہم کہاں ہیں؟''

''ایک جھنڈ میں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہاں درخت پاس پاس ہیں اور ہم ہاتھیوں سے محفوظ ہیں۔''

میں نے جرمی کو فائر اور اس کے نتائج سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن اس نے خود پوچھ لیا۔ ''تم نے انہیں ڈرانے کی کوشش نہیں کی۔''

''کی تھی..... وہ درخت دیکھ رہے ہو۔ بڑے ہاتھی نے حملہ کر کے اسے تقریباً گرا دیا ہے۔ یہ بہت غصے میں ہیں۔''

''میرے خدا.....!'' جرمی کراہا۔ ''ہم ٹریپ ہو گئے

ہیں۔"

"مجھے امید ہے ہاتھی زیادہ دیر یہاں نہیں رہیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ان کے جانے کے بعد ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

"اور اگر یہ نہ گئے تب.....؟"

"آج شام تک ہماری گم شدگی محسوس کر لی جائے گی۔ اس کے بعد ہمیں تلاش کیا جائے گا۔ یہ بہت بڑی جگہ نہیں ہے جہاں ہمیں تلاش نہ کیا جا سکے۔"

"ہاتھی بہت خراب موڈ میں ہیں۔" جرمی نے کہا۔ "میں نے کبھی ان کو اتنے اشتعال میں نہیں دیکھا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے تجزیے سے آگاہ کیا۔ "ان کی یہاں موجودگی اور اشتعال کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اول کوئی فطری تبدیلی جس کی وجہ سے یہ قبل از وقت یہاں آئے ہیں یا پھر ہاتھی دانت کے شکاری ان کے پیچھے ہیں۔"

"مجھے دوسری بات درست لگ رہی ہے۔ شاید شکاریوں نے اس جھنڈ کے کچھ ہاتھی مارے بھی ہیں تبھی یہ جنوبی افریقا میں داخل ہو کر کھلی چراگاہوں میں جانے کے بجائے اس گھنے جنگل میں چھپ گئے اور جب ہم ان کے سامنے گئے تو انہوں نے ہمیں شکاری سمجھ کر حملہ کر دیا۔" جرمی نے وہی بات کی جو میرے ذہن میں تھی۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے ان کا رویہ معمول کے برعکس ہے اور ہمیں ایسی کسی حرکت سے گریز کرنا چاہیے جس سے یہ مزید اشتعال میں آجائیں۔"

جرمی کے پاؤں کی چوٹ زیادہ تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو کم کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ جرمی اکثر سر درد کا شکار رہتا تھا اس لیے ڈسپرین کی گولیاں اس کے پاس ہوتی تھیں۔ مگر یہ ہڈی ٹوٹنے کے درد میں بیکار تھیں۔ پھر بھی جرمی نے چار گولیاں کھا لیں۔ اس سے اسے کچھ افاقہ ہوا تھا۔ پاؤں کو فکس کرنے سے اسے سکون ملا تھا اور وہ اب آسانی سے حرکت کر سکتا تھا۔ وہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے کارتوس پاؤچ کا پوچھا۔ "میرا کارتوس پاؤچ کہاں گیا؟"

"میرا خیال ہے بھاگنے کے دوران راستے میں کہیں گر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "بس میرا بچا ہے۔"

جرمی فکر مند ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "سام یہاں رک کر مدد کا یا ان ہاتھیوں کے چلے جانے کا انتظار کرنا مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

"پھر کیا حل ہو سکتا ہے؟"

"تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا اور جا کر مدد لانی ہوگی۔ میرا خیال ہے نالا یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"دیکھو تم یہاں رک کر میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔" اس نے اصرار کیا۔ "اس لیے بہتر ہے جا کر مدد لانے کی کوشش کرو۔"

"اور تم.....؟"

"میں یہاں موجود ہوں۔ تم مجھے گن اور کچھ کارتوس دے جاؤ۔"

میں کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ میں اسے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا مگر وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، ہم اس امید پر نہیں رک سکتے تھے کہ ہاتھی چلے جائیں یا مدد آجائے۔ جرمی کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی ورنہ اس کے پاؤں کا زخم بگڑ جاتا تو اسے پاؤں سے محروم ہونا پڑتا۔ میں نے اس نقطہ نظر سے ہاتھیوں کا جائزہ لیا۔ تقریباً نصف درجن ہاتھی درختوں کے پاس اس طرح موجود تھے کہ انہوں نے شمال، مشرق اور مغرب کی سمت کو مکمل طور پر گھیرا ہوا تھا۔ البتہ جنوب کی طرف کسی قدر خلا تھا کیونکہ یہاں بھی گھنے درخت تھے اور ہاتھی ان میں نہیں گھس سکتے تھے۔ مجھے شمال کی طرف مزید ہاتھیوں کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ اس طرف سے شاخیں ٹوٹنے اور زمین پر چلنے کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ مگر وہ آواز نہیں نکال رہے تھے اور نہ ہی اس طرف آ رہے تھے۔ شاید وہ مادائیں اور بچے تھے۔ مجھے ان کے نظم و ضبط پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ آواز نہیں نکال رہے تھے اور بالکل خاموشی سے حرکت کر رہے تھے۔

اگر میں جنوب کی طرف نکلتا تو مجھے نالے تک جانے کے لیے مغرب کی طرف گھومنا پڑتا۔ یہ ایک خاصا طویل چکر ہو جاتا اور امکان تھا کہ ہاتھی مجھے نالے تک نہیں جانے دیتے۔ میں کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ ناکامی کا خطرہ تھا مگر میں جرمی کی خاطر یہ خطرہ مول لے سکتا تھا۔ دوسری طرف اسے اکیلے چھوڑ کے جانے میں بھی خدشہ تھا اگر ہاتھی میرے فرار کے بعد درختوں پر حملہ کرتے تو وہ نہ اپنا بچاؤ کر سکتا تھا اور نہ فرار ہو سکتا تھا۔ جرمی میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ تمہیں کوشش کرنا ہوگی سام..... مجھے یقین ہے تم اپنا بچاؤ کر سکتے ہو۔ اگر کوئی ہاتھی پاس آنے کی کوشش کرے تو تم اسے شوٹ کر سکتے ہو۔ ہمیں اپنے بچاؤ کی اجازت ہے۔"

میں ایسا کر سکتا تھا لیکن اس کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ ہاتھی میری گولی سے فوراً ہلاک یا پیش قدمی سے معذور ہو سکتا..... اس صورت میں میرے بچاؤ کا امکان بھی کم رہ جاتا۔ ویسے بھی بھاگتے ہوئے درست نشانے پر فائر کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ شاٹ گن کا بلٹ پچاس فٹ کے فاصلے تک کارآمد رہتا ہے۔ اور اتنے فاصلے سے کسی بھاگتے ہاتھی کا نشانہ لینا بہت مشکل کام ہے۔ دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی ہاتھی یہ فاصلہ صرف دس سیکنڈ میں طے کر سکتا تھا۔ نشانہ خطا جاتا تو ایک بلٹ چلانے کے بعد مجھے گن کو لوڈ کرنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ یہ سارے امکانات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس پر صرف جرمی کی ہی نہیں میری زندگی کا بھی انحصار ہوتا اس لیے میں ایک ایک بات پر غور کر رہا تھا۔

میں تجربے کے طور پر غیر محسوس انداز میں اس طرف بڑھا جہاں ہاتھیوں کے درمیان خلا موجود تھا۔ یہاں تین ہاتھی موجود تھے مگر انہوں نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اصل مسئلہ عظیم الجثہ ہاتھی تھا اور یقیناً وہی ان کا سردار تھا۔ باقی اس کی تابعداری کر رہے تھے۔ جب ان ہاتھیوں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تو میرا حوصلہ بڑھا اور میں مزید آگے آیا۔ یہ خطرناک حد تھی کیونکہ ایک ہاتھی مجھ سے صرف بیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے یہاں سے اپنے فرار کا روٹ دیکھا۔ درختوں کے درمیان خلا زیادہ تھا جب کہ میں کسی ایسی جگہ سے گزرنا چاہتا تھا جہاں خلا کم سے کم ہوتا کہ میرے تعاقب میں آنے والے ہاتھیوں کو آسانی میسر نہ آئے اور میں ان سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جاؤں۔ اپنا روٹ طے کر کے میں واپس جرمی کے پاس آیا اور شاٹ گن اور کارتوس پاؤچ اس کے پاس رکھ دیا۔ اپنی شاٹ گن میں، میں نے صرف پانچ بلٹ والے کارتوس لوڈ کر لیے تھے۔ اس میں اتنے ہی کارتوس آ سکتے تھے۔ وہ بے چین ہو گیا۔ "یہ کیوں دے رہے ہو؟"

"یہ میرے لیے بیکار ہے اور پھر اس کے وزن کی وجہ سے میں اتنی پھرتی نہیں دکھا سکوں گا۔ اس وقت اسلحہ نہیں صرف تیزی مجھے کامیاب کر سکتی ہے۔" میں نے کہتے ہوئے پانی کی بوتل بھی اس کے پاس رکھ دی۔ آخر میں، میں نے گیس سائرن بھی اس کے حوالے کیا۔ ان چیزوں کی مدد سے وہ ہاتھیوں کو خود سے دور رکھ سکتا تھا۔ "کوشش کرنا کہ کم سے کم حرکت کرو۔ جب تک حرکت کرتے رہو گے ہاتھی تم میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔ سانس بھی آہستہ لینا، یہ سانس کی آواز بھی سن سکتے ہیں۔"

جرمی نے سر ہلایا۔ "میں سمجھتا ہوں..... تم اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے جرمی کا ہاتھ تھاما پھر اسے گلے لگایا اور سرگوشی میں کہا۔ "دوست میرا انتظار کرنا میں واپس آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"اپنا خیال رکھنا۔" جرمی بولا۔

میں نے اپنے لباس سے ہر شے اتار دی تھی جو تیزی سے حرکت میں رکاوٹ ڈال سکتی تھی۔ اس کے بعد میں سرکتا ہوا آہستہ آہستہ گھنے درختوں کی طرف آیا۔ جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ ہاتھی ان میں آسانی سے نہیں گھس سکتے تھے۔ ہاتھی بہ غور میرا جائزہ لے رہے تھے مگر انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں بہت آہستہ سے حرکت کر رہا تھا اور کسی ایسی حرکت سے گریز کیا تھا جس سے وہ قبل از وقت اشتعال میں آجاتے۔ میں تقریباً سرکنے کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا اور اب میں دو ہاتھیوں کے درمیان آچکا تھا۔ ان کے سر میرے ساتھ ساتھ ہی گھوم رہے تھے لیکن کان، سونڈ اور جسم ساکت تھے۔ یہ حوصلہ افزا بات تھی۔ ہاتھی جب غصے میں آتا ہے تو اپنی سونڈ اور کانوں کو زور سے حرکت دیتا ہے۔

اب میں تقریباً جھنڈ سے باہر آ گیا تھا صرف ایک درخت سے آگے آتا تو جھنڈ سے باہر کسی قدر کھلی جگہ آجاتا۔ میں نے محتاط انداز میں باہر قدم رکھا۔ ہاتھی مجھے دیکھ رہے تھے مگر کسی نے آگے آنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے رویے سے حوصلہ پا کر میں اسی طرح سست قدموں سے ان درختوں کی طرف بڑھا جو پاس پاس تھے اور ان سے ہوتے ہوئے میں نالے کی طرف جا سکتا تھا۔ درمیان میں تقریباً پچاس فٹ کا خطرناک فاصلہ تھا۔ ابھی میں دس قدم آگے گیا ہوں گا کہ عقب سے عظیم الجثہ ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی اور میں بے ساختہ بھاگا تھا اس کے ساتھ ہی دوسرے ہاتھی بھی چنگھاڑنے لگے اور زمین ان کے قدموں کی دھمک

سے لرزنے لگی تھی۔ وہ یقیناً میرے پیچھے آرہے تھے لیکن مجھے اتنا ہوش نہیں تھا کہ مڑ کر دیکھتا۔ میری ساری توجہ اس پر مرکوز تھی کہ پاس پاس موجود درختوں سے گزر کر ہاتھیوں سے اتنا فاصلہ کرلوں کہ پھر نالے کا رخ کرسکوں۔

تقریباً سو گز دور آنے کے بعد میں نے پہلی بار مڑ کر دیکھا تو جنگل کے دھندلکوں میں ہاتھیوں کو کچھ فاصلے پر پایا تھا۔ اگرچہ وہ بدستور بھاگ دوڑ اور چنگھاڑنے میں مصروف تھے۔ یہ اتنا فاصلہ تھا کہ میں تیزی دکھاتا تو ایک منٹ میں نالے تک پہنچ سکتا تھا اور میں نے یہی کیا۔ درمیانی فاصلہ تین سو گز سے زیادہ تھا جسے میں نے اڑتے ہوئے طے کیا اور ہاتھی خاصے پیچھے رہ گئے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ جب وہ اتنی بھاگ دوڑ کررہے تھے تو مجھ سے دور کیسے رہ گئے۔ ان کے بھاگنے سے زمین لرز رہی تھی۔ بہرحال مجھے ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت کہاں تھی؟ میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ بھاگتے ہوئے نالے کے قریب آیا تو پھسل کر گرتے گرتے بچا۔ جیپ اپنی جگہ موجود تھی اور چابی اس میں لگی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے اگنیشن گھمایا اور انجن نے جھرجھری لی مجھے عقب سے اسی عظیم الجثہ ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی۔ اس کی آواز الگ سے پہچانی جاتی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ تقریباً سو گز دور میری طرف دوڑا آرہا تھا اور اس نے سونڈ اوپر اٹھا رکھی تھی۔ یہ انداز حملہ کرنے والا تھا۔

میں نے گیئر بدلا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ نالے سے فرار کی کوشش کروں گا لیکن نالے میں اکثر مقام ایسے تھے جہاں جیپ بہت سست رفتاری سے گزر سکتی... اور اگر ہاتھی تعاقب میں نالے میں اتر آتا تو میں پھنس جاتا اس لیے میں نے نالے میں اترنے کا ارادہ ترک کردیا۔ درختوں کے درمیان سے جیپ گھماتا ہوا میں دور جانے کی کوشش کررہا تھا اور ساتھ ہی دھڑکا بھی لگا تھا کہ کسی ایسی جگہ نہ پھنس جاؤں جہاں سے جیپ آگے لے جانے کا راستہ ہی نہ ہو۔ درختوں کے درمیان گھوم گھوم کر جانے سے رفتار ٹوٹ رہی تھی بہرحال یہی مشکل میرے تعاقب میں آنے والے ہاتھی کو بھی درپیش تھی۔ اسے بھی بار بار راستہ بدلنا پڑ رہا تھا اس لیے وہ بھی پوری رفتار سے میرا پیچھا نہیں کرسکتا تھا۔ میں دیوانہ وار ڈرائیو کرتے ہوئے باہر جانے کا راستہ تلاش کررہا تھا۔ مگر جنگل تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ مجھے راستہ تلاش کرنے کے ساتھ اس بات کا خیال بھی رکھنا تھا کہ میرا رخ جنوب کی طرف رہے۔ ورنہ میں اپنی منزل سے مزید دور ہوجاتا۔

جنگل کے جو حصے گھنے لگ رہے تھے اس میں گھسنے سے گریز کررہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ کھلی جگہوں پر رہوں۔ عظیم الجثہ ہاتھی بدستور میرے پیچھے تھا۔ کھلی جگہ ہوتی تو وہ پینتیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا تھا جب کہ اس گھنے جنگل میں اس کی رفتار محدود ہوگئی تھی۔ چھوٹی اور تیز رفتار جیپ کی وجہ سے بھی میں کسی بہتر پوزیشن میں تھا۔ مگر اس ہاتھی سے پیچھا نہیں چھڑا پارہا تھا۔ اپنے جثے اور وزن سے قطع نظر اس کی رفتار حیران کن تھی۔ اچانک میں ایک کچے راستے پر جا نکلا تھا۔ یہ راستہ گاڑیوں کی آمد و رفت سے بنا تھا مگر اس میں جابجا گڑھے تھے اس لیے جیپ پوری رفتار سے نہیں دوڑ سکتی تھی۔ اس کے مقابلے میں ہاتھی کے لیے یہ گڑھے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ تیزی سے اب نزدیک آنے لگا۔ میں جیپ کو ہر ممکن تیزی سے چلا رہا تھا۔ مگر گڑھوں کی وجہ سے رفتار کم تھی۔

عظیم الجثہ ہاتھی جو پہلے پچاس گز کی دوری پر تھا اب اس کا جیپ سے فاصلہ گھٹ رہا تھا۔ چالیس گز، تیس گز، بیس گز اور پھر مشکل سے دس گز کا فاصلہ رہ گیا۔ وہ اتنے قریب آگیا کہ اس کی اٹھی سونڈ تلے اس کے کھلے منہ سے اس کے اندر کے دانت اور سرخی مائل زبان تک صاف عقبی آئینے میں دکھائی دے رہی تھی۔ اتنے پاس سے اس کے قدموں کی دھمک میں جیپ کے دھچکوں کے باوجود صاف محسوس کرسکتا تھا۔ موت اور میرے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ کچھ نزدیک اور آجاتا تو جیپ روک لیتا اور اس کے بعد میں کیسے بچتا۔ پھر جرمی کی مدد کون کرتا۔ وہ اس جنگل میں بے یار و مددگار ہاتھیوں کے رحم و کرم پر رہ جاتا۔ جرمی کا خیال آتے ہی میرے اندر جیسے بجلی سی کوندگئی تھی۔ میں نے شاٹ گن پیچھے کرکے فائر کیا۔ ایک دھماکا ہوا اور بدقسمتی سے جھٹکے کی وجہ سے شاٹ گن میرے ہاتھ سے اچھلی اور جیپ کے باہر جاگری۔ میں کوشش کے باوجود اسے نہیں پکڑ سکا تھا۔

دھماکے سے گھبرا کر ہاتھی ذرا پیچھے ہوا تھا مگر پھر چنگھاڑ کر جیپ کے پیچھے لپکا۔ گولی اسے نہیں لگی تھی... ورنہ اس کی پیش قدمی میں کچھ تو کمی آتی۔ یہ میری ایک اور بدقسمتی تھی۔ ایک منٹ بعد وہ پھر اسی پوزیشن میں جیپ سے دس گز کی دوری پر آگیا تھا۔ اس بار وہ زیادہ رفتار سے دوڑ رہا تھا اور گڑھوں سے بھرا یہ کچا راستہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ہاتھی کو جیپ سے دور رکھنے کے لیے میں نے پیچھے جو

کچھ رکھا تھا وہ اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کردیا کہ ہاتھی کچھ تو گھبرائے گا۔ ہر بار چیز پھینکنے پر وہ کچھ جھجکتا تھا مگر پھر دوبارہ نزدیک آنے لگتا۔ ہاٹ پاٹ، تھرماس، مگ، پلیٹیں سب پھینک دی تھیں اور اب میرا دایاں ہاتھ کسی چیز کو تلاش کررہا تھا۔ اچانک ہی جیکٹ میرے ہاتھ میں آگئی۔ یہ خانے میں رکھی تھی لیکن دھچکوں سے خانہ کھل گیا اور جیکٹ باہر آگئی تھی۔ میں نے جیکٹ اٹھائی تو وہ ہوا سے پھڑپھڑانے لگی... اور پھر خود میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ہاتھی کے عین آنکھوں والے حصے پر جا لپٹی۔ اسے نظر آنا بند ہوا تو اس کی رفتار خود بہ خود سست پڑگئی تھی اور مجھے موقع مل گیا کہ میں جیپ کو اس کی حد سے آگے لے جاؤں۔ ایک منٹ بعد میں کھلی جگہ تھا اور یہاں میں جیپ پوری رفتار سے دوڑا سکتا تھا۔ جب ہاتھی جیکٹ آنکھوں سے ہٹا کر کھلی جگہ آیا تو میں تقریباً دو سو گز آگے جاچکا تھا۔ اس نے محسوس کرلیا کہ میں اس کی پہنچ سے نکل گیا ہوں اس لیے اس نے چنگھاڑ ماری اور واپس شمال کی طرف مڑ گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد میں وِنڈر کوپ پارک کے ایک کھلے حصے میں پہنچا۔ یہاں آکر میں نے پہلی بار جیپ روکی اور پھر ریڈیو سے دفتر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ریڈیو کی حد میں نہیں تھا اس لیے میں نے سینٹرل کمانڈ کو ہنگامی مدد کا پیغام بھیجا۔ میں جس جگہ تھا یہاں دور تک ہری گھاس سے بھرا میدان تھا۔ اچانک مجھے دور جنگل سے ہاتھی نکلتے دکھائی دیے۔ وہ بہت عجلت میں تھے اور سب بھاگ رہے تھے مگر ان کا انداز حملہ کرنے کا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی افتاد سے بچ کر بھاگ رہے ہوں۔ میں نے دوربین نکال کر دیکھا تو مجھے کوئی دو درجن ہاتھی دکھائی دیے تھے۔ ان میں مادائیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ جنگل سے نکلتے ہی انہوں نے جنوب کا رخ کیا۔ یعنی میری طرف آنے لگے تھے۔ میں نے عجلت میں جیپ اسٹارٹ کی اور آگے روانہ ہوگیا۔ اگر وہ میری طرف نہیں بھی آرہے تھے تب بھی مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ لازمی میرے پیچھے آتے۔

مجھے جرمی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ اگر ہاتھی وہاں سے نکل آئے تھے تو اس کا کیا ہوا تھا؟ کہیں ہاتھیوں نے اسے مار تو نہیں دیا تھا؟ اس کے بعد ہاتھیوں کا وہاں رکنا بیکار تھا اور وہ وہاں سے نکل آئے تھے۔ ان خدشات کے ساتھ میں تیزی سے کروٹ واٹر پارک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر دس منٹ بعد رک کر میں ریڈیو سے دفتر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اب تک کامیابی نہیں ملی تھی۔ میں جلد از جلد مدد کا کہہ کر واپس جرمی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ بالآخر ایک جگہ ریڈیو کا رابطہ ممکن ہوا اور میں نے سیگل سے بات کرکے اسے صورتِ حال کا بتایا۔ ”جرمی کو یہاں سے نکالنے کے لیے ہیلی کاپٹر کی ضرورت پڑے گی۔ دوسرے مجھے شبہ ہے کہ یہاں ہاتھی دانت کے شکاری آگئے ہیں ان کے لیے رینجرز بھیجی جائے ورنہ ہماری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔“

”تم فکر مت کرو میں ابھی انتظام کرتا ہوں، آدھے گھنٹے کے اندر ہیلی کاپٹر پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں واپس جارہا ہوں۔“

سیگل نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں واپس روانہ ہوگیا۔ جرمی کو لینے کے لیے ہیلی کاپٹر آرہا تھا لیکن اسے کسی ایسی جگہ لانا ضروری تھا جہاں سے ہیلی کاپٹر اسے لے جاسکے۔ واپسی میں ہاتھی مجھے کروٹ واٹر کی حد میں داخل ہوتے دکھائی دیے تھے۔ وہ اب بھی عجلت میں تھے لیکن بھاگ نہیں رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ خطرے سے کسی قدر دور نکل آئے تھے۔ میں وِنڈر کوپ کی حد میں داخل ہوا تھا کہ ایک رینجرز ہیلی کاپٹر گرجتا ہوا میرے اوپر سے گزرا۔ اسے یقیناً سیگل نے بھیجا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں دوبارہ اس جنگل میں داخل ہوا جہاں جرمی کو چھوڑ کر آیا تھا۔ جب میں ان درختوں کے پاس پہنچا جہاں جرمی پناہ گزین تھا تو انہیں صحیح سلامت کھڑے دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر جرمی بھی ٹھیک تھا۔ میں اس کے پاس آیا تو وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے اسے ہلایا تو وہ چونک گیا۔

”سام یہ تم ہو؟“

”ہاں میں آگیا ہوں....“ میں نے اسے بوتل سے پانی دیا۔ ”میری بات ہوگئی ہے اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

”یہاں شکاری بھی آگئے ہیں۔“ جرمی نے تشویش ناک اطلاع دی۔ ”انہوں نے ہاتھیوں پر فائرنگ کی تھی اس کے بعد ہاتھی اچانک یہاں سے بھاگ نکلے۔“

”وہ تو میرے پیچھے آئے تھے۔“

”نہیں تمہارے پیچھے صرف بڑا والا ہاتھی گیا تھا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”بس قسمت تھی جو اس سے بچ نکلا ورنہ اس نے مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ میں نے جرمی کو مختصراً ہاتھی کے تعاقب کی روداد سنائی اور اس دوران میں اسے جیپ تک لے جانے کی تیاری کرتا

رہا۔ میں نے اسے یوں اٹھایا کہ اس کا زخمی پاؤں ہوا میں معلق تھا۔ پھر بھی اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ ابھی ہم روانہ ہونے والے تھے کہ دور کہیں خودکار ہتھیاروں سے فائرنگ کی آواز آئی۔

''یہ ہاتھیوں کے شکاری ہیں۔'' جرمی نے فکرمندی سے کہا۔

''جب میں واپس آرہا تھا تب رینجرز کا ہیلی کاپٹر میرے اوپر سے گزرا تھا۔ اگر یہ شکاری ہیں تو رینجرز نے انہیں گھیرلیا ہے۔''

اب میں سمجھا کہ ہاتھی کس بات سے خوف زدہ ہوکر جنگل سے نکل کر بھاگے تھے۔ شکاری جو اس جھنڈ کے تعاقب میں تھے وہ یہاں بھی آپہنچے۔ ان کی آمد پر ہاتھی جو جنگل میں چھپے ہوئے تھے افراتفری میں جنوب کی طرف بھاگے اور ان کا تعاقب کرتے شکاری رینجرز کی نظر میں آگئے۔ فائرنگ ان دونوں کے درمیان ہورہی تھی مگر مجھے اس وقت شکاریوں یا رینجرز کی نہیں بلکہ جرمی کی فکر ہورہی تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے جرمی کو بتایا۔ ''میرا خیال ہے رینجرز نے شکاریوں کو گھیرلیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

میں جیپ کو جنگل سے باہر لانے لگا۔ اب راستہ میری سمجھ میں آگیا تھا اور آرام سے جیپ کو باہر لے آیا۔ ابھی جیپ باہر آئی تھی کہ ریڈیو سے کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ کال آنے لگی۔ ''ریسکیو ہیلی کالنگ.....ریسکیو ہیلی کالنگ.....''

میں نے جواب دیا۔ یہ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ تھا جو ہماری فریکوئنسی پر بات کررہا تھا۔ ہیلی کاپٹر یہاں پہنچ گیا تھا۔ دس منٹ بعد پیرامیڈک جرمی کو اسٹریچر پر باندھ کر ہیلی کاپٹر میں منتقل کررہے تھے اور اس کے زخموں کی دیکھ بھال ابھی سے شروع کردی گئی تھی۔ جب اسے ہیلی کاپٹر میں منتقل کیا جانے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''میں اسپتال میں تم سے ملنے آؤں گا بس یہاں کے معاملات سے فارغ ہوجاؤں۔''

جرمی تکلیف میں تھا لیکن حوصلے سے مسکرارہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں وہیں رک گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر نہ صرف گروٹ واٹر بلکہ ونڈرکوپ کا عملہ اور گیم آفیسر بھی وہاں آچکا تھا۔ رینجرز نے مزید مدد طلب کرلی تھی اور مزید دو ہیلی کاپٹرز میں درجن سے زیادہ رینجرز پہنچ گئے تھے۔ پہلے سے موجود رینجرز نے شکاریوں کو گھیرلیا تھا اور ان کو فرار سے روکا ہوا تھا۔ مگر دوطرفہ فائرنگ میں تین شکاریوں سمیت ایک رینجر بھی مارا گیا تھا۔ شکاریوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی جن میں سے دس زندہ بچے تھے اور ان میں سے پانچ زخمی تھے۔ شکاری تین بڑی جیپوں پر تھے اور ان کے پاس ایسی برقی آریاں تھیں جو چھ انچ موٹے ہاتھی دانت کو صرف ایک منٹ میں کاٹ سکتی تھیں۔ گاڑیوں میں ایک درجن ایسے ہاتھی دانت تھے جو صرف بہت بڑے ہاتھیوں کے ہوسکتے تھے۔ ان شکاریوں نے یہاں آنے سے پہلے اس جھنڈ کے چھ ہاتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ مستقل ان کا تعاقب کرتے رہے۔

رینجرز نے بعد میں پورے علاقے کا جائزہ لیا تھا مگر مردہ ہاتھی کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ مارے جانے والے ہاتھی بوٹسوانا میں تھے۔ یہ یقیناً اسی جھنڈ کے ہاتھی تھے جو اپنی جان بچانے کے لیے جنوبی افریقا میں گھس آئے تھے۔ انہی کے پیچھے شکاری آئے تھے مگر پکڑے گئے۔ شکاریوں نے گرفتاری کے بعد اپنی زبان بند کرلی تھی مگر ان کی زبان اور گاڑیوں کے نمبر نے پول کھول دیا تھا۔ مجھے امید تھی ان کو صرف غیرقانونی شکار کے الزام میں کئی سال کی سزا ملے گی، کیونکہ جنوبی افریقا میں غیرقانونی شکار پر سزائیں سخت کردی گئی ہیں۔ بچ جانے والے ہاتھی گروٹ واٹر پہنچ گئے تھے۔ جہاں موسم ان کے لیے ابھی سرد تھا لیکن وہ بہرحال جان کے خطرے سے نکل گئے تھے۔ یہ دو درجن سے زیادہ ہاتھی تھے اور ان میں سے کئی گولیوں سے زخمی بھی تھے لیکن ان کے زخم ٹھیک ہورہے تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تو ہماری ٹیم ان کو طبی امداد بھی دے سکتی تھی۔ بعد میں، میں نے اس عظیم الجثہ ہاتھی کو ایک بار قریب سے دیکھا لیکن اب وہ پُرامن تھا اور اس نے جارحانہ رویّے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

جرمی کو ہیلی کاپٹر براہِ راست پریٹوریا کے ایک اسپتال لے گیا تھا جہاں اس کے پاؤں کا آپریشن ہوا تھا اور آپریشن کامیاب رہا تھا۔ اس کی ٹوٹ جانے والی ہڈیاں سیٹ کردی گئی تھیں۔ ایک ہفتے بعد اسے اسپتال سے فارغ کرکے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ دو دن بعد میں پھول لے کر اس کے گھر گیا تو وہ بیوی اور بچیوں میں خوش تھا۔ ہم یقیناً خوش قسمت تھے جو اپنے پیاروں میں زندہ اور خوش تھے۔ اس سارے واقعے میں میرا واحد نقصان دادا جان کی دی ہوئی جیکٹ کی گم شدگی تھی۔ میں واپس اس راستے پر گیا اور میں نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا مگر جیکٹ نہیں ملی۔

ترکی نمی دانم

سرگزشت کا خاصّہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کرہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

استنبول کے بارے میں صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ یہ مشرق اور مغرب پر مشتمل ہے۔ دو مختلف براعظموں پر پھیلا ہوا یہ شہر خلیج باسفورس کے دونوں جانب دور تک سمندر کے درمیان میں ایسا لگتا ہے جیسے نیلے پانیوں پر ایک سرسبز جزیرہ۔ استنبول جس نے نہیں دیکھا اس کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ پیدا ہی نہیں ہوا چونکہ یہ شرف صرف لاہور ہی کو حاصل ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ لہٰذا لاہور کو دیکھنے کی سند کو آپ پیدائشی

سرٹیفکیٹ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن استنبول اپنی گوناگوں خوبیوں اور پہلوؤں کے باعث ایک ایسا شہر ضرور ہے جس کو اگر پیدائش کے بعد دیکھ لیا جائے تو یہ تجربہ انسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ وہ شہر ہے جو مشرق اور مغرب کو ملاتا بھی ہے اور علیحدہ بھی کرتا ہے۔

استنبول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کی تین عظیم سلطنتوں کا مرکز رہا ہے۔ رومن سلطنت، بازنطینی سلطنت اور عثمانیہ سلطنت کی پذیرائی کا اعزاز بھی اس کو حاصل ہے۔ شکر ہے کہ آخری سلطنت عثمانیہ کا دورِ حکومت کافی عرصے رہا اور آج اگرچہ سلطنت تو باقی نہیں رہی لیکن ان کے جانشین ترک آج بھی ترکی کے حکمراں ہیں۔ تین مختلف تہذیبوں کی یادگاریں بھی یہاں موجود ہیں جن کی وجہ سے استنبول کو ایک انفرادیت حاصل ہے۔ ترکی ایک تو دنیا کے حسین ترین ممالک میں شامل ہے لیکن اس حسن میں مختلف تہذیبوں اور مختلف اندازِ تعمیر کی نادر یادگاروں نے اس کو مزید اہمیت دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے مرکزِ نگاہ ہے۔ اس بات سے اندازہ لگائیے کہ قریباً دو کروڑ سیاح ہر سال اس ملک کے عجائبات اور خوبصورت مناظر دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور ان سیاحوں کی بدولت ترکی ہر سال اس مد میں پندرہ ارب ڈالرز ان سے حاصل کرتا ہے۔

دوسرے دن ہم تینوں جلدی تیار ہو گئے۔ اس کی وجہ بٹ صاحب نے یہ بتائی کہ اس طرح شعیب مرزا پر رعب پڑے گا کہ ہم پاکستانی کتنے وقت کے پابند اور اسمارٹ ہوتے ہیں۔

خان صاحب نے کہا ”بٹ صاحب۔ ابھی تو ہمیں چند روز یہاں رہنا ہے۔ ان کو ہماری اصلیت تو معلوم ہو ہی جائے گی۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”آپ لوگ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔ اس وقت میں بہت ضروری اور جغرافیائی کام کر رہا ہوں۔“

خان صاحب یہ سن کر حیران رہ گئے کہ بٹ صاحب جغرافیائی کام بھی کر رہے ہیں حالانکہ جغرافیے کے مضمون میں وہ ہمیشہ بہت کمزور رہے ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو اس میں فیل ہوتے رہے ہیں۔ اب یہ کمی دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ ترکیب سوچی ہے کہ کتابیں پڑھنے کے بجائے وہ بذاتِ خود دنیا کو دیکھیں اور اپنا جغرافیہ مضبوط کریں۔

”مثلاً اب تک آپ نے کیا دیکھا اور محسوس کیا ہے؟“

”اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دنیا میں تین حصہ پانی ہے۔ خشکی، پہاڑ، شہر، جزیرے وغیرہ یہ سب پانی سے کم ہیں۔ ماسٹر جی تو یہی پڑھاتے تھے مگر میں نے ان کی بات پر کبھی یقین نہیں کیا۔ اب دیکھو نا جس بات کو عقل ہی نہ مانے وہ آپ خود تجربہ کیے بغیر تو نہیں مان سکتے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں ماسٹر جی کی بات پر یقین ہی نہیں تھا، اپنے ماسٹر جی کی بات پر جو والد کی جگہ ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک۔“ بٹ صاحب بے پروائی سے بولے۔ ”ہماری پسماندگی کا یہ حال ساری دنیا جانتی ہے۔ اور سچ بتاؤں کہ مجھے تو اپنے والد صاحب کی بہت سی باتوں پر بھی یقین نہیں ہوتا تھا۔“

”حیرت ہے!“

”حیرت کی کیا بات ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔“

”تو کیا تمہارے والد صاحب تمہارے یہ خیالات سن کر چپ رہتے تھے؟“

”ارے چپ، توبہ کیجیے۔ چپ رہنا تو ان کی عادت ہی نہیں تھی۔ میری اس قسم کی باتوں پر وہ آگ بگولہ ہو کر میری خوب ٹھکائی کرتے تھے اور۔ پھر مجھے کمرے میں بند کر دیتے تھے۔“

”وہ کس لیے؟“

”تاکہ میں کمرے سے نکل کر بھاگ نہ جاؤں اور ان کے غصے کا مزہ چکھتا رہوں۔ دراصل ان کا غصہ دیر تک باقی رہتا تھا، انہیں جب بھی دوسرے کاموں سے فرصت ملتی اور یاد آ جاتا تو ایک بار پھر کمرا کھلوا کر مرمت کرنے لگتے۔“

”تو آپ کی صحت مندی کا یہ راز ہے؟“

”سمجھ لیجیے۔“

”کمال ہے۔ اتنی زیادہ مرمت کے بعد بھی تم ٹھیک نہیں ہوئے۔ ویسے ہی ٹوٹے پھوٹے نظر آتے ہو۔“

”ایسا نہ کہیے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں صرف اپنے والد صاحب کے ٹھکائی کی وجہ سے ہوں۔“

”آج آپ کیا ہیں؟“

”میں ایک بٹ ہوں۔ سوچتا ہوں اگر ابا جی کبھی ناراض ہو کر مجھے عاق کر دیتے تو میں تو بٹ بھی نہیں رہتا۔ واقعی اللہ کے ہر کام میں کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے۔“

ہم لوگ ہوٹل کے لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے، یہ بہت بارونق اور ”رنگین“ جگہ تھی۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ اگر استنبول میں کہیں اور نہ جائیں اور ہوٹل کے لاؤنج ہی میں بیٹھے رہیں تو کافی تفریح ہو سکتی ہے۔

ہم نے غور کیا تو دیکھا کہ بٹ صاحب آج کچھ زیادہ ہی اپ ٹو ڈیٹ نظر آ رہے ہیں۔ انہوں نے ٹائی بھی لگا رکھی تھی حالانکہ ٹائی کو وہ انگریزوں کی غلامی کا پھندا کہا کرتے تھے۔

”تو پھر یہ کوٹ پتلون کس لیے؟“

”کوٹ پتلون انگریز کی غلامی کی نشانی نہیں ہے۔ یہ تو ایک لباس ہے جو دنیا کے بہت سے ملکوں میں پہنا جاتا ہے۔ لباس پر تو کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ ترک کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ خواتین جینز اور بلاؤز پہنتی ہیں مگر سعودی عرب میں یہ لباس پسند نہیں کیا جاتا۔ انڈونیشیا کے مسلمان لباس کے ساتھ تہمد ٹائپ کی کوئی چیز ضرور پہنتے ہیں۔ دھوتی پہننے سے کوئی ہندو تو نہیں ہو جاتا۔ ہمارے بنگالی دوست تہمد استعمال کرتے ہیں۔“

”بس بس، بھائی، سمجھ گئے، غلطی ہو گئی کہ آپ سے ایک سوال پوچھ لیا۔“

”آئندہ مجھ سے سوچ سمجھ کر بات کیجیے گا۔“ پھر اچانک وہ چاروں طرف دیکھ کر بولے۔ ”کافی دیر ہو گئی، شعیب مرزا صاحب نہیں پہنچے۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”ارے کہیں ٹریفک میں پھنس گئے ہوں گے۔ یا کوئی اور مصروفیت نکل آئی ہو گی۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ دراصل مغلوں کی ان ہی آرام طلبیوں نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کیا ہے۔“ پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ ”کاش میں اس زمانے میں ہوتا تو مغلیہ سلطنت کو ختم نہیں ہونے دیتا۔“

یکایک آواز آئی۔ ”السلام علیکم۔“

پلٹ کر دیکھا تو مرزا صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔

خان صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا ”آپ کب آئے؟ آپ نے ہماری باتیں تو نہیں سنیں۔“

”آپ لوگوں کی عبرت ناک باتیں سن کر دل بہت رنجور ہوا۔“

”یعنی رنجیدہ ہو گئے۔“

”مگر رنجور کیوں ہوئے؟“

بولے ”دراصل جب انسان غم سے چور چور ہو جائے تو اس کو رنجور کہتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”ویسے ان کو تو ”رن چور“ کہنا چاہیے۔“

کہنے لگے۔ ”آپ زیادہ قابلیت نہ بگھاریے۔ اگر میں نے اردو خوب پڑھی ہوتی تو آج یہ باتیں نہ سنتا۔ دراصل میں اردو کے مضمون اور گرامر میں ہمیشہ کمزور تھا۔“

”تو پھر آپ کون سے مضمون میں طاقتور تھے؟“

”حضرت چھوڑیے یہ باتیں۔ آئیے پہلے ناشتا کرتے ہیں پھر آپ کو استنبول کی سیر کرائیں گے۔“

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے سوال کیا۔ ”اب کہاں سے شروع کریں؟“

”کیا مطلب۔ آپ دوبارہ ناشتا شروع کرنا چاہتے ہیں۔“

”نہیں محترم یہ پوچھا ہے کہ پہلے آپ کیا دیکھنا پسند کریں گے؟“

بٹ صاحب نے ہاتھ اونچا کر دیا۔ ”میں استنبول کی سات پہاڑیاں دیکھنا چاہتا ہوں جس پر یہ شہر آباد ہے۔“

مرزا صاحب شرمندگی سے بولے ”وہ تو خود میں نے بھی نہیں دیکھیں۔ چھوڑیے۔ پہاڑیوں کو دیکھ کر کیا کریں گے۔ ساری پہاڑیاں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ پہاڑ دیکھنے کا شوق ہے تو ماؤنٹ ایورسٹ جا کر دیکھ لیجیے۔“

”مگر ماؤنٹ ایورسٹ کی سات پہاڑیوں پر کوئی شہر آباد نہیں ہے۔“

خان صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ناراضی سے بولے۔ ”کیا ہم لوگ ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں کرنے آئے ہیں؟ ہوٹل سے باہر تو نکلیے۔ فیصلہ خود ہی کر لیں گے۔“

ہم لوگ ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ بہت چہل پہل تھی۔ استنبول کو یورپ اور مشرق کی آمیزش کہنے کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ شہر پر کسی مغربی ملک کا گمان گزر رہا تھا لیکن مشرقی انداز اور طور طریقے بھی یہاں رائج ہیں۔ جینز نے اب اسکرٹ کی جگہ لے لی ہے۔ ترشے ہوئے بال۔ جدید انداز کی چال، لیکن نمایاں بات یہ دیکھی کہ عموماً خواتین کا انداز شرمیلا تھا۔ وہ مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے گریز کرتی تھیں۔

شعیب صاحب بولے۔ ”یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ آپ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں یہ

سلطان احمت (احمد) کا علاقہ کہلاتا ہے۔ یہ بہت مشہور جگہ ہے جہاں بہت سی مشہور اور قابل دید یادگاریں موجود ہیں۔'' انہوں نے بتایا کہ سلطان احمد مسجد، غالباً دنیا کی واحد مشہور اور بڑی مسجد ہے جس کے چھ مینارے ہیں۔ اس زمانے میں صرف شاہی خاندان کے افراد یا بادشاہ ہی مسجد بنوا سکتے تھے۔ یعنی ہمارے ملک جیسا حال نہ تھا کہ جو شخص جہاں چاہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالیتا ہے اور امام و خطیب بن کر اپنے ہم عصروں سے محاذ آرائی شروع کر دیتا ہے۔ اس زمانے میں شاہی خاندان کی بنوائی ہوئی مساجد میں مینار بادشاہ کے ورثاء کی تعداد کے مطابق رکھے جاتے تھے۔

بلیو مسجد سات سال کی شب و روز محنت کے بعد مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر 1609ء میں شروع ہوئی تھی اور یہ 1616ء میں مکمل ہوئی۔ اس مسجد کو بلیو مسجد شاید اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے فرش کے ٹائیلز کا رنگ نیلا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے قدموں تلے نیلا سمندر ہے۔ کیونکہ درودیوار کا رنگ فرش پر بکھرا ہوا ہے۔ مسجد کے اندر جا کر غور سے جائزہ لیں تو اس زمانے کے ماہرین تعمیر کے کمالات نظر آتے ہیں۔ عمارت کے درمیان میں چھت پر ایک بہت بڑا گنبد ہے جو شہر کے بہت سے علاقوں سے نظر آتا ہے۔ اس گنبد کے آس پاس والے گنبد بتدریج سائز میں چھوٹے ہیں۔ بڑا گنبد ان چھوٹے گنبدوں کے درمیان میں گھرا ہوا عجب منظر پیش کرتا ہے۔ مسجد کی چھت پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں پھول، درخت اور قرآن پاک کی آیات نمایاں نظر آتی ہیں۔

بلیو مسجد کے سامنے بازنطینی دور کا ''ہپوڈرام'' ہے۔ یہاں کسی زمانے میں رتھوں کی ریس ہوا کرتی تھی۔ میدان کے درمیان میں ایک مینار نما کھمبا سا کھڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ یادگار اہل فارس یہاں لائے تھے۔ دراصل یہ مصر میں بنایا گیا تھا۔ یہ بھی قدیم زمانے سے اپنی جگہ ایستادہ ہے۔ اس کی شکل سانپ جیسی ہے اس کو دیکھنے والوں کا ہر وقت مجمع لگا رہتا ہے۔ بٹ صاحب تصویر بنانے کے بہانے سیاحوں کے اس ہجوم میں گھسے رہتے تھے کیونکہ یہاں مغربی خواتین کی بہت بڑی تعداد تھی۔ خان صاحب نے انہیں بلایا بلکہ کھینچ کر لائے۔ ''بٹ صاحب آپ کی لاحول اور نیکی کہاں گئی۔ آپ غیر محرم عورتوں کے جمگھٹے میں کیا کر رہے تھے۔''

''تمہاری تو عادت ہی شک کرنے کی ہے۔ خدا جانے بھابی تمہارے ساتھ کیسے گزارہ کرتی ہیں۔ بھائی جان میں تو وہاں اس لیے گیا تھا کہ ایک گائیڈ سب کو معلومات فراہم کر رہا تھا۔ میں نے مفت میں یہ معلومات حاصل کر لیں۔''

مرزا صاحب نے کہا۔ ''بٹ صاحب۔ ان گائیڈز کی باتوں پر یقین نہ کیجیے۔ یہ اپنی طرف سے بھی بہت سی من گھڑت داستانیں شامل کر دیتے ہیں۔''

''تو پھر جھوٹ کا گناہ تو ان ہی پر ہوگا۔ ہم تو معصوم پردیسی ہیں۔ وہ جو بھی من گھڑت واقعات سناتے ہیں ہم ان پر یقین کر لیتے ہیں۔''

اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آیا غالباً 1966ء میں جب سندھ میں گڈو بیراج کا افتتاح ہوا تو سارے ملک کے صحافیوں کے وفد بلائے گئے جن میں پنجاب کے صحافی زیادہ تھے۔ سندھیوں کی مدارات اور نرم مزاجی کا نمونہ ہم نے پہلی بار وہاں دیکھا۔ ہر شخص ہر تقریب میں یوں مل رہا تھا جیسے برسوں سے واقف ہوں۔

پاکستان کے مشہور و معروف قانون داں اے کے بروہی کے چھوٹے بھائی۔ علی احمد بروہی اس زمانے میں سندھ کے محکمۂ اطلاعات میں تھے۔ بہت بے تکلف اور خوش مزاج انسان تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ انہیں صحافیوں کے ساتھ گائیڈ مقرر کیا گیا تھا۔ علی احمد بروہی نان اسٹاپ بولتے تھے اور ایک بار بریک لگانے سے بھی نہیں رکتے تھے۔ انہوں نے ہمیں سندھ کے مختلف معروف مقامات دکھائے اور ان کے بارے میں بڑی روانی سے واقعات اور کہانیاں بیان کرتے رہے۔ ہم سب بہت مرعوب اور حیران تھے کہ اس شخص کی معلومات کتنی زیادہ ہیں اور حافظہ ایسا کہ ریت کے ذرے ذرے کے بارے میں جانتے تھے۔

جب دو تین دن گزر گئے اور ہم لوگ مختلف سرکاری اور وڈیروں کی پرتکلف دعوتوں اور اظہار محبت سے شرابور ہو چکے تو ہم سب کی آخری منزل کراچی تھی۔ یہاں ہمیں ایک ہی جگہ ٹھہرایا گیا تھا مگر ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق گھومنے پھرنے کی آزادی بھی تھی۔

ہمارا ٹھکانا عموماً شام کے بعد ہمارا ہوٹل اور دن کے وقت ہفت روزہ ''نگار'' کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ نگار کے مالک و مدیر الیاس رشیدی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بہت صاف دل، صاف گو اور تواضع کرنے والے روایت پسند انسان تھے۔ ان کے دفتر میں سارے دن کراچی کے

فلمکاروں، اداکاروں، ہنرمندوں، شاعروں اور صحافیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ لاہور سے آنے والے صحافی اور فن کار بھی سارے دن اس دفتر میں چائے پیتے رہتے تھے۔ دوپہر کو لنچ بھی فراہم کیا جاتا تھا جو عموماً کباب، نان، اور بریانی پر مشتمل ہوتا تھا۔ الیاس بھائی کے گھر سے جو کھانا آتا تھا وہ مہمان ہضم کر لیتے تھے۔ اس کے بعد الیاس بھائی کا یہ روز کا معمول تھا کہ ادیبوں کے بچے ہوئے ٹکڑوں کو ملتے رہتے تھے اور پھر یہ لنچ عقبی کھڑکی سے باہر والی دکان کی چھت پر ڈال دیا جاتا تھا۔ لنچ کے مقررہ وقت پر بے شمار پرندے اس چھت پر اکٹھے ہو جاتے تھے۔

الیاس بھائی کے قریبی بے تکلف اور ہر روز آنے والے دوستوں میں ابراہیم جلیس اور طفیل احمد جمالی شامل تھے۔ (کئی سال قبل) وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد الیاس بھائی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے ہم جب کراچی جاتے تو ہمارا شمار بھی ان لوگوں میں ہونے لگا جنہیں ابراہیم جلیس الیاس بھائی کے نورتن کہتے تھے۔ ان نورتنوں کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی مگر مجلس اسی طرح سجائی جاتی تھی۔ ان نورتنوں میں ابراہیم جلیس صاحب کی سفارش پر علی احمد بروہی کو بھی شامل کر لیا گیا۔

جب نورتن اکٹھے ہوتے تھے تو لطیفہ بازی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ الیاس بھائی اس دوران میں اپنا کام کرتے رہتے۔ ٹیلی فون سنتے یا پھر نورتنوں کی باتوں پر ہنستے رہتے۔ وہ گفتگو میں حصہ نہیں لیتے تھے۔

احمد علی بروہی سے ہماری ایسی دانت کاٹی دوستی ہوئی کہ تمام عمر قائم رہی۔ ہم جب بھی کراچی جاتے تھے بروہی صاحب سے ضرور ملتے تھے۔ آخری دنوں میں وہ ریٹائر ہونے کے بعد شیخ زاید کمپلیکس کے انچارج تھے۔ باقاعدہ ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ پیشانی پر گٹا بھی پڑ گیا تھا۔ نماز تو سبھی پڑھتے ہیں مگر پیشانی پر محراب یا گٹا ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔

ایک بار ہم بروہی صاحب سے ملنے گئے، باریش اور مذہب سے نزدیک ہونے کے باوجود ان کے فلک شگاف قہقہے پہلے ہی کی طرح بلند ہوا کرتے تھے۔

انہوں نے ہمیں زبردستی لنچ کھلایا اور پرانے دنوں اور پرانے لوگوں کی یادیں تازہ کرتے رہے۔

ہم نے موقع پا کر پوچھا۔ ''بروہی صاحب، ایک بار ایمانداری سے یہ بتائیے کہ آپ نے بطور گائیڈ جو بے شمار اور مسلسل معلومات ہمیں فراہم کی تھیں وہ آپ نے کیسے حاصل کی تھیں اور آپ کو یہ سب کچھ حرف بحرف یاد کیسے رہا تھا؟''

احمد علی بروہی مسکرائے اور بولے۔ ''اب آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دیتا ہوں۔ دراصل مجھے کچھ بھی علم نہ تھا۔ بس تھوڑی بہت معلومات تھیں جو کتابوں میں پڑھی تھیں یا اخباروں میں نظر سے گزری تھیں۔ دراصل میں نے آپ لوگوں کو جو کچھ بتایا وہ سب درست تھا لیکن صرف دس فیصد۔ باقی قصے کہانیاں ہیں، خود ہی گھڑ کر سناتا رہا اور جب آپ لوگ متاثر نظر آتے تو میں اپنی طرف سے قصوں کہانیوں میں اضافہ کر دیا کرتا تھا اور آپ سب یقین بھی کر لیتے تھے۔ دراصل دنیا بھر میں گائیڈ یہی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ وہ چونکہ پیشہ ور گائیڈز ہوتے ہیں اور ہر روز سیاحوں کو اطلاعات دیتے رہتے ہیں اس لیے یہ سب انہیں زبانی یاد ہو جاتا ہے۔ اگر آج میں آپ کو وہی معلومات فراہم کروں تو ان میں کافی تبدیلی ہوگی۔ بلکہ شاید میں اس بار نئے قصے اور کہانیاں گھڑ کر سنا دوں۔''

خواتین و حضرات جو غیر ملکی سفر اور سیاحت پر جانا چاہتے ہیں انہیں یہ بات گرہ میں باندھ لینی چاہیے۔ اگر کسی سفر میں ٹریول ایجنٹ نے آپ کو گائیڈ کی سہولت فراہم کی ہے تو یہ پیشکش فوراً قبول کر لیجیے لیکن اگر کسی ملک میں آپ کو کوئی پیشہ ور گائیڈ اپنی خدمات پیش کرے تو اس سے استفادہ کرنے میں ہرج نہیں ہے۔

جہاں تک بٹ صاحب جیسے سیاحوں کا تعلق ہے انہیں گائیڈ کی معلومات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ یہ محض خوش وقتی طور پر دلچسپی کی خاطر گائیڈز کے ہجوم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کئی مقامات پر بیک وقت مختلف سیاحوں کی پارٹیوں کو مختلف گائیڈز معلومات فراہم کرتے ہیں ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ بٹ صاحب نے اس کے یہ اصول بتائے ہیں۔

1۔ اگر کسی مقام پر ایک سے زائد گائیڈز ہوں تو آپ کے لیے پہلا اصول یہ ہے کہ یہ دیکھیے کہ۔

1۔ جس پارٹی کے ساتھ خاتون گائیڈ ہے۔ اس کے ساتھ شامل ہونے کو اولین ترجیح دیجیے۔

2۔ اگر کسی جگہ ایک سے زائد خواتین گائیڈز نظر آئیں تو سب سے زیادہ خوش شکل گائیڈ کی پیروی کیجیے۔

3۔ اگر خواتین گائیڈز (بدقسمتی سے) نظر نہ آئیں تو

پھر اس پارٹی میں شامل ہوجایئے جس میں دلکش اور مغرب زدہ فیشن کی دلدادہ سیاحوں کی اکثریت ہے۔

4۔ گائیڈز جس وقت اطلاعات فراہم کرے تو اس سے ہرگز کوئی سوال نہ کیجیے ورنہ آپ اس کی نظر میں آسکتے ہیں اور وہ دریافت کرے گا کہ آپ کون سے "ٹور" والوں کے ساتھ ہیں اس طرح آپ کی چوری پکڑی جائے گی۔

5۔ اگر فالتو وقت میسر ہو تو کسی ایک ہی سیاحتی مقام پر مختلف گائیڈز کی پارٹیوں میں شرکت کرکے یہ معلوم کیجیے ان کے بیانات میں کتنا فرق ہے۔ اس طرح آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ چند بنیادی اہمیت کی معلومات کے سوا ہر گائیڈ کے قصے کہانی میں فرق ہوگا۔ مثلاً ایک گائیڈ آپ کو بتائے گا کہ اس جھیل میں دو محبت کرنے والے ڈوب کر مر گئے تھے۔ اس کے بعد کوئی سیاح اس خوبصورت جھیل میں قدم تک نہیں رکھتا۔ ان کے لیے فاتحہ یا دعا کرتا ہے۔ خدا جانے اس فاتحہ یا دعا کا فائدہ کس کو پہنچتا ہے۔ ممکن ہے کہ فرشتے اس کا ثواب کسی اور ضرورت مند کے حساب میں شامل کردیں۔

اس جھیل کے بارے میں دوسرا گائیڈ آپ کو بتائے گا کہ اس شہر میں ایک بہت خوبصورت شہزادی رہتی تھی جو اس وادی میں سیر کیا کرتی تھی اور اپنے من پسند گانے بھی گایا کرتی تھی۔ ایک دیو کا اس طرف سے گزر ہوا تو وہ شہزادی کے گانے اور شکل وصورت دونوں پر بیک وقت عاشق ہوگیا۔ پہلے تو وہ چپکے چپکے آکر شہزادی کو دیکھتا رہتا تھا اور اس کا گانا سن کر مدہوش ہوجاتا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ ایک دن وہ ایک خوبصورت شہزادے کے روپ میں اس وادی میں آیا۔ وادی بھی بہت خوبصورت تھی اور وہاں شہزادی بھی ڈیکوریشن کی حیثیت سے موجود تھی۔ دیو نے ایک انتہائی خوبصورت شہسوار شہزادے کا روپ اختیار کیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ساتھ ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے۔ اس کے بعد شہزادی نے دن میں کئی بار وادی کی سیر شروع کی تو ملکہ فکر مند ہوگئی۔ اس نے ایک دن چپکے سے شہزادی کا پیچھا کیا اور وادی میں اس کو ایک خوبصورت شہزادے کے سامنے رومانٹک گانا گاتے ہوئے دیکھا تو آگ بگولہ ہوگئی۔ اس نے یہ بات بادشاہ کو بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ملکہ سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ یہ اس کی 62 ویں ملکہ تھی اور بہت لاڈلی تھی، کافی دیر تک وہ سوچ میں گم رہا۔ ملکہ کا خیال تھا کہ شاید وہ شہزادی اور اس کے محبوب کو سخت سے سخت سزا دینے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ ملکہ یہ تصور کرکے بہت خوش تھی چونکہ وہ اس شہزادی کی سوتیلی ماں تھی اور بادشاہ اپنی اس بیٹی سے بہت محبت کرتا تھا جس کی وجہ سے ملکہ اس سے حسد کرتی تھی۔

جب بادشاہ دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا تو ملکہ سمجھی کہ شاید وہ بہت غضبناک ہوگیا ہے اور شہزادی کو کڑی سزا دینے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ لیکن شاہی ادب کی وجہ سے ملکہ نے بادشاہ کو ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ نے آنکھیں کھولیں اور مسکرایا۔

ملکہ نے حیرت سے پوچھا "عالم پناہ آپ مسکرائے کیوں؟"

"اس لیے کہ مابدولت بہت خوش ہوئے۔ دیکھو ملکہ۔ آخر اپنی بیٹی کی شادی تو ہمیں کرنی ہی ہے۔ اگر یہ کسی طاقتور اور خوشحال ملک کا شہزادہ ہے تو اسی کے ساتھ کیوں نہ شادی کردی جائے۔"

ملکہ کو اپنی تدبیر الٹ جانے کا بہت صدمہ ہوا مگر حکم شاہی کے سامنے مجبور تھی۔ پھر بھی اس نے پوچھا۔ "آخر شہزادے کے خاندان، چال چلن اور مالی حالات کے بارے میں بھی تو معلومات کرنی چاہئیں۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی بہروپیا ہو اور ہمیں دھوکا دے رہا ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ خیر چال چلن تو سب شہزادوں کا ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ مابدولت بھی نوجوانی میں ایسے ہی تھے۔"

ملکہ نے کہا۔ "لیکن پہلے شہزادی سے اس کی رضامندی تو معلوم کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے محض فلرٹ کررہی ہو؟"

"ٹھیک مشورہ دیا ہے آپ نے۔" بادشاہ نے فوراً شہزادی کو طلب کیا اور اس سے اس بارے میں دریافت کیا۔ شہزادی نے شرما کر سر جھکالیا اور کہا "جیسی آپ کی مرضی ابا حضور۔"

دوسرے دن بادشاہ اور ملکہ شہزادی کے ساتھ وادی میں گئے اور درختوں کے پیچھے چھپ گئے۔ شہزادی کو دیو (یعنی شہزادے) نے جادوئی انگوٹھی دی تھی جس کے ذریعے وہ جب چاہے اس سے بات کرسکتی تھی۔

شہزادی نے انگوٹھی سے کہا "ہیلو!"

دیو نے فوراً جواب دیا۔ اس سے پہلے کبھی شہزادی نے دیو سے فون پر، معاف کیجیے، انگوٹھی کے ذریعے بات نہیں کی تھی اس لیے وہ خوشی سے پاگل ہوگیا۔

"مجھے کیسے یاد کیا شہزادی؟"

"تم فوراً اسی وقت ہمارے رومانی مقام پر پہنچ جاؤ۔"

"بس میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

"وقت نہیں ہے۔ اس وقت جس حال میں بھی ہو میرے چٹکی بجاتے ہی آجاؤ ورنہ......"

دیو بے چارہ گھبرا گیا۔ محبوبہ نے پہلی بار انگوٹھی کے ذریعے کوئی فرمائش کی تھی۔ لہٰذا ٹالنا یا دیر کرنا ممکن نہ تھا۔ ادھر شہزادی نے چٹکی بجائی اور ادھر دیو موجود ہوگیا۔ شہزادی نے کبھی دیو نہیں دیکھا تھا اتنا لمبا چوڑا، بدشکل شخص محض لنگوٹی پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دراصل شہزادی کا پیغام ملا تو دیو غسل کرنے جارہا تھا مگر محبوبہ کے اصرار پر جس حالت میں تھا فوراً حاضر ہوگیا۔ دیو نے اپنی گونجدار ڈراؤنی آواز میں پوچھا۔ "کیا حکم ہے میرے آقا۔"

شہزادی تو پہلے ہی بے ہوش ہوچکی تھی۔ بادشاہ اور ملکہ بھی ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے۔ جب دیو کی آواز ساری وادی میں گونجی تو بھونچال آگیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوکر گرنے لگے۔ موسلا دھار بارش اور برفباری شروع ہوگئی۔ دیو ہکا بکا کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا مگر اب اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وادی نے ایک جھیل کی شکل اختیار کرلی۔ پانی دیو کے گھٹنوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے فوراً راہ فرار اختیار کی اور غائب ہوگیا۔ یہ اس خوبصورت جھیل کی کہانی ہے۔ لڑکیاں آج بھی شہزادی کے گائے ہوئے گیت گاتی ہیں اور یہ کہانی گھر گھر پہنچ گئی ہے۔"

ایک بڑی بی نے سوال کیا۔ "اگر وہ سچ مچ کا دیو تھا تو شہزادی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔"

گائیڈ۔ "دراصل میڈم وہ اس ناگہانی آفت سے گھبرا گیا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔"

"دیو کو گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر دیو کا تو ذہن ہی نہیں ہوتا تو وہ ماؤف کیسے ہوگیا تھا۔"

ایک سیاح پروفیسر بولے "سوری مداخلت کررہا ہوں۔ جدید سائنس بتاتی ہے کہ دیو کے سر میں بھی ذہن ہوتا ہے۔"

کسی نے پوچھا۔ "آپ نے کبھی کسی دیو کو دیکھا ہے؟"

"ہاں ہاں، کئی بار۔"

"وہ کیسا تھا۔ آپ نے اس کو کہاں دیکھا تھا؟"

"میں نے کئی فلموں میں دیو کو دیکھا ہے۔ بچپن میں میری مما کہتی تھی کہ بڑا ہوکر میں بھی دیو بنوں گا۔"

ایک بچے نے پوچھا۔ "مگر وہ کیسا تھا انکل؟"

"جیسے سب دیو ہوتے ہیں۔ چاہو تو تم بھی سی ڈی لاکر دیو کو دیکھ لو۔"

معاف کیجیے۔ بات ذرا طویل ہوگئی۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ گائیڈ سیاحوں کو کس طرح من گھڑت کہانیاں سنا کر بیوقوف بناتے ہیں اور سیاح چونکہ اپنی عقل اپنے ملک میں چھوڑ آتے ہیں اس لیے ان کی باتوں پر حرف بحرف یقین کرلیتے ہیں۔

ایک بار ہم اپنے ایک کراچی سے آنے والے دوست کے ہمراہ اس کو لاہور کے تاریخی مقامات دکھانے لے گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کراچی کا رہنے والا ہے شاید ان تاریخی مقامات کو دیکھ کر حیران رہ جائے گا مگر وہ بہت زیادہ ہوشیار تھا۔

ہم نے کہا۔ "دیکھو یہ بادشاہی مسجد ہے۔ کتنی شاندار اور بڑی ہے۔"

کہا "ساری مسجدیں بادشاہ ہی بنوایا کرتے تھے۔ ہاں بہت بڑی مسجد ہے مگر سنا ہے کہ عید کے موقع پر لوگ مسجد کے باہر تک صفیں بچھا کر نماز پڑھتے ہیں۔"

"تو اس میں کیا ہرج ہے؟"

"اگر یہ واقعی دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے تو اس کے اندر تمام نمازیوں کے لیے جگہ کیوں نہیں ملتی؟" انہوں نے سوال کیا۔

ہم نے کہا "مگر ہے تو بہت شاندار عالیشان۔"

"یار بادشاہ معمولی مسجدیں تو بنواتے ہی نہیں تھے۔ وہ ہر چیز بڑی بنواتے تھے۔ اب یہ سامنے شاہی قلعہ دیکھو۔ اس کا دروازہ کتنا بڑا ہے۔"

"اس لیے کہ یہاں سے ہاتھی گزرتے تھے۔"

"انہوں نے ہاتھیوں کے لیے الگ دروازہ کیوں نہیں بنوایا۔ اگر بنوالیا ہوتا تو وہ بھی ہاتھی گیٹ کہلاتا اور پرانے لاہور کے دروازوں میں ایک اور اضافہ ہوجاتا" پھر بولے "سنا ہے لاہور میں بارہ قدیمی دروازے تھے۔ بھاٹی گیٹ، ٹی گیٹ، لاہوری گیٹ، اکبری گیٹ۔"

ہم نے انہیں ٹوک دیا۔ "بھائی، دروازے پرانے زمانے میں تھے، اب تو چند ہی باقی رہ گئے ہیں۔"

وہ بہت جھگی آدمی تھے۔ بولے "تو پھر باقی دروازے کہاں گئے؟"

ہم نے بات مختصر کرنے کے لیے کہا۔"ان میں دیمک لگ گئی تھی۔"

وہ لاجواب ہوگئے۔

"دریائے راوی کسی زمانے میں قلعے کی دیواروں کے نزدیک تھا۔"

"اس وقت تو نظر نہیں آرہا۔"

"اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔اب راوی کو دیکھنے کے لیے کافی دور جانا پڑتا ہے اور ہاں۔یہ سامنے تمہیں نالہ ٹائپ جو چیز نظر آرہی ہے اس کو بڈھا راوی کہتے ہیں۔"

انہوں نے غور سے اس نالے کو دیکھا۔"واقعی کافی بڈھا نظر آتا ہے۔مگر جوان دریا اس کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔یہ دریا بھی انسانوں کی طرح بے مروت ہوتے ہیں۔بڑھاپے میں والدین کو اکیلا اور بے سہارا چھوڑ جاتے ہیں۔"

لاہور کی مال روڈ پر ہم نے انہیں عجائب گھر، این سی اے، پنجاب یونیورسٹی کا پرانا کیمپس اور دوسری تاریخی یادگاریں دکھائیں۔

انہوں نے کسی طرف دھیان نہیں دیا۔البتہ پرانے کیمپس کے سامنے ایک بڑی سی توپ نصب دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔"کتنی شاندار اور بڑی توپ ہے۔کیا یہ اصلی ہے؟"

"ہاتھ سے چھو کر دیکھ لو۔بھائی یہ سچ مچ کی توپ ہے۔"

"مگر یہاں کیوں رکھی ہے؟ کیا پہلے شاہی قلعہ یہاں تھا؟"

ہم ہنسنے لگے۔"یہ تاریخی توپ ہے۔کئی جنگوں میں کام آئی ہے اور اس کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی ہے۔اس کو بھنگیوں کی توپ کہتے ہیں۔"

کہنے لگے۔"چھی چھی۔اتنی گندی چیز یہاں سجا کر رکھی ہے۔"

انارکلی بازار دیکھ کر وہ خوش نہیں ہوئے۔"اتنا رش، اتنا ہجوم، کاریں، ریڑھے، سائیکلیں، موٹر سائیکلیں۔باہر لکھا ہے یکطرفہ ٹریفک، ایک سپاہی بھی سامنے کھڑا ہے مگر کوئی پابندی نہیں ہے۔اب تم مجھے انارکلی کا مقبرہ دکھاؤ۔"

ہم نے کہا۔"انارکلی کا مقبرہ یہاں نہیں ہے۔"

"عجیب بات ہے۔پھر یہ انارکلی بازار کیوں کہلاتا ہے جبکہ مقبرہ ہی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا۔"مقبرہ تو ہے مگر وہ قطب الدین ایبک کا مقبرہ ہے۔"

"تو کیا ان کی جگہ تبدیل کردی گئی ہے؟ بھئی یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک کے مقبرے میں انارکلی اور انارکلی کے مقبرے میں قطب الدین ایبک۔"

"مقبرے نہیں بدلے۔دونوں کی میتیں اپنی اپنی جگہ ہیں۔"

وہ سوچ کر بولے۔"ٹھیک ہی تو ہے۔انارکلی کا مقبرہ تو جہانگیر کے مقبرے کے ساتھ ہوگا۔" ان کے عجیب وغریب سوالوں اور اپنے بے ڈھنگے جوابوں سے ہم خود بھی اکتا گئے مگر بتانا تو لازمی تھا۔

ہم نے بتایا۔"انارکلی کا مقبرہ سول سیکریٹریٹ میں ہے۔"

وہ حیران رہ گئے۔"سول سیکریٹریٹ سے انارکلی کا کیا تعلق؟ وہ کوئی چیف سیکریٹری وغیرہ تو نہیں تھی۔خیر۔وہ جہاں بھی ہے مجھے انارکلی کا مقبرہ دکھادو۔"

"سوری۔آج نہیں دیکھ سکتے۔"

"کیا صرف جمعرات کو ہی دیکھ سکتے ہیں؟"

ہم نے انہیں سمجھایا۔"آج اتوار ہے اور سول سیکریٹریٹ بند ہے۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہے۔" وہ غمگین ہوکر بولے۔

"تم یہ بتاؤ کہ انارکلی سے تمہارا کوئی رشتہ ہے کیا جو اس کا مقبرہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہو۔"

کہنے لگے۔"دراصل بات یہ ہے کہ مجھے جب فلم دیکھنے کی اجازت ملی تھی تو میں نے سب سے پہلی فلم "انارکلی" ہی دیکھی تھی اور منت مانی تھی کہ جب بھی موقع ملا اس کے مقبرے پر جاکر فاتحہ ضرور پڑھوں گا۔"

ہم نے کہا"تم تو اب بھی اتنے ہی بیوقوف ہو جتنے کہ پہلے تھے مگر لگتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ تمہاری بیوقوفی بھی بڑھ گئی ہے۔"

"اچھا۔یہ بحث چھوڑو مجھے جہانگیر اور نور جہاں کے مقبرے تو دکھادو۔"

ہم انہیں شاہدرے لے گئے۔مقبرے کو دور سے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔"یہ ٹوٹی پھوٹی تاریخی بلڈنگ کیا ہے۔"

"یہ جہانگیر کا مقبرہ ہے۔"

وہ ہکا بکا ہمارا منہ دیکھتے رہے۔پھر بولے۔"یار تم لوگ بھی عجیب ہو۔بھنگیوں کی توپ کو تو ایسا بنا سجا کر رکھتے ہو اور اتنے بڑے شہنشاہ کے مقبرے کو جنگل میں توڑ پھوڑ کر رکھا

ہے۔بڑے افسوس کی بات ہے۔ہم لوگ بھی خوب ہیں اپنے عظیم لوگوں کو اہمیت نہیں دیتے اور بھنگیوں کی توپ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔تعجب ہے کہ جہانگیر نے یہ کیسے برداشت کرلیا۔"

"اس لیے کہ وہ مرچکا تھا۔" ہم نے کہا۔"اور یہ مقبرہ اس کے مرنے کے بعد بنایا گیا تھا۔"

وہ بولے"خیر۔جو بھی ہوا غلط ہوا۔آؤ اندر چل کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔"

جہانگیر کے مقبرے کے ساتھ لاہور کی انتظامیہ نے دشمنوں جیسا سلوک کیا ہے۔مقبرے کی عمارت جو کبھی پرشکوہ ہوتی ہوگی اب ایک مسمار زدہ پرانی عمارت میں بدل گئی ہے۔جہانگیر کو باغات بنوانے کا بہت شوق تھا مگر اس کے مقبرے کے آس پاس باغ تو کیا لان تک نہیں۔خود رو (گھاس) ہر طرف ویرانی کا منظر پیش کرتی ہے۔بقول غالب"اُگ رہا ہے درودیوار سے سبزہ غالب۔"

ہم دونوں نے فاتحہ پڑھی اور کافی دیر تک اداس بیٹھے رہے۔مقبرے کی چاردیواری کے اندر لوگوں نے مکانات اور جھگیاں بنالی ہیں جہاں بھینسیں بھی پالی ہیں۔یہ بدبو بھی ناقابل برداشت ہے جہانگیر جیسا نازک مزاج بادشاہ جس نے شاید زندگی میں کبھی بدبو سونگھی بھی نہ ہوگی مرنے کے بعد ہر وقت بدبو میں رہتا ہے۔واقعی اللہ بڑا ہے۔انسان کیسا ہی کیوں نہ بن جائے مرنے کے بعد نشانِ عبرت بن کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے دوست کی آنکھوں میں آنسو تھے۔"ارے تم تو مقبرے کی حالت دیکھ کر رونے لگے؟"

بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔"مقبرے کی حالت پر نہیں مسلمانوں کے زوال پر رورہا ہوں۔" اس اجڑے دیار سے غمگین ہوکر باہر نکلے تو ہمارے دوست نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔پوچھا۔"نور جہاں کا مقبرہ کہاں ہے۔"

سابق ملکۂ ہند نور جہاں کے مقبرے کی خستہ حالی بھی عبرت ہے۔

ہم دونوں خاموش اندر داخل ہوئے اور فاتحہ پڑھی۔عمارت پر درج تحریر بھی حسب حال تھی۔یہ شعر فارسی زبان میں ہے چونکہ اس زمانے میں ہندوستان میں فارسی ہی بولی جاتی تھی۔لکھا تھا۔

"برمزارِ ما غریباں، نے چراغے نے گلے......

ترجمہ: مجھ غریب کے مزار پر نہ کوئی چراغ جلاتا ہے

نہ پھول چڑھاتا ہے۔نہ کوئی پروانہ جان دینے کے لیے آتا ہے اور نہ ہی بلبل کی آواز سنائی دیتی ہے۔

شام ڈھل رہی تھی اور مقبرے کے اندر اور باہر تاریکی پھیلنے لگی تھی۔نہ کوئی سیاح تھا نہ فاتحہ پڑھنے والا۔کچھ فاصلے پر ایک دیہاتی لڑکا اپنی بکریاں ہانکتا ہوا لے جارہا تھا۔

یہ جملۂ معترضہ قدرے طویل ہوگیا۔مگر بات سے بات نکل ہی آتی ہے۔ہوٹل سے باہر نکل کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تاکہ ٹیکسی حاصل کریں یکایک بٹ صاحب کی دھیمی زیرلب آواز آئی۔"سبحان اللہ۔"

پلٹ کر دیکھا تو چار لڑکیاں ہنستی بولتی ہوئی جارہی تھیں۔لباس ان کا بھی مغربی تھا۔ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا۔"کیا لاحول بھول گئے۔ویسے تو ہر وقت اور ہر جگہ لاحول پڑھتے رہتے تھے۔"

کہنے لگے۔"یہ اسلامی ملک ہے۔اور آپ نے دیکھا نہیں کہ لڑکیاں کیسی سادگی سے باتیں کرتی ہوئی جارہی تھیں۔ویسے آفاقی صاحب۔سچ تو یہ ہے کہ یہاں عریانی اور بے ہودگی زیادہ نہیں ہے۔شاید اس وجہ سے کہ شہر کا آدھا حصہ مشرق میں اور آدھا مغرب میں ہے۔اس لیے بھی کچھ نرمی سی پیدا ہوگئی ہے دل میں۔"

خان صاحب کی آواز نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔وہ دونوں ایک ٹیکسی کے پاس کھڑے تھے جس پر انگریزی میں لکھا تھا۔"تاکسی" ہم فوراً پہنچ گئے ٹیکسی بہت بڑی اور قیمتی تھی۔ڈرائیور بہت شفیق اور بااخلاق تھا۔اس نے ہم لوگوں سے اچھا لباس پہن رکھا تھا۔سر کے بال برف کی طرف سفید، ترشی ہوئی مونچھیں بھی سفید۔سرخ وسفید رنگ، بڑا بارعب اور شاندار آدمی تھا۔

ہم لوگ ٹیکسی کے پاس پہنچے اور السلام علیکم کہا، جواب بھی یہی ملا۔

اس نے آگے بڑھ کر ہم دونوں سے ہاتھ ملایا۔"مرحبا!"

ہم دونوں نے بھی کہہ دیا۔"مرحبا!"

ٹیکسی میں بیٹھ کر خان صاحب نے خبر دی کہ ٹیکسی ڈرائیور کو صرف ترکی زبان آتی ہے۔

ترکی میں ہم نے دیکھا کہ صرف ترکی زبان ہی بولی جاتی ہے۔انگریزی جاننے والے برائے نام ہی ملتے ہیں۔ان کا انگریزی تلفظ اور لب ولہجہ بھی مغربی انداز کا ہے۔

شعیب مرزا نے پوچھا۔"کہاں چلنا ہے۔بابا انتظار

کرر ہا ہے۔ استنبول قابل دید مقامات اور یادگاروں سے بھرا پڑا ہے۔ اور ہر جگہ دیکھنے کے قابل اور حیران کر دینے والی ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

شعیب مرزا نے کہا "بلیو مسجد تو آپ نے دیکھ ہی لی۔ یہ شہر کے سب سے بلند حصے پر بنائی گئی ہے۔"

بٹ صاحب بول پڑے۔ "دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ استنبول سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔ ایک پہاڑی تو آپ نے دیکھ ہی لی۔ باقی چھ بھی نظر آجائیں گی۔"

ہم نے کہا۔ "بھئی فیصلہ تو کرو۔ کیا ہم نے صرف بیٹھنے کے لیے ٹیکسی روکی ہے؟"

شعیب مرزا نے کہا۔ "دراصل غلطی میری ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ مقامات کے بارے میں بتاتا۔ فی الحال چند مقامات بتاتا ہوں۔ باقی کا پھر فیصلہ کرلیں گے۔"

کچھ فاصلے پر ہیگا صوفیہ ہے۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال پرانا گرجا گھر ہے مگر دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ سلطان احمد پارک کے نزدیک ہے۔ ایک زمانے میں یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین تنازعہ کا سبب بھی رہا ہے اور یہ مسجد کے طور پر بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ بہت سے ترک آج بھی اسے مسجد کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس عمارت کے ساتھ المناک واقعات وابستہ ہیں۔ بازنطینی دور میں یہ چرچ یا گرجا گھر کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ سن 536ء تھا۔ اس سے پہلے پہلا چرچ بازنطینی شہنشاہ قسطنطین نے بنوایا تھا جو 404 عیسوی میں جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اس مقام پر دوسرا چرچ بنایا گیا مگر 532 عیسوی میں مظاہرے اور فسادات شروع ہوئے تو لوگوں نے اس کو نذر آتش کر دیا جس کے بعد 536 عیسوی میں موجودہ شاندار اور خوبصورت چرچ تعمیر کیا گیا۔ یہ بازنطینی دور کے واقعات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چرچ کی موجودہ عمارت یونانی ماہرین نے بنائی تھی۔ رات کے وقت یہ چرچ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ ماہرین نے اس کی دیواریں باریک سنگ مرمر سے بنائی ہیں، رات کے وقت عمارت میں روشنی رہتی تھی اور سنگ مرمر کی ان جالیوں سے باہر نکلنے والی روشنی ایک سحر انگیز کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ کسی زمانے میں اس چرچ کے اندر بے شمار شمعیں روشن کی جاتی تھیں۔ ممکن ہے کسی مشعل کی آگ نے عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر دیا ہو۔ سلطنتِ عثمانیہ کے عہد میں اس عمارت کو مسجد کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن آج کل یہ ایک میوزیم اور شہر کی انتہائی حسین یادگار ہے۔

اس عمارت کے بارے میں کئی داستانیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر عمارت کے ستونوں سے جسم کو رگڑا جائے تو ہر قسم کا درد جاتا رہتا ہے۔ آج کل بھی سیاح اس کے ستونوں سے جسم رگڑتے ہیں۔ جس خاص جگہ لوگ جسم رگڑا کرتے تھے وہاں پتھروں میں گڑھا پڑ گیا تھا۔ اس "مقدس" مقام کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک پیتل کا فریم اس کے اردگرد بنا دیا گیا ہے۔

مختلف زمانوں میں بادشاہوں نے یہاں بت بھی رکھوا دیے تھے۔ یہ جھگڑا کافی عرصے تک چلتا رہا یہاں تک کہ کمال اتاترک کے زمانے میں اس کو نیشنل میوزیم بنا دیا گیا اور اب اس کو میوزیم ہی کے طور پر جانا جاتا ہے۔

شعیب مرزا نے بتایا کہ میوزیم میں داخلے کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ بٹ صاحب نے فوراً اس کی مخالفت کر دی۔ اول تو انہیں میوزیم دیکھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ دوسرے ان کا کہنا ہے کہ ساری دنیا کے میوزیم ایک ہی جیسے ہوتے ہیں صرف ان میں رکھی ہوئی چیزیں مختلف ہوتی ہیں۔ میوزیم دیکھنے سے بہتر ہے کہ کوئی فلم دیکھ لی جائے۔ وہ کہتے تھے کہ میوزیم کے اندر جا کر موت کا ڈر ہو جاتا ہے۔

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب۔ اگر گناہ کرو گے تو ہر جگہ ڈرو گے۔ میوزیم لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عمارت ہے جو شہر کے ہر حصے سے نظر آتی ہے۔ اس کو استنبول کا "لینڈ مارک" بھی کہا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ فلموں اور تصویروں میں جیسی نظر آتی ہے درحقیقت اصل عمارت اس سے کہیں زیادہ پرشکوہ اور حسین ہے۔ بٹ صاحب نے میوزیم سے باہر نکلتے ہی آئس کریم کھانے کی فرمائش کر دی۔

ہم نے کہا کہ چلیں گے پھریں گے تو ہر جگہ آئس کریم نظر آجائے گی۔ یہاں شاپنگ سینٹر نہیں ہے۔ صرف پڑھے لکھے لوگوں کے لیے میوزیم ہوتے ہیں۔ آپ جیسے کوڑھ مغز لوگوں کے لیے شاپنگ سینٹر اور دوسری تفریح گاہیں ہوتی ہیں۔

گولڈن ہارن بھی ایک مشہور جگہ ہے۔ یہ خنجر کی شکل میں ہے غالباً اسی لیے اس کو گولڈن ہارن کہا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ سلطانوں کے کھیلوں اور شہسواری کے لیے مختص تھا، اس کو شاخ زریں بھی کہا جاتا ہے۔ آج کل یہ ایک وادی ہے جس میں پانی بھی ہے مگر ٹھہرا ہوا ساکن۔ اس پانی میں کوئی جاندار مخلوق زندہ نہیں رہتی۔ شاخ زریں یا گولڈن ہارن کسی زمانے میں قدرتی بندرگاہ تھی۔ عثمانیہ سلطانوں نے اس کو شہر کے دفاع کے لیے بھی استعمال کیا اور شاہی بیڑے کے جنگی جہازوں کی حفاظت کے لیے لوہے کی بہت موٹی زنجیر سے اس کی حد بندی کر دی گئی تھی۔

گولڈن ہارن کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے کچھ فاصلے پر اونچائی پر مسجد ایوب انصاری ہے۔ اس کو ترک مقدس ترین خیال کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں تو عالم اسلام کی اہم ترین زیارت گاہوں میں شامل ہے جہاں فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کے علاوہ غیر ملکی سیاحوں کا بھی تانتا بندھا رہتا ہے۔ حضرت ایوب انصاری کا شمار افضل ترین انصار میں ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی ہمیشہ کوشش رہی کہ قسطنطنیہ کو فتح کیا جائے جسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ 668 عیسوی میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے ایک عرب لشکر بھیجا گیا تھا۔ محاصرہ کافی عرصے تک جاری رہا لیکن شہر کو فتح کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ قلعے کی مضبوط اور بلند دیواروں پر سے حملہ آوروں پر تیروں اور آگ کے شعلوں کی بارش کر دی جاتی تھی جس کی وجہ سے فصیل تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ لیکن حضرت ایوب انصاریؓ ہر حملے میں پیش پیش رہتے تھے۔ وہ آنحضورؐ کے پسندیدہ انصار میں شامل تھے۔ ان کا پورا نام ابوایوب انصاریؓ تھا۔

قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی پہلی ناکام کوشش میں شہر کی فصیل کے باہر حضرت ایوب انصاریؓ زخمی ہو گئے اور وفات پا گئے۔ عربوں نے فصیل کے قریب اسی مقام پر ان کو دفن کر دیا۔ جب عثمانیہ ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اسی جگہ پر حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار بنا دیا گیا۔ اس کو ترکی کا مقدس ترین مقام کہا جاتا ہے۔ مزار پر ہر وقت سیاحوں اور مقامی لوگوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ یہاں بے شمار لوگ فاتحہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ عام طور پر خواتین برقعے پہن کر مزار پر آتی ہیں۔ یہاں آنے والے سیاحوں کے لیے بھی یہ ہدایت ہے کہ مزار پر مناسب اور شائستہ لباس پہن کر آئیں۔ یہاں تصویریں بنانے کی ممانعت ہے۔ مزار کے ساتھ والی مسجد میں ہزاروں افراد نماز ادا کرتے ہیں۔ جمعہ کی نماز کے وقت یہ مسجد نمازیوں سے لبریز ہوتی ہے۔

مسجد حضرت ایوب پر جا کر انتہائی دلی سکون اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ اپنے غم بھلانے اور دنیا کے مصائب سے نجات پانے کے لیے بھی یہاں آکر عبادت اور دعائیں کرتے ہیں۔ ہم لوگ جب مزار اقدس اور مسجد دیکھنے کے لیے گئے تو حسب معمول اللہ کے بندوں کا ہجوم تھا جو سکون قلب کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ یہ بھی رواج ہے کہ نئے شادی شدہ جوڑے مرادیں اور منتیں ماننے کے لیے یہاں آتے ہیں تاکہ ان کی ازدواجی زندگی مطمئن پر مسرت اور خوشگوار رہے۔

مسجد میں بیٹھ کر دلی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ ماحول بھی پاکیزہ ہے اور ہمارے مقدس مزاروں کی طرح گندگی کا نام تک نظر نہیں آتا۔

مسجد سے باہر نکل کر بازار کا رخ کریں تو درمیان میں ایک کھلا میدان ہے۔ اس جگہ بے شمار کبوتر ہمیشہ پر پھڑپھڑاتے نظر آتے ہیں۔ یہاں آنے والے ان کے لیے دانے کی تھیلیاں بھی لاتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے انہیں دانہ کھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبوتر بھی انسانوں سے بہت مانوس ہیں۔ بے خوف ہو کر ان کے سروں اور کاندھوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور دانہ چگتے رہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بزرگ ہستیوں کے مزاروں کے اردگرد ہمیشہ کبوتروں کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ عقیدت مند ان کو باقاعدگی سے دانہ بھی ڈالتے رہتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے ہمارے دوست شباب کیرانوی کسی زمانے میں بی بی پاک دامن کے مزار جایا کرتے تھے اور وہاں کبوتروں کو دانہ کھلایا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد شباب صاحب کی رہائش سمن آباد میں اور پھر شاہ جمال میں آگئی تھی لیکن شباب صاحب اپنی والدہ کی خواہش پوری کرنے کے لیے جمعرات کو کبوتروں کو دانہ ڈالا کرتے تھے یا کسی ملازم کے ذریعے دانہ ڈلوایا کرتے تھے۔ اس معمول میں انہوں نے کبھی ناغہ نہیں کیا۔

کبوتروں اور بزرگ ہستیوں کے مزارات کا خصوصی تعلق بھی ہوتا ہے۔ ہر بزرگ کے مزار پر آپ کو کبوتروں کے غول کے غول نظر آئیں گے جو رات کے وقت بھی آس پاس ہی بسیرا کرتے ہیں۔ کبوتر ایک پاک وصاف خوبصورت اور بے ضرر پرندہ ہوتا ہے۔ آپ نے شاید کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کبوتر نے کسی دوسرے پرندے یا جانور کو چونچ مار کر کھا لیا۔ اس کے برعکس کبوتر کو بھی نشانہ بناتے ہیں۔ اس کا شکار کرتے ہیں۔ بعض حکیم کبوتر کا خون یا گوشت دوائیوں میں استعمال کرتے ہیں۔

دنیا میں دوسرے مقامات پر بھی ہم نے بڑے بڑے چوک نما میدانوں میں کبوتروں کو غٹرغوں کرتے سنا اور اٹکھیلیاں کرتے ہوئے دیکھا جس طرح مرغیوں کے

درمیان میں مرغ نمایاں ہوتا ہے اسی طرح کبوتروں کے جھنڈ میں بھی نر کبوتر نمایاں نظر آتا ہے۔ مرغیاں اور کبوتریاں ان کی حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کرسکتیں شاید اس لیے کہ ابھی تک وہ مغربی تعلیم اور رسم ورواج سے ناواقف ہیں۔ لندن کے ٹریفلگر اسکوائر اور روم کے چوک دیکھئے تو کبوتروں سے بھرے رہتے ہیں۔ سیاح انہیں دانہ خرید کر کھلاتے ہیں۔ خواتین اور بچے انہیں اپنے ہاتھوں سے دانہ کھلا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی ایسا مزار آپ نے نہیں دیکھا ہوگا جہاں کبوتر نہ ہوں۔ ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ایک روحانی کیفیت طاری کردیتی ہے۔ کبوتروں کو پالنے کے شوقین بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے پاس قسم قسم کے کبوتر ہوتے ہیں جنہیں وہ فضا میں اڑا کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کسی زمانے میں کبوتر ڈاک لانے اور لے جانے کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ اس وقت پیغام رسانی کا کوئی اور موثر ذریعہ موجود نہ تھا۔ جنگوں کے زمانے میں یہ مخبر کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں اشفاق احمد مرحوم نے ایک دلچسپ اور عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔

ایک بار وہ بس کے ذریعے جوہر آباد کے علاقے میں سفر کررہے تھے۔ ان کے نزدیک والی سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی گود میں ایک خالی پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ اشفاق صاحب نے بالآخر نوجوان سے پوچھ لیا کہ آپ یہ خالی پنجرہ لے کر کیوں بیٹھے ہیں کیا خرید کر لے جارہے ہیں؟ یہ خالی کیوں ہے؟

نوجوان نے کہا۔ ”یہ پنجرہ کبھی خالی رہتا ہے اور کبھی بھرا ہوا نظر آتا ہے۔“

اشفاق صاحب نے اس بارے میں مزید دریافت کیا تو نوجوان نے کہا۔ ”میں اپنے گاؤں سے دور ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں جس روز مجھے اوور ٹائم لگانا نہیں ہوتا میں اس کبوتر کو آزاد کردیتا ہوں۔ یہ سیدھا میرے گھر پہنچ کر بیوی کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس طرح بیوی کو معلوم ہوجاتا ہے کہ آج میں گھر واپس آؤں گا۔ وہ میرے لیے کھانا تیار کرلیتی ہے۔ جس روز مجھے رات کو اوور ٹائم لگانا ہوتا ہے اس روز یہ پنجرہ بھرا رہتا ہے۔ کیونکہ میری بیوی جان لیتی ہے کہ آج میں فیکٹری میں ہی رہ کر کام کروں گا۔“

اشفاق صاحب کو ایک ان پڑھ مگر ذہین نوجوان کے طریقۂ کار کے ذریعے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے اپنی زندگی آسان کرنے کے لیے کتنی انوکھی تجویز سوچی ہے۔

ان کا فلسفہ یہ تھا کہ ذہین قابل اور ہنرمند ہونے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ ساری عمر یہ نظریہ پیش کرتے رہے کہ جو شخص اپنے ہنر میں ماہر ہے لیکن کتابی علم حاصل نہیں کرسکا ہے وہ بھی قابل تعظیم اور اپنے ہنر کا ماہر ہے۔ اس کی بھی تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح ہی عزت کرنی چاہیے کیونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی بے شمار ضروری ہنر نہیں جانتے۔ تو کیا انہیں جاہل کہنا چاہیے؟

ایک محفل میں ان کے بہت بڑے افسر دوست نے کہا کہ آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں، ان پڑھ اور پڑھے لکھے میں فرق تو ہونا چاہیے۔

اشفاق صاحب نے کہا۔ ”دیکھیے جب آپ کو اپنے مکان کا لینٹر ڈلوانا ہوتا ہے۔ دروازے کھڑکیاں اور فرش بنوانا ہوتا ہے تو آپ کاریگروں کی مدد حاصل کرتے ہیں چونکہ یہ کام آپ خود نہیں کرسکتے۔ آپ یہ بتائیے کہ اگر آپ کی لاکھوں کی نئی قیمتی کار میں خرابی پیدا ہوجائے تو آپ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آنکھیں بند کرکے اپنی مرسڈیز کار ایک مکینک کے حوالے کرکے آجاتے ہیں۔ کیا اس سے پہلے آپ اس کی ڈگری یا ڈپلومہ دیکھتے ہیں؟“

بہرحال یہ ایک نیا موضوع ہے۔ بہتر ہو کہ آپ کو استنبول واپس لے چلیں جو کہ آپ کے دیکھنے کا حقدار ہے۔

استنبول کو دیکھنے کا سلسلہ کہیں نہ کہیں سے تو شروع کرنا ہی تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ جگہ کے انتخاب کے بارے میں سب متفق نہیں تھے۔ یہ ہم تینوں کا استنبول جانے کا پہلا موقع تھا اس لیے جن جگہوں اور مقامات کے نام سنے یا پڑھے تھے ان کے بارے میں ہی ہم سب تجویز پیش کرتے رہتے تھے۔ مرزا صاحب کا معاملہ ایک غیر جانبدار مبصر کا تھا۔ وہ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے لیکن اپنی طرف سے کوئی نام تجویز نہیں کررہے تھے۔ آخر کار خان صاحب نے کہا ”ایسا کرتے ہیں کہ ہم ٹاس کرلیتے ہیں۔ جس جگہ کے نام پر سکہ گرے گا بس وہیں چلے جائیں گے۔“

شعیب مرزا آخر خاموش نہ رہ سکے۔ بولے ”آپ لوگ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟“

”ضرور کہیے۔“

”دیکھیے آج کا آدھا دن تو آپ نے یہ فیصلہ کرنے میں لگایا ہے کہ پہلے کون سی جگہ دیکھنی چاہیے۔ اگر آپ کے انتخاب کرنے کی یہی رفتار رہی تو صرف استنبول دیکھنے کے لیے آپ کو چار پانچ سال درکار ہوں گے۔“

”واہ، واہ، ماشا اللہ۔ مرزا صاحب! آپ تو بہت اچھی اردو بولتے ہیں؟“ بٹ صاحب بول پڑے۔

”کیا واقعی؟ مگر آپ نے کس طرح اندازہ لگایا۔“

”آپ کے مشکل الفاظ سے۔ اب دیکھیے نا لفظ درکار ہر شخص تو نہیں بول سکتا اور نہ ہی اس کے معنی سمجھ سکتا ہے؟“

”اچھا بٹ صاحب۔ آپ اگر درکار کے معنی بتادیں تو آپ کو بہترین لنچ کھلاؤں گا۔“ خان صاحب نے چھیڑا۔

”مجھے خوامخواہ دوسروں پر اپنا رعب ڈالنے کی عادت نہیں ہے۔ اپنا لنچ آپ اپنے پاس ہی رکھیے۔“

شعیب مرزا پھر مطلب پر آگئے۔ ”تو پھر میری تجویز یا مشورے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟“

”آپ نے یہی بتایا ہے نا کہ اس انداز سے صرف استنبول دیکھنے میں چار پانچ سال لگ جائیں گے؟“

”جی ہاں۔ میں نے یہی عرض کیا ہے۔“

”تو پھر کوئی بات نہیں۔“ بٹ صاحب بے پروائی سے بولے۔ ”ہم اپنا ویزا بڑھوالیں گے۔ ویسے بھی ترک ہمارے دوست اور بھائی ہیں۔ اتنی سی بات تو مان ہی لیں گے۔“

”بے شک۔“ ہم نے کہا۔ ”مگر چار پانچ سال آپ یہاں گزارہ کیسے کریں گے اور پاکستان میں آپ کے بچوں کا کیا ہوگا؟“

”کیسی فضول بات کردی ہے آپ نے۔“ بٹ صاحب تن کر بیٹھ گئے۔ ”جوان ہوں۔ خوبرو ہوں۔ پاکستانی ہوں اور پھر کشمیری بھی ہوں۔ کیا استنبول جیسے شہر میں مجھے کوئی کام نہیں ملے گا۔ اور کچھ نہیں تو گاڑیاں دھوکر کمالوں گا۔ سنا ہے یہاں مچھلی کا کاروبار بھی بہت اچھا ہے، میں بھی مچھیرا بن جاؤں گا۔ بہترین قسم کی مچھلی مفت کھانے کو ملے گی۔“

”چلیے۔ آپ کا بندوبست تو ہوگیا۔“ خان صاحب سر کھجا کر بولے۔ ”پاکستان میں آپ کے بچوں کا کیا ہوگا؟“

”بچے وہاں چار پانچ سال میں بڑے ہوجائیں گے۔ چھوٹا والا تو شاید مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔“

اس نوک جھونک سے مرزا صاحب بہت لطف اندوز ہورہے تھے۔

کہنے لگے۔ ”آج باسفورس کی سیر کیوں نہ کی جائے؟“

”باسفورس بھی عجیب نام ہے۔ جیسے ہومیو پیتھک دوائی فاسفورس ہوتی ہے۔ یہ کھجلی اور خارش کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔ جہاں تک سمندر دیکھنے کا شوق ہے وہ مجھے بچپن سے ہے۔ نیلا نیلا سمندر کا پانی۔ اس پر جہاز اور کشتیاں تیرتی ہوئی۔ سفید سفید پرندے اڑتے ہوئے۔ نیلا آسمان۔ نیلا پانی اور سفید بگلے جیسے پرندے۔“

مرزا صاحب نے داد دی۔ ”بہت خوب بٹ صاحب۔ آپ نے تو شاعری کردی۔ سمندر کی کیا تعریف کی ہے۔“

”سمندر مجھے بچپن سے ہی اچھا لگتا ہے مگر اس سے ڈر بھی لگتا ہے۔ کراچی میں کئی بار سمندر پر گیا مگر باعزت فاصلے پر رہا۔“

”باعزت فاصلے کا مطلب۔“

”مطلب Respect Able Distanc۔ یار تم لوگ تو انگریزی بھی نہیں جانتے۔ مگر باسفورس ایسا سمندر ہے بلکہ خلیج ہے جو ساری دنیا میں مشہور ہے اس کی اہمیت کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔ اس کے ایک طرف یورپ ہے اور دوسری طرف ایشیا۔ یہ وہ پانی کا ٹکڑا ہے جو ایشیا اور یورپ کو گلے ملنے پر مجبور کرتا ہے۔ دو براعظموں پر خلیج بہت گہری ہے اور اس کی لمبائی 20 میل ہے۔ تجارتی اور فوجی اعتبار سے یہ ایک اہم سمندری راستہ ہے۔ اس کی جنگی اہمیت کے پیش نظر 1936ء ایک بین الاقوامی کنونشن میں اس کو بین الاقوامی بحری راستہ قرار دے دیا گیا ہے تاکہ ترک حکومت اس اہم راستے کو بند کرکے عالمی معیشت کو نقصان نہ پہنچائے۔ باسفورس ترکی ہی کا ایک حصہ ہے اور اس کی نگرانی کے لیے ترکی کے بحری اور جنگی جہاز ہر وقت یہاں گشت کرتے رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں اس بحری راستے کو بہت کم استعمال کیا جاتا تھا لیکن عالمی معیشت اور جنگی ضروریات کے تحت اس خلیج سے پچاس ساٹھ ہزار جہاز گزرتے ہیں۔ اسی راستے سے ضروری سامان اور خصوصاً تیل وسطی ایشیا، روس اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ اب تو چین بھی اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادی صورتحال کے پیش نظر تیل حاصل کرنے کے لیے یہی راستہ استعمال کرتا ہے۔

باسفورس کی سیاحت استنبول آنے والے ہر شخص کے لیے لازمی امر ہے۔ ایک خوبصورت ٹرمنل سے کشتیاں اور چھوٹے بحری جہاز مسافروں کو باسفورس کی سیر کراتے ہیں۔ یورپ اور استنبول کو ملانے والا زیرِآب طویل راستہ بھی باسفورس کے نیچے سے گزرتا ہے۔

باسفورس ایک ایسی خلیج ہے جو استنبول میں تقریباً ہر جگہ سے نظر آتی ہے اور آنکھوں کو فرحت بخشتی ہے۔ باسفورس کی

بحری سیر آپ اپنی مرضی کے مطابق جتنی دیر تک چاہے صرف کرائے میں اضافے کے حساب سے کرسکتے ہیں۔

باسفورس کے دونوں جانب ایشیائی اور یورپی علاقے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہوگی کہ استنبول کا ایشیائی علاقہ یورپی علاقے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ البتہ یورپی حصہ زیادہ سرسبز ہے۔ اونچے اونچے درخت، سبزہ زار، باغات، صاف ستھرے اور سفید رنگ کے خوبصورت مکانات کی وجہ سے اس علاقے کے حسن میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ استنبول کا شہر نشیب و فراز میں ہے۔ ہر جگہ سے آپ کو استنبول کے جو حصے نظر آتے ہیں ان کا حسن قابل دید ہے۔ سفید رنگ کے مکانات اور تمام گھروں کی ڈھلوان سرخی مائل چھتیں ایک عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔ اس میں اگر سمندر کی خوبصورتی کو بھی شامل کرلیا جائے تو ایسا بے مثال دلکش شہر کہیں اور نہ ہوگا۔

باسفورس کے ایک جانب سمندر ہے اور دوسری جانب خوبصورت جدید اور قدیم دلکش عمارتیں حد نظر تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ بادشاہوں، شہزادوں اور امراء کے محلات تھے جن کی خوبصورتی کو اب تک برقرار رکھا گیا ہے اور دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں کرسکتا ہے کہ یہ پرشکوہ خوبصورت اور پرسکون محلات حال ہی میں تعمیر کیے گئے ہیں۔ جب فیری ساحل کے نزدیک سے ہوکر گزرتی ہے تو محلات اور مکانات کے لان اور باغات بھی نظر آتے ہیں۔ ان محلات اور خوبصورت عمارتوں کو ہوٹلوں میں تبدیل کردیا گیا ہے جہاں صرف امراء اور دولت مند لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ مہنگے ترین ہوٹل ہمیشہ اور ہر موسم میں بھرے رہتے ہیں جن کی بکنگ کافی عرصے قبل کرائی جاتی ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں محلات اور حویلیوں کو مہنگے ہوٹلوں میں تبدیل کردیا گیا ہے مگر افسوس کہ ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی۔ حالانکہ لاہور، ملتان، رحیم یار خان، جیسے شہروں میں نوابوں کے شاندار محلات موجود ہیں۔ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں نے حکمرانی سے محروم ہونے کے بعد یہی طریقہ اپنایا ہے جس کی وجہ سے دنیا بھر سے غیر ملکی سیاح یہاں آکر قیام کرتے ہیں اور مقامی رسم و رواج سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس بہانے ہندوستان ہر سال اربوں ڈالر بھی کماتا ہے اور اپنے کلچر کو بھی پھیلاتا ہے۔ ان دولت مند غیر ملکی سیاحوں کی وجہ سے بے شمار خاندانوں کو روزگار میسر آتا ہے جو ملک کی معیشت کو بہتر بنانے میں شریک ہے۔

بعض پاکستانی کہتے ہیں کہ صاحب کیا کریں، ہمارے شہروں میں غربت، بدنظمی ہے ایسا ماحول نہیں ہے جس سے غیر ملکی لطف اندوز ہوسکیں۔ حالانکہ ہمارے شہروں اور بھارتی شہروں کے ماحول میں زیادہ فرق نہیں ہے بلکہ ہمارے شہر نسبتاً صاف ستھرے اور خوبصورت ہیں۔ اس کے برعکس بمبئی، کلکتہ اور دہلی جیسے شہروں میں گندگی اتنی زیادہ ہے کہ فیشن ایبل علاقوں میں بھی بدبو کے مارے دم گھٹ جاتا ہے۔ آبادی کی ریل پیل بہت زیادہ ہے۔ سڑکوں پر آوارہ گائیں گھومتی پھرتی ہیں۔ دہلی میں بندروں نے لوگوں کی زندگی عذاب کردی ہے۔ سڑکوں پر غلاظت کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر لاکھوں افراد زندگی بسر کرتے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف ٹریفک میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے بلکہ گندگی بھی پھیلی رہتی ہے۔ یہ مجبور لوگ ساری زندگی فٹ پاتھوں پر گزار دیتے ہیں۔ ان کی شادیاں ہوتی ہیں۔ وہیں ان کے بچے جنم لیتے ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے مگر ہندوستان والے شرمندہ ہونے کے بجائے بڑے فخر سے یہ ماحول غیر ملکیوں کو دکھاتے ہیں جو کہ ان کے لیے ایک انوکھی دنیا کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہندوستان اور دوسرے ترقی پذیر ایشیائی ملکوں میں جو فلمیں عالمی میلوں میں داد و تحسین پاتی ہیں ان میں ان ملکوں کی غربت مجبوریاں، بدترین حالات زندگی کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ چیزیں ترقی یافتہ مغرب کے لیے ایک عجوبہ ہیں۔ وہ حیران بھی ہوتے ہیں اور تفریح بھی حاصل کرتے ہیں کہ آج کل کے دور میں بھی ایسے ملک موجود ہیں جہاں لوگ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

بھارت کے پہلے نامور حقیقت پسند ہدایت کار ستیہ جیت رائے نے بھی یہی نسخہ استعمال کیا تھا جس کی وجہ سے ان کی فلم کی ساری دنیا میں واہ واہ ہوگئی حالانکہ ہندوستان کے کسی شہر میں "کلکتہ" سمیت یہ فلم ایک دو روز ہی چلی ایک بار ستیہ جیت رائے کی فلموں کا خصوصی ہفتہ منایا گیا جس میں ان کی سات شہرۂ آفاق فلموں کی سات روز نمائش کی گئی تھی لیکن کسی ایک دن بھی کسی فلم کا ہاؤس فل نہیں ہوا۔

ہمارے پاکستان میں اختر کاردار نے بھی "جاگو ہوا سویرا" کے نام سے اسی قسم کی ایک فلم بنائی تھی۔ اس کی بیشتر بلکہ تمام تر شوٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی۔ اس فلم کے کیمرامین برطانوی تھے۔ گیت فیض احمد فیض نے لکھے تھے۔ اسکرپٹ میں بھی ان کا دخل تھا۔ ستیہ جیت رائے کی طرح اختر کاردار نے بھی گمنام یا نئے فن کاروں سے کام لیا تھا۔ اس فلم میں بھی غربت، بیماریاں، کھانسی، معذوری غرض یہ کہ ایک صحیح تصویر پیش کی گئی تھی جو اہل مغرب کے لیے بہت زیادہ تفریح کا سبب بنی۔ اس فلم کو پاکستان میں تو کسی سنیما میں ایک ہفتہ چلنا بھی نصیب نہیں ہوا لیکن عالمی میلوں میں اختر کاردار نے بہت داد سمیٹی۔ کچھ عرصے تک اس تعریف کے نشے میں چور رہنے کے بعد اختر کاردار نے دوسری فلم شروع کی جس کا نام غالباً "دور ہے سکھ کا گاؤں" تھا لیکن یہ ادھوری رہ گئی۔

مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ جب غیر ملکی سیاح انڈیا آکر گندگی کے ڈھیر، فٹ پاتھوں پر انسانوں کا جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنا۔ آبادی کا ہجوم، بھوک، ننگ، سڑکوں پر گایوں کی چہل قدمی، غربت، بیماری، معذوری، اور بدنظمی مغربی سیاحوں کے لیے نفرت یا پریشانی کا سبب نہیں بنتی بلکہ وہ ایک ایسی دنیا کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں جس کا اب مغرب میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم پاکستانیوں کو غیر ملکی سیاحوں کے سامنے شرم سار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن چیزوں کو ہم برا اور باعث شرم سمجھتے ہیں وہ مغربی سیاحوں کو جوق در جوق یہاں کھینچ لائیں گی۔ البتہ ملک میں امن دامان ضروری ہے۔ دہشت گردی سے غیر ملکی سیاح بہت گھبراتے ہیں۔

تذکرہ استنبول کے محلات کا ہو رہا تھا کہ بہترین ہوٹلوں میں تبدیل ہوچکے ہیں جو باسفورس کے کنارے کنارے قطاریں بناتے باسفورس کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور تک پھیلی ہوتے ہیں اور استنبول کا شہر اور سمندر حد نگاہ تک ساتھ چلتے ہیں۔ قدرت کی کاریگری اور حضرت انسان کی کاری گری کا یہ ایک مشترکہ شاہکار۔ باسفورس کا پانی بالکل نیلا ہے۔ عمارتوں کی رنگت عموماً سفید ہے۔ نیلے اور سفید کا یہ امتزاج بھی بہت خوب ہے۔ خلیج میں سیاحوں کو تفریح کرانے والی کشتیوں اور بجروں کے علاوہ مختلف ملکوں کے بحری جہاز بھی آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی کبھی ان کی پرشور ہوٹر کی آوازوں سے سمندر کے پانی میں ارتعاش پیدا ہوجاتا ہے اور اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی ہے۔

باسفورس دن کے وقت کچھ منظر پیش کرتا ہے لیکن رات کے وقت اس میں ایک فلمی کشش کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ سمندر کے کناروں پر بنی ہوئی خوبصورت عمارتوں اور پرشکوہ محلات رات کو روشنی سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ جب روشنیوں کا عکس سمندر کے نیلگوں پانی پر پڑتا ہے، منظر کے حسن و جمال میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ ترک موسیقی کے بھی رسیا ہیں۔ تفریحی بجرے جب قریب سے گزرتے ہیں تو ترکی موسیقی کی آوازوں کی وجہ سے ایک عجیب سماں پیدا ہوجاتا ہے۔

شعیب مرزا ہمیں آس پاس کے مناظر اور عمارتوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کررہے تھے۔

اچانک مرزا نے کہا "وہ دیکھیے۔ سامنے والی وسیع اور شاندار عمارت۔"

بٹ صاحب بہت اشتیاق سے اس بارے میں جاننا چاہتے تھے کیا، یہ بھی کسی سلطان کا محل تھا۔"

وہ ہنسنے لگے۔ "سلطان کا محل تو نہیں ہے مگر آپ کے لیے ایک یادگار ضرور ہے۔"

بٹ صاحب نے فوراً اندازہ لگایا۔ "سمجھ گیا، یہ کوئی تاریخی عجائب گھر ہے؟"

"یہ تاریخی عجائب گھر نہیں ہے فوجی اکیڈمی ہے، یہ فوجیوں کے لیے ایک تاریخی درسگاہ ہے۔ اس اکیڈمی سے تعلیم حاصل کرنے والے فوج میں عموماً بہت ترقی کرتے ہیں اور انہیں اپنی اس اکیڈمی پر ناز ہے۔"

"عمارت تو بہت خوبصورت ہے۔" ہم نے کہا۔

"اور شاندار بھی۔"

"اور بہت دور تک پھیلی ہوئی بھی ہے۔" خان صاحب بولے۔

شعیب مرزا مسکرائے اور بولے۔ "آپ نے اکیڈمی کی بہت سی خوبیاں بیان کردیں مگر ایک قابل ذکر بات آپ نہیں جانتے۔"

"وہ کیا؟"

"پاکستان کے ایک چیف آف آرمی اسٹاف و صدر نے بھی اس اکیڈمی سے تربیت حاصل کی ہے۔ اس لحاظ سے شاید اس کی اہمیت آپ کے لیے زیادہ ہو۔"

بٹ صاحب نے حیران ہوکر پوچھا۔ "کیا ہمارے ملک میں فوجی اکیڈمی نہیں ہے کہ پرویز مشرف کو فوجی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے اتنی دور آنا پڑا۔"

"بٹ صاحب۔ آپ کو آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ پرویز مشرف کے والد ملازمت کے سلسلے میں کافی عرصے ترکی میں رہے ہیں اور پرویز مشرف نے ابتدائی تعلیم ترکی

میں ہی حاصل کی ہے۔"

شعیب مرزا نے تبصرہ کیا۔ "مشرف میں جو آزاد خیالی اور مغربی رنگ ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ ترکی کے آزاد اور سیکولر معاشرے میں رہ چکے ہیں۔"

"اسی لیے وہ اپنے کتے کو ہر وقت گود میں لیے پھرتے ہیں۔"

بٹ صاحب بے چین ہوگئے۔ "کیا ہم یہ اکیڈمی اندر سے دیکھ سکتے ہیں۔"

"کیا فائدہ۔ اب تو پرویز مشرف بھی اس اکیڈمی سے رخصت ہو چکے ہیں۔"

"ترکی پرویز مشرف کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پرویز مشرف پاکستان کا نقشہ بدل دیں گے۔"

"خدا نہ کرے۔" بٹ صاحب بول پڑے۔ "ایک فوجی یحییٰ خان پہلے ہی پاکستان کا نقشہ بدل چکے ہیں۔ دعا کیجیے کہ پرویز مشرف ایسا نہ کریں۔"

"تم جب سوچتے ہو.... منفی انداز میں سوچتے ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پرویز مشرف کشمیر پاکستان کو دلا کر ملک کا نقشہ بدل دیں۔"

"آمین!" ہم سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

ہم لوگ جس فیری میں سوار تھے اس میں غیر ملکی سیاح اور مقامی ترک بھی تھے۔ ڈھائی تین برس کی عمر کا ایک گول مٹول گورا چٹا بچہ اچانک بھاگتا ہوا ہم لوگوں کے پاس آیا اور کچھ بولنے لگا۔ بڑی دیر میں سمجھے کہ وہ سوال کر رہا ہے "پاکستان" یعنی کیا آپ پاکستانی ہیں۔ ہم نے کہا "یس، پاکستانی۔"

وہ بھاگتا ہوا عرشے پر چلا گیا جہاں اس کے والدین اور ایک بڑا بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے جا کر ان سب کو مطلع کیا کہ "پاکستان" اور ہم لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا سارا خاندان اٹھ کر مسکراتا ہوا ہم لوگوں کے پاس آیا۔ بچے کے والد نے "پاکستان" کہہ کر خوشی سے ہم لوگوں سے ہاتھ ملایا بلکہ بغلگیر بھی ہوگئے۔ ان کی بیگم نے بھی "پاکستان" کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔ بڑا بیٹا بھی ہم لوگوں سے بغلگیر ہوگیا اور دیر تک لپٹا رہا جیسے کسی بچھڑے ہوئے عزیز سے کافی عرصے بعد مل رہا ہو۔

سنا تو تھا لیکن دیکھ بھی لیا کہ ترک قوم پاکستان اور پاکستانیوں سے بہت محبت کرتی ہے۔ یہ جذبہ دوطرفہ ہے کیونکہ ہر پاکستانی ترکوں سے محبت کرتا ہے اور ان کے کارناموں پر فخر کرتا ہے۔ ترکوں کی محبت کی وجہ سے جنگ عظیم کے دور میں ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی بھرپور حمایت کی تھی۔ مذہبی قسم کے لوگ اس لیے پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں کہ جب ہندوستان میں خلافت کی مہم شروع ہوئی تو مسلمانوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ یہاں تک کہ خواتین نے اپنے زیورات تک نذر کر دیے۔

ترک ایک بہادر قوم ہے۔ وہ پاکستانیوں کی بہادری کے بھی معترف ہیں۔ خصوصاً 1965ء کی جنگ میں کئی گنا بڑے اور طاقتور ملک کے ساتھ پاکستانی فوج نے جو سلوک کیا اس پر ترک فخر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی ایک بہادر قوم ہے۔ مسلمانوں نے کئی سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ افغانستان کے راستے چند ہزار فوجیوں کے ساتھ مسلمان حملہ آور ہندوستان آتے تھے اور کئی مہاراجاؤں کی بہت بڑی فوج کو شکست دے دیا کرتے تھے محمد بن قاسم جیسا نوجوان سپہ سالار چند ہزار کے لشکر کے ساتھ سندھ کے ساحل پر اترا اور فتوحات کرتا ہوا بے روک ٹوک آگے بڑھتا رہا۔ ظہیر الدین بابر کو جب فرغانہ میں برے حالات سے دوچار ہونا پڑا تو وہ صرف بارہ ہزار کا لشکر لے کر ہندوستان جیسے عظیم اور وسیع ملک پر چڑھ دوڑا اور کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈال سکا۔ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکمرانی کا دور ختم ہوگیا لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ خطہ پر حکمرانی کرنے والی فاتح قوم دوڈھائی سال انگریزوں کی غلامی میں رہنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ذہنی طور پر غلام ہوگئی۔ غلامی کا یہ داغ برصغیر کے مسلمانوں کے دماغ سے چپک کر رہ گیا ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں پر بھی دوسرے ملکوں نے طویل عرصے تک حکمرانی کی ہے مگر کتنی عجیب بات ہے کہ یہ اقوام ذہنی غلامی سے آزاد ہیں۔ وہ آج اپنے سابقہ حکمرانوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتے ہیں اور ان سے قطعی مرعوب یا خوفزدہ نہیں۔ الجزائر پر فرانس نے عرصہ دراز تک قبضہ رکھا۔ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے لیکن الجزائر والوں نے جنگیں لڑ کر اپنی آزادی چھین لی۔ اس کے بعد سے الجزائری فرانس کے ذہنی غلام نہیں رہے۔ ویت نام پر امریکیوں نے کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے لیکن انہوں نے آزادی کی جنگ جاری رکھی یہاں تک کہ امریکا جیسی سپر پاور کو ہار ماننی پڑی۔ ویت نامی امریکا کے ذہنی غلام نہیں بن سکے۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں عرب ممالک برطانیہ، اٹلی اور جرمنی کے فوجیوں کے بوٹوں کے نیچے روندے گئے۔ عورتوں کی عزتیں پامال کی گئیں۔ ہزاروں جانیں قربانی کی بھینٹ چڑھا دی گئیں لیکن عرب ذہنی طور پر انگریزوں کے غلام نہیں بن سکے۔ جاپان میں ایٹم بم گرانے کے بعد امریکیوں نے جسمانی اور ذہنی طور پر جاپانیوں کو بے عزت اور ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر جاپانیوں نے امریکیوں کی غلامی قبول نہیں کی۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں مگر خدا جانے یہ لعنت ہم لوگوں پر نازل ہوئی ہے کہ انگریزوں کی مختصر غلامی کے بعد اب ہم ذہنی اور معاشرتی طور پر ان کے دائمی غلام بن گئے ہیں۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے ترکوں کی محبت عشق کی حد تک ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہماری بہت سی خامیاں اور خرابیاں بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پاکستان کو پاکستان کہتے ہیں اور پاکستانیوں کو پاکستانی۔ ترکی ہم جتنی بار بھی گئے ہم نے یہی محسوس کیا کہ پاکستان کا نام ترکی میں "کھل جا سم سم" کی کیفیت رکھتا ہے۔ بہت سے مشکلیں چٹکی بجانے میں آسان ہو جاتی ہیں۔

ہوٹل کے منیجر تک یہ جاننے کے بعد آپ کو بہترین کمرے رعایتی نرخ پر دے دیا کرتے ہیں۔ صبح ناشتے کا مقررہ وقت ختم ہونے کے بعد پاکستانیوں کے لیے ڈائننگ ہال کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اگر باورچی جا چکا ہو تو ہوٹل کی مالکہ اپنے ہاتھوں سے آپ کو ناشتا بنا دیتی ہے۔

ایک بار ہم اناطولیہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمیں جو کمرے دیے گئے وہ بہترین مقام پر تھے مگر جب کمرے میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ کمرے کا ائرکنڈیشنر صحیح طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔ رات گئے مکینک کو بلایا گیا۔ مالک مصطفیٰ شیران نے بہت معذرت کی کہ ہوٹل میں کوئی اور کمرا خالی نہ تھا۔ انہوں نے اپنا ذاتی کمرا پیش کر دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے سامان اٹھا کر اس کمرے میں پہنچایا۔ جب ہم نے شرمندگی اور شکر گزاری کا اظہار کیا تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہنس کر بولے۔ "نو بودر، برادر" ("بھائی پریشان نہ ہوں")

دوسرے دن صبح ہم لوگ حسب معمول دو گھنٹے تاخیر سے ناشتے کے لیے پہنچے۔ ایک ویٹرس نظر آئیں تو ان سے کہا کہ ہمیں فی الحال دودھ، اوولٹین اور چند ٹوسٹ دے دیجیے تو مہربانی ہوگی۔

وہ مسکرائیں اور ترکی میں کچھ کہہ کر چلی گئیں۔ چند لمحے بعد ہی ہوٹل کی مالکہ مسکراتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ "گڈ مارننگ، مرحبا۔"

جواب میں بھی ہم نے مرحبا کہہ دیا۔ بٹ صاحب جب تک ترکی میں رہے مرحبا، گڈ مارننگ یہاں تک کہ اہلاً وسہلاً مرحبا بھی کہہ دیا کرتے تھے۔

خان صاحب چڑ جاتے۔ "بٹ صاحب خدا کا خوف کیجیے۔ اہلاً وسہلاً عرب کہتے ہیں۔"

جواب میں انہوں نے کہا۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔ دونوں ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔"

اگر آپ کسی دکان پر کوئی چیز خریدنے جائیں اور دکان بند ہونے والی ہو پھر بھی پاکستانیوں کے لیے دکان کھول دی جاتی ہے اور قیمتوں میں رعایت بھی کر دی جاتی ہے۔ ایک بار ہم نے کہا "آپ نے اتنی کم قیمت کر دی۔ آپ کو نقصان نہیں ہوگا؟"

دکاندار نے مسکرا کر کہا۔ "ہم نقصان نہیں اٹھاتے بس اپنا منافع نہیں لیتے۔"

"تو پھر دکانداری کا کیا فائدہ۔"

"بہت سے کام فائدے کے بغیر ہی کیے جاتے ہیں۔"

اب چلیے باسفورس، جہاں..... ایک خوبصورت اور خوش مزاج ترک فیملی اپنے دو پیارے پیارے بچوں کے ساتھ ہم لوگوں سے ملاقات کرنے کے لیے آئی تھی۔

ترک نوجوان کا نام نعیم تھا۔ بیگم خالدہ تھیں۔ بچوں کے نام یاد نہیں رہے مگر وہ بہت جلد ہم سے مانوس ہوگئے۔ ایک بچہ اچانک غائب ہوگیا اور کچھ دیر بعد ہم لوگوں کے لیے آئس کریم لے آیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ہاتھ سے آئس کریم ہمارے منہ میں ڈال دی اور پھر ترکی میں پوچھا۔ "اچھی لگی؟"

اس کے والدین تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے۔ مرزا صاحب تو ترکی میں کافی وقت گزارنے کے بعد اچھی خاصی ترکی بولتے اور سمجھتے تھے اس لیے وہ ہمارے غیر رسمی مترجم کے فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔

ہم نے محسوس کیا کہ ترکی زبان میں بہت سے الفاظ اردو کے بھی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اردو میں ترکی کے بے شمار الفاظ شامل ہیں... اور دونوں بہت سی زبانوں کا ملغوبہ ہے۔ دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ آپ کو اردو میں مل جائیں گے۔ مگر اکثریت عربی، فارسی اور ترکی زبان کی ہے۔ مرزا نے بتایا کہ ترکی میں کم از کم دس ہزار الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن طرز تحریر اور تلفظ کی تبدیلی کی وجہ سے اندازہ نہیں ہوتا۔

ترک ہر موقع پر پاکستان سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جیسے رحیم نے کہا" پاکستانی واقعی ایک بہادر قوم ہیں۔ اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتے ہیں۔ اور اب تو پاکستان نے ایٹم بم کا تجربہ بھی کرلیا ہے۔ اب انڈیا طاقت کے بل پر پاکستان سے کوئی بات نہیں منوا سکتا۔ ہم سب کو پاکستان پر فخر ہے۔ کاش پاکستان کو بھی کوئی کمال اتاترک مل جائے۔"

خان صاحب نے اداسی سے کہا۔" ہمیں بھی ایک قائد اعظم ملے تھے مگر زندگی نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی ورنہ پاکستان آج ایک بہت مضبوط، جدید اور بدلا ہوا ملک ہوتا۔"

"اللہ کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے پاکستان کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی بہت بڑا کردار رکھا ہو۔ اس وقت حالات کتنے بدلے ہوئے ہیں۔ مسلمان ملک ایک دوسرے کے نزدیک آرہے ہیں۔ یہ غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں۔ شاید انہیں یہ احساس ہوچکا ہے کہ مسلمان متحد ہوکر ہی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔"

یکا یک ایک وہیل مچھلی سمندر کی سطح پر نمودار ہوئی اور دو تین قلابازیاں لگا کر پھر سمندر کے پانی میں گم ہوگئی۔

بٹ صاحب پریشان ہوگئے۔"اسی لیے میں کہتا تھا کہ سمندر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ساحل پر واپس جانا چاہیے۔ اگر وہیل کشتی میں آگئی تو ہم سب تو گئے اس کے پیٹ میں۔"

"تو پھر چلیے۔ باسفورس تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ رات کے وقت کسی دن آئیں گے اور سمندر کی سرگوشیاں سنیں گے۔"

بٹ صاحب بولے۔" مجھے تو معاف ہی کیجیے مجھے سمندر کی سرگوشیاں سننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ رات کے وقت تو میں نہانے کے ٹب میں بھی جانے سے ڈرتا ہوں۔"

"کیا رات کے وقت آپ کے غسل خانے کے ٹب میں وہیل مچھلیاں آجاتی ہیں؟" شعیب مرزا نے کہا۔

بٹ صاحب نے بہت معقول بات کی" مرزا صاحب دراصل یہ ایک نفسیاتی مسئلہ یا وہم ہے۔"

"جب آپ جانتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں صرف وہم ہے تو آپ کیوں ڈرتے ہیں؟"

"بس یوں سمجھیے کہ بچپن میں ڈراؤنی کہانیاں بہت سنی ہیں۔ مجھے ڈراؤنی کہانیاں سننے کا بچپن ہی سے شوق ہے۔ نہ کہانیاں سننا چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ڈرنا۔"

استنبول کے سفر کا فائدہ بٹ صاحب کو یہ ہوا کہ پانی سے ان کا ڈر نکل گیا یا بہت کم ہوگیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ استنبول میں رہیں اور سمندر کے نظارے سے محروم رہیں۔ استنبول کے ہر کونے سے سمندر کا نیلا پانی نظر آتا ہے۔ اس طرح سمندر سے محبت ہوجاتی ہے اور اس کی خوبیاں آہستہ آہستہ واضح ہونے لگتی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے استنبول میں جہاں بھی سمندر دیکھا بہت پاک اور صاف نظر آیا۔ کوڑا کرکٹ، گندگی، پلاسٹک کے خالی تھیلے، پھلوں کے ادھ کھائے ٹکڑے۔ ساحل پر گھوڑوں یا اونٹوں کی گندگی اور بدبو (جو کہ کراچی میں عام ہے) اس قسم کی کوئی چیز استنبول میں نظر نہیں آتی۔ اس کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ کہ ترک صفائی اور سلیقہ پسند قوم ہیں، نہ وہ خود گندے رہتے ہیں اور نہ ہی گندگی کو برداشت کرتے ہیں۔

ہم جب پہلی بار یورپ گئے تو سب سے پہلے روم اور اس کے بعد پیرس میں چند روز قیام کیا۔ یہ دونوں شہر اپنے حسن و جمال اور تاریخی عمارتوں کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ روم تو مصوروں اور فن کاروں کا قدیم شہر ہے۔ روم کی اکثر سڑکیں بہت قدیم پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی ہیں، انہیں اتنی مضبوطی سے بنایا گیا ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ نہ تو کہیں سے ٹوٹی ہیں اور نہ بارش اور برفباری نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اس زمانے میں یورپ میں سڑکیں عام طور پر پتھروں سے ہی بنائی جاتی تھیں اور یہ پتھر اس خوبصورتی کے ساتھ لگائے گئے ہیں کہ آرٹ کا نمونہ نظر آتے ہیں۔ کاروں کی ہر وقت آمد و رفت کی وجہ سے یہ پتھر چکنے ہوگئے ہیں بارش ہو یا ہلکی سی برفباری ہوجائے تو یہ سڑکیں بجائے خود خوبصورتی کا نمونہ ہیں۔ البتہ روم کے قدیم تاریخی علاقوں میں بگھیاں، گھوڑے گاڑیاں چلتی ہیں جس کی وجہ سے یہاں گھوڑوں کے لید کی بدبو ان خوبصورت تاریخی عمارتوں تک جانے والوں کو خاصی پریشان کرتی ہے مگر روم کے لوگ اس بدبو کی پروا نہیں کرتے۔ یا شاید بدبو کے عادی ہوگئے ہیں لیکن روم میں اگر آپ کا گزر کسی خاتون کے نزدیک سے ہوجائے تو ایک دم فضا مہک جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کسی عطر بنانے والے کارخانے میں آگئے ہیں خدا جانے روم والے اس بدبو کو سیاحوں کے لیے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر اس بہانے خود بھی ذرا خوشبودار ماحول میں سانس لے کر خوش ہوجاتے ہیں۔

جب ہم پہلی بار روم گئے تو اس کی تعریفوں اور خوبیوں کے بیان کی وجہ سے ہم روم کو قلوپطرہ کے زمانے کا روم سمجھ رہے تھے مگر یورپ کے دوسرے قدیم تاریخی شہروں کے مقابلے میں اگر دیکھا جائے تو روم ایک شکستہ حال شہر نظر آتا ہے۔ اس کی خوبیاں اور رعنائیاں کچھ وقت کے بعد آپ پر ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر بھی بٹ صاحب کو روم کبھی پسند نہیں آیا۔

"یہ بھی کوئی شہر ہے۔ کھنڈرات کا مجموعہ ہے۔ پرانی تاریخی عمارتوں کے در و دیوار ٹوٹے پھوٹے نظر آتے ہیں۔ آخر یہ لوگ ان کی مرمت کیوں نہیں کراتے۔"

"اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ روم کو اس کی اصل شکل و صورت میں دیکھیں۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھائی یورپ کی تو بڑھیا خواتین بھی ہر وقت بنی سنوری اور میک اپ سے لدی ہوئی نظر آتی ہیں مگر روم شہر کو انہوں نے یتیم خانہ بنا دیا ہے۔"

خان صاحب نے انہیں سمجھایا کہ پرانی چیزوں کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ جب بقول آپ کے دنیا بھر کے لوگ یہی کھنڈر دیکھنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں آجاتے ہیں تو انہیں بلاوجہ مرمت پر پیسا ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

روم ہمارے نزدیک غالب کے شعر کی مانند ہے۔ آپ غالب کے شعر کو جتنی بار پڑھیں گے وہ اتنا ہی زیادہ اچھا اور معنی خیز لگے گا۔ مگر بٹ صاحب کو نہ تو غالب سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ روم سے۔ ہم نے کئی بار انہیں روم کے خوبصورت پہلو دکھائے اور انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی طرح قائل نہیں ہوئے۔

"یار۔ یہ تو ایک پرانا شہر لگتا ہے۔"

اس لیے کہ یہ واقعی پرانا ہے۔ روم کے بہت وسیع حصے میں ہمیں کوئی جدید اور اونچی عمارت نظر نہیں آئی۔ بیشتر علاقہ دو منزلہ اور تین منزلہ عمارتوں پر مشتمل ہے۔ اس قدامت میں بھی ایک ایسا حسن ہے جو صرف روم اور اٹلی کے شہروں میں ہی نظر آتا ہے۔ پیرس، لندن وغیرہ میں آپ کو یہ سادگی کہیں نظر نہیں آئے گی۔

روم کو ہم نے تصاویر اور فلموں میں بہت دیکھا اور پسند کیا تھا۔

مگر جب روم گئے تو بٹ صاحب نے "دور کے ڈھول سہانے" کہہ کر سارا جوش جذبہ خاک میں ملا دیا۔ روم کی وہ سڑکیں۔ پرانی عمارتیں۔ پرانے زمانے کی

سیدھی سادی سی سڑھیوں کو روم میں دیکھیں تو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ سب ہم بہت خوبصورت اور رنگین انداز میں دیکھ چکے ہیں۔

مثال کے طور پر کلوزیم کی یادگار نصف ٹوٹی ہوئی عمارت کو ہی دیکھ لیجیے۔ خان صاحب نے دیکھا تو کہا۔ ”آفاقی صاحب اس عمارت کی وجہ سے یہ ہر سال کروڑوں روپے کماتے ہیں کیا ان کی معمولی سی مرمت پر کچھ رقم نہیں لگا سکتے۔“

دراصل اس قدامت اور نیم شکستگی میں ہی کلوزیم اور روم کی خوبصورتی ہے۔ اگر کلوزیم کے ٹوٹے ہوئے حصے کی مرمت کر دی جائے تو ان کا پرانا پن اور حسن ختم ہو جائے گا۔ جدید اور خوبصورت عمارتیں تو ساری دنیا میں بکھری ہوئی ہیں۔

روم فواروں کا شہر ہے۔ صدیوں سال پرانے یہ فوارے ویسے کے ویسے ہی پرانے ہیں۔ ان پر نہ رنگ روغن کرایا گیا نہ ان پر جمی ہوئی کائی کو صاف کیا گیا۔ یہ فوارے بھی بے شمار ہیں اور ہر انداز کے ہیں۔ کہیں ان میں سے بوچھاڑ کی شکل میں پانی نکلتا ہے۔ کہیں نلکوں کی طرح نکلتا ہے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے بچوں کے مجسمے پیشاب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی زمانے میں پاکستان میں مشہور زمانہ فلم رومن ہالی ڈے کی نمائش ہوئی تھی۔ جس نے روم کو اس انداز میں پیش کیا تھا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہم جب روم پہنچے تو سب سے پہلے ان مقامات کو دیکھنے گئے جنہیں ہم فلم میں دیکھ کر مسحور ہو گئے تھے مگر بہت مایوسی ہوئی۔ پرانے کائی زدہ فوارے۔ پتھروں کی سڑکیں۔ جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی پرانی دیواریں۔ فلم میں اسپینش اسٹیپس کی سیڑھیاں بھی دکھائی گئی تھیں جہاں ہیرو گریگری پیک اور ہیروئن کیتھرین ہیپ برن کا ایک چھوٹا سا رومانی منظر بھی تھا۔ اسپینش اسٹیپس کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ عام سی سیڑھیاں تھیں جن کے اوپر سیاح چڑھ رہے تھے یا اتر رہے تھے۔ سیڑھیوں کے سامنے کچھ ریستوران اور مختلف دکانیں تھیں جہاں سیکڑوں مرد اور خواتین سیاح بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ تصویریں بنا رہے تھے یا خوشنما پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر والوں کو اپنے تاثرات سے آگاہ کر رہے تھے۔ اسپنش اسٹیپس میں کوئی خاص بات نہیں نظر آئی۔

یہ دیکھنے کے لیے آخر ان رومانی سیڑھیوں کے اوپر کیا ہے ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو وہاں ایک سڑک نظر آئی۔ کوئی خاص بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ ہے روم کے مشہور زمانہ اسپینش اسٹیپس کا احوال۔

روم کے پرانے تاریخی علاقوں میں بگھی پر سوار ہو کر گئے تو سڑکوں پر بدبو نے ہمارا استقبال کیا۔ فونٹین دی ٹریوی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو سیاح اس فوارے میں ایک سکہ پھینکتا ہے وہ کم از کم تین بار روم ضرور آتا ہے۔ ہم نے بھی شوق میں آ کر فوارے میں سکے پھینکے اور واقعی تین بار اٹلی جانے کا موقع ملا۔

ہم یہ بتا رہے تھے کہ یہاں لوگ نہانے میں بہت کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ ہفتوں غسل نہیں کرتے۔ غسل کے بجائے وہ خوشبو سے نہا لیتے ہیں۔ اس طرح پانی کی بچت ہو جاتی ہے مگر لاکھوں روپے کی خوشبو انڈیلنی پڑتی ہے۔ کم و بیش یہی صورتحال پیرس اور لندن میں بھی ہے۔ نہانا تو دور کی بات ہے منہ ہاتھ دھونا بھی ان کے لیے ایک بہت بڑی آفت سے کم نہیں ہے۔ کچھ عرصہ قبل تو یہ واش بیسن کے اندر پانی بھر کر اسی سے منہ ہاتھ دھو لیا کرتے تھے مگر اس پانی کو واش بیسن میں ہی محفوظ رکھتے تھے۔ ان کے بعد کوئی اور آتا، اسی واش بیسن کے پانی سے منہ ہاتھ دھوتا اور رخصت ہو جاتا۔ البتہ یورپ کی خواتین میک اپ پر ہمیشہ سے بہت زور دیتی رہی ہیں۔ چاہے ایک ہفتے تک غسل نہ کریں مگر صبح شام میک اپ سے چہرہ سجانا لازم ہے۔ آج بھی یورپ کی اسی نوے سالہ بوڑھی خواتین بھی میک اپ سے غفلت نہیں برتتیں۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین میں یا بسوں میں یہ بزرگ خواتین بار بار آئینے میں میک اپ تازہ کرتی ہوئی نظر آ جاتی ہیں۔

پیرس تو خوشبوؤں کا شہر ہی کہلاتا ہے جب پہلی بار ہم لوگ پیرس گئے اور ہر طرف خوشبو بکھری دیکھی تو بٹ صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ دراصل پیرس میں ہر روز خوشبو کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سارا شہر خوشبودار رہتا ہے۔

”بٹ صاحب۔ خدا کا خوف کرو ایسی بات کرو جو کوئی مان بھی لے۔“ خان صاحب کو یہ گپ پسند نہ آئی۔

”آپ مجھ پر اتنی بے اعتباری کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہر روز صبح سویرے پیرس کے درخت دھوئے جاتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر پانی سے درخت دھونا اور شہر کو خوشبوؤں سے نہلانا دو علیحدہ باتیں ہیں۔ اور یہاں تو خوشبو ویسے بھی بہت مہنگی ہوتی ہے۔“

استنبول میں یہ بات نہیں نظر آئی۔ نہ ہی وہاں سڑکوں

پر چلتے ہوئے خوشبوؤں کی مہک پھیلی دیکھی تھی۔ استنبول یورپ کے شہروں کی طرح صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں کے شہری بھی بہت مہذب اور تمیز دار ہیں۔ شہر میں گندگی یا بدبو کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ شہر اتنا خوشبودار کیوں ہے؟ یہ سوال بٹ صاحب نے دریافت کیا۔

"آپ بتائیے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

بٹ صاحب ناتوانہ انداز میں مسکرائے۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ استنبول کے لوگ ہر روز غسل کرتے ہیں۔ نمازی پانچ وقت وضو کرتے ہیں۔ ایسے صاف ستھرے لوگوں کو خوامخواہ خوشبو لگانے کی کیا ضرورت ہے۔"

ہم بھی ان کی اس دلیل سے متاثر ہوئے۔ "بٹ صاحب آپ نے آج ثابت کر دیا کہ کشمیریوں کا دماغ بھی خوب چلتا ہے۔"

"ارے کشمیر کی کیا پوچھتے ہیں۔ ارے بھائی وہاں تو زعفران کے کھیت ہوتے ہیں اور آپ کو پتا ہے کہ زعفران کتنی خوشبودار چیز ہوتی ہے۔"

"اور مہنگی بھی۔" خان صاحب نے چھیڑا۔

"خان صاحب...... یہ زعفران ہے۔ گنے کا کھیت نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان میں ایک تولہ زعفران کی ڈبیا کتنی مہنگی ملتی ہے اور وہ بھی اصلی نہیں ہوتی۔"

شعیب مرزا جو ہمیں ساحل سمندر پر ایک خوبصورت سے ریستوران میں بٹھا کر گئے تھے ہانپتے کانپتے گرتے پڑتے آئے اور ایک کرسی پر بقول بٹ صاحب کے ڈھے گئے۔ ہم شاید یہ بتانا بھول گئے کہ شعیب مرزا خاصے بھاری بھرکم انسان تھے اور ایک پاؤں پر زور ڈال کر چلتے تھے، کئی بار ہم لوگوں نے اس بارے میں سوچ بچار کیا کہ آخر وہ اس طرح ایک ٹانگ گھسیٹ کر کیوں چلتے ہیں۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ شاید وہ گھوڑے سے گر گئے ہوں گے۔ خان صاحب نے کہا کہ شاید فٹ بال کھیلتے ہوئے ٹانگ میں چوٹ لگ گئی ہوگی۔ ہمارا خیال تھا کہ کسی ایکسیڈنٹ کی وجہ سے لنگڑانے لگے ہیں۔ شعیب مرزا سے دریافت کیا تو انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور بولے "دراصل مجھے پولیو کے قطرے نہیں پلائے گئے تھے۔"

"کیوں نہیں پلائے گئے۔ کیا آپ کسی پہاڑی گاؤں میں رہتے تھے؟"

"بات یہ ہے کہ میرے والد اور والدہ دونوں کو بھولنے کی عادت تھی اور دونوں بحث کرنے کے بھی شائق تھے۔ جب پولیو کے قطرے پلانے کا وقت آیا تو ابا نے کہا کہ قطرے تو میں نے خود پلوا دیئے تھے۔ اماں کا کہنا تھا کہ آپ تو اس وقت کراچی گئے ہوئے تھے۔ اس بحثا بحثی میں میں پولیو کے قطرے پینے سے محروم رہ گیا ہمارے دادا بہت عقلمند تھے۔ جب ان کے سامنے مسئلہ پیش ہوا تو انہوں نے کہا کہ اگر آپ لوگ بھول گئے ہیں تو احتیاطاً ایک بار اور قطرے پلا دیں۔ کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اب اماں اور ابا میں بحث شروع ہو گئی کہ پولیو کے قطرے دوبارہ پلانے سے نقصان ہوگا یا نہیں۔ میں تو بہت چھوٹا تھا مگر جب بڑا ہوا اور میں نے لنگڑانا شروع کیا تو میں نے ابا اور اماں سے کہا۔ "اگر آپ لوگ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے تو کسی ڈاکٹر سے ہی پوچھ لیا ہوتا۔"

یہ بات وہ دونوں مان گئے مگر اس وقت تک میں لنگڑا ہو چکا تھا۔

شعیب صاحب کچھ دیر کو ستاتے رہے۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ دراصل اس بہانے وہ ساحل سمندر کے خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دیکھا جائے تو درحقیقت استنبول کے ساحل پر حد نظر تک پھیلے ہوئے خوبصورت ریستوران اس شہر کی جھومر ہیں۔ جو آپ کو کسی اور شہر میں یہ منظر دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ ساحل پر دور تک ریستوران پھیلے ہوئے ہیں جہاں ہر وقت رونق رہتی ہے، کوئی کھا رہا ہے، کوئی کافی پی رہا ہے۔ بٹ صاحب کا تو ساحلی ریستوران سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ خان صاحب نے انہیں فوراً حساب لگا کر بتایا کہ ہم لوگوں کو یہاں بیٹھے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ ترکی لیرا میں حساب لگائیں تو ہم نے یہاں بیٹھ کر اتنی رقم ضائع کی ہے۔ اگر ڈالر میں حساب لگائیں تو اتنے ڈالر یہاں خرچ ہو چکے ہیں جنہیں اگر پاکستانی روپے میں تبدیل کیا جائے تو ہم نے اس ایک جگہ بیٹھ کر اتنی رقم خرچ کر دی ہے۔

یہ حساب کتاب سن کر بٹ صاحب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ رات کو ہوٹل جا کر ہم لوگ ترکی میں قیام کا باقاعدہ شیڈول بنائیں گے اور اس کے مطابق ہر جگہ وقت صرف کریں گے تاکہ فضول خرچی نہ ہو۔

ویسے استنبول واقعی ایک انوکھا شہر ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں بلیک سی، مرمرا سی اور باسفورس کا ایک جگہ ملاپ ہوتا ہے۔ یہ ایسا ملک ہے جس نے دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں کا عروج اور زوال دیکھا ہے۔ یہ کئی مختلف تہذیبوں کا مرکز رہا ہے اور ہر تہذیب اپنے نقش ونگار اور نشانیاں یہاں چھوڑ گئی ہے۔ اس ملک کے ساحلوں پر خوں ریز جنگیں لڑی گئی ہیں۔ کتنے طاقتور حکمرانوں نے باسفورس پر بالادستی قائم کرنے کے لیے جنگ وجدل کیا ہے۔ بے شمار فوجیوں نے اس کے حصول کے لیے اپنی جانیں دی ہیں اور وطن سے دوران کی بے گور وکفن لاشیں پیوند زمین یا سمندر کی مچھلیوں کی غذا بن چکی ہیں۔ ملکوں کو فتح کرنے کی خواہش ہر حکمران کے دل میں مچلتی رہی ہے لیکن قسطنطنیہ پر حکمرانی کے شوق میں بہت زیادہ قربانیاں دی گئی ہیں۔

آج کا قسطنطنیہ ایک خوبصورت پرسکون اور مہذب شہر ہے جو مشرق اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ اعزاز دنیا کے کسی اور ملک کو حاصل نہیں ہوا ہے۔ استنبول کا ایک حصہ اس وقت یورپ میں اور دوسرا ایشیا میں ہے مگر مختلف تہذیبوں کی آمیزش نے اس شہر کو ایک نرالا حسن اور حیثیت عطا کی ہے۔

ایک بات تو ہم بتانا بھول ہی گئے۔ ترکی کا پنیر بے حد خوبصورت اور لذیذ ہوتا ہے۔ جب ہم نے پہلی مرتبہ ایئرپورٹ پر پنیر منگایا تو اس کی شکل دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ چکھے بغیر مزید منگا لیا مگر جب کھایا تو ہوش اڑ گئے۔ جو لوگ ترکی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ پنیر کی صورت شکل دیکھ کر زیادہ متاثر نہ ہوں۔ یہ حد سے زیادہ نمکین ہوتا ہے۔ اتنا زیادہ نمکین کہ اس کا ایک لقمہ کھانا بھی ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔

پنیر بہت اچھا تھا۔ مہنگا بھی تھا۔ اس لیے اس کو ضائع بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

خان صاحب نے خاتون ویٹرس کو بلایا اور بہت مشکل سے اس سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دریافت کیا کہ اس کے نمک کو کم کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ پہلے تو وہ ہماری بات سمجھی ہی نہیں پھر اس نے کہا۔ "میں منیجر سے مشورہ کر کے بتاتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد منیجر کے ساتھ وہ آ گئی۔ یہ خاتون منیجر تھیں اور خاصی بارعب اور خوش شکل تھیں۔ انہوں نے ہم سے ترکی میں پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ خوش قسمتی سے اسی وقت ایک یورپین جوڑا ریستوران میں داخل ہوا تو ہماری یہ مشکل آسان ہو گئی۔ مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ جوڑا صرف انگریزی جانتا تھا۔ ترکی سے نابلد تھا۔ انہوں نے ازراہ مہربانی سامنے سے گزرتے ہوئے ایک ترک جوڑے سے دریافت کیا کہ وہ انگریزی جانتے ہیں۔

انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تھوڑی تھوڑی انگریزی تو جانتے ہیں مگر ترکی بالکل نہیں جانتے۔" وہ دیکھنے میں تو ترک لگ رہے تھے لیکن دراصل وہ یونانی تھے۔

قصہ مختصر یہ کہ پنیر کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

پنیر پر یاد آیا کہ سنا تھا فرانس میں پنیر کی بے شمار قسمیں ہوتی ہیں اور یہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ فرانس کے صدر جنرل ڈیگال نے ایک بار کہا تھا کہ جس قوم میں پنیر کی 280 قسمیں ہوتی ہیں اس پر حکومت کرنا کتنا مشکل ہوگا۔

یوں تو دنیا کے دوسرے شہروں اور ملکوں پر بھی مختلف اقوام کی حکمرانی رہی ہے لیکن ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ مختلف حکمرانوں کے دور کی حسین اور باوقار یادگاریں شانہ بہ شانہ بہترین حالت میں ایک دوسرے کے سر سے سر جوڑے نظر آئیں۔ استنبول پر بازنطینی حکمرانوں نے ایک طویل عرصے تک حکومت کی ہے اور اس کو اپنی تہذیب کی بوقلمون سے سجایا ہے۔ انہوں نے اس شہر اور ملک کو خوبصورت اور پرکشش بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ اب تاابد اس حسین ملک پر وہی بادشاہت کرتے رہیں گے۔ لیکن بازنطینی حکومت اور تہذیب بالآخر روبہ زوال ہو گئی۔ استنبول اب رومن سلطنت کا پایہ تخت بن گیا۔ رومن ہمیشہ سے ایک خوش ذوق اور حسن پرست روایات کے حامل رہے ہیں۔ یہ واحد دارالحکومت ہے جس کو ہر دور میں بہت محبت سے سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دلی کتنی بار اجڑی اور ہر آنے والے حاکم نے پرانی یادگاروں کی اس طرح حفاظت نہیں کی کہ گزشتہ تہذیب کی پرچھائیاں بھی اسی شان وشوکت کے ساتھ قائم رہیں۔ افغان حملہ آوروں کی دلی اور طرح کی تھی۔ مرہٹوں کی دلی کا رنگ جدا تھا۔ پھر مغل آئے تو انہوں نے دلی کو اپنی تہذیب میں رنگ لیا۔ ان کے زوال کے بعد انگریزی حکومت نے دلی کا نظم ونسق سنبھالا۔ اس کو ایک نیا رنگ وروپ دیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد آج کی دلی پرانی تہذیبوں کے آثار مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ دہلی کا لال قلعہ، شاہی مسجد اور دوسری یادگاریں اب محض یادگاریں ہی رہ گئی ہیں۔ اگر بھارتی حکومت کو غیر ملکی سیاحوں کے اربوں ڈالر کا لالچ نہ ہو تو ہندوستان سے مسلمانوں کے عہد کی یادگاریں یا تو مسمار کر دی جاتیں یا پھر انہیں ہندو مذہب اور تاریخ کا ایک حصہ ثابت کر دیا جاتا جیسا کہ تاج محل آگرہ کے بارے

میں ہو رہا ہے۔

تاج محل کی ایک اپنی تاریخ ہے اور ہر سیاح اور مورخ اس کو شہنشاہ شاہجہاں سے منسوب کرتا ہے۔ یہ روضہ شہنشاہ نے اپنی چہیتی ملکہ کے لیے تعمیر کروایا تھا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آج بھی ہندوستان کی حکومت اس مقبرے کی وجہ سے اربوں ڈالر سالانہ کما رہی ہے۔ پچھلے دنوں ایک ہندو پروفیسر نے یہ شوشہ چھوڑا کہ تاج محل دراصل ایک مندر تھا جسے مغلوں نے زبردستی مقبرہ بنا دیا۔ پروفیسر صاحب یہ دیکھنے سے بھی قاصر ہیں کہ ہندوؤں کے مندر کی طرز تعمیر یکسر مختلف ہوتی ہے۔ مندروں میں ایسے مینارے نہیں ہوتے نہ ہی دیواروں پر آیات قرآنی تحریر کی جاتی ہیں۔

خوش قسمتی سے استنبول کو ایسے تنگدل اور متعصب ہمسائے نصیب نہیں ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کی تاریخ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکی ہے۔ البتہ ہیگا صوفیہ، آیا صوفیہ کے بارے میں اختلاف ہمیشہ سے رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ آیا صوفیہ کو سردار بائز اس نے ساتویں صدی قبل از مسیح میں تعمیر کرایا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے استنبول کی حفاظت کے لیے باسفورس کو اہمیت دی۔ اس کے بعد اس پر رومنوں کا قبضہ ہوگیا۔ قسطنطین اعظم نے بازنطینہ کی مختصر آبادی کو نکال باہر کیا اور اس بستی کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ قسطنطین بت پرست تھا لیکن بعد میں عیسائی ہوگیا تھا۔ اس طرح ایک ملا جلا نیا مذہب وجود میں آگیا۔ اس شہر کی بنیاد 326 میں رکھی گئی تھی۔ عیسائیوں نے استنبول کو دیکھا تو اس کی وسیع و عریض فصیلیں اور اس قدر بڑا شہر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس شہر نے کئی نام تبدیل کیے۔ اس کا پہلا نام بازنطینہ تھا۔ اس کے بعد یہ قسطنطنیہ کہلایا مسلمانوں نے فتح کرنے کے بعد اس کا نام استنبول رکھا جو آج بھی اس نام سے مشہور ہے۔

آیا صوفیہ یا ہیگا صوفیہ کے بارے میں ایک تنازعہ رہا ہے لیکن کمال اتاترک نے اس کو میوزیم میں تبدیل کرکے یہ جھگڑا ہی ختم کردیا۔ یہ کسی زمانے میں عیسائیوں کی عبادت گاہ رہا۔ مسلمانوں نے فتح کرنے کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کردیا۔ آخر میوزیم پر آکر بات ختم ہوئی۔

آیا صوفیہ استنبول کے ہر حصے سے نظر آتا ہے مگر اس کا حسن اور جاہ و جلال کا عمارت کے اندر جا کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔ 360 میں تعمیر ہونے والی اس حسین، دلکش عمارت کو دیکھ کر انسان مسحور رہ جاتا ہے۔

اس عمارت کی تعمیر کے بارے میں ایک کہانی بھی مشہور ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن دنوں اس کی تعمیر جاری تھی تو مزدور اپنے اوزار ایک بچے کے حوالے کر گئے کہ ان کا خیال رکھنا۔ مزدوروں کے جانے کے بعد ایک فرشتہ نمودار ہوا اور اتنی بڑی عمارت میں ایک بچے کو دیکھ کر فرشتے نے پوچھا کہ یہ سب مزدور کام چھوڑ کر تمہیں اکیلا کیوں چھوڑ گئے ہیں۔

بچے نے بتایا کہ وہ مزدوروں کے اوزاروں کی حفاظت کے لیے وہاں موجود ہے۔ فرشتے نے کہا تم اسی وقت جاؤ اور تمام مزدوروں کو بلا کر لاؤ۔ ان اوزاروں کی میں خود حفاظت کروں گا۔ بچہ فرشتے کے کہنے پر مزدوروں کو لینے چلا گیا۔ مزدوروں نے بچے کو دیکھا تو بہت ناراض ہوئے کہ تم ہمارے قیمتی اوزار حفاظت کے بغیر چھوڑ کر کیوں آئے۔ بس اب تم واپس نہ جانا۔

بچہ واپس نہیں آیا مگر فرشتہ اس کا آج تک منتظر ہے اور عمارت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کہانی کے مطابق فرشتہ آج بھی وہیں موجود ہے۔ عمارت کے اس کونے میں ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اس پتھر کے پاس آکر منت مانتا ہے اس کی خواہش ضروری پوری ہوتی ہے۔

بٹ صاحب بولے۔ ''اگر فرشتہ اتنا ہی نیک دل تھا تو وہ خود مزدوروں کو بلانے کیوں نہیں گیا۔ اس معصوم بچے کے سپرد یہ کام کیوں کردیا؟''

''اس نے کوئی مصلحت سوچی ہوگی۔''

''مصلحت نہیں۔ یہ فرشتے کی کام چوری تھی۔ بے چارے معصوم بچے کو ٹھوکریں کھانے کے لیے بھیج دیا۔ یہ کیسا ظالم فرشتہ تھا۔ اور پھر اس نے بچے کو تلاش کیوں نہیں کیا؟''

خان صاحب ان سوالات سے تنگ آگئے۔ بولے۔ ''بھائی یہ فرشتے کا اور اس بچے کا آپس کا معاملہ ہے۔ ہمیں درمیان میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟''

یہ بحث کافی دیر جاری رہتی اگر شعیب مرزا اٹھ کر کھڑے نہ ہوجاتے۔ انہوں نے کرسی سے اٹھ کر ایک انگڑائی لی اور بولے ''بھائیو اب ٹوپ کاپی محل دیکھنا ہے یا گرینڈ بازار چلنا ہے۔''

''ہم بازار دیکھنے نہیں یہاں سیر کرنے آئے ہیں۔''

''وہ بازار بھی تاریخی ہے اور استنبول آنے والا ہر شخص اس کو ضرور دیکھتا ہے۔''

''بھئی یہ تو شہر شروع سے آخر تک تاریخی ہے۔ تاریخ کو چھوڑو، شہر کی سیر کرو۔''

جاری ہے

جہنمی گڑھے

صائمہ اقبال

یورپ کے متعدد شہروں میں عجیب وغریب واقعات رونما ہورہے ہیں۔ کبھی پورا پورا کمرا تو کبھی کسی کا بیڈ، کبھی سڑک پر چلتی ہوئی گاڑی غائب ہورہی ہے۔ ایسے ایسے سنسنی خیز واقعات کا سامنا ہے کہ میدان میں کھیلتے ہوئے کھلاڑی کو منٹوں سیکنڈوں میں زمین نگل لے رہی ہے۔

یورپ بھر میں جگہ جگہ زمین انسانوں کو نگل رہی ہے

وہ رات انتہائی تاریک تھی۔

فلوریڈا کے مغربی شہر ٹیمپا پر سناٹا طاری تھا۔ خلیج میکسیکو سے آنے والے پانیوں پر گہرا تیرتا تھا اور ماحول غنودگی کی گرفت میں تھا۔

شہر کے دیگر مکانات کے مانند جیفری کا مکان بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ نیند کی وادی میں اتر چکا تھا۔ کمرے میں لیمپ کی زرد روشنی لرز رہی تھی۔ سامنے ٹی وی رکھا تھا، جس کے پہلو میں نصب شیلف میں کتابیں بے ترتیبی سے

تھنسی ہوئی تھیں۔ اُس کے اہلِ خانہ اپنے اپنے کمروں میں سوئے ہوئے تھے۔

ایسے میں مکان میں چھائی خاموشی میں کچھ ہلچل ہوئی۔ اِس سے قبل کہ وہ بستر سے باہر آتا، اچانک زمین لرزنے لگی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

جیفری نے دونوں ہاتھوں سے بستر تھام لیا۔ اور تب، اُسے ایک خوفناک احساس نے آن گھیرا۔ زمین لرز نہیں رہی تھی... وہ دھنس رہی تھی... بے حد تیزی سے۔ اسے سالم نگل رہی تھی۔

''جیرمی...'' وہ چلّایا۔ ''میری مدد کرو!''

جیرمی نے اپنے بھائی کی آواز سنی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''میری مدد کرو۔'' پکار میں دکھ تھا۔

وہ فوراً ساتھ والے کمرے کی جانب دوڑا جہاں داخل ہوتے ہی وہ بھونچکا رہ گیا۔

اُس کا بھائی، اپنے بستر سمیت تیزی سے زمین میں دھنس رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین نے اچانک دلدل کی شکل اختیار کرلی ہو۔

''مجھے بچاؤ۔'' جیفری کا چہرہ خوف سے سفید ہوچکا تھا۔

جیرمی آگے بڑھا ہی تھا کہ زمین کے دھنسنے کی رفتار میں یکدم اضافہ ہوگیا اور پلک جھپکتے ہی پورا بستر زمین میں غائب ہوگیا۔ اب وہاں ایک مکروہ گڑھا تھا۔

''مدد کرو...'' گہرائیوں سے جیفری کی پکار سنائی دی۔

اُس نے ٹارچ سے اندر روشنی پھینکی، جو کچھ دُور جا کر تاریکی میں گم ہوگئی۔

''جیفری!'' وہ پوری قوت سے چلّایا، مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اسی اثنا میں سائرن کی تیز آواز ماحول میں گونجی۔ پڑوسی نے شور سن کر ہنگامی امداد کے مرکز پر فون کردیا تھا۔ مکان کے باہر گاڑیاں آکر رکیں۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی، مگر جیرمی پر وحشت طاری تھی۔

اچانک کسی نے اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ ''رک جائیے۔'' اور تب اس کی نظر ریسکیو اہل کاروں پر پڑی جو اُسے کھینچ رہے تھے۔

''فوراً باہر آجائیں، زمین کھسک رہی ہے۔'' یہ جملہ اسے لمحۂ حال میں لے آیا۔ اس وحشت ناک احساس نے اسے آلیا کہ وہ کسی بھی لمحے زمین میں دھنس سکتا ہے۔

جیرمی باہر آگیا۔ اور اب ریسکیو اہل کار اس پُراسرار گڑھے کی سمت بڑھ رہے تھے جو ایک انسان کو نگل چکا تھا۔

وہ یکم مارچ 2013 کی رات تھی، جب خلیج میکسیکو سے آنے والے پانیوں پر ٹھہرا تیر رہا تھا۔

☆☆☆

سورج طلوع ہوچکا تھا اور ٹیمپا کی فضاؤں پر سراسیمگی کے بادل تیر رہے تھے۔

پولیس نے جائے وقوعہ کو سیل کردیا تھا۔ ریسکیو اہل کار جیفری کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا، یہ اندیشہ قوی ہوتا جارہا تھا کہ بدقسمت جیفری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

میڈیا کے نمائندوں نے مکان کو گھیر رکھا تھا۔ محلے والے بھی چہرے پر خوف لیے اِس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لیے چلے آئے تھے — سب کی توجہ کا مرکز جیرمی تھا، جو اِس پُراسرار واقعے کا چشم دیدہ گواہ تھا اور اُس وقت ایک رپورٹر سے بات کررہا تھا۔

''وہ میرے سامنے تھا... مجھے مدد کے لیے پکار رہا تھا، مگر میں اُس کے لیے کچھ نہیں...'' اس کی ہچکی بندھ گئی۔

''آپ کے خیال میں وہ اب تک زندہ ہوگا؟'' رپورٹر نے سوال کیا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' اس نے آنسو پونچھے۔ ''ریسکیو ٹیم نے یقین دلایا ہے کہ وہ اسے باہر نکال لیں گے مگر... میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''ویسے آپ کے بھائی کا پیشہ کیا تھا؟''

''وہ...'' جیرمی کے ذہن کے پردے پر ایک فلم سی چلنے لگی۔ جیفری کی پُراسرار سرگرمیاں... مطالعے میں رہنے والی بے ڈھنگی کتابیں... راتیں جنگل میں گزارنے کی عادت... ہر منظر اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اس کا بھائی مخفی علوم کے تعاقب میں ہے، مگر اس لمحہ وہ اپنے احساسات کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''وہ... میری طرح ایک کسان تھا۔''

ٹھیک اُس لمحے جب جیرمی رپورٹر کو واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کررہا تھا، سارجنٹ سڈنی نے کمرے کی دیوار پر لگے شیلف سے ایک کتاب اٹھائی، جس کے سرورق پر ایک سانپ بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

جیپ پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

ستائیس سالہ جیمس ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ فلوریڈا کے محکمۂ ارضیات میں ریسرچ آفیسر تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر اُس کی گرل فرینڈ اینا موجود تھی۔ جھیل سی آنکھوں والی اینا یونیورسٹی آف ساؤتھ فلوریڈا میں سوشل سائنسز کی طالبہ تھی۔

پچھلی نشست پر کیری اور اینجل براجمان تھے۔ وہ دونوں اورلینڈو کے ایک معروف میگزین سے وابستہ تھے۔ کیری اسپورٹس رپورٹر تھا، جب کہ اینجل میگزین کے لیے پُراسرار اور دلچسپ کہانی اکٹھی کیا کرتی تھی۔

اینجل کو اپنے کام سے نفرت تھی۔ پُراسرار قصے کہانیوں کو وہ توہم پرست ذہنوں کی اختراع تصور کیا کرتی تھی۔ ذاتی زندگی میں ہر شے کو سائنس اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتی۔ اِسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ پیشہ ورانہ ذمّے داریوں نے اُسے ایک ایسے شعبے میں لا پھینکا، جو اُس کے رجحانات سے قطعی میل نہیں کھاتا تھا۔

گاڑی میں سوار اپنے دوستوں کے برعکس اینجل کا تعلق فلوریڈا سے نہیں تھا۔ وہ الونائی کے ایک چھوٹے سے شہر کولمبیا میں پیدا ہوئی، ملازمت کی تلاش اسے پڑوسی ریاست لے آئی جہاں اُس کی کیری نامی ایک خوبرو نوجوان سے ملاقات ہوئی اور جلد ہی دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ کیری ہی کے توسط سے اُس کی جیمس اور اینا سے ملاقات ہوئی۔

اس وقت وہ چاروں بہ ذریعہ ہائی وے اورلینڈو سے ٹیمپا جارہے تھے۔ سفر کا بنیادی مقصد اس پُراسرار گڑھے کو قریب سے دیکھنا تھا، جس نے کچھ روز قبل ایک دیہاتی کو نگل لیا تھا۔ دراصل اینجل کو میگزین ایڈیٹر کی جانب سے یہ اسٹوری کور کرنے کی ذمّے داری سونپی گئی تھی۔ ٹیمپا میں بیس بال کا ایک ٹورنامنٹ بھی شروع ہونے کو تھا، اِسی وجہ سے کیری بھی ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔ جب اُنھوں نے اپنے منصوبے کا ذکر جیمس اور اینا سے کیا، تو وہ بھی تیار ہوگئے۔

اینجل کی ایک بہن تھی رابیکا گو کہ وہ جڑواں بہنیں نہیں تھیں، مگر اُن میں حیران کن حد تک مشابہت پائی جاتی تھی۔ وہی نین نقش، وہ ہی قد کاٹھ۔ رابیکا اُس سے دو برس بڑی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ گھومنا پھرنا اُس کا من پسند مشغلہ تھا۔ اسی شوق کے باعث اس نے کولمبیا کی کسی درس گاہ میں داخلہ لینے کے بجائے پڑوسی شہر کے واٹرلو ہائی اسکول کا انتخاب کیا۔ رہائش کے لیے ہاسٹل کو منتخب کیا، یوں اُسے گھومنے پھرنے کی آزادی مل گئی۔ وہ کبھی دوستوں کے ساتھ جنگل میں کیمپ لگاتی، کبھی مچھلی کے شکار پر نکل جاتی۔

وہ اکثر ٹیلی فون پر اینجل کو اپنی آوارہ گردی کے قصے سنایا کرتی تھی۔ اِن قصوں کے دوران کبھی کبھار اس کے دوستوں کا بھی ذکر آتا۔ اس شام بھی ہاسٹل سے روانہ ہونے سے قبل رابیکا نے اینجل کو فون کیا تھا۔

''آج کا پروگرام بڑا ہی زبردست ہے۔ ہم پوری شام جنگل میں گزارنے والے ہیں۔'' وہ خاصی پُرجوش تھی۔ ''کچھ نئے دوست بھی ہیں۔ امید ہے خوب لطف آئے گا۔''

اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جنگل سے لوٹ کر اینجل کو تمام تفصیلات سے آگاہ کرے گی... مگر وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔

اس روز واٹرلو شہر ایک غیرمتوقع طوفان کی زد میں آگیا۔ آسمان پوری قوت سے برس پڑا۔ دریاؤں میں طغیانی آگئی۔ کئی گھر تباہ ہوگئے۔

طوفان تھمنے کے بعد جب شہر کی انتظامیہ نے بحالی کا کام شروع کیا، تو اندازہ ہوا کہ کئی افراد لاپتا ہیں۔ اور اُن ہی لاپتا افراد میں ایک نام رابیکا اون کا بھی تھا۔

پولیس نے فوراً اُس کے اہل خانہ سے رابطہ کیا۔

''اُس کا اپنا دوستوں کے ساتھ جنگل میں کیمپنگ کا پروگرام تھا۔'' اینجل نے پولیس کو بتایا۔

پولیس نے اُس کے دوستوں سے پوچھ گچھ کی، مگر اُنھوں نے یہ کہہ کر پولیس کے خدشات میں اضافہ کردیا کہ اُنھیں ایسے کسی پروگرام کا قطعی علم نہیں۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، اندیشہ بڑھتے گئے، جو بالآخر درست ثابت ہوئے۔ ایک ہفتے بعد پولیس کو اُس کی لاش مل گئی۔

کیچڑ میں لت پت رابیکا کی لاش ایک گہرے گڑھے سے ملی، جس کے اطراف جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم سے پتا چلا کہ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔ گڑھے کے قریب سے ملنے والے شواہد سے پولیس نے اندازہ لگایا کہ وہاں اُس رات وہ تنہا نہیں تھی۔ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔

پولیس کا خیال تھا کہ رابیکا نے اپنے دوستوں کے ساتھ کیمپ لگایا ہوگا، اس دوران اُنھیں طوفان نے آلیا، جس سے بچنے کی کوشش میں وہ گڑھے میں گرگئی۔ سر پر آنے والی شدید چوٹ کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئی اور دھیرے دھیرے موت کی وادی میں اتر گئی۔

بہ ظاہر یہ ایک معمولی کیس تھا، مگر ایک پیچیدگی تھی۔ پولیس سرتوڑ کوشش کے باوجود اُن افراد کا سراغ نہیں لگا سکی،

جو اس رات رابیکا کے ساتھ تھے۔ غالب امکان تھا کہ وہ غیر مقامی تھے۔

بالآخر ڈیڑھ برس کی تحقیقات کے بعد واٹرلو کی پولیس نے اِس کیس کی فائل بند کردی۔

بہن کی موت کے دو برس بعد اُس نے اپنے طور پر اس واقعے کی تحقیقات کا فیصلہ کیا اور رابیکا کے فوٹو البمز اور اسکول ریکارڈز کی مدد سے اُس کے دوستوں کی تلاش میں نکل پڑی۔

رابیکا کے رابطے میں موجود تمام لڑکے لڑکیوں سے اس کی ملاقات ہوگئی، مگر تصویروں میں نظر آنے والے تیکھے نقوش کے ایک نوجوان سے اُس کی ملاقات نہیں ہوسکی۔

اطلاعات کے مطابق رابیکا کی موت کے چند ماہ بعد اُس نے واٹرلو چھوڑ دیا تھا۔ البتہ پولیس ریکارڈ سے اُس کا سراغ مل گیا۔ اس کا نام ایلکس پیٹرسن تھا اور اُس کا تعلق والمبیر نامی گاؤں سے تھا۔ پولیس نے رابیکا کی گمشدگی کے سلسلے میں اس سے بھی ملاقات کی تھی، مگر کوئی خاص معلومات حاصل نہیں کرسکی۔

اینجل نے اس گاؤں کا بھی سفر کیا، مگر یہ کوشش لاحاصل رہی۔ وہ چند برس قبل دیہی زندگی کو خیرباد کہہ چکا تھا۔

”یہ ارضیاتی معاملہ ہے۔“ جیمس کی آواز اینجل کو لمحۂ حال میں لے آئی۔

کیری نے اینجل کو ٹہوکا دے کر اینا کی جانب متوجہ کیا، جس کے چہرے پر حیرت تھی۔

جیمس نے اپنی محبوبہ کی معصومیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ”وہ گڑھا فقط ایک Sinkhole (گرتہ یا آبگیرہ) ہے۔“

”Sinkhole...“ اینا نے یہ لفظ دہرایا۔ حیرت قائم رہی۔

”ہاں۔ یعنی فطری اور کبھی کبھار انسانی عوامل کے نتیجے میں جنم لینے والا ایک گڑھا۔ یہ دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں swallow hole بھی کہتے ہیں، کیونکہ جب یہ گڑھا نمودار ہوتا ہے تو زمین کی اوپری سطح اس طرح ڈھے جاتی ہے، جیسے کسی نے اسے نگل لیا ہو۔ یہ عام طور سے ساحلی اور نشیبی علاقے میں ظاہر ہوتے ہیں، جہاں کی مٹی میں کیلشیم کاربونیٹ وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ دراصل سخت ترین زمین کے درمیان بھی خلا ہوتا ہے، دراڑیں ہوتی ہیں۔ مسلسل بارش یا نکاسی کے ناقص نظام کی وجہ سے زمین پانی جذب کرتی رہتی ہے اور ہوتے ہوتے یہ پانی زیرِ زمین پانی تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسی زمین بہ ظاہر ٹھوس لگتی ہے، مگر اس اندرونی حصہ اپنی سختی کھو چکا ہوتا ہے۔ اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب زمین اندر کو دھنس جاتی ہے۔ کبھی کبھار یہ عمل سست روی سے انجام پاتا ہے، پر کبھی کبھار یہ اچانک بھی ہوتا ہے۔“

کیری نے مصنوعی جمائی لی، مگر جیمس نے نوٹس لیے بغیر بات جاری رکھی۔ ”ماضی میں جب سائنس نے ترقی نہیں کی تھی، اس قسم کے گڑھوں سے مافوق الفطرت قصے جوڑ دیے جاتے تھے، اِسے پُراسرار قوتوں کی کارستانی تصور کیا جاتا تھا، مگر آج اِن کی سائنسی توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ ساحلی علاقوں کی زمین میں نمکیات ہوتے ہیں۔ اگر وہ دھیرے دھیرے گھل جائیں تو ایک وقت ایسا آتا ہے، جب زمین ڈھے جاتی ہے۔ کچھ برس قبل بحرِ مردار کے کنارے ایک ایسا ہی گڑھا ظاہر ہوا تھا۔ یہ سمندر میں بھی ظاہر ہوسکتا ہے، اس کی ایک مثال برازیل کے سمندر میں موجود گریٹ بلو ہول ہے۔ یاد آیا، 2010 میں فلوریڈا ہی میں ایک گڑھا نمودار ہوا تھا، جس نے ایک گاڑی کو نگل لیا تھا اور....“

”بس کریں مسٹر جیمس۔ ہمیں پتا ہے کہ آپ نے گزشتہ دنوں ایک ٹی وی چینل کو خصوصی انٹرویو دیا ہے۔ جب نشر ہوگا ہم دیکھ لیں گے۔ پلیز ابھی ہمیں بور مت کریں۔“ کیری نے انگڑائی لی۔ ”اور ویسے بھی اب مجھے نیند آرہی ہے۔“

☆☆☆

کمرے کی فضا میں عجیب سا بوجھل پن تھا۔

مارک ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا، جس پر ٹیمپا میں ظاہر ہونے والے گڑھے پر ایک رپورٹ نشر ہورہی تھی۔

پروگرام کا میزبان معروف ماہرِ ارضیات برولس مارگر سے بات کررہا تھا۔

”30 فٹ چوڑا اور 20 فٹ گہرا گڑھا، جس نے ایک انسان کو نگل لیا، جس کی لاش تاحال نہیں ملی... پورے امریکا میں اِس حوالے سے سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے۔ ماہرِ ارضیات کی حیثیت سے آپ کی اِس بارے میں کیا رائے ہے مسٹر برولس؟“

برولس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”بے شک یہ واقعہ خاصا ہولناک ہے، کسی ڈراؤنی فلم کے مانند، مگر Sinkhole کوئی نیا تصور نہیں، یہ الگ بات ہے کہ لوگ اس بابت بہت کم جانتے ہیں۔“

رپورٹر نے بات اچک لی۔ ”ٹیمپا کے واقعے کو چند ہی روز گزرے ہیں اور فلوریڈا اور پینسلوانیا میں دو اِس قسم کے گڑھے ظاہر ہوچکے ہیں۔ اسی طرح گزشتہ برس کیلی فورنیا میں ایک بس اچانک زمین میں دھنس گئی تھی۔“

”آپ دُرست کہہ رہے ہیں۔“ برولس نے کہا۔ ”مگر خوش قسمتی سے مذکورہ واقعات میں کوئی شخص ہلاک نہیں ہوا۔ دیکھیں اس قسم کے گڑھے یکدم نمودار نہیں ہوتے۔ اِن کے لیے مخصوص حالات، موسم اور زمینی ساخت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمین میں مختلف اقسام کے پتھر پائے جاتے ہیں، جن میں چند اگر طویل عرصے تک پانی میں رہیں، تو گھل جاتے ہیں۔ اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے، جب اندرونی زمین سرکنے لگتی ہے اور گڑھا سا بن جاتا ہے۔“

”مگر گوئٹے مالا کی زمین کے بارے میں تو ایسی کوئی اطلاع نہیں ملتی، جہاں 2010 میں عین شہر کے بیچوں بیچ ایک سو فٹ گہرا گڑھا نمودار ہوا، جس نے تین منزلہ عمارت نگل لی اور پندرہ افراد کی جان لے لی؟“ میزبان نے خاصی تیاری کر رکھی تھی۔

”دیکھیں اس واقعے کا سبب بدترین بارشیں اور ناقص ڈرینج سسٹم تھا، جس کی وجہ سے زیرِ زمین دراڑیں پڑ گئیں۔ گوئٹے مالا کا واقعہ ہولناک ضرور ہے، مگر پُراسرار نہیں۔ البتہ ٹیمپا کے کیس کا پریشان کن پہلو یہ ہے کہ گڑھا ایک مکان کی چھت تلے نمودار ہوا۔ میں یہ سوچ کر دہل جاتا ہوں کہ اگر جیفری بش اس مکان میں تنہا مقیم ہوتا، تو شاید کئی دن تک لوگوں کو اس سانحے کا پتا نہ چلتا۔“

”یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔“ رپورٹر کے چہرے پر تفکرات ابھرے۔

اسکرین کے سامنے بیٹھے مارک کی آنکھوں میں اندیشے تیرنے لگے۔ گلا چٹخنے لگا۔

”بے شک، مگر جیسا میں نے کہا یہ روز روز نمودار نہیں ہوتے۔ بے فکر رہیں، ایسا نہیں ہوتا کہ آپ دفتر جاتے ہوئے اچانک زمین میں دھنس جائیں، یا گالف کھیلتے ہوئے یکدم زمین آپ کو نگل لے۔“

مارک کا دل دہل گیا۔ وہ ایک گالفر تھا۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ گالف کے میدان ہی پر گزرتا تھا۔

☆☆☆

”ہم لیک لینڈ کے مقام پر رکیں گے۔“ جیمس کی آواز جیپ میں بلند ہوئی اور اینا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کیری بھی آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہوگیا۔ البتہ اینجل خاموش بیٹھی کتاب پڑھتی رہی۔

”اف خدایا، تم نے مجھے تو ڈرا ہی دیا جیمس۔“ کیری نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہی ہوا تم بیدار ہوگئے۔ اب ذرا ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لو۔ میں بھی نیند پوری کرلوں۔“ وہ مسکرایا۔

”ہم لیک لینڈ سے کتنے فاصلے پر ہیں؟“ اینا نے سوال کیا۔

”لگ بھگ اٹھارہ میل۔“ جیمس نے جواب دیا۔ ”امید ہے، سورج طلوع ہونے سے قبل ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ شہر کے داخلی حصے میں ایک موٹیل ہے، ہم وہاں کچھ دیر آرام کریں گے۔“

”تم لوگ آرام کرنا، میرا ارادہ مُن پارک دیکھنے کا ہے۔“ اینجل نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں... کیا اُس پارک میں کوئی پُراسرار کہانی چھپی ہے!“ جیمس نے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

وہ چاروں تھکن سے بے حال تھے۔ جیسے ہی انہیں موٹیل نظر آیا انہوں نے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کرلیا اور جیپ پارک کر کے موٹیل میں داخل ہوگئے۔

بنو ثعلبہ

ایک عام اور قدیم اسم علم جس کا اطلاق قدیم عرب کے متعدد قبائل کبیرہ کی بڑی شاخوں کے ناموں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ثعالبہ بن عکابة، جو کب بن دائل کے بڑے قبیلے کی اہم شاخ ہے اور یمامہ سے بحرین تک کے علاقے میں آباد ہے۔ ”ثعلبہ بن ذبیان“ جو غطفان کی شاخ ہے اور علاقہ نفود میں آباد ہے۔ ”ثعلبہ بن یربوع“ تمیم کا ایک قبیلہ ہے۔ ثعلبہ نام کے دو اور قبائل بھی قابل ذکر ہیں ان میں یثرب بن اوس کا ایک قبیلہ ثعلبہ اور دوسرا ثعلبہ بن الفطیون“ جو یہود بنی قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک رکن مخیریق بہت بڑا عالم تھا یہ آنحضور کا مخالف تھا بعد میں اس نے اسلام قبول کرلیا اور جنگ احد میں شہید ہوا۔

ایک اور شخص ثعلبہ بن عمرو بن مجالد تھا جو خاندان غسان کا پہلا رئیس بتایا جاتا ہے۔

مرسلہ: توحید احمد خان، شادی پور

میزیں خالی پڑی تھیں۔ کاؤنٹر پر بھی سناٹا تھا۔ وہ ایک میز تک گئے اور اپنے جسموں کو کرسیوں کے حوالے کر دیا۔
''کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔'' ایک بھاری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ چاروں نے چونک کر گردن اٹھائی۔ سامنے ایک سیاہ فام عورت کھڑی تھی۔
''وہ...'' جیمس بوکھلا گیا۔ ''کچھ پینے کو مل سکتا ہے۔''
''ضرور۔'' اس نے ایک گہری نظر ان پر ڈالی اور کاؤنٹر کی جانب چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں چار گلاس لیے لوٹی، جس میں جامنی رنگ کا مشروب تھا۔
''کیا آپ کھانے کے لیے بھی کچھ آرڈر کرنا پسند کریں گے؟'' اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر اینجل کی آواز بلند ہوئی۔ ''ہاں، بہت بھوک لگی ہے۔ چکن سینڈوچز پلیز۔''
عورت لوٹ گئی۔ دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اِس بار ہاتھ میں چار پلیٹیں تھیں۔
''آپ یہاں تنہا ہوتی ہیں؟'' اینا نے اس سے سوال کیا۔
''ہاں۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں اِس موٹیل کی مالکہ ہوں۔ بہت کم لوگ آتے ہیں یہاں۔ ماضی میں یہاں دو ملازم ہوا کرتے تھے، مگر اب اِن کی ضرورت نہیں رہی۔''
''یہ موٹیل خاصا الگ تھلگ ہے، آبادی سے خاصا دُور۔'' جیمس نے مشروب کا گھونٹ لیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ کاروباری نقطۂ نگاہ سے یہ جگہ کچھ مناسب نہیں۔''
عورت کی آنکھوں میں ماضی کی پرچھائیں نظر آئی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ ''آپ درست کہہ رہے ہیں مگر ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ کبھی یہ ایک مصروف گزرگاہ ہوا کرتی تھی، مگر ستمبر 2006 کے بعد...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''ستمبر 2006...'' اینجل کا ذہن ماضی میں تھا۔ ''مجھے یاد آرہا ہے۔ شاید کسی شخص کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔''
''ہاں۔'' عورت نے جواب دیا۔ ''اس کا نام اینگلو فری لینڈ تھا۔ یہ ستمبر 2006 کا ذکر ہے۔'' عورت کرسی لے کر بیٹھ گئی۔ ''علاقے کا ڈپٹی شیرف میٹ ولیز اور اُس کا پارٹنر معمول کی ڈیوٹی پر تھے۔ ایسے میں اُن کی نظر ایک مشکوک سیاہ کار پر پڑی۔ انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا، مگر رکنے کے بجائے کار ڈرائیور نے اُن پر فائرنگ کر دی۔ دونوں افسر موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔ اس واقعے سے پورے شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی ہل گیا۔ قاتل کی تلاش شروع ہوئی۔ خوش قسمتی سے ایک چشم دیدہ گواہ کو گاڑی کا نمبر یاد تھا۔ تفتیش سے پتا چلا کہ گاڑی اور لینڈ و سے چند روز قبل چوری ہوئی تھی۔''
اُس نے گہرا سانس لیا۔ چاروں کی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ عورت نے پھر کہانی کا سرا پکڑا۔ ''لیک لینڈ میں چند افراد نے یہ گاڑی اینگلو نامی ایک آدمی کے پاس دیکھی تھی جو ایک جھگڑالو شخص کی شہرت رکھتا تھا۔ وہ گزشتہ ایک برس سے جنگل کے قریب ایک کاٹیج میں رہ رہا تھا۔ پولیس اس کاٹیج تک پہنچ گئی۔ انہیں گاڑی بھی مل گئی اور وہ پستول بھی جس سے فائر کیے گئے تھے۔ چند لوگوں کا کہنا ہے کہ...'' اُس نے چند پلوں کا توقف کیا۔ ''کاٹیج سے پولیس کو انسانی ہڈیاں بھی ملی تھیں، مگر حکام نے کبھی اِس کی تصدیق نہیں کی۔ اتنا ضرور پتا چلا کہ وہ شخص فلوریڈا کا نہیں تھا۔ اِس کا تعلق الوتائی کے گاؤں ھیکر سے تھا۔''
''ھیکر...'' اینجل نے نام دہرایا۔ یہ گاؤں اس کے آبائی شہر کولمبیا اور واٹرلو کے درمیان واقع تھا۔
''ہاں۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ اینگلو ایک ساحر تھا۔ کاٹیج سے ایسی کتابیں بھی ملیں جو منتروں سے بھری ہوئی تھیں۔ کیا پتا انسانی ہڈیوں والی بات بھی درست ہو۔ خیر، شیرف گریڈی جوڈ کے حکم پر لیک لینڈ کی پولیس فورس اُس کی تلاش میں نکل پڑی۔ پولیس افسران مجرم کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل میں داخل ہوئے، جہاں وہ شخص الاؤ جلائے دیوانہ وار رقص کر رہا تھا۔ پولیس نے اسے دیکھتے ہی گولیوں کی بارش کر دی۔ کہتے ہیں اس پر 68 فائر کیے گئے اور وہ موقع ہی پر ہلاک ہو گیا۔''
''68 فائر۔ حیران کن!'' کیری نے دھیرے سے کہا۔
چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر جیمس کی جھجکتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ''کیا یہ واقعہ اِسی ہائی وے پر پیش آیا تھا؟''
عورت کی آنکھوں میں دُکھ تیر گیا۔ ''ہاں، جنگل کے جنوبی حصے میں۔ اور تب سے اِس ہائی وے کو آسیبی تصور کیا جانے لگا۔ کچھ لوگوں نے اینگلو کی بدروح دیکھنے کا بھی دعویٰ کیا۔ یوں دھیرے دھیرے اس سڑک کا استعمال کم ہوتا گیا اور...'' عورت چپ ہو گئی۔

☆☆☆

وہ ایک گرم دن تھا۔
جب جیپ ٹیمپا کے نواحی علاقے میں داخل ہوئی، سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔
''سفر کب تمام ہوگا؟'' اینا نے سوال کیا۔ تھکاوٹ چہرے سے عیاں تھی۔ لیک لینڈ سے ٹیمپا تک کا سفر انہوں نے خاموشی سے طے کیا تھا۔ سب اس واقعے کے زیرِ اثر تھے، جو ہائی وے پر پیش آیا تھا۔
''بس ہم پہنچنے والے ہیں۔'' جیمس نے جواب دیا۔ وہ بھی تھک گیا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد جیپ ایک درمیانی درجے کے ہوٹل کے سامنے رکی۔
وہ تینوں کاؤنٹر کی جانب بڑھ رہے تھے، مگر اینجل لان ہی میں رک گئی، جہاں دھوپ میں خوش رنگ پھول لہرا رہے تھے۔
وہ ایک بڑے سے سرخ پھول پر جھک گئی۔ بیگ سے کیمرا نکالا۔ سورج اس کے عقب میں تھا اور تصویر اتارنے کے لیے یہ روشنی مناسب تھی۔
اس کی نظریں کیمرے کی اسکرین پر ٹکی تھیں کہ اچانک اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک سرگوشی ہوئی۔
''رابیکا...''
اس کے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ فوراً پلٹی۔ سامنے ایک دراز قد آدمی کھڑا تھا، جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ویرانی تیر رہی تھی۔ اس نے سر پر ہیٹ لگا رکھا تھا۔
''کون ہیں آپ؟'' اینجل کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ اس آدمی کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہے۔
جواب دینے کے بجائے وہ آدمی اُسے گھورتا رہا۔
اینجل کی پریشانی بڑھنے لگی۔ ''آپ نے ابھی میری... بہن کا نام لیا۔''
اچانک وہ آدمی پلٹا اور تیزی سے ہوٹل کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔
''رکیے۔'' اینجل نے پکارا، مگر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازہ عبور کر گیا۔
کچھ پل وہ یونہی متذبذب کھڑی رہی پھر داخلی حصے کی جانب بڑھنے لگی۔ ایسے میں ایک ویٹر دروازے سے باہر آیا۔
''ابھی یہاں سے کوئی صاحب گزرے تھے؟ لمبے سے، اُن کے سر پر ہیٹ تھا؟'' اس نے اینجل سے سوال کیا۔
''ہاں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''وہ ادھر گئے ہیں۔''
ویٹر دروازے کی جانب دوڑ پڑا، مگر چند ساعتوں بعد مایوس لوٹ آیا۔ ''شاید وہ نکل گئے۔ ضرور ان کی کار نزدیک کھڑی ہوگی، ورنہ اتنی جلدی.. وہ میز پر اپنی کتاب بھی بھول گئے۔'' ویٹر نے سیاہ چرمی جلد والی ایک کتاب اُس کے سامنے لہرائی، جس پر ایک سانپ بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ سامان کمروں میں رکھ چکے تھے اور اب ڈرائنگ روم میں بیٹھے لنچ کر رہے تھے۔
''کھانا خوش ذائقہ ہے۔'' کیری نے ڈبل روٹی کا ٹکڑا چباتے ہوئے کہا۔ ''اُن سینڈوچز سے بہت بہتر جو ہم نے اُس اجاڑ موٹیل میں کھائے تھے۔''
''جھوٹ مت بولو۔'' اینجل نے فوراً کہا۔ ''ان کا ذائقہ منفرد تھا۔''
''بالکل۔'' جیمس نے نیپکن سے منہ پونچھا۔ ''کیونکہ ان میں پُراسراریت بھری ہوئی تھی، جس کی اینجل کو ہمہ وقت تلاش رہتی ہے۔''
میز پر قہقہہ بلند ہوا۔
لنچ کے بعد اینجل کھڑی ہو گئی۔ ''مجھے نکلنا ہوگا۔ میں اس Sinkhole کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔''
''میرا اور اینا کا تو آرام کا ارادہ ہے۔'' جیمس نے جمائی لی۔ ''نیند آرہی ہے۔ شام میں ہم میوزیم کا چکر لگائیں گے۔''
''میوزیم کی سیر آپ دونوں کو مبارک ہو۔ میں تو ٹیمپا کے بیس بال فیڈریشن کا رخ کرنے لگا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کیری بھی کھڑا ہوا۔ ''ڈنر پر ملتے ہیں دوستو۔''
کچھ دیر بعد کیری اور اینجل ہوٹل کے باہر کھڑے تھے۔ وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہو گئے جو پہلے ٹیمپا بیس بال فیڈریشن کے دفتر کے سامنے رکی، جہاں کیری اتر گیا۔
''آپ کہاں جائیں گی مس؟'' ڈرائیور نے سوال کیا۔
''جیفری بش کے مکان پر۔'' اُس نے کہا۔
ڈرائیور نے سرد آہ بھری۔ ''بے چارہ! اُس کی آخری رسومات بھی ادا نہیں ہو پائیں۔''
اب ٹیکسی وہیں علاقے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ چند ساعت خاموش چھائی رہی۔ پھر ڈرائیور کی آواز بلند ہوئی۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ اِس طرح زمین کا دھنس جانا ایک فطری عمل ہے۔ وہ فلوریڈا کی زمینی ساخت کو اس کا سبب قرار دیتے ہیں، مگر مجھے تو یہ واقعہ بہت ہی عجیب لگتا ہے۔ سوچتا ہوں، اگر

مجھے زمین نے اچانک نگل لیا، تو...'' وہ چپ ہوگیا۔

''فکر مت کریں۔ ایسا خال خال ہی ہوتا ہے۔'' اینجل کے ذہن میں جیمس کا طویل لیکچر گھوم رہا تھا۔

کچھ دیر تک ٹیکسی کھیتوں کے درمیان سے گزرتی رہی پھر وہ مکانات کی ایک قطار کے سامنے رکی۔

''وہ سامنے والا مکان ہے۔'' ڈرائیور نے انگلی سے اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' اینجل نے اتر کر پیسے ادا کیے۔

مکان سے چند قدم کے فاصلے پر اُس کا سامنا دو نوجوانوں سے ہوا۔

''ہیلو۔'' اینجل نے انہیں مخاطب کیا۔

''ہائے۔'' اُنہوں نے جواب میں ہاتھ ہلایا۔

''کیا میں آپ کا کچھ وقت لے سکتی ہوں؟''

''بالکل۔'' ایک نوجوان نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام ٹام ہے اور یہ مائیک ہے۔''

''میں ایک صحافی ہوں۔ میرا نام اینجل ہے۔ دراصل میں گزشتہ دنوں پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی پوچھیے۔'' ٹام کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی ابھری۔

''اِس بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟'' اس نے نوٹ بک نکال لی۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر ٹام نے کہا۔ ''پورے محلے میں خوف پایا جاتا ہے، شدید خوف۔''

اینجل اس کے الفاظ نوٹ کرنے لگی۔ ٹام نے بات جاری رکھی۔ ''ہم ڈرے ہوئے ہیں۔ ہمیں خطرہ ہے کہ اس قسم کا واقعہ ہمارے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔''

''مگر ایسا ہوگا نہیں۔'' مائیک نے اِس کی بات کاٹ دی۔

''تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اینجل نے اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کی۔

''کیونکہ ہم خدا کے فرماں بردار ہیں۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''اس جیفری کی طرح نہیں جو شیطانی چکر میں پڑ گیا تھا۔''

''شیطانی چکر؟'' اینجل کے اندر کا صحافی چونکا۔

''ہاں۔ اس کے بھائی جیری نے میڈیا کو بتایا کہ وہ کسان تھا، مگر ہم نے تو اسے کبھی کھیتوں میں نہیں دیکھا۔'' ٹام نے بھی مائیک کی تائید کی۔ ''وہ گھر سے کم ہی نکلتا تھا۔ سنا ہے کہ وہ پُراسرار قوتوں کے تعاقب میں لگا ہوا تھا اور اسی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔''

''کیا واقعی؟'' اینجل کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔

''ہاں۔'' ٹام نے گردن ہلائی۔ ''لوگوں کو لگتا ہے کہ اب اِس گھر میں آسیب نے بسیرا کر لیا ہے۔ کسی شخص کو نزدیک جانے کی اجازت نہیں۔ اُس کے اہلِ خانہ بھی اپنے رشتے داروں کے ہاں منتقل ہوگئے ہیں۔ پولیس نے اُنہیں کسی سے بات کرنے سے منع کر دیا ہے۔''

''کیا میں اُس کے بھائی سے مل سکتی ہوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''کوشش کرکے دیکھ لیں۔'' ٹام نے کہا۔ ''وہ اسٹریٹ نمبر 12 میں اپنے کزن کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔''

''شکریہ۔'' اینجل نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک پرانی وضع کے مکان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

گھنٹی کے جواب میں ایک صحت مند شخص نے دروازہ کھولا، جو اینجل کو دیکھتے ہی بھونچکا رہ گیا۔

''ہیلو، میں اینجل ہوں، اینجل اون۔'' اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ہائے! میں جیری بش۔'' اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں بعد جیری ڈرائنگ روم میں بیٹھا اُس کے سوالات کے جواب دے رہا تھا مگر اِس گفتگو کے نتیجے میں کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔

اُسے مزید کریدنے کی غرض نے اینجل نے ایک غیر روایتی طریقہ اپنانے کا فیصلہ کیا۔ ''آپ نے میڈیا کو بتایا کہ آپ کا بھائی ایک کسان تھا مگر میں یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

اینجل نے ہوا میں تیر چلایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ پُراسرار قوتوں کا پیروکار تھا۔''

تیر نشانے پر بیٹھا۔ جیری کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ چند ساعت وہ خاموش رہا پھر اُس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ''وہ... ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ ہاں اُسے مخفی قوتوں میں دلچسپی تھی، مگر جادو... روحوں کو بلانا... یہ سب اُس نے... واٹرلو سے لوٹنے کے بعد شروع کیا۔''

''واٹرلو؟'' اینجل کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ ''واٹرلو میں ایسا کیا ہوا تھا؟'' لہجے میں بے صبری تھی۔

''میں نہیں جانتا۔'' جیری نے آنسو پونچھے۔ ''یہ کئی برس پہلے کی بات ہے۔ وہ سیاحت کا شوقین تھا۔ 2004 کا موسم سرما اُس نے واٹرلو کے نزدیک ایک گیس اسٹیشن پر گزارا اور وہاں کچھ عجیب واقعہ پیش آیا...''

اینجل دم سادھے بیٹھی رہی۔

جیری نے گہرا سانس لیا۔ ''اس نے کبھی تفصیل سے تو نہیں بتایا۔ بس، مجھے اتنا علم ہے کہ وہ وہاں کسی... طوفان میں پھنس گیا تھا، بہ مشکل اپنی جان بچا کر نکلا...... اس واقعے کے بعد وہ عجیب و غریب کتابیں پڑھنے لگا... اور پھر... ایک حبس زدہ رات ایک انتہائی پُراسرار شخص نے ہمارے دروازے پر دستک دی، جسے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوگیا... بس، اس کے بعد سے وہ اکثر راتیں گھر سے باہر گزارنے لگا... مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے، مگر اس سے قبل میں کچھ کرتا کہ وہ...'' جیری نے چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

اینجل کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے.... واٹرلو... طوفان... پُراسرار اجنبی... آخر اس نے خاموشی توڑی۔ ''میں نے سنا ہے کہ پولیس نے آپ کو لوگوں سے بات کرنے سے منع کیا تھا۔''

''ہاں۔'' جیری نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''دراصل جو کچھ میں نے آپ کے سامنے بیان کیا، یہی سب میں نے سارجنٹ کو بھی بتایا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس سے علاقے میں خوف پھیل سکتا ہے، اِسی وجہ سے انہوں نے مجھے کسی سے بات نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔''

''تو پھر... آپ نے یہ سب مجھے کیوں بتایا؟'' اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

چند ساعت جیری خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس کے لب وا ہوئے۔ ''آپ کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا... مجھے آپ کا چہرہ دیکھا بھالا لگا... پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے جیفری کے پرانے البم میں ایک لڑکی کی تصویر دیکھی تھی جو...''

اینجل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جیری نے بات جاری رکھی۔ ''جو آپ سے انتہائی حد تک مشابہ تھی۔''

''مگر... میں تو کبھی آپ کے بھائی سے نہیں ملی۔''

''مجھے اندازہ ہے مگر... اس لڑکی کا چہرہ... وہ بالکل آپ جیسی تھی۔''

''کیا میں وہ البم دیکھ سکتی ہوں؟''

''نہیں۔'' لہجے میں تاسف تھا۔ ''وہ البم اس کے بستر کی سائڈ ٹیبل میں تھا... اور زمین نے جیفری کو بستر سمیت...'' وہ چپ ہوگیا۔

''میں سارجنٹ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''اوہ ہاں، ضرور۔ اُن کا نام سڈنی چیپل ہے۔ کیا میں آپ کو پولیس اسٹیشن تک چھوڑ دوں؟''

''ہاں ضرور۔ میں آپ کی ممنون ہوں گی۔''

چند منٹوں بعد وہ ایک پرانی وضع کی ویگن میں بیٹھی پولیس اسٹیشن کی سمت بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

کیری ٹیمپا بیس بال فیڈریشن کے دفتر سے لوٹ آیا تھا اور اب اینا اور جیمس کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا۔

''اینجل اب تک نہیں لوٹی۔'' اینا نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

کیری نے گھڑی دیکھی۔ ''شاید وہ ڈنر تک ہی واپس آئے۔''

جس وقت وہ تینوں گرما گرم کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اینجل پولیس اسٹیشن میں سارجنٹ سڈنی کی منتظر تھی۔

''ہیلو، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' ایک درمیانے قد کا جاذبِ نظر آدمی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میرا نام اینجل ہے۔ میں جیفری بش کے کیس کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آئی ہوں۔'' اس نے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

''کیس بالکل سادہ ہے۔ زیرِ زمین تبدیلیوں کی وجہ سے ایک Sinkhole نمودار ہوا، جس نے اسے بستر سمیت نگل لیا۔'' اس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''ٹیمپا کے محکمۂ ارضیات کی رپورٹ ہم تک پہنچ گئی ہے۔ میں اس کی کاپی آپ کو دے سکتا ہوں۔''

''جی شکریہ، میں اس کیس کے دیگر پہلوؤں پر بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' اُس نے کہا۔

اینجل نے جیری سے ہونے والی گفتگو سے سارجنٹ کو آگاہ کیا، مگر اِس دوران واٹرلو اور فوٹو البم کے ذکر سے اجتناب برتا۔

سارجنٹ چند ساعت گہری سوچ میں غرق رہا۔ پھر

انجیل کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا آپ مافوق الفطرت قوتوں پر یقین رکھتی ہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

”گڈ۔ میں بھی نہیں رکھتا۔“ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ”مگر ہمارے ہاں توہم پرستوں کی کمی نہیں۔ اس گڑھے کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور ہوگئے تھے، اس لیے میں نے جیری کو اس سے متعلق بات کرنے سے منع کیا تھا۔ دیکھیں اس قسم کے گڑھے دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ چند برس قبل میں لیک لینڈ بھی تعینات تھا، وہاں بھی میں نے اس قسم کے گڑھے دیکھے تھے۔“

”لیک لینڈ؟“ انجیل کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟“

”میں 2004ء سے 2008ء تک وہاں رہا۔ بہت خوبصورت علاقہ تھا وہ۔ کرائم ریٹ بہت کم تھا۔ ویسے ٹیمپا بھی برا نہیں...“

”جس زمانے میں آپ وہاں تعینات تھے، اُن ہی دنوں اینگلو کے بہیمانہ قتل کا واقعہ پیش آیا تھا۔“ اُس نے سارجنٹ کی بات کاٹ دی۔

ماضی کی تلخ یاد سارجنٹ کی آنکھوں میں اتر آئی۔ اُس نے بھاری آواز میں کہا۔ ”ہاں، اس وقت میں لیک لینڈ میں تعینات تھا۔ اس کیس پر کام کرنے والی ٹیم کا بھی میں حصہ رہا، مگر میں اس نہتے شخص پر گولیاں برسانے والے ظالموں میں شامل نہیں تھا۔ بے شک وہ قاتل تھا، مگر شیرف کا وہ اقدام سراسر غیر قانونی تھا۔“

”ایسا کیا ہوا کہ شیرف کو یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا؟“ انجیل نے اُسے کریدا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مقتول ولیمز شیرف کا بہت قریبی دوست تھا، مگر یہ نکتہ اِس ظالمانہ اقدام کا جواز فراہم نہیں کرتا۔“

”سنا ہے اینگلو ایک ساحر تھا؟“ انجیل نے سوال کیا۔

”جیسا میں نے کہا کہ میں اِس قسم کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔“ سارجنٹ سڈنی نے جواب دیا۔ ”بے شک اینگلو کے گھر سے ہمیں جانوروں کی ہڈیاں اور عجیب وغریب کتابیں ملی تھیں، مگر یہ اُسے قتل کرنے کا کوئی جواز تو نہیں۔ دراصل...“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ”شیرف گریڈی ایک توہم پرست آدمی تھا۔ خدا کے مانند اُسے شیطانی طاقتوں پر بھی پورا یقین تھا۔ اُس نے اینگلو کے ولیمز پر حملے کو شر اور خیر کی جنگ پر محمول کیا۔ بدقسمتی سے اُس کے گرد کئی ایسے افراد تھے، جو اس کے ہم خیال تھے۔ تو بس... وہ اینگلو پر پل پڑے، اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔“ سارجنٹ چپ ہوگیا۔

انجیل گہری سوچ میں گم تھی۔ پھر اُس نے سوال کیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ جیفری بش کے گھر سے پولیس کو چند پُراسرار کتابیں ملی تھیں۔“

”ہاں۔“ سارجنٹ نے کہا۔ ”جیفری مخفی علوم میں دلچسپی رکھتا تھا اور اُس کے مکان سے ملنے والی تمام کتابیں جادو ہی سے متعلق ہیں۔ تاہم ہم نے وہ کتابیں ڈاکٹر جون پارکر کو دکھائی تھیں، انہوں نے اپنی رپورٹ میں انہیں بچوں کی کہانیاں کہہ کر رد کردیا تھا۔ اگر آپ ان کتابوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں تو ان سے مل سکتی ہیں، وہ شہر کے مشرقی کنارے پر جنگل کے قریب رہتے ہیں۔“

”مسٹر جون پارکر۔“ اس نے نام دہرایا۔ ”کیا آپ اُن کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے۔“

”ضرور۔“ سارجنٹ نے جواب دیا۔ ”وہ انتہائی قابل اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ اُن کا موضوع ہے۔ پُراسرار علوم کے حوالے سے بھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔“

”شکریہ سارجنٹ۔“ یہ کہہ کر انجیل کھڑی ہوگئی اور دروازے کی سمت بڑھنے لگی۔

☆☆☆

وہ لکڑی سے بنا قدیم طرز کا مکان تھا، جو خاصی اچھی حالت میں تھا۔

دستک دینے پر ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا، جس نے ایپرن پہن رکھا تھا۔

”جی میں ڈاکٹر جون سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”میرے پیچھے آیئے۔“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

انجیل اُس کے پیچھے چلتے ہوئے کتابوں سے بھرے ایک کمرے میں پہنچ گئی، جہاں روشنی کی قلت تھی۔

”آپ یہاں انتظار کریں۔“ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔

اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سامنے والی دیوار پر بڑی سی گھڑی نصب تھی جس کا مرکزی کانٹا دس کے ہندسے سے تیس منٹ دُور تھا۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے جنگل نظر آرہا تھا جہاں درختوں کے درمیان کہرا چھایا ہوا تھا۔

وقت کاٹنے کے لیے وہ شیلف میں لگی کتابیں دیکھنے لگی۔ بیشتر کتابیں مذاہب عالم کی بابت تھیں۔ ایک حصہ سوانح عمری کے لیے مختص تھا۔ ایک جدید ٹیکنالوجی سے متعلق تھا۔

شیلف پر نظریں دوڑاتے ہوئے اس کی نظر ایک ایسے خانے پر پڑی، جو سیاہ رنگ کی چرمی جلد والی کتابوں سے بھرا تھا، مگر اُن پر تو عنوانات درج تھے، نہ ہی مصنفین کے نام۔

تجسس کے زیرِ اثر انجیل نے ایک کتاب نکالنی چاہی کہ ایک بھاری آواز نے اُس کا ہاتھ روک لیا۔

”اس کا مطالعہ شاید آپ کے لیے زیادہ دلچسپ ثابت نہ ہو مس انجیل۔“

وہ مڑی۔ سامنے سفید سوٹ میں ملبوس درمیانے قد کا ایک ضعیف العمر آدمی کھڑا تھا۔

”جی میں...“ انجیل نے کچھ کہنا چاہا کہ ڈاکٹر نے بات کاٹ دی۔ ”آپ ایک صحافی ہیں اور چند گھنٹوں قبل ہی ٹیمپا آئی ہیں، ایک ایسی اسٹوری پر کام کرنے.... جو بہ ظاہر بہت پُراسرار ہے۔“

”آپ... یہ سب کیسے جانتے ہیں؟“ لہجے میں الجھن تھی۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ ”پریشان مت ہوں مس انجیل۔ دراصل سارجنٹ نے مجھے فون کرکے آپ کے بارے میں مطلع کردیا تھا۔“

”اوہ سوری۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں سمجھی کہ...“

”آپ سمجھیں کہ میں پُراسرار قوتوں کا حامل ہوں۔“ ڈاکٹر کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ”خیر، آپ کچھ جاننا چاہتی ہیں مس انجیل۔ برائے مہربانی تشریف رکھیں۔“

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صوفے پر بیٹھ گیا۔ انجیل اس کے دائیں جانب بیٹھ گئی۔

اسی اثنا میں ملازم اندر داخل ہوا اور میز پر کافی کے دو کپ رکھ کر چلا گیا۔

”میں دراصل...“ اُس نے کچھ دیر توقف کیا۔ اس دوران ڈاکٹر کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی رہیں۔

”میں اُن کتابوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں جو پولیس کو جیفری بش کے گھر سے ملیں۔“ بالآخر اس نے کہا۔

”کیا آپ روحوں پر یقین رکھتی ہیں مس انجیل؟“ اس نے یکدم سوال کیا۔

”نہیں۔“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

ڈاکٹر کی آنکھوں میں پُراسراریت چمکی۔ ”شاید آپ یقین نہ رکھتی ہوں مس انجیل، مگر روحیں ہوتی ہیں اور...“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ”انتقام کا جذبہ بہت ظالم ہوتا ہے جو ایک جیتے جاگتے انسان کو بدروح کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔“

”انتقام کا جذبہ؟“ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی۔

”ہاں مس انجیل۔ انتقام کا جذبہ، جس کے لیے انسان کسی بھی حد تک جاسکتا ہے... یہاں تک کہ شیطان سے بھی ہاتھ ملاسکتا ہے۔“

”تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ اینگلو کا قتل، جیفری کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ، زمین کا دھنس جانا... یہ سب انتقامی کارروائیاں ہیں؟“ ایک بار پھر اسے اپنی آواز اجنبی لگی۔

چند ساعت ڈاکٹر خاموش رہا۔ ”مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو آپ نے کہہ ہی دیا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ...“ لمحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔ ”فتح ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔ شر کا پیروکار کتنا ہی پُرقوت ہو، وہ قدرت سے جیت نہیں سکتا۔ زیرِزمین قوتیں خدا کے تابع ہیں، انہیں اپنے سامنے سرنگوں کرنے کی خواہش عارضی طور پر تو حقیقت کا روپ اختیار کرسکتی ہے، مگر اس کا نتیجہ ہولناک ہوتا ہے۔ قدرت جواب ضرور دیتی ہے۔“

☆☆☆

اُس نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں ابھی آدھا گھنٹا تھا۔

گلاس میں شراب انڈیل کر وہ صوفے پر جا بیٹھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ رہ رہ کر اس لڑکی کا خیال آرہا تھا، جس سے آج اس کا سامنا ہوا۔ وہ اس کی محبوبہ سے کتنی مشابہ تھی۔ وہی آنکھیں، وہی ناک، وہی قد کاٹھ... ایک لمحے کے لیے تو لگا، جیسے رابیکا سامنے کھڑی ہے۔

”رابیکا...“ اس نے دھیرے سے کہا اور اس کا دل کرب سے بھر گیا۔ ماضی کے مناظر ذہن کے پردے پر چلنے لگے۔

رابیکا سے اُس کی ملاقات واٹرلو ہائی اسکول میں ہوئی تھی۔ ابتدائی چند ملاقاتوں کے بعد ہی وہ دونوں دوست بن گئے۔

وہ اسکول کا غیر مقبول ترین نوجوان تھا۔ اُس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اِس کا ایک سبب تو اُس کا دیہی پس منظر تھا اور دوسرا جادو میں اُس کی بے پناہ دلچسپی۔ سب جانتے تھے کہ وہ اکثر شام میں جنگل میں دریا کے کنارے گزارتا ہے۔ پھر عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے بھی دیگر طلبا اس سے کتراتے تھے، مگر

روسی شہر سمارا: پُراسرار گڑھوں کی دوزخ

گڑھوں (Sinkholes) کا اچانک نمودار ہونا، زمین کا یکدم دھنس جانا کوئی نیا واقعہ نہیں۔ دنیا بھر میں اس قسم کے گڑھے پائے جاتے ہے، مگر گزشتہ ایک برس میں ان واقعات میں ہونے والے حیران کن اضافے کے باعث پوری دنیا میں سراسیمگی پھیل گئی ہے۔ سائنسی توجیہات کے برعکس عام افراد ان واقعات کو عقائد اور توہمات کی کسوٹی پر پرکھ رہے ہیں۔ اکثریت کی رائے ہے کہ زمین کا یوں دھنس جانا قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ بیشتر مذاہب میں دنیا کے خاتمے کے قریب زمین کے دھنس جانے کا تذکرہ جوملتا ہے۔

اِن پُراسرار گڑھوں کا تازہ شکار روس کا شہر سمارا ہے، جس پر گزشتہ کچھ عرصے سے خوف کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق گزشتہ چند ہفتوں کے دوران روس کے اس جنوب مشرقی شہر میں سڑکوں کے اچانک دھنسنے کے سوے زائد واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ دو درجن گاڑیوں کو زمین نگل چکی ہے۔ ایک شخص ہلاک اور متعدد زخمی ہو چکے ہیں۔ خوف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ متاثرہ علاقوں میں انتظامیہ نے گاڑی چلانے پر پابندی عائد کردی ہے۔

ماہر ارضیات کے مطابق اس قسم کے گڑھے عام طور سے ریتیلی زمین پر نمودار ہوتے ہیں، مگر سمارا میں چٹانی زمینوں پر ان کا ظہور ہوا ہے، جس کی وجہ سے سائنس دانوں میں بے چینی اور عوام میں خوف وہراس پھیل گیا ہے۔

چند سائنس دانوں کے مطابق ان واقعات کا سبب زیرِ زمین پانی کی بڑھتی ہوئی سطح ہے۔ موسم سرما میں یہاں شدید برف باری ہوتی ہے۔ جوں جوں موسم گرم ہوتا ہے، برف پگھل کر زمین میں جذب ہو جاتی ہے۔ سمارا میں زیرِ زمین پتھر برسوں تک پانی میں رہنے کی وجہ سے گھل گئے ہیں۔ ایسے میں جب دباؤ بڑھتا ہے، زمین اندر دھنس جاتی ہے۔ چند ماہرین کے بہ قول اس عجیب وغریب واقعے کا اصل سبب شہر کے اطراف میں پائی جانے والی سرنگیں ہیں۔ کھدائی کے مسلسل عمل کی وجہ سے ارضیاتی نظام بگڑ گیا ہے، جس کی وجہ سے اِس قسم کے واقعات پیش آرہے ہیں۔

یہ بات لمحہ فکریہ ہے، کیونکہ دنیا بھر میں معدنی ذخائر کے حصول کے لیے کھدائی کا عمل جاری ہے۔ کہیں ہیرے اور دیگر بیش قیمت پتھر تلاش کیے جارہے ہیں، کہیں نمک۔ کہیں پیٹرول نکالنے کے لیے زمین کھودی جارہی ہے، کہیں گیس کے حصول کے لیے یہ عمل انجام دیا جارہا ہے۔ تواتر سے انجام دیے جانے والے اس عمل کی وجہ سے مستقبل میں ان گڑھوں کے نمودار ہونے کے خدشات بڑھ گئے ہیں۔

اطلاعات کے مطابق روس کے قدامت پسند حلقے ان واقعات کو خدا کا عذاب قرار دیتے ہوئے عوام کو مذہب کی جانب لوٹنے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کی تلقین کررہے ہیں۔ ایک خبررساں ایجنسی کے مطابق سمارا کے واقعات کے بعد روس میں ساحروں کا کاروبار خوب چمک اٹھا ہے۔ ہر دوسرا شخص اپنے تحفظ کے لیے ان سے رجوع کررہا ہے۔

رابیکا... وہ ایک نڈر اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ تجربات کا حصہ بننے کے لیے ہمہ وقت تیار۔ اُس کے لیے ایلکس اور اُس کے دوستوں کی سرگرمیاں کسی ایڈونچر سے کم نہیں تھیں۔

"دوست..." ایلکس کا منہ کڑوا ہوگیا۔ آنکھوں کے سامنے تین چہرے گھوم گئے۔ اینگلو فری مین، جیفری بش اور مارک مھیل!

ھیکر سے تعلق رکھنے والا اینگلو اُس کے بچپن کا دوست تھا اور اس دوستی کی مضبوطی کی وجہ یکساں دلچسپیاں تھیں۔

پڑھائی کے سلسلے میں واٹرلو آنے کے بعد بھی ایلکس اور اس کی ملاقاتیں منقطع نہیں ہوئیں۔ دراصل اینگلو نے واٹرلو کے نواح میں واقع ایک گیس اسٹیشن پر ملازمت اختیار کرلی تھی۔ ہر ہفتے کی شام وہ اور اینگلو قریبی جنگل میں گزارتے جہاں وہ الاؤ کے گرد بیٹھ کر منتروں کا جاپ کرتے۔

فلوریڈا سے تعلق رکھنے والا جیفری بش اُسی گیس اسٹیشن پر ملازم تھا جہاں اینگلو کام کیا کرتا تھا۔ وہ ایک مُرتجسس نوجوان تھا۔ جب اُسے اینگلو کی سرگرمیوں کا پتا چلا، تو وہ بھی ان میں شامل ہوگیا۔

گو ساحر بننے کی خواہش اُن کی دوستی کا سبب تھی مگر ایلکس اور اینگلو حقیقتاً بہت مختلف تھے۔ ایلکس پُراسرار قوتوں کے تعاقب میں ضرور تھا، مگر وہ اُنھیں منفی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اینگلو کا خیال تھا کہ اِن قوتوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں۔

اینگلو کی صحبت نے جیفری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کا تجسس خواہشات میں بدلنے لگا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ دولت کا حصول ایسی خواہش تھی جس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔

ایک برس تک پُراسرار قوتوں کا تعاقب کرنے کے بعد تین نوجوانوں پر مشتمل اس گروہ میں ایک لڑکی کا اضافہ ہوا۔ وہ رابیکا تھی، جسے ایلکس نے اپنی گرل فرینڈ کے طور پر متعارف کروایا۔

کبھی کبھار وہ اُن کے ساتھ چلی آتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ چار کے بجائے پانچ ہوجاتے۔ پانچواں نوجوان مارک مھیل تھا۔ اُسے جادو سے قطعی دلچسپی نہیں تھی، مگر کیمپنگ کا شوق تھا۔ تو جب کبھی فرصت ہوتی، وہ ان کے ساتھ ہولیتا۔ مارک کے پاس کار تھی، جس کی وجہ سے انھیں سفر میں سہولت رہتی۔ اِسی وجہ سے کسی کو اس کی موجودگی پر اعتراض نہیں ہوتا۔

اور پھر ایک روز اینگلو نے ایک خطرناک منصوبہ ان کے سامنے پیش کیا۔

وہ موسم سرما کی ایک خوشگوار رات تھی۔ پانچوں جنگل میں الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔

"ہم چھوٹے موٹے کرتب کرنا تو سیکھ ہی چکے ہیں، کیوں نہ کچھ بڑا کیا جائے۔" یہ اینگلو کے الفاظ تھے، جو ایلکس کو گراں گزرے۔

"ہم کرتب کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے شوق کے لیے یہاں اکٹھا ہوتے ہیں دوست۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے درست کہا۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اب کچھ پُرخطر کام کیا جائے۔ سنو یورپ سے آنے والی کچھ کتابیں میرے ہاتھ لگی ہیں۔ جن میں ایک ایسے افریقی جادو کا ذکر ہے، جس کے ذریعے ساحر بیک وقت کئی انسانوں کے حواس اپنے قابو میں کرسکتا ہے... اور ایک اور عمل بھی ہے، جس کے ذریعے زیرِ زمین قوتوں کو اپنے تابع کیا جاسکتا ہے..." اُس کی آواز میں بے پناہ اشتہا تھی۔

"شان دار! اِن سے تو کئی فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔" جیفری کی عینک پر الاؤ کے شعلوں کا عکس تھا۔

"لیکن یہ بہت پُرخطر ہے۔" ایلکس نے فوراً کہا۔ "اس طرح کی قوتوں کے حصول کے لیے برسوں کی ریاضت چاہیے۔ اور افریقا کے برعکس..."

"میں جانتا ہوں دوست۔" اینگلو نے بات کاٹ دی۔ "افریقا کے برعکس، یہاں امریکا میں اِس سحر میں مہارت کا حصول خاصا دشوار ہے۔ اور اس کا ایک واضح سبب ہے..." اس نے ڈرامائی وقفہ لیا۔ "وہاں کے قبائل میں آج بھی انسانی قربانی کا تصور پایا جاتا ہے۔ یہ انسانی خون ہی ہے، جس سے یہ عمل حقیقت کا روپ اختیار کرتا ہے، ایک دوشیزہ کا خون۔ اگر ہم ایسا کرسکیں تو..."

"یہ خیالی باتیں ہیں۔" ایلکس کی آواز میں کاٹ تھی۔

"نہیں۔" اینگلو نے فوراً کہا۔ "میں کسی قربانی کی بات نہیں کررہا۔ کتابوں میں پورا عمل درج ہے۔ ہم کسی بھی لڑکی کا خون استعمال کرسکتے ہیں۔ ایک پیالا درکار ہوگا بس۔ اور ہم اس عمل کو انجام دینے کے قابل ہوجائیں گے۔"

چند ساعت خاموشی چھائی رہی، جسے رابیکا کی پُرجوش آواز نے توڑا۔ "اگر ایک پیالے ہی کی بات ہے، تو تم میرا خون استعمال کرسکتے ہو۔"

"آئیڈیا برا نہیں۔" جیفری نے فوراً کہا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہے۔" ایلکس نے اُسے گھورا۔ "یہ سب انتہائی پُرخطر ہے، اور میں کسی کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ کسی کو بھی نہیں۔"

اچانک ماحول میں تناؤ بھر گیا۔ چند ساعت خاموشی چھائی رہی، جسے بالآخر مارک نے توڑا۔ "یہ باتیں چھوڑو۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

اس رات وہ سب خاموش ہی رہے۔ فضا میں ناپسندیدگی تیر رہی تھی۔ جنگل سے لوٹنے کے بعد کئی دن تک ایلکس کا اینگلو، جیفری اور مارک سے سامنا بھی نہیں ہوا۔ یوں یہ واقعہ اس کے ذہن سے اتر گیا۔

پھر ایک دوپہر مارک کے توسط سے اُسے اینگلو کا پیغام ملا۔ "جنگل میں شام گزارنے کا پروگرام ہے۔ فلوریڈا سے جیفری کے چند دوست بھی آئے ہوئے ہیں۔ اچھا وقت کٹے گا۔" مارک کے لہجے میں تجسس تھا۔

"خوب! اچھا آئیڈیا ہے، کافی دن ہوگئے ملے ہوئے۔" رابیکا چہکی۔

رابیکا کا ہوسٹل شہر کے وسط میں تھا۔ مارک بھی اُسی علاقے میں مقیم تھا۔ پروگرام طے ہوا کہ مارک رابیکا کو ہوسٹل سے پک کرتا ہوا اُس مشرقی علاقے کی طرف آئے گا، جہاں ایلکس کا گھر تھا۔

اور وہاں سے وہ تینوں جنگل کی سمت جائیں گے۔

ایلکس نے ہامی تو بھرلی، مگر اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ رات اس کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دے گی۔

شام ہوتے ہی تیز ہوائیں چلنے لگیں، جن میں وقت گزرنے کے ساتھ شدت آتی گئی۔ ایلکس نے بھانپ لیا کہ طوفان آنے والا ہے۔ اس نے رابیکا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، مگر نیٹ ورک جواب دے چکا تھا۔ پھر اس نے مارک کا نمبر ملایا، یہ کوشش بھی ناکام گئی۔

اِسی اثنا میں تیز بارش شروع ہوگی، جس نے کچھ ہی دیر میں تباہ کن طوفان کی شکل اختیار کرلی۔

اس غیر متوقع طوفان نے واٹرلو کو ہلا کر رکھ دیا۔ خصوصاً نواحی علاقے شدید متاثر ہوئے۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہوا، تو ہر طرف تباہی کے نشانات بکھرے تھے۔ کئی مکانات ڈھے چکے تھے، جن میں ایلکس کا کاٹیج بھی شامل تھا۔ اُسے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اگلے چند روز اسپتال میں گزرے جہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد اِس پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ رابیکا لاپتا ہے۔

ہوسٹل انتظامیہ سے معلوم ہوا کہ اُس طوفانی شام بارش شروع ہونے سے قبل ہی وہ ہوسٹل سے نکل گئی تھی۔ اس اطلاع نے اس کے اندیشے بڑھا دیے۔ پھر اُس نے مارک سے ملاقات کی، جس نے یہ کہہ کر اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ وہ اس شام گھر سے نکلا ہی نہیں۔

''میں تو یہی سمجھا تھا کہ طوفان کے باعث پروگرام ملتوی ہوگیا ہے۔'' مارک کے لہجے میں الجھن تھی۔

ایلکس نے اینگلو اور جیفری سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی، مگر جس گیس اسٹیشن پر وہ ملازم تھا، وہاں سے پتا چلا کہ وہ طوفان کے بعد ڈیوٹی پر نہیں آیا۔

ایک ہفتے بعد پولیس کو جنگل سے رابیکا کی لاش مل گئی۔ اس سانحے سے ایلکس کو گہرا صدمہ پہنچا۔ اور اسی صدمے میں شک کے جرثومے نے جنم لیا، جس نے دھیرے دھیرے ایک عفریت کی شکل اختیار کرلی۔ ایسا عفریت، جو ہر پل اُس کے کان میں سرگوشیاں کرتا کہ اُس کی محبوبہ اینگلو اور جیفری کے شیطانی منصوبے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ایلکس کو اِس بات کا بھی کرب تھا کہ وہ سب جانتے ہوئے بھی اُسے بچا نہیں سکا۔

ان سیاہ احساسات نے اُسے دیوانگی کے انجان میدان میں دھکیل دیا۔ ذہنی حالت بگڑنے لگی۔ سب چھوڑ چھاڑ کر وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔ مگر وہاں بھی چین نہیں ملا..... بدلہ لینے کی خواہش پنپنے لگی اور اُس نے وہی ہتھیار استعمال کرنے کا ارادہ کیا، جسے رابیکا کے قاتل اپنی قوت بنانا چاہتے تھے۔

اُس نے مخفی علوم کا تعاقب تیز کردیا۔ پُراسرار قوتوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے پُرخطر میدانوں میں اتر گیا۔ اس بابت دستیاب تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مزید پختگی کے لیے افریقا چلا گیا، جہاں گھنے، تاریک جنگلوں میں اس نے طویل ریاضت کی اور دو برس بعد جب ایلکس امریکا لوٹا، وہ انتقام لینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اور فقط اینگلو اور جیفری اس کا نشانہ نہیں تھے، اسے یقین تھا کہ مارک بھی اس عمل میں پورا پورا شریک تھا۔

اگر وہ چاہتا تو ایلکس کو سزا دے سکتا تھا مگر دوستی آڑے آرہی تھی۔ اسی دوران لیک لینڈ کے شیرف نے اینگلو کو جادوگر سمجھ کر درجنوں گولیاں اس کے بدن میں اتار دیں۔ دراصل یورپ و امریکا میں برسوں تک یہ قانون رہا کہ جادوگر کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اس لیے شیرف کو اینگلو کے قتل پر افسوس نہ تھا۔

اینگلو کے قتل کے بعد ایلکس نے جیفری کی تلاش شروع کی، جس میں اُسے کافی وقت صرف کرنا پڑا۔ وہ فلوریڈا میں نہیں تھا، مگر ایلکس کو جلدی نہیں تھی۔ اس نے ایک ماہر شکاری کی طرح انتظار کیا۔

بالآخر ایک دن جیفری فلوریڈا لوٹ آیا۔ اور تب ایلکس اُس سے ملا۔ ''تیار رہو، کسی بھی وقت موت کا فرشتہ تمہارے سر پر پہنچ جائے گا۔''

جیفری کے لیے جو موت اُس نے چنی تھی، اُس کے لیے سخت ریاضت درکار تھی۔ اس نے جیفری کو پیغام بھجوا دیا۔ ''تمہیں زمین نگل لے گی۔ اپنی حفاظت کرسکتے ہو، تو کرلو۔''

اتفاق ہے کہ جیفری زندہ زمین میں دفن ہوگیا اور اب... مارک کی باری تھی۔

گھڑی کا گھنٹا بجا۔ ایلکس ماضی سے لوٹ آیا۔ اُس نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ دس بج چکے تھے۔ وقت گزارنے کے لیے اس نے ٹی وی آن کردیا، جہاں Sinkhole کے بارے میں ایک رپورٹ نشر کی جارہی تھی۔

پروگرام کا میزبان ایک نوجوان ماہرِ ارضیات سے محوِ گفتگو تھا، جس کا نام جیمس جیکسن تھا۔

''اس واقعے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے مسٹر جیمس؟''

''میری رائے بہت سادہ ہے۔ یہ ایک Sinkhole ہے، بس۔ یہ ایک ارضیاتی عمل ہے، کوئی عذاب نہیں، کسی پُراسرار قوت کی کارستانی نہیں...''

''پُراسرار قوت!'' ایلکس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ بکھر گئی۔

ماہرِ ارضیات نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے یاد آرہا ہے۔ دو برس قبل چین میں ایک گڑھے نے پورا ٹرک نگل لیا تھا۔ چین ہی کے ایک شہر میں پانچ دکانیں زمین میں دھنس گئی تھیں۔ گوئٹے مالا میں 2007 اور 2010 میں اس قسم کے خوفناک گڑھے نمودار ہوچکے ہیں... وینزویلا کے انتہائی دورافتادہ پہاڑی علاقے میں ایسے گڑھے ہیں، جو انتہائی حد تک قدرتی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ماضی میں یہ عجیب تصور کیے جاتے ہوں، مگر آج ارضیاتی ماہران کی حقیقت سے واقف ہیں۔''

''کیا یہ فقط فطری عمل ہے؟ یا اس میں انسانی عوامل بھی کارفرما ہیں؟'' میزبان نے سوال کیا۔

اسٹوڈیو میں بیٹھے جیمس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''دیکھیں ہم زمین سے معدنیات نکال رہے ہیں... تیل، گیس، کوئلہ، نمک۔ معدنی ذخائر کے لیے ہم زمین کو کھودتے جارہے ہیں۔ اس سے زمین میں خلا پیدا ہورہا ہے... جس کی وجہ سے فطری نظام متاثر ہورہا ہے... ایسے میں زلزلے، بھاری بارشوں اور کیمیائی تبدیلیوں کی وجہ سے زمین کے دھنسنے کے واقعات امکانی ہیں...''

ایلکس اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے اپنے اگلے شکار کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

☆☆☆

''اینجل ابھی تک نہیں لوٹی۔'' کیری نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ چہرے پر فکرمندی تھی۔

''آجائے گی، فکر مت کرو۔ وہ بہت بہادر ہے۔'' جیمس نے قہقہہ لگایا۔ ''میری ماہرانہ رائے سے لطف اندوز ہو۔''

جس وقت وہ تینوں ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھے تھے، اینجل نے ڈاکٹر جون کے گھر سے باہر قدم رکھا اور یکدم اس احساس میں گھر گئی وہ ایک ویرانے میں کھڑی ہے، جس کی زمین پر گہرا تیر رہا ہے۔

چند قدم آگے بڑھنے کے بعد تنہائی کا احساس مزید قوی ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر مکان کی سمت دیکھا، جس کی تمام بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ اُس نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھنے لگی۔

راستہ کچا تھا۔ دونوں جانب درخت تھے، جن کے گرد کہرا رقص کرتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ ہائی وے کچھ ہی دور ہے، جہاں سے کوئی نہ کوئی ٹیکسی ضرور مل جائے گی۔

چلتے چلتے اچانک اُسے اِس احساس نے آن گھیرا کہ وہ اجنبی زمین پر ہے، راستہ بھول چکی ہے۔

کچھ دُور اسے روشنی نظر آئی۔ شاید کوئی الاؤ جلائے بیٹھا تھا۔

جھاڑیوں کو ہٹاتی ہوئی وہ اس سمت بڑھنے لگی۔ خشک پتے اُس کے قدموں تلے چرمرائے۔

وہ اُس شخص کی پشت پر پہنچ چکی تھی اور الاؤ کو دیکھ سکتی تھی، جس کے گرد ایک دائرہ کھچا تھا، جس میں سرخی مائل سیال تیر رہا تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ شخص یونہی ساکت بیٹھا رہا۔

اینجل گھوم کر اُس کے سامنے آگئی اور تب حیرت نے اس پر حملہ کیا۔

''تم!'' اُس نے زور سے کہا۔

اُس شخص نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اینجل پر نظر پڑتے ہی وہ غرایا اور اس پر چھلانگ لگا دی۔

اینجل نے خوف کے زیرِ اثر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی، مگر اُس وقت تک وہ اُس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ مگر جوں ہی وہ شخص اُس کے قریب آیا، ٹھٹک گیا۔

اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اینجل کے چہرے پر ٹکی تھیں پھر وہ مڑا۔ غصے سے غرایا۔ جلتی ہوئی لکڑیوں کو ٹھوکر لگائی۔ شعلے تاریکی میں چمکے اور بجھ گئے۔ اگلے ہی پل وہ شخص دوڑتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

اینجل کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چند ساعت وہ یونہی کھڑی رہی۔ حواس بحال ہوئے تو ذہن تیزی سے حرکت کرنے لگا۔

جس پُراسرار شخص سے اُس کا ابھی سامنا ہوا تھا، وہ اس کے لیے یکسر اجنبی نہیں تھا۔ مگر اینجل نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا... کہاں؟

وہ اپنی یادداشت کھنگالنے لگی۔ یکدم ذہن میں جھماکا ہوا۔

''رابیکا کے البم میں جس نوجوان کی تصویر تھی وہ...'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بکھرے ہوئے ٹکڑے باہم ملنے لگے تھے۔ واقعات میں ربط نظر آنے لگا... واٹرلو... اینگلو فری لینڈ... جیفری بش... اور یہ شخص... ایلکس پیٹرسن۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ الجھن سے برآمد ہونے والی سلجھن ایک پریشان کن احساس کی حامل تھی۔ اموات کے اس سلسلے کا سبب اس کی بہن کی موت تھی۔ مگر اس کی بہن

تو..... نظروں کے سامنے رابیکا کا مطمئن چہرہ گھوم گیا۔

اس نے سر اٹھایا۔ سامنے ہائی وے تھا، جس کی دوسری جانب رہائشی علاقے کی روشنیاں رقصاں تھیں۔

☆☆☆

اُس کی نظریں گیند پر تھیں۔ اسٹیک پر گرفت مضبوط تھی اور وہ ایک زوردار ہٹ لگانے کے لیے تیار تھا۔

اسٹیک ہوا میں بلند ہوئی۔ دھوپ اُس کے بازوؤں پر چمکی۔ اسٹیک گیند سے ٹکرائی اور..... وہ تاریکی میں اتر گیا۔

"شان دار شاٹ۔" اس کے ساتھی ایڈ میگالیٹا نے تالی بجائی، مگر اُسے اپنی پشت سے کوئی جواب نہیں ملا۔

ایڈ مڑا اور بھونچکا رہ گیا۔ وہ مقام جہاں کچھ دیر قبل مارک کھڑا تھا، اب ایک چھوٹا سے سوراخ تھا۔

وہ تیزی سے اُس جانب بڑھا۔ "مارک..."

"میری مدد کرو۔" اس کے ساتھی کی پکار تاریکی میں گونجی۔

اگلے چند منٹوں میں اسنیر اریگولف کورس میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ واقعے کی اطلاع ملتے ہی ریسکیو ٹیمیں گالف کورس کی جانب دوڑ پڑیں، میڈیا کے نمائندوں نے بھی موقع پر پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ اور ہر ایک کے ذہنوں میں ایک ہی اندیشہ تھا، کیا زمین نے ایک اور شخص کو نگل لیا ہے؟

پورا اوا ٹرلو سکتے میں تھا۔

اطلاع ملتے ہی مارک کی بیوی لوری بھی گالف کورس پہنچ گئی، مگر پولیس نے اسے جائے وقوعہ کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں دی۔

ایک ریسکیو اہل کار نے سوراخ میں روشنی پھینکی۔ اُسے دور تاریکی میں ایک سر نظر آیا۔

"کیا تم مجھے سن سکتے ہو؟" وہ چلّایا۔

"ہاں۔" مارک نے سر اٹھایا۔ آنکھوں میں خوف تھا۔ "میری مدد کرو۔"

ریسکیو اہل کار فوراً کام پر لگ گئے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ زیرِ زمین ہونے والی تبدیلیوں سے مارک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹی تلے دب سکتا تھا۔

دوسری جانب تاریکی میں ڈوبے مارک کے ذہن میں اندیشے تیر رہے تھے۔ اینگلو..... جسے گولیاں سے بھون دیا گیا۔ جیفری..... جسے زمین نے نگل لیا اور اب.....

مارک کا دم گھٹ رہا تھا۔ ریت نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ آکسیجن گھٹتی جا رہی تھی نا امیدی عود کر آئی تھی۔ اسے اپنی موت کا یقین ہونے لگا تھا۔

ایسے میں اُسے چرچ کے گھنٹے کی خفیف سے آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔

"کیا یہ میرا وہم تھا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

نہیں۔ گھنٹے کی آواز پھر سنائی دی تھی۔ انتہائی نزدیک۔

مارک کے دل میں امید کا جھماکا ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ خدا کو یاد کر رہا تھا۔ خدا جو اس کا راہبر تھا۔ جو وحشت کے دنوں میں اس پر سایہ کرتا تھا۔ خدا... جو خیر کی قوتوں کا مرکز تھا۔

"میری روح تیرے حوالے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

یکبارگی اُسے اپنی دائیں جانب، کچھ اوپر روشنی نظر آئی، جس میں لطافت کا احساس تھا۔

وہ ایک دراڑ تھی، جو دھیرے دھیرے بڑی ہونے لگی۔ انسانی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔ پھر دراڑ میں ایک مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔

"دوست فکر مت کرو۔ ہم جلد تمہیں نکال لیں گے۔" وہ ایک ریسکیو اہل کار تھا۔

☆☆☆

جیپ ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ کیری نے سنبھالی ہوئی تھی۔ ساتھ والی نشست پر اینجل بیٹھی تھی، جس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا اطمینان تھا۔ پچھلی نشست پر جیمس اور اینا براجمان تھے۔ اُن چاروں کی منزل اورلینڈو کا علاقہ تھا، جہاں معمول کی زندگی اُن کی منتظر تھی۔

اینجل سوچ رہی تھی ہم ترقی کی معراج پر پہنچ کر بھی قرونِ اولیٰ کی سینہ بہ سینہ چلنے والی روایتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ الیکٹرونک کے آلات استعمال کرتے ہیں مگر ذہن کی رو کو چودھویں صدی سے باہر نہیں نکال پائے ہیں تبھی تو ہالی وو ڈ میں سب سے زیادہ ہارر فلمیں بن رہی ہیں کہ یہ سب ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ ایک جیسا واقعہ تین دوستوں کے ساتھ پیش آیا اور اتفاق سے وہ تینوں ہی پُراسرار علوم سے دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ارضیاتی تبدیلی کو بھی پُراسرار علوم کی کارستانی سمجھ لیا گیا۔ اگر ڈاکٹر جون جیسے لوگ اس قسم کے واقعات کو اپنے مفاد کی خاطر پُراسرار قرار دے رہے ہیں تو ایک اہم کردار اینجل اور اس کے دوست اسے ارضیاتی تبدیلی قرار دے رہے ہیں۔ مگر حقیقت کیا ہے صرف خدا جانتا ہے صرف خدا۔

مسکراہٹوں کے سفیر

تنویر ریاض

رلانا بہت آسان ہے مگر ہنسانا اتنا ہی مشکل ہے۔ لیکن یہ پاکستانی فن کاروں کو ہی اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اس مشکل فن کو بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ پاکستان نے ایک سے بڑھ کر ایک فنکار پیدا کیے ہیں جنہوں نے منفرد انداز سے اپنا مقام بنایا ہے۔ ان میں لہری صاحب کا اپنا علیٰحدہ مقام ہے۔ انہوں نے سنجیدہ انداز اختیار کرکے لوگوں کو ہنسانے کا انوکھا انداز اپنا رکھا تھا۔

ایک نامور فنکار جس پر پاکستانی فلم انڈسٹری کو ناز ہے اسے خراجِ تحسین

فلموں میں مزاحیہ اداکار کا کردار ہمیشہ سے ہی اہم رہا ہے اور صرف برصغیر پاک و ہند ہی نہیں بلکہ ہالی ووڈ میں بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور شہرہ آفاق کامیڈین چارلی چپلن اس کی روشن مثال ہے جس کا نام ہی ہالی ووڈ کی فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، بولی ووڈ اور پاکستانی فلم انڈسٹری میں ایسے کئی مزاحیہ اداکار منظر عام پر آئے جنہوں نے اپنی مزاحیہ اداکاری اور دلچسپ حرکات کی بدولت فلم بینوں کے دلوں پر ایک عرصہ تک راج کیا۔ ان

میں گوپ، یعقوب، آغا، مقری، جانی واکر، محمود، اسرانی، اے شاہ شکار پوری، نذر، ظریف، رنگیلا، منور ظریف، نرالا، معین اختر، عمر شریف اور لہری وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب اداکار اپنے وقت میں مشہور اور مقبول رہے لیکن جو شہرت اور مقبولیت لہری صاحب کے حصے میں آئی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے تیس سال تک فلم کے پردے پر راج کیا۔

بلاشبہ کامیڈی، آرٹ کی مشکل ترین صنف ہے جس طرح ایک مزاح نگار یا مزاحیہ شاعر بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح مزاحیہ فنکار بھی خال خال دیکھنے میں آتے ہیں۔ موجودہ دور کی مثال ہی لے لیجیے۔ اس وقت بولی ووڈ میں دو درجن سے زیادہ مشہور اداکار فلموں میں چھوٹے بڑے رول کرنے کے لیے موجود ہیں لیکن مزاحیہ اداکاری کے شعبے میں کوئی بڑا نام نہیں نظر آتا۔ شاید اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اکشے کمار اور گووندا جیسے اداکاروں نے کامیڈی ایکٹر کے طور پر کام کر کے اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کامیڈی اتنی ہی آسان ہوتی تو ہر دوسرا اداکار مزاحیہ اداکار بننے کی دوڑ میں شامل ہو چکا ہوتا۔ اسے ایک آسان فن سمجھنے والے احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ منہ بگاڑ کر ذو معنی جملے بولنا یا فضول قسم کی اچھل کود کرنا کامیڈی کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ کامیڈی وہ ہے کہ آپ ایک جملہ بول کر بھرے ہال میں قہقہوں کا طوفان برپا کر دیں جس کا مظاہرہ اداکار لہری مرحوم نے کیا۔ وہ جوکر اور کامیڈین کے فرق کو سمجھتے تھے اور انہوں نے ہمیشہ اپنی اداکاری میں اس کا خیال رکھا۔

ساری زندگی لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے والے اداکار لہری بھارت کے شہر کان پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن پیدائش اپریل 1931ء ہے اور 13 ستمبر 2012ء کو کراچی کے ایک مقامی اسپتال میں انتقال کر گئے۔ وہ کئی برس سے بیمار تھے۔ 1983ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور کافی عرصہ تک ذیابیطس اور سانس کے عارضے میں مبتلا رہے۔ ذیابیطس کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ بھی کاٹ دی گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ بہت ہمت اور جرأت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں صرف یہ شکوہ تھا کہ ملک و قوم بالخصوص حکومت نے ان کی خدمات کا وہ صلہ نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔

لہری کا اصلی نام سفیر اللہ تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کان پور میں ہی حاصل کی اور قیام پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں انہوں نے ٹائپنگ اور اسٹینوگرافی سیکھی اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں بطور اسٹینو ٹائپسٹ کام شروع کر دیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے اور دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر خوب پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ دوستوں کی فرمائش پر ہی انہوں نے اسلامیہ کالج کراچی کے فنکشن میں ایک مزاحیہ خاکہ "مریض عشق" کے نام سے پیش کیا جس میں انہوں نے ایک بوڑھے مریض کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا جو ایک نرس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ طور پر اداکاری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں انہوں نے ایک انٹرویو میں اپنے اس فیصلے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا۔ "جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اپنے فن سے لوگوں کے چہروں پر خوشیاں بکھیر سکتا ہوں تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ کوئی ایسا کام کروں جس کے ذریعے لوگ بڑے پیمانے پر میرے فن سے مستفید ہو سکیں۔ اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں ہر شخص پریشان اور افسردہ نظر آتا ہے۔ میں ان کی پریشانیاں تو کم نہیں کر سکتا لیکن انہیں چند لمحوں کے لیے خوشی ضرور دے سکتا ہوں جو میرے نزدیک کسی عبادت سے کم نہیں چنانچہ میں نے اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا۔

اداکار ابوشاہ کی وساطت سے ان کی ملاقات ہدایت کار شیخ حسن سے ہوئی جو ان دنوں ایک فلم انوکھی، شروع کرنے والے تھے اور اس میں بھارتی اداکارہ شیلا رمانی کو کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ یہ سن کر لہری کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ انہیں شیلا رمانی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ پہلی ہی فلم میں انہوں نے اپنی کامیڈی کا لوہا منوا لیا۔ یہ فلم 1956ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد انہیں کئی ماہ تک کسی دوسری فلم میں کام نہیں ملا۔ اس وقت تک کراچی میں ایک ہی اسٹوڈیو تھا جہاں محدود تعداد میں فلمیں بنا کرتی تھیں جبکہ لاہور فلم سازی کا بڑا مرکز تھا جہاں پانچ چھ اسٹوڈیوز میں دن رات فلموں کی شوٹنگ ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی سے ابھرنے والا ہر فنکار ایک دو فلموں میں کام کرنے کے بعد لاہور کا ہی رخ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ لہری نے بھی اپنے کیریئر کو آگے بڑھانے کے لیے لاہور کا رخ کیا جہاں انہیں دل میں تو، میں ایک مختصر کردار ملا۔ اس کے بعد انہیں فیصلہ اور سویرا، جیسی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اس وقت لاہور میں نذر اور ظریف کا طوطی بول رہا تھا اور ہر فلم میں انہی میں سے کوئی اداکار بطور کامیڈین کاسٹ کیا جاتا تھا۔ ان بلند پایہ فنکاروں کی موجودگی میں لہری جیسے نئے فنکار کے لیے اپنی جگہ بنانا آسان نہیں تھا لیکن لہری اپنے منفرد اسٹائل کی وجہ سے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی نظروں میں آ چکے تھے لہٰذا ان کے لیے آگے کا سفر آسان ہو گیا۔

1960ء میں انہوں نے الہ دین کا بیٹا، رات کے راہی اور انصاف، میں کام کیا اور کامیاب رہے۔ 1961ء میں نامور اداکار وحید مراد نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز بطور فلم ساز کیا اور ایک فلم انسان بدلتا ہے، شروع کی۔ اس فلم میں لہری نے اپنی شاندار اداکاری سے نقادوں اور فلم بینوں کو بے حد متاثر کیا اور اس فلم میں شاندار پرفارمنس دینے پر انہیں پہلا نگار ایوارڈ ملا۔

اس کے بعد لہری نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور وہ تیزی سے کامیابی کی منزلیں طے کرتے گئے۔ انہوں نے 1956ء میں فلم انوکھی، سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ جبکہ ان کی آخری فلم بابو 2001ء میں ریلیز ہوئی۔ اس دوران میں انہوں نے تقریباً 220 فلموں میں کام کیا جو تعداد کے لحاظ سے ایک ریکارڈ ہے۔ لہری کے کریڈٹ پر بے شمار کامیاب اور یادگار فلمیں ہیں جن کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ البتہ قارئین کی دلچسپی کے لیے چند نام یہاں دیئے جا رہے ہیں جن میں لہری کا کام دیکھ کر ان کی فنی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں، عشق پر زور نہیں، آنچ، جب سے دیکھا ہے تمہیں، دامن، توبہ، پیغام، ایسا بھی ہوتا ہے، کنیز، آشیانہ، آگ کا دریا، آگ، دیور بھابی، دل میرا دھڑکن تیری، انجمن، نورین، دل لگی، بہشت اور نادانی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

لہری کی اداکاری کے کئی روپ ہیں۔ عام طور پر برصغیر کی فلموں میں کامیڈین کو ہیرو کے دوست اور دست راست کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لہری بھی اس روایت سے نہ بچ سکے اور انہوں نے اپنے دور کے مقبول فن کاروں سنتوش کمار، کمال، محمد علی، ندیم اور وحید مراد کے دوست کا کردار اس خوبی سے نبھایا کہ بعض مناظر میں وہ ہیرو سے بھی آگے نظر آئے۔ انہوں نے فلموں میں صرف کامیڈی ہی نہیں کی بلکہ کیریکٹر ایکٹر کے طور پر بھی اداکاری کے جوہر دکھائے اور ان کرداروں میں بھی لہری کی پرفارمنس کو بے

عالم نزاع

جب انسان پر عالمِ نزاع کا وقت ہوتا ہے تو اس پر موت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، مثلاً ناک کا ٹیڑھا ہو جانا، پاؤں کا ست جانا کہ پھیل نہ سکیں یا اسی قسم کی اور چیزیں جو جانکنی کے وقت ظاہر ہوتی ہیں تو جو افراد اس وقت ایسے شخص کے پاس موجود ہوں ان کے لیے مستحب ہے کہ اس کا منہ قبلہ کی طرف پھیر دیں۔ سیدھی کروٹ لٹانا سنت ہے۔ اگر چت لٹانا مقصود ہو تو اس کے پاؤں قبلے کی طرف کر دیں اور سر کے نیچے ایک تکیہ رکھ کر ذرا اوپر اٹھا دیں تاکہ اس کا منہ قبلے کی طرف ہو جائے۔ اس طرح لٹانا بھی جائز ہے اور اگر مرنے والے کو کچھ زیادہ تکلیف ہو تو اس کو اسی وضع پر چھوڑ دیں جس وضع پر وہ پڑا ہو۔ اس کے اقربا پر اور اگر اقربا موجود نہ ہوں تو جو کوئی مسلمان وہاں پر موجود ہوں شہادتین کی تلقین کرنا "غرغرہ" کے وقت سے قبل یعنی اس سے پہلے کہ دم اس کے گلے میں آ کر اٹکے، واجب ہے کیونکہ یہ حالت سننے اور سمجھنے کی نہیں رہتی۔ بعض علماء کے نزدیک تلقین کرنا مستحب ہے اور اس سے مراد اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ، ہے اور بعض کے نزدیک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ لیکن تلقین اس طور سے کی جائے کہ حاضر خود پڑھ پڑھ کر سنائیں اور مرنے والا شخص سنے اور سمجھے۔ مرنے والے کو نہ کہیں کہ تو بھی کہہ اس لیے کہ یہ وقت تکلیف کا ہوتا ہے۔ مبادا ان کا کہنا اس کو برا معلوم ہو یا وہ بسبب تکلیف کی زیادتی انکار کر دے جو اس کے حق میں بہتر نہیں۔ حاضرین اس وقت تک تلقین کرتے رہیں کہ مرنے والا ایک بار شہادتیں صراحتاً یا اشارۃً کہہ ڈالے پھر اس کو تلقین کرنا موقوف کر دیں اگر اس کے بعد کوئی دنیاوی بات اس کے منہ سے نکلے تو پھر اسی طور پر تلقین کریں یہاں تک کہ اس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو جائے۔ اگر کسی مسلمان سے کفر کا کلمہ جانکنی کی حالت میں منہ سے نکل جائے تو اس کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت مانگنی چاہیے۔ مرنے والے کے پاس سورہ یاسین اور سورہ رعد پڑھنا مستحب ہے۔

مرسلہ: ارشد علی ارشد، دبئی یو اے ای

حد پسند کیا گیا۔
انہوں نے جوانی میں بعض اولڈ کیریکٹر بھی بڑی خوب صورتی سے نبھائے بشلاً دل میرا دھڑکن تیری اور نورین میں ان کے کردار کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ خاص طور پر انہوں نے نورین میں ٹریجڈی رول کر کے فلم بین اور نقادوں کو حیرت زدہ کردیا۔ یہ ایک ایسے باپ کا کردار تھا جو اپنی جوان بیٹیوں کی شادی کرنے کے لیے پائی پائی جوڑ کر جہیز بناتا ہے لیکن ڈاکو اس کا سارا سامان لوٹ کر لے جاتے ہیں اور اس صدمہ سے وہ پاگل ہوجاتا ہے۔ ان کے دردناک مکالمے سن کر ہال میں بیٹھے ہوئے فلم بین بالخصوص مخصوص خواتین اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پاتیں اور پورے ہال میں ان کی سسکیاں گونجنے لگتیں۔ اس طرح انہوں نے فلم بینوں کو ہنسانے کے ساتھ ساتھ انہیں رلانے میں بھی اپنی صلاحیتوں کا شاندار مظاہرہ کیا۔

یادگار کرداروں کے حوالے سے عشق پر زور نہیں، ان کی ایک قابلِ ذکر فلم ہے جس میں انہوں نے ایک لالچی بوڑھے منشی کے کردار میں کچھ اس طرح حقیقت کا رنگ بھرا کہ فلم بین آج بھی اسے یاد کرتے ہیں، اسی طرح آگ کا دریا میں انہوں نے ایک سندھی منشی کا کردار بڑی عمدگی سے نبھایا تھا اور سندھی لب و لہجے میں انتہائی خوب صورت انداز میں مکالموں کی ادائیگی کی۔ ہدایت کار حسن طارق کی فلم دیور بھابی میں انہوں نے رانی کے کنجوس باپ کے روپ میں لاجواب مزاحیہ اداکاری کا مظاہرہ کیا جبکہ حسن طارق کی ایک اور سپر ہٹ فلم انجمن میں انہوں نے ایک طوائف زادی کے پیغام رساں اور نائیکہ کے عاشق کے کردار میں ناقابلِ فراموش پرفارمنس دی تھی۔

جن دیگر فلموں میں لہری نے روایت سے ہٹ کر یادگار کردار ادا کیے۔ ان میں آج اور کل، اُف یہ بیویاں، صائمہ، دل لگی اور پیغام قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح منفی مزاحیہ کرداروں میں بھی وہ اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چبھتے ہوئے کاٹ دار جملوں کی بدولت ان کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھر دیا اور یہی ان کی انفرادیت تھی جس کی بدولت وہ دیگر مزاحیہ اداکاروں سے الگ نظر آتے ہیں۔ لہری کے فن کا یہی کمال تھا کہ انہوں نے پھکڑ پن اور مزاح کے فرق کو واضح کیا اور سوانگ بھرنے یا حرکات و سکنات سے لوگوں کو ہنسانے کے بجائے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں شائستہ اور چبھتے ہوئے جملوں کی برجستہ ادائیگی سے فلم بینوں کو محظوظ کیا، وہ جملوں سے مزاح پیدا کرنے کے قائل تھے اور اس کے لیے بعض اوقات وہ اسکرپٹ میں لکھے ہوئے مکالموں کے بجائے بے ساختگی اور روانی میں اپنے جملے بول جاتے تھے۔

لہری نے اپنی اداکاری میں ہمیشہ شائستگی کا خیال رکھا اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر مکالموں کی ادائیگی کی۔ انہوں نے زبان و بیان کی صحت کا بھی خیال رکھا۔ وہ انتہائی خوش پوش اداکار تھے اور لباس کے انتخاب میں انہوں نے ہمیشہ خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا، بعض مناظر میں وہ فلم کے ہیرو سے زیادہ اسمارٹ نظر آتے تھے۔ وہ پاکستان کے واحد اداکار تھے جنہوں نے سوٹ پہن کر کامیڈی کی۔

انہوں نے پورے فلمی کیریئر کے دوران صرف تین پنجابی فلموں میں اداکاری کی۔ ان کی پہلی پنجابی فلم ہدایت کار ایس سلیمان کی یار دوست تھی جس میں محمد علی، اکمل، فردوس اور نغمہ نے بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ایک اور فلم ہدایت کار لقمان کی وہٹی تھی جس میں انہوں نے باقاعدہ پنجابی زبان میں مکالمے ادا کیے لیکن انہوں نے اس کے بعد مزید پنجابی فلموں میں کام نہیں کیا۔

دیکھا جائے تو لہری محض ایک مزاحیہ اداکار ہی نہیں بلکہ ورسٹائل فنکار بھی تھے اور انہوں نے نورین میں سنجیدہ کردار ادا کر کے یہ ثابت کردیا کہ وہ ہر قسم کے رول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے ان کی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور انہیں مزاحیہ کرداروں تک محدود کردیا۔

لہری کو ان کے فن کے اعتراف میں بارہ مرتبہ نگار ایوارڈ دیا گیا۔ کسی زمانے میں یہ پاکستان کا واحد معتبر ایوارڈ تھا جس کے حصول کے لیے فلمی شخصیات ہمیشہ آرزومند رہتی تھیں اور اسے پاکستان کی فلمی صنعت میں وہی مقام حاصل تھا جو بھارت میں فلم فیئر ایوارڈ کو ہے۔ اب تو پاکستان کی فلمی صنعت ہی نزع کے عالم میں ہے۔ اس لیے ان ایوارڈز کا سلسلہ بھی موقوف کردیا گیا ہے۔ لہری صاحب کو جن فلموں میں عمدہ اداکاری پر ایوارڈ دیا گیا ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ دامن، پیغام، کنیز، نہیں میں وہ نہیں، صائقہ، نئی لیلیٰ نیا مجنوں، انجمن، دل لگی، آج اور کل، نیا انداز، صائمہ اور بیوی ہو تو ایسی۔ □

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ اُن کے ذہنِ رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آئیے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

ہندوستان اور پاکستان کی فلمی صنعت کی کہانی بھی عجیب ہے۔ پاکستانی فلم انڈسٹری نے بھارتی فلمی صنعت کی کوکھ سے ہی جنم لیا۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کی فلمی صنعتوں میں بہت سے طریقے اور بہت سے لوگ مشترک تھے۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے لوگ بمبئی کی فلمی صنعت میں نمایاں کارنامے دکھا رہے تھے۔ ان میں فلم ساز، ہدایت کار، اداکار، گلوکار، موسیقار، کیمرا مین اور دوسرے ہنر مند شامل تھے جنہوں نے ہندوستان کی مشترکہ

فلمی صنعت میں گرانقدر کارنامے سرانجام دیے تھے۔

ہندوستان میں فلم کے ہر شعبے میں مسلمان موجود تھے جو اپنی بے مثال کارکردگی اور ذہانت کی وجہ سے مشترکہ ہندوستان میں بھی بہت نمایاں تھے۔ یہ نہ بھولیے کہ پہلی ہندوستانی فلم جس نے بہترین غیر ملکی ایوارڈز حاصل کیے تھے وہ محبوب خان کی مدر انڈیا تھی جس نے پہلی بار بالی وڈ کے بڑے بڑے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول کرائی تھی۔ اگر محبوب خان کی صحت اور مالی حالات اجازت دیتے تو وہ یقیناً ہالی ووڈ کے عظیم ہدایت کار ڈیوڈ لیتس کے ساتھ ایک عالمی شہرت یافتہ فلم بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔

ہدایت کاروں میں فضلی برادرز، اے آر کاردار، نذیر صاحب، ڈبلیو زیڈ احمد، نجم نقوی جیسے مسلمان ہدایت کاروں نے ہندوستان کی فلمی صنعت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اداکاروں میں دلیپ کمار، حبیب، نجم الحسن، حمید جیسے نامور اداکاروں نے اپنا نمایاں مقام بنالیا تھا۔ کہانی اور نغمہ نویسوں میں آرزو لکھنوی، فیاض ہاشمی، شکیل بدایونی، کیفی اعظمی، ضیا سرحدی، سردار جعفری، جاں نثار اختر جیسے نغمہ نویسوں کے دم سے بھارتی فلموں کی موسیقی میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ موسیقاروں میں ماسٹر غلام حیدر، خورشید انور، نوشاد، غلام محمد، سجاد جیسے موسیقاروں کی موسیقی سے بھارتی فلموں کی موسیقی جگمگا رہی تھی، گلوکاروں میں محمد رفیع، طلعت محمود، جی اے درانی اور دوسرے ممتاز گلوکار اور گلوکارائیں ہندوستان کی فلمی صنعت میں جگمگا رہے تھے۔ گلوکاراؤں میں میڈم نور جہاں، شمشاد بیگم، امربائی پانکی، بیگم اختر اور دوسری معروف گلوکاراؤں کی وجہ سے ہندوستان کی فلمی صنعت نغمہ و ساز کی ایک کہکشاں کی طرح تھی۔ مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی فلمی صنعت کی ترقی اور مقبولیت میں مسلمانوں کا حصہ کم نہ تھا۔

پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ایک افراتفری سی مچ گئی۔ بمبئی کی فلمی صنعت سے وابستہ لوگوں کو یقین تھا کہ قیام پاکستان کے بعد بھی فلمی دنیا کے حالات بہتر رہیں گے لیکن جب بمبئی میں ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور فلمی صنعت میں بھی ابتری مچ گئی تو بیشتر مسلمانوں نے پاکستان آنے کو ترجیح دی اور جیسے تیسے پاکستان پہنچ گئے ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا تعلق بنیادی طور پر پاکستانی علاقوں سے نہ تھا لیکن ہندوستان میں اپنے لیے حالات سازگار نہ پاکر کئی لوگوں نے پاکستان آنے کو ہی ترجیح دی۔ اس زمانے میں ہندوستان کی ہر ممتاز فلمی شخصیت کی خواہش یہی تھی کہ پاکستان میں جا کر رہے۔ اسی زمانے میں محبوب خان اور اے آر کاردار بھی امکانات کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان آئے تھے، انہوں نے لاہور کراچی میں چند روز قیام کیا۔ صورت حال کا جائزہ لیا۔ دوستوں سے مشورے کیے اور واپس جانے کو ہی بہتر جانا۔

گزشتہ دنوں 2013ء میں ہندوستان کی فلمی صنعت کی عمر ایک سو سال ہو گئی ہے۔ انہوں نے اپنی سنچری مکمل کر لی ہے جبکہ پاکستان کی فلمی صنعت اس سے آدھی عمر کی ہے۔ ایک اور اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندوستان میں 1906ء میں جب فلمی صنعت کی بنیاد رکھی گئی تو ان میں پیش پیش اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خاندانی لوگ تھے جو محض روپیہ کمانے کے لیے نہیں بلکہ فلمی صنعت کو دنیا میں ایک بلند مقام دینے کے خواہش مند تھے۔ ان کے پاس دولت بھی تھی اور اس کاروبار میں حصہ خریدنے کے لیے پیسا بھی تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی انڈین فلم انڈسٹری مضبوط پیروں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ تعلیم یافتہ اور بلند خیال لوگوں کی شمولیت نے ہندوستان کی فلمی صنعت کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے عالمی فلمی میلوں میں شرکت کر کے داد بھی حاصل کر چکی تھی۔ خواجہ احمد عباس کی فلم "بیٹا" ہندوستان کی پہلی فلم تھی جو عالمی میلوں میں شریک ہو کر داد حاصل کر چکی تھی۔ جب ہندوستان میں فلمی صنعت قائم کی گئی تو سمجھدار لوگوں نے فلم اسٹوڈیوز کی طرف اولین توجہ دی۔ انہوں نے ہالی ووڈ کے معیار پر اسی طرز کے فلمی نگار خانے قائم کیے جس کا معیار اور شہرت ہالی ووڈ کے فلمی نگار خانوں سے کسی طرح کمتر نہ تھی۔ آج جو نقاد اور دانشور ہندوستان کی فلمی صنعت سے پاکستانی صنعت کا موازنہ کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ انڈیا میں فلم اسٹوڈیوز کی داغ بیل اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باحوصلہ لوگوں نے ڈالی تھی۔ آج سے سوا سو سال قبل بھارتی نگار خانوں میں جرمن اور انگریز ہنر مند اور کاریگر کام کر رہے تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کو اس تربیت دی اور فلم سازی کے ہنر میں یکتا کیا۔

اس کے برعکس پاکستان کی فلمی صنعت پر نظر ڈالیں تو یہ گجراتی فلموں کے شعبے میں تھی۔ دراصل لاہور کی فلموں کے لیے سرمایہ کلکتہ کے گجراتی سیٹھ فراہم کرتے تھے۔ پنچولی، روپ کے شوری وغیرہ دراصل ان ہی کے سرمائے سے کام

کرتے تھے۔ اسٹیج ڈرامے، تھیٹر اور فلمیں، لاہور اور کلکتہ میں بنائی جاتی تھیں۔ فن کار، گلوکار، ہدایت کار اور موسیقار وغیرہ بھی لاہور ہی فراہم کرتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور کلکتہ کے لیے ایک سپلائی ڈپو تھا۔ جو بھی فن کار، مصنف یا گلوکار لاہور میں نمایاں ہوتا تھا وہ ٹکٹ کٹا کر فوراً کلکتہ کا سفر اختیار کرتا تھا پھر وہاں کامیابی اور مقبولیت حاصل کرنے والے اپنی قسمت مزید بہتر بنانے کے لیے بمبئی کا رخ کرتے تھے اور وہاں دولت، شہرت اور مقبولیت ان کے قدم چومتی تھی۔ راتوں رات سب کچھ حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن کامیابی چند خوش قسمتوں کے نصیب میں ہی آتی تھی۔ ورنہ ہزاروں اسی امید پر اپنی زندگیاں ضائع کر دیتے تھے۔ بمبئی میں فلم اسٹوڈیوز قائم تھے جن میں بعض بڑے کامیاب اور تاریخ ساز اسٹوڈیوز تھے۔

اس کے برعکس جب پاکستان میں فلمی صنعت سنبھالنے والے آئے تو یہاں جلے یا نیم جلے نگار خانے ہی ان کو ملے۔ ان کے ضروری آلات بھی ہندو اپنے ساتھ لے گئے تھے کیونکہ فلم انڈسٹری پر یہاں بھی قیام پاکستان سے پہلے ہندو ہی چھائے ہوئے تھے اس لیے جب وہ پاکستان سے گئے تو اپنے تجربات کے ساتھ ساز و سامان بھی ساتھ لے گئے۔ پاکستان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آیا تھا جبکہ ہندوستان والوں کو جمی جمائی ترقی یافتہ فلم انڈسٹری، بہترین نگار خانے، جدید ترین لیبارٹری اور ایڈیٹنگ روم ملے تھے۔ انہیں بہت زیادہ قابل اور تجربہ کار لوگ بھی گھر بیٹھے ہی مل گئے تھے۔ پاکستان آنے والوں نے درحقیقت ایک جذبے کے تحت فلمی صنعت پاکستان میں قائم کرنے کے لیے کام کیا تھا حالانکہ اس وقت تو فلموں کے لیے برائے نام سرمایہ بھی موجود نہ تھا۔

بہرحال حوصلہ مند پاکستانیوں نے ایک ایک پائی جوڑ کر فلمیں بنائیں۔ پاکستان میں بھارتی فلموں کی کھلی درآمد کے بارے میں پاکستانی فلمی صنعت نے بہت سخت جدوجہد کی یہاں تک کہ بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی لگ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مقامی فلمی صنعت میں ایک انقلاب آ گیا۔ جو سینما اونر اور فلم ڈسٹری بیوٹرز بھارتی فلموں کو درآمد کرنے کی کوشش میں مصروف تھے ان کا رویہ اچانک بدل گیا۔ ظاہر ہے کہ انہیں فلموں کی ضرورت تھی جو مقامی طور پر ہی بنائی جا سکتی تھیں۔ شاہ نور اسٹوڈیوز اس وقت بہترین نگار خانہ تھا لیکن اس کے بعد آغا جی اے گل اور باری ملک جیسے بڑے تقسیم کاروں نے بھی ایور نیو اسٹوڈیوز اور باری اسٹوڈیو کی بنیاد رکھی۔ تقسیم کار چوہدری ثناء اللہ نے بہت اچھا ثنائی اسٹوڈیو بنایا۔ اشفاق ملک نے اے ایم اسٹوڈیوز تعمیر کیا۔ اس کے بعد کچھ اور لوگوں نے بھی نگار خانے بنائے لیکن فلم تقسیم کاروں کا وہ گروپ جنہوں نے پاکستان میں

بھارتی فلموں کی درآمد کے لیے ایک پُرزور مہم چلا رکھی تھی، وہ یہ جنگ ہار گئے اور فلم اسٹوڈیوز، سینما گھر اور فلمیں بنانے لگے۔ فلموں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی تو مزید سینما گھروں کی ضرورت پڑی اور پورے ملک میں نئے سینما گھروں کا جال سا بچھ گیا۔

آیئے، اب واپس انڈین فلم انڈسٹری کی طرف آتے ہیں۔ بمبئی میں سب سے زیادہ منظم اور انگریزی بنیادوں پر قائم کیا ہوا اسٹوڈیو ''بمبئی ٹاکیز'' تھا۔ یہ 1934ء میں قائم کیا گیا تھا۔ بمبئی ٹاکیز ایک زمانے میں معیار اور کامیابی کی سند سمجھا جاتا تھا۔ اس اسٹوڈیو نے یادگار فلمیں بنائیں۔ اچھے بامقصد موضوعات فلمائے، نئے نئے فن کار اور ہنر مند تلاش کیے۔ ایک زمانے میں یہ بمبئی بلکہ ہندوستان کا بہترین فلم ساز ادارہ تھا۔ اسی طرز پر کلکتہ میں ''شیو تھیٹرز'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ شیو تھیٹرز نے بھی فلم سازی میں صحت مند رجحانات قائم کیے۔ بہت اچھے بنگالی ناولوں کو فلموں کی شکل میں ڈھالا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں باوقار اور معیاری فلم ساز ادارے صرف دو تھے۔ بمبئی ٹاکیز اور شیو تھیٹرز، دوسرے اداروں نے بھی فلم سازی کا سلسلہ جاری رکھا لیکن یہ معیار اور وقار دوسرے اداروں کو حاصل نہ ہوسکا۔

بمبئی ٹاکیز شہر کے پُرسکون علاقے ملاڈ میں قائم کیا گیا تھا جو کہ بمبئی کا ایک نواحی علاقہ تھا۔ بمبئی ٹاکیز نے کل 120 فلمیں بنائیں جن میں سے کچھ یادگار اور ناقابلِ فراموش ہیں۔

یہ ادارہ ہندوستان کی عظیم ترین اداکارہ دیویکا رانی اور ہمنشو رائے نے باہمی شراکت کی بنیاد پر بنایا۔ دیویکا رانی ہندوستانی اداکاراؤں میں ایک نمایاں حیثیت کی مالک تھی۔ انڈین فلم انڈسٹری کا تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ رابندر ناتھ ٹیگور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی پھر انگلستان ہی سے انہوں نے اداکاری اور دوسرے ہنر سیکھے۔ انڈیا واپس آکر انہوں نے ہمنشو رائے، اور فنانسر راج نرائن دوبے کے ساتھ مل کر ممبئی ٹاکیز سے فلم سازی کا آغاز کیا جو ایک نامور اور باوقار فلم ساز ادارہ بن گیا۔ یہ پہلا فلم اسٹوڈیو تھا جو اسٹاک ایکسچینج میں شامل تھا۔ بمبئی کے بڑے بڑے سرمایہ کار اس اسٹوڈیو کو مالی امداد فراہم کرتے تھے جن میں ایف ای ڈنشا، سر فیروز سیتھیا، جیسے لوگ شامل تھے۔ یہ بہت منافع بخش ادارہ تھا۔ بمبئی ٹاکیز نے کل 120 فلمیں بنائیں ان کی ہر فلم سوچ سمجھ کر بنائی جاتی تھی اور معیار کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔

دیویکا رانی نے ہمنشو رائے سے شادی کی تھی جو عین جوانی میں مرگئے۔ کچھ عرصے بعد دیویکا رانی نے فلمی صنعت سے قطع تعلق کر کے ایک روسی مصور سے شادی کر لی تھی۔ دیویکا رانی کو نہ صرف موضوعات اور اداکاری پر بلکہ فن کاروں کے انتخاب میں بھی کمال حاصل تھا۔

بمبئی ٹاکیز نے جو بڑے فن کار تخلیق کیے ان میں خود دیویکا رانی، دلیپ کمار، راج کپور اور مصنف آغا جانی کاشمیری شامل ہیں۔

اس اسٹوڈیو کی بننے والی اشوک کمار اور دیویکا رانی کی فلم ''اچھوت کنیا'' نے کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ اس فلم میں ایک اہم موضوع فلمایا گیا تھا۔ یہ ایک اچھوت لڑکی اور اچھے خاندان کے لڑکے کے رومانس کی کہانی تھی۔ دیویکا رانی کی فلموں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی مشہور فلموں میں جوانی کی ہوا، جیون نیّا شامل ہیں۔ اس اسٹوڈیو کے لیے یورپ اور جرمنی کے ہنر مندوں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ جوار بھاٹا، کنگن اور بندھن بمبئی ٹاکیز کی کامیاب ترین فلموں میں شامل ہیں۔ ہمنشو رائے کی وفات کے بعد اسٹوڈیو کا انتظام دیویکا رانی نے سنبھال لیا تھا اور بہت کامیابی سے اسٹوڈیو چلایا لیکن بعد میں حصہ داروں میں اختلاف رائے پیدا ہونے کے بعد اسٹوڈیو روبہ زوال ہوگیا۔ بعد میں اشوک کمار اور ایس مکرجی نے علیحدہ ہوکر فلمستان کے نام سے ایک اور فلم ساز ادارہ بنا لیا تھا۔

دیویکا رانی کو ہندوستان کے تمام اعلیٰ ترین ایوارڈز سے نوازا گیا۔ 1958ء میں انہیں پدم شری ایوارڈ دیا گیا۔ انہیں اعلیٰ ترین فلمی ایوارڈ ''داداصاحب پھالکے'' ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ وہ ہندوستان کی نیشنل اکیڈمی برائے ڈراما، ڈانس، میوزک اور فلم کی بھی رکن رہ چکی ہیں۔ ان ایوارڈز کی وہ مستحق بھی تھیں۔

بمبئی ٹاکیز کی بنائی ہوئی چند یادگار فلموں کے بارے میں ذیل میں معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔

1935ء جوانی کی ہوا۔ اس کی ہیروئن دیویکا رانی تھیں۔ 1936ء جیون نیّا، ضدی، اچھوت کنیا، جوار بھاٹا، قسمت جس نے طویل ترین عرصے تک چلنے کا اعزاز حاصل

فلمستان اسٹوڈیو

کیا اور محل۔ ہمنشو رائے 1940ء میں وفات پاگئے تھے۔

1954ء میں بمبئی ٹاکیز اسٹوڈیو بند ہوگیا جو کہ انڈین فلم انڈسٹری کے لیے ایک مثال تھا۔ 1990ء میں بمبئی ٹاکیز کے فنانسر راج نرائن دوبے وفات پاگئے۔ 1994ء میں دیویکا رانی دنیا سے رخصت ہوگئیں اور 10 دسمبر 2001ء کو اشوک کمار بھی انتقال کر گئے۔ اس طرح بمبئی ٹاکیز کے ساتھ ہی اس کے ساتھ وابستہ بے شمار رومانی اور فلمی داستانوں کا اختتام ہوگیا۔ بمبئی ٹاکیز دراصل ہمنشو رائے اور دیویکا رانی کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ انہوں نے ایک تاریخ ساز فلمی ادارہ قائم کیا تھا جو کہ ان دونوں کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ 42 سال کی عمر میں ہمنشو رائے کی اچانک وفات کے بعد دیویکا رانی نے بہت کامیابی سے اس عظیم ادارے کو چلایا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ بمبئی ٹاکیز کی بنائی ہوئی 120 فلموں میں صرف ایک شخص کا سرمایہ تھا جس کا نام راج نرائن دوبے تھا۔ وہ دیویکا رانی اور ہمنشو رائے کے ہر قدم پر شریک رہے۔ جب بمبئی ٹاکیز کا خاتمہ ہوا تو ادارے پر واجب تمام قرضے راج نرائن دوبے نے ہی ادا کیے تھے۔

☆☆☆

بمبئی میں فلمستان ایک بہت ممتاز فلم ساز ادارہ تھا جو سات ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ جب اشوک کمار اور ان کے بہنوئی ایس مکرجی نے اختلافات کے بعد بمبئی ٹاکیز سے علیحدگی اختیار کی تو اشوک کمار، ایس مکرجی اور ساوک واچا نے مشترکہ طور پر فلمستان کی بنیاد رکھی جس نے بہت سی یادگار فلمیں پروڈیوز کیں۔ ایس مکرجی بمبئی ٹاکیز سے آتے ہوئے اپنے ساتھ سپر اسٹار اشوک کمار اور ہدایت کار گیان مکرجی کو بھی لے آئے تھے۔ ایس مکرجی کو فلموں کے اسکرین پلے لکھنے اور کمرشل فلمیں بنانے میں کمال حاصل تھا۔ 1940ء اور 1950ء کی دہائی میں فلمستان نے کامیاب فلموں کے بنانے میں بہت نام اور پیسا کمایا۔

اس ادارے سے ہندوستانی فلموں کی جذباتی یادیں بھی وابستہ ہیں جس نے نئے انداز کی فلمیں بنا کر سب کو چونکا دیا تھا۔ 1948ء میں فلمستان نے ''شہید'' بنائی تھی جس میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل نے ناقابلِ فراموش اداکاری کی تھی۔ یہ ایک نئے اور انقلابی موضوع پر بنائی گئی فلم تھی۔ 1949ء میں فلمستان نے ''سرگم'' بنائی۔ 1953ء میں بنی انارکلی نے تو سارے ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ 1954ء میں فلمستان کی ایک اور سپر ہٹ فلم ''ناگن'' کی نمائش ہوئی تھی جس نے بے حد کامیابی حاصل کی تھی۔ فلمستان کی فلموں میں موسیقی عموماً بہت اچھی ہوتی تھی۔

فلمستان نے 1954ء میں فلم ''منیم جی'' بنائی

تھی۔ 1955ء میں ایک اور ہٹ فلم ”تم سا نہیں دیکھا“ فلمستان کی پیشکش تھی اور بہت کامیاب اور مقبول فلم تھی۔ 1975ء میں بنائی جانے والی ”پے انگ گیسٹ“ بھی بے حد کامیاب فلم تھی۔

مصنف ناصر حسین بھی فلمستان سے وابستہ تھے۔ انہوں نے بہت سی کامیاب فلمیں لکھی تھیں۔ فلم ”تم سا نہیں دیکھا“ کے بعد وہ ہدایت کار بھی بن گئے تھے۔ فلمستان کی بنائی ہوئی فلموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ چند کے نام پیش ہیں۔ دوج کا چاند، 1964ء۔ بابر 1960ء۔ خوبصورت دھوکا، 1959ء۔ میں نے جینا سیکھ لیا 1959ء۔ سنسکار 1958ء۔ چمپا کلی، 1957ء۔ پے انگ گیسٹ، 1957ء۔ تم سا نہیں دیکھا 1957ء۔ ہیر، 1956ء۔ درگیش نندنی، 1956ء۔ ہم سب چور ہیں، 1956ء۔ آب حیات، 1955ء۔ منیم جی 1955ء۔ جاگرتی، 1954ء۔ ناگن، 1954ء۔ ناستک، 1954ء۔ شرط 1954ء۔ انارکلی، 1953ء۔ آنند مٹھ، 1952ء۔ شبستان، 1951ء۔ سرگم، 1950ء۔ شبنم، 1949ء۔ شہید، 1948ء۔ دو بھائی، 1947ء۔ شکار، 1946ء۔ آٹھ دن، 1946ء۔

اب فلمستان کے مالک بدل گئے ہیں۔ فلمستان کا فلم سازی کے اعتبار سے بھی پہلے جیسا زوروشور نہیں رہا۔ فلمستان کی شبنم اور شہید سے ہی دلیپ کمار اور کامنی کوشل کا رومان شروع ہوا تھا جس کا نتیجہ جدائی نکلا۔ کہتے ہیں کہ کامنی کوشل ہی دراصل اشوک کمار کی پہلی اور آخری محبت تھی۔

اس اسٹوڈیو نے بہت اچھے دن دیکھے ہیں۔ اب اس کو فروخت کر کے یہاں کوئی کمرشل پلازہ تعمیر کرنے کی بات چیت چل رہی ہے۔ دنیا کے دوسرے شعبوں کی طرح فلمی دنیا میں عروج و زوال کے دور چلتے رہتے ہیں۔ کل کے سپر اسٹار آج بھلائے جا چکے ہیں۔ کل کے فلم ساز ادارے اب ناپید ہو چکے ہیں۔ یوں ہی دنیا بدلتی ہے اسی کا نام دنیا ہے۔

☆☆☆

ہندوستان کے ممتاز اور نمایاں فلمی نگار خانوں میں محبوب اسٹوڈیو کا نام بھی نمایاں ہے۔ محبوب اسٹوڈیو ہدایت کار و فلم ساز محبوب خان نے 1954ء میں تعمیر کیا تھا۔ اس سے پہلے ان کا فلم ساز ادارہ محبوب پروڈکشنز ملک کے ممتاز فلم ساز اداروں میں شمار ہوتا تھا۔ محبوب خان کی مشہور زمانہ فلم ”مدر انڈیا“ بھی اسی اسٹوڈیو میں بنائی گئی تھی۔ یہ فلم آسکر کے مقابلوں میں پانچ غیر ملکی زبان کی فلموں میں سے ایک نامزد شدہ فلم تھی۔ مدر انڈیا وہ فلم تھی جس نے ساری دنیا میں دھوم مچادی تھی اور صحیح معنوں میں دنیا بھر میں انڈین فلموں کا تعارف کرانے والی یہ پہلی فلم تھی۔ ”مدر انڈیا“ نے اسی سال فلم فیئر ایوارڈ کے علاوہ دوسرے اعزازات بھی حاصل کیے تھے۔

محبوب اسٹوڈیو جدید ترین ساز و سامان سے لیس تھا اور بمبئی کے بڑے بڑے فلم ساز اس اسٹوڈیو میں اپنی فلمیں بنایا کرتے تھے جن میں گورودت، چیتن آنند، اور دیو آنند جیسے نامور ہدایت کار شامل ہیں۔ اس اسٹوڈیو میں شوٹنگ کے لیے پانچ فلور تھے۔ بعد میں من موہن ڈیسائی نے بھی محبوب اسٹوڈیو میں فلم سازی شروع کردی تھی۔ 1970ء میں محبوب اسٹوڈیو میں ایک ریکارڈنگ اسٹوڈیو کا بھی اضافہ کیا گیا۔ محبوب صاحب تو اس دنیا میں نہیں رہے مگر ان کی بنائی ہوئی یادگار فلمیں لوگوں کو آج تک یاد ہیں۔ اب ان کے بیٹے فلم اسٹوڈیو اور ریکارڈنگ اسٹوڈیو کو چلاتے ہیں۔ آج بھی اس کا شمار بمبئی کے بہت اچھے فلمی نگار خانوں میں کیا جاتا ہے۔ اس اسٹوڈیو میں ہندوستان کے معروف مجسمہ ساز امیش کپور کے مجسموں کی نمائش بھی منعقد ہوئی تھی۔ اسٹوڈیو کے ایک حصے میں نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹس ہے۔ اپنے اردگرد کے خوبصورت علاقے اور خوشگوار ماحول کی وجہ سے محبوب اسٹوڈیوز کو آج بھی بمبئی کے فلمی نگار خانوں میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

اب ذرا اس فلم اسٹوڈیو کے آغاز کی وجہ بھی سن لیجیے۔ ہدایت کار محبوب خان نے 1935ء میں ہدایت کاری کا آغاز کیا تھا۔ ان کا فلم ساز ادارہ محبوب پروڈکشنز ایک نمایاں ادارہ تھا جس نے بہت اچھی فلمیں بنائی تھیں اور محبوب کا شمار انڈیا کے بڑے اور مشہور ہدایت کاروں میں ہونے لگا تھا۔

محبوب نے جب اسٹوڈیو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو بہت دور نہ تھی۔ اس زمانے میں بمبئی ٹاکیز اور فلمستان گورے گاؤں اور ملاڈ کے علاقوں میں تھے۔ محبوب کی دو فلمیں انمول گھڑی 1946ء اور انداز 1949ء سپرہٹ ہوئی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے کافی سرمایہ کمایا تھا جس کے بعد انہیں ذاتی فلم اسٹوڈیو بنانے کا خیال آیا تھا۔ بالآخر انہوں نے باندرہ کے علاقے میں اسٹوڈیو کے لیے جگہ کا انتخاب کیا۔ محبوب نے اپنی فلمیں ”آن“ اور ”امر“ اسی اسٹوڈیو میں بنائی تھیں۔ ”مدر انڈیا“ کی بے پناہ کامیابی اور آسکر ایوارڈ کی وجہ سے محبوب خان کی اہمیت اور عزت میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ جن دنوں محبوب اپنی فلمیں نہیں بناتے تھے وہ اپنے اسٹوڈیو کو دوسرے فلم سازوں کو کرائے پر دے دیا کرتے تھے۔ ان کے آس پاس رہنے والوں سے بہت اچھے مراسم تھے۔ خالی اوقات میں وہ فلم کی شوٹنگ یا کاغذی تیاریوں میں مصروف نہ ہوتے تھے تو قریبی ملنے والوں سے گپ شپ بھی کرتے تھے۔ ”سن آف انڈیا“ کی ناکامی نے انہیں شدید ذہنی اور مالی نقصان پہنچایا تھا۔ ان دنوں وہ بدمزاج اور چڑچڑے بھی ہوگئے تھے۔ کئی سالہا سال پرانے دوست اور رفیق ان کی بدمزاجی کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔

اس اسٹوڈیو میں کئی مشہور فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ گورودت کی فلم ”کاغذ کے پھول“ محبوب اسٹوڈیو میں ہی بنائی گئی تھی۔ دیو آنند نے بھی اپنی معروف فلم ”گائیڈ“ اسی اسٹوڈیو میں بنائی تھی جو بے حد کامیاب ہوئی تھی۔ دیو آنند نے بیس برس تک محبوب اسٹوڈیو میں اپنا فلمی دفتر رکھا تھا۔

محبوب خان نے ناکامیوں کا منہ کم ہی دیکھا تھا۔ ”مدر انڈیا“ جیسی بے مثال فلم کے بعد ”سن آف انڈیا“ نے انہیں ذہنی اور مالی طور پر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ قرضوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان ہی پریشانیوں کی وجہ سے وہ 1956ء میں صرف 56 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئے لیکن ہمیشہ کے لیے اپنا نام دنیا میں چھوڑ گئے۔

جب 1970ء میں مدر انڈیا کے حقوقِ تقسیم محبوب صاحب کے خاندان کو واپس ملے تو خاندان کے حالات بہتر ہوگئے تھے لیکن بدقسمتی نے پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ دسمبر 2000ء میں اسٹوڈیو میں آگ لگ گئی اور اس کے دو شوٹنگ فلور جل کر راکھ ہوگئے۔

دیویکارانی اور ہمانشورائے

محبوب خان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر 2007ء میں انڈیا کے محکمہ ڈاک نے ان کے لیے ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا تھا۔ محبوب اسٹوڈیو میں کچھ اور کامیاب فلمیں بھی بنائی گئی تھیں جن میں ”ہم دونوں“ 1962ء، گائیڈ 1965ء، امر پالی 1966ء، جانی میرا نام 1970ء، لال پتھر 1971ء، آندھی 1975ء، کچھ کچھ ہوتا ہے 1998ء، بلیک 2005ء، پہیلی 2005ء، ساوریا 2007ء، گزارش 2010ء، ہاؤس فل 2، 2007ء، دبنگ 2، 2012ء قابلِ ذکر ہیں۔

یہ کہانی ہے اس شخص کی جو گاؤں سے پیدل چل کر بمبئی آیا تھا جہاں اس نے ہر طرح کی محنت مزدوری کی۔ ایکسٹرا کی حیثیت سے بھی کام کیا اور پھر ہندوستان کا سب سے نامی گرامی فلم ساز اور ہدایت کار کہلایا محض اپنی صلاحیتوں کے بل پر۔ محبوب صاحب صرف گجراتی زبان لکھ اور پڑھ سکتے تھے مگر ہندوستان کی فلمی صنعت انہیں کبھی بھلا نہ سکے گی۔

☆☆☆

جب پاکستان کی فلمی صنعت نے کروٹ بدلی اور انڈین فلموں کی بندش کے بعد پاکستان میں فلم سازی نے زور پکڑا تو فلم سازوں نے بھی نئے نئے موضوعات پر فلمیں بنانے کا آغاز کردیا۔ دراصل آزادی سے پہلے ملک کی آزادی کے لیے جنگ کرنے والوں کے بارے میں فلمیں

بنائی جاتی تھیں۔
انگریز حکومت نے آزادی کے ان متوالوں کو ڈاکو اور لیٹروں کا نام دیا تھا اور عوام کو یہ تاثر دیا تھا کہ یہ آزادی کے مجاہد نہیں بلکہ برے کردار کے مالک، ڈاکو، لٹیرے اور بدمعاش تھے، لیکن رفتہ رفتہ فلم سازوں نے عوام میں یہ شعور پیدا کیا کہ وہ آزادی کی جنگ لڑنے والوں اور ڈاکوؤں میں فرق محسوس کرسکیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے اس قسم کی فلمیں بنانے کا آغاز فلم ساز شوکت شیخ نے کیا تھا۔ فلم کا نام ''عجب خان'' تھا۔ اس کے مصنف ریاض شاہد اور ہدایت کار خلیل قیصر تھے۔ لالا سدھیر اور حسنہ نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم بہت زیادہ کامیاب ہوئی تھی کیونکہ اپنی نوعیت کی پہلی فلم تھی۔
عجب خان انگریز فوج میں ملازم ایک بھائی کی کہانی تھی جو اپنے قبیلے کی ایک لڑکی کا انتقام لینے کے لیے ایک بہت بڑے انگریز افسر کی بیٹی کو اغوا کر کے پہاڑیوں میں لے جاتا ہے۔ فرنگی فوج انگریز لڑکی کو آزاد کرانے کے لیے تمام طریقے آزماتی ہے مگر کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس فلم کے موسیقار رشید عطرے تھے جن کی موسیقی نے اس فلم کی کامیابی میں ایک نمایاں حصہ لیا تھا۔ ''عجب خان'' پورے ملک میں کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی اور کراچی میں اس نے گولڈن جوبلی منائی تھی۔
''عجب خان'' کی کامیابی کے بعد ایسے موضوعات پر اور بھی کئی فلمیں بنائی گئی تھیں۔ عجب خان کے بعد آزادی کے لیے جنگجو افراد کے بارے میں مزید فلمیں بنائی گئیں جن میں ملنگی، نظام لوہار، جبرو، امام دین گوہا، شیر محمد خان تالپور، اور ہوش محمد شیدی کے نام شامل ہیں۔ اس وقت اس سلسلے میں بنائی گئی ایک فلم ''جاگ اٹھا انسان'' بھی تھی۔ یہ فلم دراصل بلوچستان کے جنگجو قادر بخش کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے بنائی تھی۔ قادر بخش بلوچستان کی تاریخ کے ایک جیالے کی کہانی ہے جس میں قادر بخش کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ قادر بخش بلوچ ایک بہادر اور جاں باز جنگجو تھا۔ وہ مکران کے ایک گاؤں میں رہتا تھا اور پُرامن زندگی گزار رہا تھا۔
کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ قادر بخش مکرانی (محمد علی) اپنے گاؤں میں فقیر محمد (وحید مراد) کے ساتھ خوشی منا رہا ہے۔ اسی وقت ایک لٹا پٹا قافلہ گاؤں میں آتا ہے۔ قافلے کے مفلوک الحال ارکان بتاتے ہیں کہ گجرات سے جان بچانے کے لیے یہاں آئے ہیں جہاں انگریز مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہے ہیں اور ان کی زندگی محال ہوچکی ہے۔ ہم اپنی زندگی اور آبرو کی حفاظت چاہتے ہیں۔ کیا یہاں ہمیں پناہ مل سکے گی؟''
قادر بخش ان کو خوش آمدید کہتے ہیں کہ جب تک آپ ہمارے علاقے میں ہیں ہم جان و مال سے آپ کی حفاظت کریں گے۔
اسی دوران میں گجرات کے مقامی لوگوں پر فرنگیوں کے ظلم و ستم کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ بات بہت معمولی واقعے سے شروع ہوتی ہے جب کچھ انگریز سپاہی کنویں پر اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے پر مقامی لوگوں سے جھگڑا کرتے ہیں۔ بات بڑھ جاتی ہے۔ معاملہ جنگ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لڑائی میں فرنگیوں کا کیپٹن ہلاک ہوجاتا ہے۔ اسی وقت فقیر محمد وہاں پہنچ جاتا ہے اور مظلوموں کو قادر بخش کے پاس لے جاکر تمام واقعہ سناتا ہے۔ قافلے والے انگریز فوجیوں سے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں۔ قادر بخش ان کی ہمت بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اپنے مہمانوں کی حفاظت اور عزت کرنا خوب جانتے ہیں۔
ادھر انگریزوں کا کمانڈر اسکاٹ اپنے فوجیوں کے ساتھ پیچھا کرتا ہوا وہاں آتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم اپنے کیپٹن کے قاتل کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ قادر بخش کہتا ہے کہ تمہارے کیپٹن کا قاتل ہمارے پاس نہیں ہے۔ کمانڈر اسکاٹ تلاشی لینے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو قادر بخش بھڑک جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ نہ بھولو کہ تم قادر بخش مکرانی کے علاقے میں ہو۔ میں تلاشی کی اجازت نہیں دوں گا اور اگر اصرار کیا تو یہاں بہت خون خرابا ہوگا۔
کمانڈر اسکاٹ اس وقت تو چلا جاتا ہے مگر پھر فوجی تیاریوں کے ساتھ دوبارہ آتا ہے اور الزام لگاتا ہے کہ قادر بخش آس پاس کے علاقوں میں ڈکیتی کی وارداتیں کرتا ہے۔ تم لوگ اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کردو اور گاؤں خالی کر کے کہیں اور چلے جاؤ۔ میں اپنے علاقے میں یہ حرکتیں برداشت نہیں کرسکتا۔ قادر بخش غصے سے بے قابو ہوجاتا ہے مگر دوسرے ساتھی اسے سمجھاتے ہیں کہ کمانڈر اسکاٹ توپیں بھی اپنے ساتھ لایا ہے۔ ہمیں اپنی عورتوں اور بچوں کو کہیں محفوظ جگہ منتقل کردینا چاہیے۔ اس کے بعد ہم بے خوف ہوکر ان کا مقابلہ کرسکیں گے۔ چنانچہ قادر بخش خواتین اور بچوں کو بلوچستان کے پہاڑوں میں بھیج دیتا ہے اور پھر یہ

فلم باغی کا ایک سین

فیصلہ کرتا ہے کہ انگریزوں کے حملے کا انتظار کرنے سے پہلے ہمیں... خود ان پر حملہ کردینا چاہیے۔ سب اس تجویز سے اتفاق کرتے ہیں۔ قادر بخش کا منہ بولا بھائی ہری سنگھ (کمال ایرانی) بھی اس کا ساتھ دینے کا اعلان کرتا ہے۔
انگریز حکومت کی طرف سے قادر بخش کے سر کی قیمت 25 ہزار روپے مقرر کردی جاتی ہے جو کہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ انگریز قادر بخش اور ہری سنگھ کو ہندو مسلمان کا ذکر کر کے بیوفائی کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ قادر بخش اسکاٹ سے کہتا ہے کہ ہم لوگ تو سر سے کفن باندھ کر نکلے ہیں۔ کملا قادر بخش کی بہادری سے متاثر ہوکر اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ فقیر محمد (وحید مراد) زیبا سے محبت کرتا ہے جن کی قادر بخش شادی کرا دیتا ہے۔ انگریز بے خبری میں حملہ کردیتے ہیں۔ کملا قادر بخش کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان دے دیتی ہے۔
قادر بخش واپس مکران چلا جاتا ہے۔ اس کے تمام جاں نثار ساتھی ایک ایک کر کے مارے جاتے ہیں۔ قادر کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور اس کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔
قادر کی بیوی اپنے شوہر سے آخری ملاقات کے لیے جیل میں جاتی ہے۔ قادر اپنی بیوی کو آخری وصیت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے بیٹے سے کہنا کہ جب وہ میری قبر پر آئے تو آزاد وطن میں کھلنے والے پھول میری قبر پر چڑھائے۔
قادر کو پھانسی دے دی جاتی ہے لیکن اس کا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل ہوجاتا ہے جنہوں نے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی جان اور مال کی قربانی دی تھی۔ ایسے ہی سر پھرے جانبازوں کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجے میں ہمیں انگریز کی غلامی سے نجات ملی اور آج ہم ایک آزاد مسلم ملک کے خوددار شہری ہیں جو دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت ہے۔ اس کہانی سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس زمانے میں پاکستان میں کیسے بامقصد اور ارفع موضوعات پر فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ افسوس کہ آج جب ہم آزاد تو ہیں مگر ہم ایسے موضوعات کو فراموش کر بیٹھے ہیں بلکہ اب تو پاکستان میں فلمی صنعت کا وجود تک نہیں ہے۔
فلم جاگ اٹھا انسان، کی فلم بندی کراچی میں کی گئی تھی اور اس کے اداکاروں اور ہنرمندوں میں زیادہ تعداد کراچی کی صنعت سے وابستہ لوگوں کی ہی تھی۔ اور فلم میں محمد علی نے مرکزی کردار بہت جوش اور جذبے کے ساتھ ادا کیا تھا جسے بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا۔ محمد علی نے قادر بخش مکرانی کے کردار میں بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ وحید مراد کی اداکاری بھی قابلِ ذکر تھی، وحید مراد اور زیبا کے رومانی کردار تھے۔ کراچی کے باصلاحیت ہدایت کار شیخ حسن اس کے ہدایت کار تھے۔ انہوں نے اردو اور سندھی میں بہت معیاری فلمیں بنائی ہیں۔ ناظم پانی پتی اور دکھی پریم نگری نے اس فلم کے نغمات لکھے تھے۔ اس فلم کے گلوکاروں میں نور جہاں، مہدی حسن، مسعود رانا شامل تھے۔ فردوس نے بھی اس فلم میں ایک مختصر کردار ادا کیا تھا، اس وقت تک وہ ہیروئن نہیں بنی تھیں۔ لعل محمد اقبال نے فلم کی بہت دلکش موسیقی مرتب کی تھی۔

☆☆☆

کبھی کبھی مجھے چنن دین اور اس کا فلسفہ بہت یاد آتا

ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ چنن دین ہی سچا تھا؟ تھا تو وہ ایک ان پڑھ دیہاتی مگر اس کا کہا ہوا فقرہ مجھے قریب قریب ہر روز یاد آجاتا ہے۔ ہوا یہ کہ مکئی کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کا موسم تھا۔ اپنے ایک زمیندار دوست کی دعوت پر میں اپنے چند احباب کے ساتھ ان کے گاؤں گیا ہوا تھا۔ جاتی سردی کا زمانہ پنجاب میں بہت پُرلطف ہوتا ہے۔ دھوپ میں تمازت بھی ہوتی ہے مگر... جسم میں پیوست ہونے والی ہوا میں ٹھنڈک اور کاٹ بھی ہوتی ہے۔ خزاں کی آمد آمد کے ساتھ جاتی بہار کے پھولوں کی رونق بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ یہ بھی ایسا ہی کھٹا میٹھا موسم تھا۔ دوپہر کے وقت ہم لوگوں نے مکئی کی روٹی پر خالص مکھن کے ڈلے رکھ کر تربتر کیے اور گرم گرم ساگ کے ساتھ خدا جانے کتنی دیر تک کھاتے رہے۔ چنن دین سے اس روز میری پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا اور سنتا بھی کیسے؟ وہ دور دراز گاؤں میں رہنے والا میرے زمیندار دوست کا ایک بے حیثیت مزارع تھا۔ اس روز بھی وہ گرم گرم مکئی کی روٹی لاکر ہمارے سامنے رکھ رہا تھا۔ کبھی ساگ کی بھاپ اڑاتی ہوئی پلیٹ لاتا۔ کبھی پانی کا جگ ہمارے سامنے میز پر سجاتا۔ ہم لوگ کھلے میدان میں نیلے آسمان کے نیچے کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور نہ جانے کب سے ساگ اور روٹی کھا رہے تھے۔ لنچ سے فارغ ہوئے تو چائے اور کافی کا دور چلا۔ چنن دین ایک حقہ تازہ کرکے لے آیا۔ جو تمبا کو نوشی بالکل نہیں کرتے تھے یا جنہوں نے کثرت سے سگریٹ نوشی کرنے کے بعد اب سگریٹ کو منہ لگانا چھوڑ دیا تھا اس دن وہ بھی حقے کے کش لگاتے اور گڑگڑ کرتے رہے۔ اس لمبے چوڑے پروگرام کے بعد سونا بھی لازمی تھا۔ کچھ غنودگی کے عالم میں تھے اور بعض حضرات کے خراٹے بلند ہو رہے تھے۔ چنن دین خاموشی سے دبے پاؤں آیا اور حقہ اٹھا کر لے گیا۔ میری آنکھ لگ گئی۔

نیند کا جھونکا رخصت ہوا تو دن ڈھل رہا تھا۔ جاڑوں کا دن ہی کتنا ہوتا ہے؟ چنانچہ ایک بار پھر کافی اور چائے کا دور چلا۔ چنن دین پھر حقہ تازہ کرکے لے آیا اور ہمارے سامنے پیش کرنے کے بعد اپنی ''شکل گم'' کر گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کھیلوں، فلموں، کتابوں، سیاست اور معاشی برائیوں سے ہوتی ہوئی گفتگو چنن دین پر پہنچ کر ختم ہوئی۔ زمیندار صاحب کہنے لگے۔ ''یہ جو چنن دین ہے نا، اس کا عجیب وغریب فلسفہ ہے۔''

''فلسفہ؟ مگر یہ تو ان پڑھ لگتا ہے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''ارے بھئی چٹا ان پڑھ ہے۔ مگر اس کا زندگی کے بارے میں انوکھا نظریہ ہے۔''

اتنی دیر میں ایک نوجوان لڑکا لسی کا ایک جگ تھامے ہوئے آیا۔ جگ اس نے ہم لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور بڑی لجاجت سے ہمارے زمیندار دوست کی طرف تکنے لگا۔ وہ مسکرائے اور بولے ''ٹھیک ہے بات کرلیں گے تیرے باپ سے'' وہ پُرامید نظروں سے ہم سب کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ''پہلے یہ تو بتاؤ کہ کافی اور چائے کے ساتھ لسی کا کیا جوڑ ہے؟ اور پھر یہ سمجھاؤ کہ یہ لڑکا کس شخص سے سفارش کرانا چاہتا ہے اور کس سلسلے میں؟ آخر یہ سسپنس کیا ہے؟''

وہ کہنے لگے ''یہ لڑکا چنن دین کا بیٹا ہے، جب کوئی مہمان شہر سے آتا ہے تو یہ میرے کان کھانے لگتا ہے کہ شاہ جی ابا سے سفارش کراؤ کہ وہ مجھے اسکول میں داخل کرادے۔'' تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد بھی بات ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی تو چنن دین کو طلب کیا گیا۔

زمیندار صاحب اس سے مخاطب ہوئے۔ ''چنن دین یہ لوگ شہر کے بڑے اثر والے بندے ہیں، میرے دوست بھی ہیں۔ تمہارے سرسوں کے ساگ کی تعریف کر رہے ہیں۔''

چنن دین ہاتھ جوڑ کر ہمارے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ''مہربانی ہے شاہ جی کی، میں تو بڑا نکما بندہ ہوں شاہ جی۔''

وہ بولے ''تم نے حقہ بھی خوب تازہ کیا تھا۔ تمباکو تمہارے کھیت کا تھا؟''

''جی شاہ جی۔''

''اچھا چنن دین، یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ لوگ پوچھ رہے ہیں کہ چنن دین کا مغز تو نہیں پھر گیا۔ آخر چکر کیا ہے؟''

''چکر کوئی نہیں شاہ جی۔''

''پھر تم اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے اسکول میں کیوں نہیں داخل کراتے؟''

چنن دین کچھ دیر خاموش، مہر بہ لب رہا۔

دیویکا رانی اور روسی شوہر

پھر بولا۔ ''پڑھ کے اسے کیا لینا ہے جی؟ یہ ان پڑھ ہی ٹھیک ہے۔''

یہ گفتگو ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ چپ چاپ کبھی شاہ جی کی طرف دیکھتے کبھی چنن دین کی طرف۔

آخر کار شاہ جی نے بات چیت کے موضوع کو ہمارے سامنے دھکیل دیا ''بھئی آپ خود ہی فیصلہ کردیں اب۔''

''کس بات کا فیصلہ؟'' ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

کہنے لگے ''یہ چنن دین جو ہے نا، یہ اپنی لڑکی کو تو اسکول میں پڑھا رہا ہے مگر بیٹے کو نہیں پڑھنے دیتا۔''

''بھئی کیا چکر ہے چنن دین؟'' میں نے استفسار کیا۔

چنن دین کہنے لگا۔ ''سر جی گل اتنی ہے کہ میں اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا۔''

''بھئی، مطلب بیان کرو کب تک پہیلیاں بجھواتے رہو گے، صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں لڑکے کو پڑھانے سے کیا تکلیف ہوتی ہے؟''

چنن دین سیدھا کھڑا ہوگیا اور فیصلہ کن انداز میں بولا ''صاحب جی ہمارے گاؤں میں جس لڑکے نے دس

جماعتیں پاس کرلیں وہ پھر ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا، کبھی لوٹ کر آیا بھی تو دو چار دن سے زیادہ گاؤں میں نہیں رکا۔ اسے گاؤں کی ہر چیز بری لگتی ہے، نہ گھر اچھے لگتے ہیں نہ کھیت نہ گلیاں، جتنی دیر گاؤں میں رہتا ہے گاؤں کی اور گاؤں والوں کی برائیاں ہی کرتا رہتا ہے۔ دو چار دن اسی طرح گزر جاتے ہیں تو وہ پھر شہر کو لوٹ جاتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی اس کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ پڑھائی لکھائی ہم لوگوں کو راس نہیں آتی صاحب جی، جسے اپنی اولاد کو ہمیشہ کے لیے کھونا ہو وہ اسے اسکول میں داخل کرا دے۔"

میں نے کہا" مگر چنن دین انسان کو ترقی تو کرنی چاہیے، پڑھ لکھ کر شہر جا کر لڑکے اچھی باتیں سیکھتے ہیں، ترقی کرتے ہیں، کام کرتے ہیں۔"

"پر صاحب جی اپنے کس کام کے۔ ماں باپ کو، گھر والوں کو اور گاؤں والوں کو اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ آپ ہی بتائیں سر جی، اگر سارے لڑکے ہی پڑھ لکھ کر شہر چلے گئے تو گاؤں کا کیا بنے گا۔ اس لیے ان کو شہر کی ہوا ہی نہیں لگانی چاہیے۔" یہ کہا اور چنن دین سامنے دھرا ہوا حقہ اٹھا کر چلا گیا۔

زمیندار دوست کہنے لگے۔ "نرا جاہل ہے پینڈو کہیں کا۔ دنیا کہاں جارہی ہے اور ہمارے دیہاتی کن سوچوں میں ہیں۔"

مگر جب میں نے ایک دن اخبار میں ظہیر عباس کی خبر پڑھی تو مجھے چنن دین پھر یاد آگیا۔ یہ خبر آپ نے بھی پڑھی ہوگی۔ اخباری نمائندے نے لندن سے اطلاع بھیجی تھی کہ مشہور و معروف پاکستانی کرکٹر ظہیر عباس نے لندن کے گرد و نواح میں ایک خوبصورت علاقے میں مکان خرید لیا ہے۔ وہ لندن ہی میں کاروبار کرنے اور آباد ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ایک اور کرکٹر محسن خان ہیں۔ یہ بہت ہونہار کرکٹ کے کھلاڑی تھے۔۔۔۔۔۔۔ دورۂ انگلستان میں انہوں نے رنز کا ڈھیر لگا دیا تھا اور خوب شہرت حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ہم تو سمجھ گئے تھے کہ یہ بھی گئے ہاتھوں سے۔ لیکن ٹیلی ویژن پر ان کا ایک انٹرویو دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ محسن خان نے فرمایا تھا کہ وہ تو کاؤنٹی میں بھی نہیں کھیلیں گے۔ ان پر ان کے ملک کا حق ہے اور وہ ہمیشہ پاکستان کے لیے کھیلیں گے اور یہیں رہا کریں گے مگر ہوا کیا؟ محسن خان نے بعد میں انگلستان ہی کو ٹھکانا بنا لیا۔ انہوں نے بھی وہاں ایک گھر خرید لیا اور اپنی بیگم کے ساتھ وہیں آباد ہونے کا پروگرام بنا لیا۔ کرکٹ کے اور بھی بہت سے کھلاڑی انگلستان میں کاروبار وغیرہ کر رہے ہیں۔ گھر بار بھی وہیں بنا چکے ہیں اور وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں یعنی جسے بھی موقع ملا اور باہر کی ہوا لگی اس نے اپنے گاؤں سے منہ موڑ لیا۔

محض کھلاڑیوں تک ہی محدود نہیں ہے ہر شعبۂ زندگی میں ایسا ہی نظارہ ہے۔ ڈاکٹروں کو دیکھ لیجیے۔ انجینئروں کو دیکھ لیجیے۔ دوسرے علوم میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے والوں کو دیکھیے، ہر ایک نے دیارِ غیر میں ٹھکانا بنا لیا ہے، جسے ابھی تک مناسب موقع نہیں ملا وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بہ امر مجبوری رہتا پاکستان میں ہے مگر خواب یورپ اور امریکا کے دیکھتا ہے اور اسی تگ و دو میں ہے کہ کسی طرح "باہر" چلا جائے۔ ان میں سے جو لوگ ابتدا میں ملازمت کے سلسلے میں باہر جاتے ہیں وہ یا تو پاکستان واپس ہی نہیں آتے اور اگر کبھی مختصر عرصے کے لیے آتے بھی ہیں تو ناک بھوں ہی چڑھاتے رہتے ہیں۔ "یہاں یہ نہیں ہوتا یہاں وہ نہیں ہوتا؟ کس قدر جاہل پس ماندہ لوگ ہیں۔ دم گھٹتا ہے، یہاں تو سڑکیں گندی لوگ خراب کوئی معقول چیز ملتی ہی نہیں۔ جدید آسائش سے ہر شخص محروم ہے۔ یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے؟"

ہماری ایک کزن کے صاحبزادے والدین کے واحد بیٹے اور تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔ ماں باپ نے اپنا پیٹ کاٹ کر اور بہنوں کی حق تلفی کر کے انہیں پڑھایا۔ ڈاکٹری میں داخلہ دلایا۔ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے تو ضد کرنے لگے کہ اسپیشلائزیشن کے لیے انگلینڈ جاؤں گا۔ ماں باپ نے قرض ادھار کیا۔ ایک بیٹی کی شادی ملتوی کر کے بیٹے کو انگلستان روانہ کر دیا۔ چار سال کا کورس ہے۔ صاحبزادے پچھلے دنوں پہلی بار چند روز کے لیے واپس آئے تھے۔ ہمارے گھر بھی ملاقات کے لیے آئے۔ گرمی کی شدت، گرد و غبار اور مچھروں مکھیوں کی بھرمار کی شکایت کرتے رہے۔ "دنیا کہاں جارہی ہے اور ہم لوگ وہیں کے وہیں ہیں؟"

میں نے کہا "ہم ابھی ترقی کے مدارج طے کر رہے ہیں۔ تم جیسے حساس لوگ علم اور تجربہ حاصل کر کے ملک میں آئیں گے تو رفتہ رفتہ اس کا حلیہ بھی بدل جائے گا۔"

منہ بنا کر بولے "انکل میں کوئی پاگل ہوں جو اس جہنم

محبوب اسٹوڈیو

میں آؤں گا۔ یہ کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے؟"

میں نے ان کے بوڑھے والدین کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش نظریں جھکائے اس طرح بیٹھے تھے جیسے ان سے کوئی بہت بڑا اور گھناؤنا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ میں نے کہا "سنا۔۔۔۔۔ آپ کے بیٹے کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

باپ نگاہیں چرا کر مسکرائے۔ ماں بولیں۔ "مرضی ہے اس کی جہاں چاہے رہے۔ بس خوش رہے۔"

اور اس کی بہنوں کو کون بیاہے گا؟ اس کے بوڑھے ماں باپ کے قرضے کون اتارے گا؟ اس کو والدین اور قوم نے بے شمار اخراجات اور بے حساب آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ ڈاکٹر بنایا تھا۔ کیا وہ اس کی خدمات سے محروم ہی رہیں گے؟ میں یہ سب باتیں سوچ کر رہ گیا۔ کہنے سے فائدہ بھی کیا ہوتا؟ مگر یہ سوچتا رہا کہ چنن دین شاید ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ان لوگوں کو تعلیم اور باہر کی ہوا نہ لگتی تو یہ بھی اپنے گاؤں میں رہتے، اپنی استطاعت اور قابلیت کے مطابق ماں باپ بہن بھائی اور گاؤں والوں کے کام تو آتے۔ اب تو یہ ان سب کے لیے صفر ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ ہونے کے برابر۔ ان کی تعلیم اور ترقی سے اس ملک اور معاشرے کو کیا فائدہ ہوا؟

ایک طرف تو باہر کی ہوا کھانے والوں کا یہ رویّہ ہے۔ دوسری طرف ہماری حکومت اور معاشرے نے شاید قسم کھالی ہے کہ کسی شعبے میں اصلاح نہیں کریں گے بلکہ ہر چیز کو خراب سے خراب تر ہی بنا کر دم لیں گے۔ باہر جانے والے یا ملک ہی میں تعلیم حاصل کر کے باشعور ہو جانے والے نوجوانوں کا بھی ایک نظریہ ہے۔ ان کی بھی ضرورتیں، احساسات اور توقعات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا انہیں ہم پورا کر رہے ہیں؟ یا اس کے لیے کوشاں بھی ہیں؟ اس رویّہ کی ایک مثال "یوم آزادی" کے سلسلے میں لاہور سے پیش کیا جانے والا ایک ڈراما "دیارِ محبت" تھا۔ موضوع یہ تھا کہ اپنا ملک ہی خلوص، محبت اور سکونِ دل کا منبع ہے۔ کہانی یہ ہے کہ ایک صاحب کی بیوی، ایک بیٹی اور ایک بیٹا دس سال سے امریکا میں آباد تھے، اب جو واپس آئے تو نوجوان بیٹے نے بہت شور مچایا۔ پہلا اعتراض تو اس نے ٹریفک کی بے ہنگم صورتِ حال پر کیا۔ دوسری شکایت اسے کسٹم کے رویّے سے تھی۔ اس بے چارے کا صرف ان ہی دو چیزوں سے واسطہ پڑا تھا۔ اب اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے ملک کا ٹریفک شرمناک حد تک دنیا کا بدترین ٹریفک ہے اور ہمارے کسٹم والوں اور دوسرے دفاتر والوں کا بھی عمومی رویّہ درست نہیں ہے۔ ان دونوں چیزوں کو درست کرنے کے لیے جذباتی نعروں یا اعلیٰ ٹیکنالوجی بھی درکار نہیں ہے۔ مگر ان کی حالت بد سے بدترین ہوتی جارہی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ مصنف نے جو دو سوال نوخیز ذہنوں کی طرف سے اٹھائے ہیں انہیں مطمئن کرنے کے لیے بھی کوئی معقول دلیل پیش کی جائے گی مگر ہوا یہ کہ امریکا سے آنے والے نوعمر لڑکے نے ٹریفک اور دفتری رویّے کی شکایت کی تو دادا ابا امریکی معاشرے کی خرابیوں کا تذکرہ اور پاکستان سے ان کا موازنہ کرنے لگے۔ اب ہمیں آزاد ہوئے 66 سال ہو چکے ہیں اب تو یہ عذر بھی فرسودہ ہو چکا ہے کہ ہم نئے نئے آزاد ہوئے ہیں، رفتہ رفتہ ترقی کرلیں گے اور پھر روزمرہ کے معاملات کی اصلاح کے لیے کس ترقی کی ضرورت ہے

اس کے لیے تو محض ارادہ اور منصوبہ کافی ہے۔

ایک طرف چنن دین کا فلسفہ ہے کہ لڑکے لکھ پڑھ کر اپنوں سے بیگانے ہو جاتے ہیں اور دیہی زندگی کو خیرباد کہہ کر بڑے شہروں یا ترقی یافتہ ملکوں کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں تو دوسری طرف نشے کی عالمی وبا نوجوانوں کی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔

پچھلے دنوں ایک امریکی ماہرِ قانون پاکستان میں منشیات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ وہ یہ دیکھنے آئے تھے کہ منشیات کی روک تھام کے لیے پاکستان میں کیا موثر قوانین بنائے گئے ہیں اور کس قسم کی سزائیں دی جارہی ہیں۔ اس سے پہلے ایک امریکی استاد بھی آئے تھے اور پاکستان میں منشیات کی بڑھتی ہوئی وبا سے بیزار ہو کر واپس گئے۔ ان کا خیال ہے کہ منشیات کی پیداوار کو روکنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس سے پہلے امریکی اور دوسرے مغربی اخبارات میں باقاعدہ طور پر یہ مہم چلائی جاچکی ہے کہ منشیات، خصوصاً ہیروئن کے کاروبار کا سرچشمہ پاکستان ہے اور اس طرح یورپ اور امریکا کے نوجوانوں کی تباہی کا ذمے دار بھی پاکستان ہے۔ جہاں تک منشیات کی تجارت اور استعمال کا تعلق ہے کوئی بھی ذی شعور آدمی اس کی مذمت کرنے میں پس وپیش سے کام نہیں لے گا۔ یہ وہ نشے ہیں جنہوں نے ہزاروں لاکھوں افراد کو بیکار عضو بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ لوگ اب معاشرے کا ناسور بنتے جارہے ہیں۔ اسی طرح منشیات کی تجارت کو بھی کوئی معقول شخص مناسب نہیں سمجھتا۔ منشیات کی روک تھام کے لیے ہمارے ملک میں بھی بہت کوششیں ہو رہی ہیں اور لوگوں کو پکڑا جارہا ہے لیکن پاکستان میں جس طرح دوسرے قوانین پر عمل کرایا جاتا ہے وہی حال منشیات کے قوانین کا بھی ہے۔ جب ٹریفک کے تمام قوانین کی موجودگی کے باوجود ہمارے شہروں پر ایک لاقانونی سرزمین کا گمان گزرتا ہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ منشیات کی روک تھام کے قوانین پر کس تندہی سے عمل کرایا جاتا ہوگا؟ جبکہ منشیات کے تاجروں کے پاس خدا کے فضل وکرم سے کروڑوں بلکہ اربوں روپے موجود ہیں اور سرکاری محکموں سے کالی بھیڑیں تلاش کرنے میں انہیں زیادہ تردد اور پریشانی نہیں ہوتی ہوگی۔ منشیات میں ملوث لوگ کبھی پکڑے بھی جاتے ہیں لیکن عموماً ٹرک ڈرائیور قسم کے لوگ ہی قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھ آتے ہیں۔ اصل لوگ پسِ پردہ ہی رہتے ہیں۔

اکثر تو یہ خبر آتی ہے کہ ایک کار یا ٹرک کو گھیر کر اتنی بھاری مقدار میں ہیروئن پکڑی گئی مگر مجرم فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ پھر کسٹم والے بھی آئے دن چھاپے مارتے رہتے ہیں اور کروڑوں اربوں روپے مالیت کی ہیروئن پر قبضہ کر لیتے ہیں مگر محض ہیروئن بڑے تاجروں تک کسٹم والوں کا ہاتھ پہنچتا ہے، نہ پولیس والوں کا۔ بہر حال اس معاملے میں شکایت بھی نہیں کرنی چاہیے کہ اب ہمارے ملک میں قانون کے نفاذ کا یہی چلن ہوگیا ہے۔ ہیروئن اور دوسری منشیات کی لعنت پاکستان کے لیے بھی اتنی تباہ کن ہے جتنی کسی اور ملک کے لیے ہوسکتی ہے اور پاکستانی قوم اور معاشرے کو بھی اس کی روک تھام کے لیے حتی الامکان موثر کارروائی کرنی چاہیے۔ مگر دوسرے کاموں کی طرح اس محاذ پر بھی ہمارے محکمے وہی کر رہے ہیں جو کافی نہیں ہے۔

یہ تو پاکستان کی حد تک ایک سرسری جائزہ ہے۔ جہاں تک امریکا اور یورپ کا تعلق ہے منشیات کی وبا پہلے وہاں پھیلی اس کے بعد پاکستان میں اس کی قدر و منزلت شروع ہوئی۔ جو امریکی حکام اور دانشور اٹھتے بیٹھتے پاکستان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان میں اس لعنت کے انسداد کے سلسلے میں ضروری اقدامات نہیں کیے جارہے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہیروئن اور دوسرے نشوں کا استعمال امریکا اور یورپ میں اس وقت بھی عام تھا جب پاکستان والے ہیروئن کے نام تک سے ناواقف تھے۔ اس وقت افیم اور چرس قسم کے نشے پاکستان میں ہوا ضرور کرتے تھے مگر یہ بہت سستے نشے تھے اور فیشن میں بھی داخل نہ تھے بلکہ عموماً افیمی اور چرسی معاشرے میں بری نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس وقت امریکا اور یورپ ہیروئن کی کشید میں مصروف تھے اور ان کی قوم کے نوجوان اس نئے تجربے کی سنسنی خیزی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اگر امریکا اور یورپ کی حکومتیں اتنی ہی محتاط اور فکر مند ہیں تو انہوں نے ابتدا ہی میں منشیات کی روک تھام کے لیے ضروری اقدامات کیوں نہیں کیے؟ اس وقت تو پاکستان اتنی بڑی تعداد میں ہیروئن وغیرہ تیار بھی نہیں کرتا تھا اور نہ برآمد کرتا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان اور دنیا بھر کے دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں منشیات کو سونے کی تجارت میں تبدیل کرنے والے خود مغربی تاجر ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے پاکستان میں چرس اور افیم وغیرہ نہایت حقیر اور بے حیثیت نشے تھے۔ چند روپے میں نشے باز

دیویکارانی

پاکستان میں تو خیر کرپشن کے الزامات اب فیشن کا درجہ پاچکے ہیں اور ان میں سو نہیں تو اسّی فیصد حقیقت ہوتی ہے مگر دوسری طرف ترقی یافتہ ملکوں میں کسٹم والے ہیروئن کی روک تھام کے لیے جو اقدامات کر رہے ہیں وہ بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق برطانیہ میں کسٹم والے جتنی ہیروئن پکڑتے ہیں اس سے 700 گنا زیادہ ملک میں درآمد ہو جاتی ہے۔ منشیات کے عادی افراد کے علاج کے لیے بہت سے ادارے قائم ہیں مگر ان کی تعداد ضرورت سے کہیں کم ہے اور سہولتیں بھی پوری نہیں ہیں۔

برطانوی انڈر سیکریٹری مسٹر ڈیوڈ میلور نے ان ہی دنوں امریکا کا دورہ کیا اور واپسی پر ایک معلومات آفریں مضمون لکھا۔ انہوں نے لکھا "ایک محاورے کے مطابق جب امریکا کو چھینک آتی ہے تو یورپ نمونیہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ معاشیات کی حد تک تو درست ہوگا لیکن جہاں تک منشیات کا تعلق ہے یوں سمجھئے کہ امریکا شدید بخار میں مبتلا ہے۔ اپنے آٹھ روزہ دورے میں مجھے امریکا کے تمام منشیات اور جرائم کے اڈوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ سرکاری محکموں اور اعلیٰ حکام سے بھی بات چیت ہوئی۔ میں جس سے بھی ملا اس نے کہا کہ منشیات اس وقت امریکا کی نمبر ایک پرابلم ہے۔ امریکا میں ہر روز دنیا کے مختلف ملکوں سے

اپنا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ مگر اس کو باقاعدہ تجارت بنانے والے امریکا اور یورپ ہی کے لوگ ہیں۔ آپ اخبار میں پڑھتے ہوں گے کہ کسٹم والوں نے اتنی بڑی مقدار میں ہیروئن پکڑی ہے جس کی قیمت بیرونی مارکیٹ میں اتنے کروڑ روپے ہے۔ یعنی پاکستان تو اس نشے کو اب بھی کوڑیوں کے مول فروخت کر رہا ہے۔ اربوں کھربوں کی آمدنی سے تجوریاں مغربی اسمگلر اور تاجر ہی بھر رہے ہیں اور پھر بھی سارا الزام غریب پاکستان کے سر ہے۔

دیکھا جائے تو اب تک ہر بری چیز مغرب سے مشرق کی طرف آتی ہے۔ پہلے چائے اور کافی آئی اور آپ کو یاد ہوگا کہ اسے مقبول بنانے کے لیے مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ جب لوگوں کو چائے کی عادت پڑ گئی تو چائے اور کافی کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا اور یہ اربوں روپے سالانہ کا کاروبار ہوگیا۔ شراب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ شراب کوئی مفید چیز تو نہیں ہے۔ کوئی معاشرہ اسے اچھا نہیں سمجھتا مگر امریکا اور یورپ نے شراب کی تجارت کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ مشرقی ملکوں کو شراب کی بوتلوں میں غرق کر دیا۔ ہمارے ملکوں کے نوجوان لڑکے لڑکیاں اور دوسرے طبقے شراب کے عادی ہوتے چلے گئے اور مغرب میں شراب کشید کرنے والی کمپنیاں اربوں کھربوں پونڈ کماتی رہیں۔ سیز ہر بھی مغرب ہی کے راستے مشرق میں پہنچا۔

کشتیوں، بحری جہازوں، ہوائی جہازوں، کاروں اور دوسرے ذرائع مواصلات کی مدد سے بے اندازہ منشیات درآمد کی جارہی ہیں۔ ریاست جارجیا کے اٹارنی جنرل نے مجھے بتایا کہ 70 فیصد جرائم میں منشیات کے تاجر اور اسمگلر ملوث ہیں۔ دوسروں کی تو چھوڑیے امریکی سوسائٹی کے اعلیٰ ترین افراد کوکین اور ہیروئن کے نشے میں مبتلا ہو چکے ہیں جو امریکیوں اور حکومت کے لیے شدید تشویشناک امر ہے۔ قریباً 40 لاکھ امریکی باقاعدگی سے کوکین استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ کوکین بھی اتنی ہی خطرناک اور مہلک چیز ہے جتنی کہ ہیروئن۔ امریکی معاشرے میں دوسرے نشوں کی طرح کوکین کو بھی مقبولیت حاصل ہے۔ دراصل کوکین اور ہیروئن جڑواں بہنیں ہیں، انتہائی مہلک اور زہرناک۔ دونوں کا عادی ہوجانے کے بعد اس عادت سے چھٹکارا پانا مشکل ہوجاتا ہے۔ امریکا میں دس بارہ سال کی عمر کے بچے بھی ان نشوں کا شکار ہوجاتے ہیں اور جو بچہ ایسا نہیں کرتا اس کو دوسرے بچے نہ صرف برا اور بزدل سمجھتے ہیں بلکہ زبردستی اسے نشہ کرادیتے ہیں۔ امریکا میں شدید انسدادی سزاؤں کے باوجود منشیات کی لعنت پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ دوسری طرف جیلوں کا یہ حال ہے کہ جارجیا میں منشیات کے جرم میں ایک قیدی کو جو 30 سال قید کی سزا بھگت رہا تھا محض 17 ماہ بعد رہا کردیا گیا۔ یہی حال دوسری ریاستوں کا بھی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اتنی دولت، ترقی یافتہ ٹیکنالوجی، انسداد کے جدید ترین سائنسی طریقوں کے باوجود امریکا اور یورپ منشیات پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں۔ بلکہ یہ لعنت مغرب میں روز افزوں ہے۔ لہٰذا کھسیانے ہوکر الزام اب وہ پاکستان پر ڈال رہے ہیں۔ سارا زور اس بات پر ہے کہ پاکستان اس ملک سے منشیات کی اسمگلنگ کو روک دے اور منشیات کی پیداوار اور کاشت پر پابندی عائد کرے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن دنوں پاکستان ہیروئن کے لیے مشہور نہ تھا اس وقت بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے منشیات امریکا اور یورپ پہنچ جاتی تھیں۔ اگر ان ملکوں کی حکومتیں قوانین، تعزیرات، سزاؤں اور معاشرتی اصلاحات کے باوجود انسداد منشیات میں ناکام ہیں تو پھر دوسرے ملکوں کو موردِ الزام ٹھہرانا کہاں تک درست ہے؟ اور پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ اب تک تو ہر وبا اور لعنت مغرب ہی سے مشرق میں آتی رہی ہے۔ شراب، تمباکو، سگریٹ، نشہ آور ادویات، مہلک اور جان لیوا دوائیں، خطرناک بیماریاں، چائے، کی لت۔ حد تو یہ ہے کہ ادویات کے نام پر مشرق کے ترقی پذیر ملکوں کو ایسی دوائیں بھیجی جاتی رہی ہیں جن کا استعمال خود مغرب میں ممنوع قرار دیا جاچکا ہے، اس کے علاوہ نئے شرم ناک فیشن، جدیدیت کے نام پر معاشرتی خرابیاں، تعلیم کے نام پر قومی قدروں سے انحراف اور بغاوت، قرضوں کے نام پر تیسری دنیا کے ملکوں کو گروی رکھنے کی ترکیبیں۔ یہ سب مغرب والے ہمیں عطیے کے طور پر دے رہے ہیں۔ اب اگر مشرق کی طرف سے انہیں محض ایک برائی ہیروئن کی شکل میں ملی ہے تو اس پر اتنا شور وغل کیوں کرنے لگے؟ وہ تو قطار در قطار اس نشے کے حصول کے منتظر رہنے لگے ہیں۔

قطار کا ذکر آتے ہی ذہن میں ایک نیا دریچہ کھل گیا۔ انتظار بھی عجیب چیز ہے مگر ہم پاکستانی انتظار کیوں نہیں کرتے؟ آیئے سنیے۔

کسی چیز کے حصول کے لیے قطار میں کھڑے ہوجانا کتنی معمولی اور آسان سی بات ہے لیکن ذرا گہرائی میں جاکر دیکھیے تو پتا چلے گا کہ یہ اتنا معمولی کام بھی نہیں ہے اور آسان تو بالکل ہی نہیں ہے۔ یہ کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ آپ اپنے اردگرد دیکھ کر لگا سکتے ہیں۔ جگہ جگہ "قطار بنایئے" کی ہدایات کے باوجود کوئی شخص قطار بنانے کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور دوسری تمام "فلاحی اور اصلاحی مہمات" کی طرح لوگوں کو قطار میں کھڑا کرنے کی مہم میں بھی ہماری انتظامیہ فیل ہوگئی ہے۔

پچھلے دنوں ایک دانشور خاتون نے اپنے کالم میں قوم کو اس مسئلے پر کافی شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ ہماری قوم کو قطار بنانے کی عادت نہیں ہے حالانکہ ساری دنیا کی مہذب اقوام قطار بندی کو اپنی عادت بلکہ فطرت ثانیہ بنا چکی ہیں۔ دراصل ترقی یافتہ قومیں محض قطار ہی بنا کر کھڑی نہیں ہوجاتیں، وہ اور بھی بہت سے ایسے سماجی، سیاسی اور انتظامی کام کرتی ہیں جن کا ہمارے ملک میں ابھی تک رواج نہیں ہوسکا ہے۔ انہوں نے بجا نکتہ آفرینی کی کہ قطار بندی بذاتِ خود کسی قوم میں نظم وضبط، رواداری اور برداشت کی قوت کی موجودگی کا اظہار کرتی ہے۔ یہ لوگوں کو مہذب، صلح پسند اور انصاف پسند بنادیتی ہے۔ آگے چل کر انہوں نے عوام کو بہت نصیحتیں کیں اور مشورے دیے۔ صرف ان پر ہی منحصر نہیں ہے ہمارے ملک کا تعلیم یافتہ دانشور طبقہ عام طور پر عوام کو غیر مہذب ہونے کا طعنہ دیتا رہتا ہے۔ قطار بندی کی عادت کا نہ ہونا بھی ان کے نزدیک قوم کی بنیادی خامیوں میں سے ایک ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو پڑھے لکھے لوگ عام لوگوں کو قطار بندی نہ کرنے کا طعنہ دیتے ہیں وہ بذاتِ خود بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہیں ہمارے ملک میں کبھی قطار بنانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی یا پھر جب بھی موقع ملے وہ خود قطار بندی کے اصول کی خلاف ورزی میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

"قطار بندی" کے فائدے اپنی جگہ بجا سہی اور ہماری قوم میں اس مہذب عادت کا نہ ہونا افسوس وندامت کی بات سہی مگر کیا کبھی کسی نے سوچنے کی زحمت بھی گوارا فرمائی ہے کہ یہ لوگ آخر قطاریں کیوں نہیں بناتے، دیکھیے صاحب! یہ بالکل سیدھا سا مسئلہ ہے۔ جو قومیں قطار بندی کی عادی ہیں انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ قطار بندی کے ذریعے وہ اپنا مطلب حاصل کرلیں گے مگر کیا ہمارے ملک میں بھی ایسا ہوتا ہے؟

جب ہم نے ہوش سنبھالا اور علم تمدن سے واقف ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہماری قوم کس قدر "ناشائستہ" ہے۔ اس کا سب سے زیادہ احساس اس وقت ہوا جب ہم فلم دیکھنے کے لیے ایک نئے سینما گھر میں گئے۔ کھڑکیوں کے سامنے دو دو تین تین قطاریں بنی ہوئی تھیں اور یہ بے چارے خدا جانے صبح سویرے کتنی دیر سے یہاں پہنچ کر ٹکٹ خریدنے کے منتظر تھے۔ گرمی، دھوپ، شدید سردی، دھواں دھار بارش بھی ان کے شوق اور عزم میں رکاوٹ نہیں بن سکی تھی۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد اچانک خبر آئی کہ بکنگ کھل گئی ہے۔ اس خبر کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے بوتل سے جن کھل گیا ہے۔ ساری قطاریں دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہوگئیں اور کھڑکیوں کے سامنے وہ دھکم پیل شروع ہوئی کہ خدا کی پناہ! کہیں سے چند پیشہ ور پہلوان قسم کے حضرات نمودار ہوئے اور انہوں نے ہجوم کے سروں پر سے گزر کر کھڑکیوں تک پہنچنے کی کوشش کی اور پہنچ بھی گئے۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر وہ کھڑکیوں سے لٹک کر کسی نہ کسی طرح ٹکٹ خریدنے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ ابھی چند ہی ٹکٹ فروخت ہوئے تھے کہ یکایک کھڑکی بند ہوگئی اور اعلان ہوا کہ ٹکٹ ختم ہوگئے۔ چنانچہ وہ سیکڑوں انسان جو گھنٹوں سے قطاروں میں کھڑے انتظار کررہے تھے انہیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ ٹکٹ یا تو پہلوانوں نے دھینگا مشتی کے ذریعے حاصل کرلیے یا پھر ان لوگوں نے بلیک مارکیٹ میں خرید لیے جو ٹکٹوں کی زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ذرا غور فرمایئے کہ جو شخص قطار میں شامل ہوکر یہ سمجھتا ہو کہ وہ اپنی باری آنے پر سینما کا ٹکٹ خریدنے میں کامیاب ہوجائے گا کیا وہ ساری زندگی اپنی اس آرزو کو پورا کرسکتا ہے؟

ہدایت کار محبوب

اس کے مقابلے میں ایک دوسرا منظر دیکھیے۔ لندن میں پکاڈلی کے علاقے میں واقع ایک پُرشکوہ سینما کے آگے حدِ نگاہ تک ٹکٹ خریدنے والوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بل کھاتی ہوئی قطاریں سینما کے سامنے سے گزر کر بازو والی گلی میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم اپنے ایک پاکستانی دوست کے ساتھ یہ فلم دیکھنے پہنچتے ہیں کیونکہ یہ ایک دانشور ہیں اور پاکستان سے پہلی بار بیرونِ ملک گئے ہیں اس لیے اتنی لمبی قطاریں دیکھ کر ان پر خفقان طاری ہوجاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بھائی واپس چلو، ہماری باری تو ساری زندگی نہیں آسکتی، ہم انہیں تسلی دیتے ہیں مگر وہ بار بار کسی "بلیکیے" کو تلاش کررہے ہیں۔ یکایک قطار میں حرکت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگتی، تقریباً دس منٹ بعد ہم بھی کھڑکی کے سامنے کھڑے ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ حالانکہ

ہم اس طویل قطار کے آخری حصے میں تھے۔ ہمارے دانشور دوست بہت حیران ہیں اور بار بار انگریزوں کی تعریف کررہے ہیں۔

"دیکھا آپ نے، کتنے آرام سے قطار میں کھڑے ہوئے تھے، ایک ہمارے ہاں کے جاہل لوگ ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر آپ یہ بھول گئے کہ ٹکٹ بھی کبھی کوبل گئے ہیں، کیا کبھی آپ نے کسی پاکستانی سنیما گھر میں بھی قطار میں کھڑے ہوکر ٹکٹ خریدنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی انتہائی کامیاب اور مقبول فلم سنیما گھر میں دکھائی جارہی ہو؟"

وہ لاجواب ہوجاتے ہیں مگر وہ صرف ایک دانشور ہیں۔ ہمارے ملک کے ہزاروں لاکھوں دانشور خاموش نہیں ہوتے جب تک وہ خود لندن جاکر یہ تماشا نہ دیکھ لیں اور انہیں بھی ایسا ہی تجربہ نہ ہوجائے، وہ بدستور اپنی قوم کو نفرین کرتے رہیں گے۔ سارا الزام جہالت اور بدتہذیبی کو دیں گے اور یہ بھی بھول جائیں گے کہ ہمارے ملک میں قطار نہ بنانے والوں میں محض ان پڑھ اور جاہل ہی شامل نہیں ہیں، تعلیم یافتہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی "قطار بندی" کا صدمہ سہنے کو تیار نہیں بلکہ اسے توہین سمجھتا ہے اور یہی لوگ بیرونِ ملک جاکر قطار میں کھڑے ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

مسئلہ بالکل واضح ہے۔ جب تک آپ قطار میں کھڑے ہونے والوں کو یہ یقین نہیں دلائیں گے کہ اپنی باری آنے پر وہ اپنا مقصود حاصل کرسکتے ہیں اس وقت تک آپ ان سے قطار میں کھڑے ہونے کی "حماقت" کی توقع کیوں کرکرسکتے ہیں؟ ایسے مناظر آپ نے بارہا دیکھے ہوں گے۔ بس اسٹاپوں پر لوگوں کا ہجوم ہے اور بس کا دور دور تک پتا نہیں ہے۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد بس آتی ہے سب لوگ اس پر پل پڑتے ہیں۔ وہ دھکم پیل ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! اندر والوں کو باہر آنے کی جگہ نہیں ملتی، باہر والے اندر جانے کی گنجائش نہیں پارہے۔ پھر بھی ان سیکڑوں "انسانوں" کو بہر حال اپنے گھر یا منزل پر جانے کی لگن ہے۔ چند منٹ کی لپاڈگی کے بعد چند مسافروں کو لے کر بس روانہ ہوجاتی ہے۔ کچھ مضبوط لوگ اس سے لٹکے ہوئے ہیں باقی سیکڑوں آدمی مایوس و مجبور کھڑے تک رہے ہیں۔ اب دوسری بس خدا جانے کب آئے گی اور ظاہر ہے کہ وہ بھی خالی نہیں ہوگی۔ یہ ہزاروں لاکھوں عورتیں، مرد، بوڑھے اور بچے جو ہر روز ہمارے شہروں کے بس اسٹاپوں پر انتظار میں عمریں گزار دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر کو آخری بس میں بھی جگہ نہیں ملتی ان سے آپ قطار میں کھڑے رہنے کی توقع کرسکتے ہیں؟

آپ کسی بینک میں چالان جمع کرانے گئے ہیں۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا بینک ہے، یہاں قطار میں کھڑے ہوئے بغیر آپ کی شنوائی ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے چنانچہ مجبوراً آپ بھی قطار میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ قطار اپنی جگہ سے حرکت نہیں کررہی، وجہ؟ چالان پر چالان بینک کے اندرونی حصوں سے کلرک کے پاس آرہے ہیں، وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ان لوگوں کی خدمت سرانجام دے رہا ہے جو قطار ہی سے نہیں آنکھوں سے بھی اوجھل ہیں۔ آپ گھنٹوں قطار میں کھڑے رہتے ہیں اور فائدے میں وہ لوگ رہتے ہیں جو قطار میں نہیں ہیں۔ اسی طرح آپ ریلوے کا یا پی آئی اے کا ٹکٹ خریدنے گئے ہیں اور غلطی سے قطار میں کھڑے ہوگئے ہیں مگر آپ کو قطار میں کھڑے ہونے کا فیض نہیں پہنچ رہا۔ فیضیاب وہ لوگ ہورہے ہیں جن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ جو گھر بیٹھے ہی دور دور سے اپنا کام کراسکتے ہیں۔ یہی رویّہ آپ معاشرے کے دوسرے شعبوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ چاہے جتنے قانون پسند شہری ہوں، ضروری نہیں ہے کہ آپ قانون شکنی کے الزام میں پکڑے نہیں جائیں۔ اس کے مقابلے میں قانون شکن لوگوں کو آپ کھلے عام دندناتے ہوئے دیکھیں گے۔ لوگ قانون کی پاسداری نہیں کرتے۔ نہ تو قانون کی پاسداری کرکے انہیں کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی قانون شکنی سے کوئی نقصان۔ ہمیں لوگوں سے یہ بھی شکایت ہے کہ "قانون کی مدد نہیں کرتے۔ لیکن جو لوگ قانون کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں کوئی انعام نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس ان کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ سڑک پر کسی شدید زخمی کو پڑا ہوا دیکھنے کے بعد اس کی مدد نہ کرنے والا دوسرے ملکوں میں موردِ الزام قرار پاتا ہے مگر ہمارے ملک میں اس کی مدد کرنے والا تھانے کچہریوں میں کھنچا پھرتا ہے اور پھر آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ ہر اچھے شہری کا فرض ہے کہ وہ خلافِ قانون اور خلافِ ضابطہ باتوں کی متعلقہ حکام سے شکایت کرے لیکن ہمارے ہاں لوگ ایسا نہیں کرتے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو زندگی بھر کا روگ نہیں لگانا چاہتے۔ غرض ہر وہ کام جو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ستائش کے قابل سمجھا جاتا ہے ہمارے ہاں اس کے برعکس

دیکھنے میں آتا ہے۔ جو لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے وہ انصاف کی تلاش میں سالہا سال عدالتوں میں حاضریاں دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

سڑک پر حادثہ ہوجاتا ہے اور مشتعل ہجوم بس کو آگ لگا دیتا ہے، واقعی کتنی ناشائستہ اور نامعقول حرکت ہے۔ لیکن جب لوگ دیکھتے ہیں کہ حادثات کی روک تھام کے لیے موثر اقدامات نہیں کیے جاتے اور بے گناہ معصوم لوگ آئے دن کیڑے مکوڑوں کی طرح بے رحم ڈرائیوروں کی بے پروائی کا نمونہ بنتے ہیں مگر انہیں کوئی سزا نہیں ملتی تو نتیجے کے طور پر وہ خود اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر قانون بے احتیاط ڈرائیور کو سزا دے تو لوگوں کو سڑکوں پر ویگنیں اور بسیں نذرِ آتش کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جب قانون حرکت میں نہیں آتا تو لوگ اسے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اندھے کی لاٹھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

آپ کسی ملازمت کے لیے درخواست دیتے ہیں، اہل بھی ہیں مگر ملازمت کسی اور کو مل جاتی ہے پھر آپ سے مہذب انداز میں اپنی باری کا انتظار کرنے کی توقع بھی کی جاتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اونچے نمبر پانے والے طلبا کو داخلہ نہیں ملتا مگر بارسوخ اور سفارشی جگہ پالیتے ہیں۔ یہ ہزاروں لاکھوں طلبا اور طالبات کب تک اپنی باری کا انتظار کریں؟ ایک طالب علم رات دن ایک کرکے پڑھتا ہے مگر نمبر ایسے طلبا کے حصے میں آجاتے ہیں جس نے تمام سال کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور پھر لطف کی بات یہ کہ اعلیٰ ملازمت بھی اسی کوڑھ مغز طالب علم کو مل جاتی ہے۔

آپ ایک جائز کام کے لیے ہفتوں مہینوں بلکہ برسوں انتظار کرتے ہیں مگر دفتری سرخ فیتہ راہ میں حائل ہے۔ دوسری طرف رشوت کا ہتھیار ہے مگر ایک تو وہ خلافِ اخلاق اور خلافِ مذہب ہے دوسرے ملک کا ہر قابلِ ذکر ذمہ دار حاکم یہ کہہ رہا ہے کہ رشوت دینے والا بھی اتنا ہی مجرم ہے جتنا کہ رشوت لینے والا۔ آپ رشوت نہیں دیتے اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ آپ کا جائز کام بھی کسی طرح پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا جبکہ دوسروں کے ناجائز کام روزانہ دھڑا دھڑ ہورہے ہیں۔ آپ اخلاق، اصول اور شرافت کی مالا کب تک جپ سکتے ہیں۔ جبکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس طرح آپ عمر بھر اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکیں گے؟ پھر آپ کو یہ طعنے ملتے ہیں کہ آپ معاشرے میں کرپشن پھیلا رہے ہیں۔ غرضیکہ مسائل کی ایک طولانی فہرست ہے جن کا حل کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے مگر الزام پھر بھی آپ ہی کے سر آتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قطار بندی کوئی کیوں کرے جبکہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ جس دن لوگوں کو قطار بندی کے نتیجے میں کچھ ملنے لگے گا وہ خود بخود قطار بنا کر کھڑے ہوجائیں گے۔

قطار بندی میں کمال میں نے انگریزوں میں دیکھا۔ بس اسٹاپ ہو یا فاسٹ فوڈ کی کوئی دکان، جہاں ایک سے دوسرا گاہک آیا، فوری طور پر ایک دونفری قطار بن جاتی ہے۔

وہاں معاشرتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بہت سی خرابیاں بھی جڑ پکڑ چکی ہیں جن کا نشانہ سیاہ فام اور تارکینِ وطن بنتے ہیں۔ ان تارکینِ وطن کی اکثریت ایشیائی ہے جن میں پاکستانی نژاد بڑی تعداد میں شامل ہیں۔

1970ء میں ایک پاکستانی فلم دوستی بنی تھی، اس کی بیشتر فلمبندی انگلستان خصوصاً لندن میں ہوئی تھی، اس فلم میں ان لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی جو روزگار کی تلاش میں لندن جاتے ہیں مگر وہاں کیا کیا تکالیف برداشت کرتے ہیں جبکہ پاکستان میں ان کے اہلِ خاندان یہی سمجھتے ہیں کہ وہ لندن میں عیش کررہے ہیں۔ اس فلم کی کہانی میں نے لکھی تھی۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا کہ انگلستان میں مقیم مختلف طبقوں اور مزاجوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو اسکرین پر پیش کیا جائے۔ ایک کردار ساقی کا بھی تھا۔ یہ ایک بے روزگار اور کاہل پاکستانی ہے اور جیب تراشی اور فراڈ کو بھی جائز خیال کرتا ہے۔ ایک منظر میں ساقی صاحب ایک دکان سے کوئی چیز اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ فلم کے سادہ لوح ہیرو اعجاز انہیں ٹوک دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ کیا کرتے ہو؟ یہ تو چوری ہے۔ جواب میں ساقی صاحب مسکراتے ہوئے فرماتے ہیں تو پھر کیا ہوا، اس قوم نے بھی تو سیکڑوں سال ہمیں لوٹا ہے!

یہ بھی ایک نقطہ نظر تھا۔ اس کی یاد تازہ کرنے کا سبب ان دنوں شائع ہونے والا ہمایوں گوہر کا انٹرویو تھا۔ میں ان سے کبھی نہیں ملا نہ کبھی ان کی تصویر دیکھی مگر الطاف گوہر صاحب کے حوالے سے انہیں جان گیا اور جب تفصیلی انٹرویو پڑھا تو مان گیا کہ الطاف گوہر کا بیٹا ہی ایسی باتیں کرنے کا ادراک، شعور اور حوصلہ کرسکتا ہے۔ مذکورہ بالا انٹرویو میں بے شمار مسائل زیرِ بحث آئے تھے جن میں سے

کچھ بین الاقوامی امور سے تعلق رکھتے تھے مگر جن کے اثرات سے ہم بھی محفوظ نہیں رہے پھر کچھ ایسے مسائل بھی تھے جو ہمارے ملکی، قومی، سیاسی، ذہنی اور نفسیاتی معاملات سے واسطہ رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے ہمایوں گوہر کے تجزیے سے مجھے اور دوسرے لوگوں کو اختلاف ہو لیکن اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد دو باتیں بالکل واضح ہیں نمبر ایک یہ کہ ہمایوں گوہر نے پہلے سے قائم شدہ مفروضوں اور تصورات کو اپنا کر ذہنی مکھی پر مکھی مارنے کا شغل اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے طور پر ان مسائل پر غور کرنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچے اور نمبر دو یہ کہ آج کے زمانے میں جبکہ دنیا کے دانشور دو مختلف طبقات میں بٹ گئے ہیں اور دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ صرف ان دو میں سے کسی ایک نظریے کو اپنائیں ورنہ جاہل، رجعت پسند، کسی اور کے آلہ کار یا احمق کہلائیں گے۔ ایسے میں ہمایوں گوہر نے نہایت صفائی اور سادگی سے اپنا ایک تجزیہ اور نظریہ پیش کرتے ہوئے کچھ نتائج اخذ کیے تھے اور نہایت خود اعتمادی سے ان پر رائے زنی کی تھی۔ ہم ان سے اختلاف کا حق بھی رکھ سکتے ہیں اور اتفاق بھی کر سکتے ہیں مگر ہوشمندی اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان نئی آوازوں پر بھی کان دھریں جو ہمارے ہاں مروج سیاسی اقتصادی اور سماجی نظریات کے سُر میں سُر ملا کر کورس گانے سے قاصر ہیں بلکہ اپنی عقل اور شعور کے مطابق تجزیہ کر کے خود... اپنے خیالات اور نظریات بھی پیش کرنے کا ادراک اور حوصلہ رکھتے ہیں اس اعتبار سے یہ انٹرویو ہم سب کو خصوصاً سیاستدانوں کو اور سب سے بڑھ کر ہمارے نوجوان طبقے کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ بہت غور سے پڑھنا چاہیے اور اس کو موضوع بحث اور غور وخوض کا مرکز آغاز بنانا چاہیے۔ اس سے اختلاف اور اتفاق کا حق اپنی جگہ مگر کیا یہ ضروری بلکہ لازمی نہیں ہے کہ ہم رائج الوقت نظریے سے ہٹ کر کسی اور نظریے پر بھی ٹھنڈے دل سے غور وخوض کریں؟

اس انٹرویو میں مختلف سوالات اٹھائے گئے تھے پہلے تو بین الاقوامی اور قومی نظام معیشت اور اقتصادی نظام کو دیکھ لیجیے جیسا کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جو عالمی اقتصادی نظام قائم کیا گیا وہ ہمارے اور آپ کے (مراد پسماندہ اقوام)... فائدے اور تعمیر کے لیے نہیں تھا اس کا مقصد بڑی طاقتوں کو اپنے مطلب اور ضروریات کے مطابق چھوٹی اقوام کو ایکسپلائیٹ کرنے کا حق عطا کرنا تھا، عالمی قرضے، عالمی بینک، عالمی منصوبے یہ سب دام ہمرنگ زمیں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ایک طرف عالمی بینک اور دوسرے نام نہاد امدادی ادارے ہیں اور دوسری طرف عالمی ترقی یافتہ بینکوں نے تجارتی بینکوں کا لبادہ اوڑھ کر اپنے سامراجی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ مقصد واحد محض اور محض لوٹ مار ہے۔ پہلے جو مغربی اقوام مختلف ملکوں پر قابض ہو کر اور انہیں نو آبادیاں بنا کر انہیں لوٹا کرتی تھیں بعد میں انہیں قرضوں، بیرونی امداد، بیرونی منصوبوں اور مشوروں کے نام پر لوٹا جانے لگا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے مغربی قوموں کو چھوڑ کر دنیا کے کون سے ممالک ہیں جو قرضوں کے انبار تلے دبے سسک نہیں رہے ہیں؟ ان میں ایسے ممالک بھی شامل ہیں جن کے وسائل لامحدود اور جن کی معاشی صلاحیتیں بے حساب ہیں مگر بھلا ہو مغربی نظام سرمایہ داری کا یہ سب آج اربوں کھربوں ڈالر کے مقروض ہیں۔ نہ صرف انہیں قرضے ادا کرنے ہوں گے بلکہ قرض دینے والوں کی ہدایات کے مطابق اپنے ملک کی معیشت اور اقتصادیات کو مرتبہ کرنا ہوگا، چاہے اس کے نتیجے میں ملکی معیشت کا تختہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والا ملک ایسا نہیں ہے جو بے اندازہ قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہانپ نہیں رہا ہے اس تمام صورت حال کا حل ہمایوں گوہر نے یہ تجویز کیا تھا کہ مقروض ممالک قرضوں کی ادائیگی سے صاف انکار کر دیں۔ اس لیے کہ نمبر 1۔ وہ ان کے عوض بہت کچھ ادا کر چکے ہیں اور خاصے نقصانات برداشت کر چکے ہیں اور نمبر 2۔ قرضہ دینے والے ممالک صدیوں سے ان ممالک کا اقتصادی استحصال کرتے آئے ہیں بلکہ انہیں لوٹتے اور اپنے گھر بھرتے رہے ہیں لہٰذا اب یہ اسی سلوک کے مستحق ہیں کہ قرض لینے والے ان کے قرضوں کی ادائیگی سے منکر ہو جائیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ مسئلے کا حل ہے؟

جواب یہ ہوسکتا ہے کہ قرضے دینے والوں کی اپنی معیشت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قرضے دیں ورنہ ان کی اپنی صنعتیں ان کے اپنے منصوبے برباد ہو جائیں گے۔ قرضہ جاری کرنا ان کی مہربانی نہیں اقتصادی ضرورت ہے مگر اب قرض لینے والے ملکوں کو ان کی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ نہیں بننا چاہیے۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ اگر کوئی سود خور فرد لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں برائے نام قرضے دے کر زندگی بھر کی مالی محکومی کا پٹا لکھوا لے تو سوسائٹی

اسے ظالم کہتی ہے مگر جب ترقی یافتہ قومیں یہی سلوک اس سے زیادہ بدترین سنگین اور گھناؤنے حالات میں ترقی پذیر اقوام کے ساتھ روا رکھیں تو ہم اسے اقتصادیات کہتے ہیں اور ان ملکوں کو غریب ملکوں کا مددگار قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جب ترقی پذیر ملکوں کی حکومتوں میں ''مالیاتی جادوگر'' محض اعداد وشمار کے ہیر پھیر اور جادو کی کرامات تک محدود نہ رہیں بلکہ اپنے اقتصادی اور معاشی نظام کو از سر نو ترتیب دیں ان کی تربیت کے لیے بیرونی ملکوں کے ماہرین کا مشورہ لینے کے بجائے اپنے حالات کو اپنے وسائل کے مطابق حل کرنے کی کوشش کریں۔

ایک دوسرا مسئلہ جو انہوں نے اس انٹرویو میں چھیڑا وہ ''جمہوریت'' کا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ہمایوں گوہر نے جمہوریت اور خصوصاً ترقی پذیر ملکوں میں جمہوریت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں بھی ان پر نہ صرف خود غور کر چکا ہوں بلکہ چند بار اس موضوع پر تھائی لینڈ اور دوسرے مشرقی ملکوں کے حوالے سے لکھ بھی چکا ہوں۔ دیکھیے جناب ایک چیز ہوتی ہے آئیڈیلزم، تصورات کی دنیا اور دوسری چیز ہے حقائق۔ اب جہاں تک ترقی پذیر دنیا کے سیاسی مسائل کا تعلق ہے تو میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہم ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے آئیڈیلزم کی ڈوریوں کا سہارا لیتے ہیں اور حقیقی مسائل کو خیالی تصورات کی بنا پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ہمایوں گوہر کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہوں کہ مغربی حاکم جب بحالتِ مجبوری اپنی نو آبادیوں کو چھوڑ کر گئے تو وہ یہاں اپنی زبان اپنا کلچر اپنا نصابِ تعلیم چھوڑ گئے بلکہ اس کے ساتھ اپنی ٹوٹی پھوٹی از کار رفتہ ٹیکنالوجی اور لنگڑی لولی صنعتیں بھی بخش گئے۔ نئے آزاد ہونے والے ملکوں کے لیے یہ نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھیں کیونکہ وہ اپنی سائنسی اور تکنیکی تعلیم کے بل بوتے پر اس قسم کی صنعتیں قائم کرنے کے اہل ہی نہ تھے، ہاں وہ کسی خراب ہونے والے پرزے کی مرمت اور تبدیلی کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتے تھے اور یہ واحد ٹیکنیکل علمی معلومات تھیں جو مغربی حکمران اپنے ورثے میں چھوڑ کر گئے تھے۔

تعلیمی نظام اور کلچرل طرز زندگی قوموں پر بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن میری دانست میں مغربی حکمرانوں نے جو سب سے بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ سیاسی میدان میں تھا۔ انگریزوں، فرانسیسیوں پرتگالیوں، ہسپانویوں کے دنیا کو فتح کرنے سے پہلے بھی دنیا بھر کے مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں میں انواع واقسام کے سیاسی اور اقتصادی نظام موجود تھے اور ہر ملک اپنی ضروریات اور محسوسات کے مطابق اپنے لیے طرز حکومت منتخب کرتا تھا مگر اقوام مغرب نے ساری دنیا کی ''برین واشنگ'' کر دی۔ کمیونزم کے زیر نگیں ملکوں سے قطع نظر جنہوں نے اپنے انداز میں ان علاقوں میں رہنے والوں کی برین واشنگ کی ہے۔ مغربی حاکم تو چلے گئے مگر وہ تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں یہ بیج بو گئے کہ جمہوریت ہی درست، مناسب بلکہ واحد مہذب اور عملی نظام ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے وہ لائقِ تعزیر ہے وہ انسانوں اور عوام کا دشمن ہے، جمہور کا غدار ہے۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ مغربی حاکموں نے اپنے زیر نگیں ملکوں میں نہایت احتیاط اور منصوبہ بندی کے ساتھ اس پالیسی پر عمل کیا کہ تعلیم عام نہ ہونے پائے۔ محدود پیمانے پر مغربی تعلیم کو عام کیا گیا مگر اس کے ساتھ ہی مقامی آبادی میں یہ تاثر سختی سے رائج کر دیا کہ مغربی طریقہ تعلیم اور نظریات کے علاوہ دیگر علوم اور نظریات انتہائی فرسودہ، بوسیدہ، پسماندہ اور انسان دشمن ہیں۔ ان پر بادشاہوں کے زمانے میں عمل کیا جاتا تھا جو عوام کے دشمن تھے اس لیے اب ''جمہوریت'' اور مغربی نظریات کے سوا دوسرے تمام طریقوں کو مسترد کر دینا نہایت ضروری ہے کیونکہ تعلیم کا اوسط بہت کم تھا بعض انگریزی پڑھے لکھے لوگ ہی تعلیم یافتہ کہلاتے تھے اور دوسری زبانوں کی تعلیم کو حکمرانوں نے لاعلمی اور جہالت قرار دے دیا تھا اس لیے انجام کار آزاد ملکوں میں زمام حکومت اور فیصلوں کی قوت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی جو سیاسی سماجی اقتصادی اور ذہنی طور پر مغربی حاکموں کے پروردہ تھے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسمی اور قانونی طور پر مغربی حکمران اپنی نو آبادیوں سے رخصت تو ہو گئے مگر اپنے پیچھے وہ اپنے کارندے اور جانشین چھوڑ گئے۔ یہ وہ ذہنی خلیفہ تھے جو اپنے پیشرو کے فلسفۂ حیات، فلسفۂ زندگی اور اقتصادی اور سیاسی نظام کے قیام ہی کو اپنے ملک اور قوم کے لیے راہِ نجات تصور کرتے تھے۔

جمہوریت ایک اچھا نظام حکومت ہے لیکن محض ایک ماحول میں اور مخصوص حالات کی موجودگی میں اسے ایک طرزِ حکومت قرار دیا جاسکتا ہے مگر آپ اس کو مغرب کی

عیاری ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ''جمہوریت'' کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا اور اس کی اتنی تشہیر کی کہ آج ''جمہوریت'' کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے خواہ وہ اس کے نتائج وعوامل سے باخبر ہو یا نہ ہو وہ اسی طریقے کو تمام مسائل کا حل خیال کرتا ہے۔ دنیا میں ہر زمانے میں مختلف نظریات اور فلسفۂ حیات کارفرما اور موجود رہے ہیں۔ ہر ایک میں خامیاں اور خوبیاں رہی ہیں مگر اسے آپ مغربی ذریعۂ ابلاغ کی کامیابی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ فی زمانہ ساری دنیا میں اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ جمہوریت ہی قوموں کے لیے راہِ نجات اور امرت دھارا کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمہوریت کی خوبیاں اپنی جگہ مگر اس میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں لیکن انہیں یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اہلِ مغرب نے جمہوریت کو اپنایا ہے مگر اس کی شکلیں تبدیل کر دی ہیں۔ امریکی جمہوریت اور قسم کی ہے اور اس میں میرے نزدیک خوبیاں کم ہیں اور برائیاں زیادہ۔ یہ وہ طرزِ جمہوریت ہے جس میں کوئی نادار اور غریب تو کیا متوسط طبقے کا انسان بھی برسراقتدار آنے کا خواب نہیں دیکھ سکتا اور پھر لطف یہ ہے جو شخص بھی اس جمہوریت میں برسراقتدار آتا ہے وہ اتنے بہت سے عوامل کے دباؤ میں ہوتا ہے کہ بعض اوقات کھلم کھلا وہ ''جمہور'' اور قوم کے مفادات کے برعکس فیصلے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ سرمایہ داروں کے اثر ورسوخ سے کبھی باہر نہیں نکل سکتا اور اس اعتبار سے مجھے امریکی جمہوری نظام ایک فن فیئر یا تماشے کی طرح نظر آتا ہے مگر ہم اہلِ مشرق کو اس پر رائے زنی کرنے اور خامیوں کی نشاندہی کرنے کا کوئی حق نہیں دیا جاتا۔ باقی رہے یورپ کے جمہوریت پسند تو وہ اپنی مصلحتوں کے تابع ہیں۔ وہ امریکی عوام کو تو یہ حق دینے کو تیار ہیں کہ وہ مناسب تبدیلیاں کر کے اپنے حالات وپسند کے مطابق ''جمہوریت'' اختیار کر لیں، خواہ اس میں عام آدمی کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہی کیوں نہ ہو مگر یہ دانشور اور جمہوریت کے مجاور کسی مشرقی ملک کو یہ حق دینے کے لیے کسی صورت تیار نہیں ہوتے کہ وہ اگر مناسب سمجھیں تو جمہوریت کو نظر انداز کر کے باہمی مشورے سے کوئی اور نظامِ حکومت اپنا لیں یا پھر اس جمہوریت میں اپنے حالات اور ضروریات کے تحت ردّوبدل کر لیں۔ یورپ کے ممالک میں آپ کو جمہوریت کی بدلی ہوئی شکلیں نظر آئیں گی۔ ان کے دساتیر بھی مختلف ہیں اور طریقۂ انتخاب بھی ایک جیسا نہیں ہے مگر کیونکہ وہ مغرب ہے اس لیے ان کے لیے سب جائز اور روا ہے لیکن اگر کوئی مشرقی ملک اپنے حالات کے مطابق جمہوریت میں ضروری ردّوبدل کرنے کا ارادہ رکھے تو وہ نکو بن جاتا ہے، دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا جاتا ہے کہ دیکھو یہ جمہوریت کا قائل نہیں ہے، اسے مطلق یہ حق نہیں دیا جاتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا مغربی جمہوریت کوئی الہامی یا آسمانی نظریہ ہے جس پر سب کا ایمان لانا اور زیرزبر کی تبدیلی کے بغیر ایمان لانا ضروری ہے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں تو ان ہی اہلِ مغرب نے ردّوبدل بھی کر لیا اور اس پر زیادہ شور بھی نہیں مچایا مگر ''جمہوریت'' میں کسی قسم کی تحریف؟ توبہ کیجیے میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مغرب کے سوداگر اور بازی گر دنیا کو بیوقوف بنانے کے لیے تشہیر اور برین واشنگ کے کیا کیا طریقے اختیار کرتے ہیں؟ جو قوم ایک مشروب کو ساری دنیا کے لیے ضرورتِ زندگی میں داخل کرا سکتی ہے۔ اسرائیل کو حق بجانب قرار دینے پر قادر ہے۔ یہودیوں کو مظلوم ثابت کر سکتی ہے وہ ''جمہوریت'' کو بھی مشروب کی طرح رائج کر سکتی ہے۔ اب ذرا دیکھیے کہ اسرائیل بھی جمہوریت ہے مگر عربوں کے لیے ڈکٹیٹر، امریکا بھی جمہوریت ہے مگر کالوں کے لیے جہنم۔ جنوبی افریقا بھی جمہوریت ہے مگر اکثریت کے حق میں قاتل مگر کیا ان تمام جمہوریتوں پر کسی ''جمہوری'' قوم نے نکتہ چینی کی ہے؟

حیرت ہے کہ جمہوریت کو خطرہ محض مشرقی ملکوں ہی میں لاحق ہوتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب مغرب کے مفادات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دنیا میں جمہوریت کتنے ممالک میں قائم ہے اور کن صورتوں میں قائم ہے اور کیا واقعی اس نے وہاں کے تمام لوگوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔

☆☆☆

پاکستان میں یہ اسی جمہوریت کا کمال ہے کہ جس وڈیرے اور جاگیردار نے جتنے زیادہ چور، ڈاکو، اچکے اور رسہ گیر پال رکھے ہوں، وہ آج کل کی مروجہ اصطلاح میں اتنا ہی مضبوط ELECTABLE کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ معاشرتی جرائم میں ان نادیدہ سرغنوں اور سرپرستوں کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کے لیے فلموں، خصوصاً پنجابی فلموں کو موردِالزام ٹھہراتے ہیں ان کے لیے بھی یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ پنجابی فلموں میں ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھانے والے مظلوم کو ہیرو کا نام دیا جاتا ہے جو معمول کے مطابق انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ان میں دوسرا موضوع باہمی دشمنیاں اور انتقام کی آگ کو بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور آئے دن اخبارات میں شائع ہونے والے روح فرسا اور سنگین واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری پنجابی فلمیں کسی حد تک ہمارے دیہاتی معاشرے کی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں جبکہ دوسری فلموں میں گل وبلبل کے رومانی قصوں اور جرم وسزا کے مغربی تصورات کے سوا دوسرے موضوعات کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں اور یہی پنجابی فلموں کے قبولِ عام ہونے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ دیہاتی معاشرے میں عام کسان کی زندگی کے شب وروز جس ناانصافی کے ماحول میں بسر ہوتے ہیں اور حصولِ انصاف سے محروم رہنے کے باوجود اس کے دل میں جو جذبات اور آتش فشاں ابلتے رہتے ہیں اس کے نتیجے میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص پروچانڈیو بن جائے۔ مگر جب کوئی پروچانڈیو بن جاتا ہے تو اس کے کارناموں میں ہر شخص اپنی دبی ہوئی خواہشوں اور سسکتی ہوئی آرزوؤں کا نظارہ کر لیتا ہے اور اس طرح مجرموں کو ان کے نزدیک ہیرو کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ ایک انتہائی خوفناک اور تشویشناک صورتِ حال ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہم ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں جس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے مگر ہم اس آگ کو بجھانے کی تدبیر تو کیا اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔

مغرب میں ''رابن ہڈ'' ایک ایسا ہی کردار تھا۔ یہ مغرب کے استحصالی معاشرے میں انصاف کا علمبردار اور غریبوں اور مظلوموں کا حمایتی تھا ''رابن ہڈ'' امیروں کی دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ غریبوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہو کر امیروں کے سامنے آہنی چٹان بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ مگر آپ نے کبھی غور کیا کہ آج کے مغربی معاشرے میں کوئی ''رابن ہڈ'' کیوں نہیں جنم لیتا اور وہ مغربی بچے جو کسی زمانے میں ''رابن ہڈ'' کی کہانیوں کو حفظِ جاں بنا کر رکھتے تھے، اب ان کے لیے ''رابن ہڈ'' ایک خیالی کردار بن کر رہ گیا ہے اور اس کردار میں بھی اب ان کے لیے کوئی خاص دلچسپی کا سامان موجود نہیں ہے۔ مغرب کا بچہ اب سائنس فکشن اور ایٹمی دور میں سانس لینے والے کرداروں کی خیالی کہانیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اب وہاں ''رابن ہڈ'' پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں۔ مغربی معاشرے میں سائنٹفک انداز میں بینک لوٹنے، فراڈ کرنے والے، لوٹ مار کرنے والے اور دوسرے جرائم کرنے والے لوگ تو موجود ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ معاشرہ اب رابن ہڈ سے محروم ہو چکا ہے اس لیے کہ سماجی ناہمواری، انصاف کا عدم حصول، قانونِ عمل کی سست رفتاری اور ''مائٹ از رائٹ'' کا اس معاشرے میں کوئی وجود باقی نہیں ہے مگر کیا ہمارے معاشرے میں بھی اس کا کوئی امکان ہے؟ خاص طور ایسی صورت میں جبکہ ہم ایک مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے دعویدار بھی ہیں؟

☆☆☆

سندھ کا مشہور ومعروف ڈاکو پروچانڈیو اپنی زندگی میں بھی خبروں کا موضوع بنا رہا۔ اب مرنے کے بعد بھی پروچانڈیو کے تذکرے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اخباری نامہ نگار اس بارے میں خصوصی جائزے شائع کرتے رہے ہیں اور اس کی زندگی پر ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے جس میں اس کے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر ہلاکت تک کے واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ پروچانڈیو ڈاکو کیوں بنا؟ اس کے اسباب قریب قریب وہی ہیں جو برصغیر میں پیدا ہونے والے تمام قابلِ ذکر اور ناقابلِ ذکر ڈاکوؤں کے ہوتے ہیں یعنی سماجی انصاف سے محرومی، جاگیرداروں اور وڈیروں کا استحصال، پولیس کی بے اعتنائی، انصاف کا عدم حصول، معاشی لوٹ کھسوٹ۔ طبقہ وارانہ نشیب وفراز اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی بے حسی۔ اس کے بعد نوبت آتی ہے عدالتی انصاف کی۔ عدالتیں انصاف کرنے کے لیے کوائف وشواہد کی محتاج ہوتی ہیں اور ابتدائی رپورٹوں اور دوسرے واقعات کی ترتیب دینے میں پولیس اور جھوٹی گواہیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مرحلے پر بھی ایک بےنوا اور بےزر آدمی کو انصاف میسر نہیں آتا۔ پھر ہمارے عدالتی طریقہ کار کی طوالت بھی ایک مرحلہ ہے۔ مقدمات اتنی طوالت اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر بشرطِ محال کسی کو انصاف حاصل ہو بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس دوران میں ملزم ایک بھیانک مجرمانہ

ماحول میں آلام ومصائب کی زندگی گزارتا ہے اور ہماری جیلوں کا ماحول ایسا ہے کہ کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد انسان یا تو تارک الدنیا ہو جاتا ہے یا عادی مجرم۔

پروچانڈیو ہو یا کوئی دوسرا ڈاکو۔ ہر ایک کی زندگی کو ان ہی مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے اور آج جو پروچانڈیو سوسائٹی میں موجود ہیں انہیں بھی بعینہٖ وہی حالات درپیش رہے ہیں۔ جو ڈاکو بن چکے، وہ تو اب واپسی کا سفر اختیار کرنے سے معذور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرے میں مستقبل کے جو پروچانڈیو جنم لے رہے ہیں یا جنم لینے والے ہیں ان کی روک تھام کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ بھارت میں بھی ڈاکوؤں کی کوئی کمی نہیں ہے، نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اگر ملک کی وسعت اور آبادی کے تناسب کو دیکھا جائے تو غالباً ہمارے ہاں ڈاکوؤں کی پرورش اور تعداد کہیں زیادہ ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد سماجی اور انتظامی نظام تو بھارت میں بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوا۔ نہ ہی سماجی ناانصافیوں اور معاشی ناہمواریوں کا ازالہ ہوسکا۔ طبقہ وارانہ منافرت بھی اس معاشرے میں ہم سے کہیں زیادہ ہے، اس کے باوجود سماجی بنیادوں پر ڈاکوؤں کو راہ راست پر لانے کے لیے وہاں کئی تحریکیں چلائی گئیں جنہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ڈاکوؤں کی عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ تائب ہونے کی صورت میں وعدہ کیا گیا کہ انہیں معمولی سزاؤں کے بعد معاشرے میں نئے سرے سے باعزت شہریوں کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح ایک محدود پیمانے پر ہی سہی مگر بھارت میں ڈاکوؤں کو ختم کرنے کی ایک شعوری اور سماجی کوشش ضرور کی گئی جبکہ ہمارے ہاں درجنوں سماجی انجمنوں اور مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے دعویداروں کی طرف سے اس اہم مسئلے کو حل کرنے کی کوئی تدبیر اور کوشش نہیں کی گئی۔

پروچانڈیو کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور اس کے بعد آئے دن منظرِ عام پر نمودار ہونے والے ڈاکوؤں کے حالاتِ زندگی پڑھیے (جو عموماً اخباری کالموں کی زینت بنتے رہتے ہیں) تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا وجوہ آپ کو ہر ڈاکو کے معاملے میں کارفرما نظر آئیں گی۔ اسباب وعلل قریب قریب وہی ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے یا ان کو خراب تر کرنے کے طریقے بھی وہی ہیں۔ چلیے ایک شہری جائز یا ناجائز شکایات کی بنا پر ڈاکو بن گیا یا بنا دیا گیا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ مرحلہ بھی اپنی جگہ انتہائی قابلِ غور اور تشویشناک ہے۔ ڈاکوؤں سے لے کر عام بدمعاشوں تک کے واقعات دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ابتدائی جرائم میں یا تو وہ پکڑا ہی نہیں گیا یا بہ آسانی ضمانت پر رہا ہوگیا۔ انتہا یہ کہ ایک قاتل بھی جیل جانے سے بچ گیا یا پھر مختصر سزا کاٹ کر دوبارہ سنگین تر جرائم کرنے کے لیے تازہ دم اور تربیت یافتہ ہو کر جیل سے باہر آگیا۔ گویا سنگین جرائم میں ہلکی اور برائے نام سزائیں اور اکثر حالات میں سزاؤں سے محفوظ رہنا بھی اس رجحان کو بڑھانے میں نمایاں ہے۔ اگر کوئی شخص قابو میں آ ہی گیا تو اس نے دو راستے اختیار کیے۔ سپاہیوں یا جیل کے حکام سے مراعات حاصل کرنے کے بعد موقع پا کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل بھاگا یا مردانہ وار جیل توڑ کر فرار ہوگیا اور اس طرح پہلے سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین جرائم کا مرتکب ہوا۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ جب تک قانون نافذ کرنے والے اداروں کو موثر بنایا جائے اور قانون وانصاف کی فراہمی کی سہولتیں ہر خاص عام کے لیے یکساں آسان اور فراواں میسر نہ کی جائیں، انتظامی طور پر اس مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں ہے اور یہ تو اس مسئلے کا سرے سے کوئی حل ہی نہیں کہ پہلے تو ڈاکو بنائے جائیں اور پھر پولیس مقابلے میں انہیں ہلاک کیا جائے اور اس سلسلے میں سیکڑوں پولیس والے بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ایسی کہانیوں میں سوفیصد آپ کو ایسے شواہد ملیں گے کہ سماجی ناانصافی اور زبردست مظالم سے تنگ آ کر ایک شخص نے جب پولیس چوکی کے دروازے کھٹکھٹائے تو اسے تحفظ کے بجائے بے حسی اور سرد مہری ہی نصیب ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے دل ودماغ میں یہ خیال راسخ ہوگیا کہ یہ معاشرہ ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ کے فلسفے پر عامل ہے اور جب تک وہ خود قانون کو ہاتھ میں نہیں لے گا اس کو انصاف نہیں مل سکے گا۔ ہر ڈاکو، بدمعاش اور مجرم کے حالاتِ زندگی میں یہ نکتہ آپ کو مشترک نظر آئے گا۔

دریں حالات اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کب تک اور کتنے ڈاکوؤں کو ماریں گے اور اس کا فائدہ کیا ہوگا جبکہ ان کی جگہ دوسرے اور اکثر حالات میں ان سے زیادہ تعداد میں ڈاکو پیدا ہو جائیں گے؟ دوسرے لفظوں میں جب تک ڈاکو ساز نرسریاں اور اسکول ختم نہ ہوں گے ڈاکوؤں کی پیدائش، نشوونما اور پرورش ختم نہ ہوسکے گی۔

جاری ہے

سزا

سید احتشام

ضمیر اگر زندہ ہو تو خلش چین لینے نہیں دیتی، اس نے ڈرائیونگ کرنے میں ایک بے احتیاطی کی تھی جس کا نتیجہ ایک خوفناک حادثہ نکلا۔ وہ اگر چاہتے تو اپنے بیٹے کو بچاسکتے تھے۔ وہ بھی خود کو بچاسکتا تھا مگر قانون کے احترام میں اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی کو داؤ پر لگادیا۔ احترامِ انسانیت ایک زندہ معاشرے کی پہچان ہے، باضمیر قوم کی شناخت ہے۔

ایک ایسا قصہ جو مہذب معاشرے کا عکس ہے

اس وحشت ناک سانحہ نے آج سے تقریباً چار ماہ قبل جنم لیا تھا لیکن اس کے بھیانک اثرات میں کمی آنے کے بجائے شدت آگئی ہے۔ ہر لمحے درد کی آگ پھیلا کر گزر جاتا ہے اور اس کی تپش ہمیں بے حال کر دیتی ہے۔ زندگی کی کشتی، وقت کے بے رحم تھپیڑوں پر کسی کھلونے کی مانند ڈولتی، ڈگمگاتی، ڈوبتی، ابھرتی نہ جانے کس سمت رواں ہے۔ کیا اس کی متلاطم لہریں کبھی پرسکون بھی ہوں گی؟ شاید نہیں۔ وہ کہنے کو تو ایک حادثہ تھا لیکن اس کے جلو میں کئی

حادثے تھے، جنہوں نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا تھا۔ آج ہمارے دل و دماغ غم سے بوجھل ہیں اور روح زخم زخم، لیکن یہ زخم خود ہم نے لگائے تھے تاکہ اس کی سوزش اور جلن ہمارے ضمیر کی تسکین کا باعث ہوسکے۔

وہ ایک سہانی رات تھی۔ ہمارے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سہانی رات کے دامن میں کچھ ایسی چنگاریاں چھپی ہوئی تھیں جو ہمارے فرض کو پھونک سکتی تھیں اور یہ کہ ہمیں اس رات کی سیاہی اپنے اشکوں سے دھونی پڑے گی۔

میں اپنے شوہر ٹام، اپنی سب سے گہری سہیلی جولی اور اس کے شوہر پیٹر کے ہمراہ سیر و تفریح سے گھر لوٹی تھی۔ ہم چاروں نہ صرف بچپن کے دوست تھے بلکہ ہماری دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ہم نے اسکول میں ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر ٹام اور پیٹر فوج میں بھی ساتھ تھے۔ ہماری شادیاں بھی ایک ہی ہفتہ میں آگے پیچھے ہوئی تھیں۔ ہماری گود بھی ایک ہی مہینے کے فرق سے ہری ہوئی تھی۔ خدا نے ہم دونوں کو لڑکا عطا کیا تھا اور ہمیں اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت میں یکساں مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں۔ یہ دونوں بچے ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے اور ان کی دوستی مثالی قرار پائی تھی۔ میرے بچے کا نام اینڈی اور جولی کے بیٹے کا نام مائنک تھا۔

اس شام دونوں دوست کہیں سیر و تفریح کے لیے گئے تھے۔ جب ہم میاں بیوی تفریح گاہ سے گھر لوٹے تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ اینڈی اب تک گھر لوٹ چکا ہوگا۔ اس روز وہ دن بھر کام کرتا رہا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ تھک گیا ہوگا لیکن میں یہ بھول گئی تھی کہ بیس سال کے نوجوان تھکا نہیں کرتے۔ ہم نے غسل کیا اور ہلکی پھلکی غذا کھا کر سونے چلے گئے۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ بستر پر دراز ہوتے ہی ہمیں گہری نیند آگئی اور ہم دنیا و مافیہا سے بےخبر ہوگئے۔ یکایک اطلاعی گھنٹی کی پرشور آواز سے ہماری آنکھ کھل گئی۔

"رات کے تین بجے کون آسکتا ہے؟" ٹام اپنی دستی گھڑی سے الجھتا ہوا، غنودہ لہجے میں بولا۔

"ممکن ہے، اینڈی اپنی چابی یہاں بھول گیا ہو۔" میں نے کروٹ بدل کر لائٹ کا سوئچ آن کردیا۔

"یہ گھر لوٹنے کا وقت ہے؟" ٹام کے لہجے میں برہمی تھی۔ "اس کے پاس فالتو چابی تو ہوگی۔ وہ کہاں رکھی ہے۔"

ہم بستر سے اتر کر ڈرائنگ روم میں پہنچے اور دروازے کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ ہماری نگاہ باہر سرخ روشنیوں پر پڑی۔ یہ ویسی ہی روشنیاں تھیں جو پولیس کار کی چھت پر ہوتی ہیں۔ "اوہ، خدایا، نہیں" میں نے گھبرا کر سوچا، کہیں اینڈی پھر شراب کے نشے میں ڈرائیو کرتے ہوئے گرفتار تو نہیں ہوگیا؟ ہم جانتے تھے کہ وہ شراب کا رسیا تھا۔ اس کی عمر بیس سال ہوچکی تھی اور وہ قانوناً شراب پینے کا حقدار ہوچکا تھا۔ ہم اسے صرف یہی مشورہ دے سکتے تھے کہ نشہ کے عالم میں کار ڈرائیو مت کیا کرو۔ اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو کسی دوست کے ہمراہ گھر آجایا کرو یا ہمیں اطلاع دے دو تاکہ ہم وہاں پہنچ کر تمہیں گھر لے آئیں۔ مگر وہ جوانی کے جوش میں سارے فیصلے خود کرنا چاہتا تھا۔ اور ہم صرف یہی امید کرسکتے تھے کہ وہ صحیح فیصلے کرے۔ اکثر میرے جی میں یہ خیال آتا کہ کاش ہماری ریاست کا قانون نوجوانوں کی شراب نوشی پر سخت پابندی عائد کردے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں شراب نوشی کی اجازت دینا، ان کی زندگی میں زہر گھولنے کے مترادف ہے۔ یہ عمر شراب نوشی کی نہیں ہوا کرتی، زندگی سنوارنے کی ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو انسان اتنا باشعور بھی نہیں ہوتا کہ اپنے بھلے برے کی تمیز کرسکے۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ ٹام نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھول دیا، باہر ایک پولیس آفیسر کھڑا تھا۔

"کیا یہ ٹام وین رائٹ کا مکان ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں ہی ٹام ہوں۔" ٹام نے جواب دیا۔ "خیریت تو ہے؟"

"مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں ایک منحوس خبر کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔" وہ خاصا نروس نظر آرہا تھا۔ اس نے گلا کھنکار کے صاف کیا۔ "میں بے حد اختصار سے کام لوں گا۔" وہ بولا۔

ٹام نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ اندر داخل ہوگیا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے سے بلا کی متانت ہویدا تھی۔

"آپ کے لڑکے کو ایک شدید حادثہ پیش آگیا ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ لوگوں کو لے کر ریورسائڈ اسپتال پہنچوں۔ ایک

نوجوان کی حالت بہت نازک ہے جبکہ دوسرا نوجوان ہلاک ہوگیا ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کون کیا ہے۔" اس نے بےچینی سے اپنے جسم کا وزن ایک پیر سے دوسرے پیر پر منتقل کیا۔

میرا سر چکرانے لگا اور جسم سے ٹھنڈا پسینا پھوٹ پڑا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں جلدی سے بیٹھ گئی۔ میرے کانوں سے ٹام کی آواز ٹکراتی رہی لیکن اس کے الفاظ پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ پھر اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا اور ہم جلدی جلدی لباس تبدیل کرکے اس پولیس آفیسر کے ساتھ اس کی کار میں اسپتال روانہ ہوگئے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور میں دل میں اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔ نہ جانے ان دونوں میں سے کون زندہ تھا اور کون ہلاک ہوا تھا۔ دوسرا نوجوان کون تھا؟ ذہن میں طرح طرح کے سوالات ناخن گاڑ رہے تھے اور دل انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔ ٹام اپنی جگہ پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔ یہ سفر مکمل خاموشی میں کٹا لیکن یہ خاموشی چیختی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اسپتال پہنچنے پر ٹام کے بازوؤں نے مجھے سہارا دیا اور ہم تیزی سے ایمرجنسی روم کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ سنسان کوریڈور عبور کرتے ہوئے ہمیں اپنا فیملی ڈاکٹر، اپنی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔

"ٹام، ایمی۔" اس نے قریب پہنچ کر مصافحہ کیا۔ "فی الحال میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ اینڈی زندہ ہے لیکن اس کی حالت انتہائی تشویش ناک ہے۔" اس نے آگاہ کیا۔

"اس کے سر میں شدید چوٹیں آئی ہیں۔ ہم اب تک ان کی شدت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے ہیں، تاہم میں نے ایک اسپیشلسٹ کو طلب کرلیا ہے۔"

"وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ ہے۔" میرے دماغ میں یہ چیخ بازگشت بن کر پھیلتی چلی گئی۔ لیکن پھر اسی لمحہ مجھے خیال آیا کہ کوئی ہلاک ہوگیا ہے۔ کون......؟ وہ کون ہے......؟ اس خیال کے رینگتے ہی میں خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"آخر ہوا کیا تھا؟" ٹام کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "ہمیں تو کچھ بھی نہیں معلوم۔" اس کا لہجہ خوف اور گھبراہٹ سے کانپ رہا تھا۔

"کیا ہم اینڈی سے مل سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔

''آؤ، بیٹھو۔'' ڈاکٹر موری نے ہمیں کرسیاں پیش کیں۔ میں نے دیکھا، کمرے کے فرش پر خون کے دھبے تھے۔ ایک اسٹریچر پر خون آلود گدوں اور چادروں کا ڈھیر تھا۔ ایک گوشے میں چمڑے کی کرسی پر اینڈی کے خون آلود کپڑے رکھے تھے۔ اچانک مجھے ابکائی سی آگئی۔ لیکن میں نے بروقت اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ نہ جانے اینڈی کس حال میں تھا۔ ''خدایا ہماری مدد کر۔'' میں نے دعا مانگی اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''پولیس کے بیان کے مطابق، جہاں تک انہیں علم ہے، اینڈی اپنے کسی دوست کے ساتھ بلیو کینڈل بار سے اس وقت اٹھا، جب بار بند ہو رہا تھا۔'' ڈاکٹر نے ہمیں آگاہ کیا۔ ''بارٹینڈر کے بیان کے مطابق، دونوں نشے میں دھت تھے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ غیر معمولی تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہے تھے کہ کار قابو سے باہر ہوگئی اور سڑک کے کنارے واقع ایک گڑھے میں لڑھک کر تقریباً آٹھ سو فٹ تک قلابازیاں کھاتی ہوئی، بالآخر ایک درخت سے جاٹکرائی۔ لیکن ان قلابازیوں کے دوران ہی یہ دونوں نوجوان کار سے باہر اچھل کر دور جا گرے تھے اور نہ جانے کتنی بار زمین سے ٹکرائے تھے۔ دوسرا نوجوان موقع پر ہی ہلاک ہوگیا کیونکہ کار قلابازیاں کھاتی ہوئی، اس پر جا الٹی تھی۔'' ڈاکٹر نے خاموش ہوکر ایک تاسف آمیز گہری سانس خارج کی۔

''ڈاکٹر، کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہلاک ہونے والا نوجوان کون ہے؟'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''نہیں، میں نہیں جانتا۔ میں اینڈی کے پاس تھا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

اسی لمحہ ایک ڈاکٹر کئی نرسوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ''میں ڈاکٹر کین ہوں، برین اسپیشلسٹ'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''ہم اینڈی کے والدین ہیں۔'' ٹام نے کہا اور ہم کھڑے ہوگئے۔

''آپ لوگ اس سے مل سکتے ہیں لیکن وہ بے ہوش ہے۔'' اس نے آگاہ کیا۔ ''ہم اس کا خصوصی معائنہ کر رہے ہیں۔ اسے فی الحال انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا ہے۔ میرے ساتھ آئیں۔'' اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میں نے قدم اٹھانا چاہا لیکن میرے پیر جیسے من من بھر کے ہوگئے تھے۔ ٹام کا چہرہ راکھ رنگ ہو رہا تھا اور اس کے عضلات تن گئے تھے۔ اس نے مجھے بازو سے تھام کر، آگے بڑھنے میں مدد دی۔ اس لمحہ کوریڈور کے ٹکڑے رونے، چیخنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز مانوس سی لگی۔

دوسرے ہی لمحے جولی اور پیٹر ہمارے سامنے تھے اور ان کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ ہلاک ہونے والا مائنک تھا۔ جولی پر نگاہ پڑتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ درد و کرب نے اس کے اور پیٹر کے چہرے کو گویا کھرچ ڈالا تھا۔ میں لپک کر اس کے سینے سے جا لگی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اچانک پیٹر نے ہمیں کھینچ کر ایک دوسرے سے الگ کردیا۔

''ہمیں تم لوگوں کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے بیٹے کی وجہ سے ہمارے مائنک کی جان گئی ورنہ وہ آج زندہ ہوتا۔'' اس نے چیختے ہوئے الزام لگایا۔ اور جولی کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور نفرت کی زیادتی سے اس کے چہرے کے خدوخال بگڑ گئے تھے۔

ڈاکٹر موری اور وہ پولیس آفیسر جو ہمیں لے کر یہاں آیا تھا۔ موقع کی نزاکت بھانپ کر ہمارے درمیان حائل ہوگئے۔ پھر وہ پولیس آفیسر ہم سے گویا ہوا۔ ''ہمیں اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ کار کون ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار بے شک مسٹر ٹام کی تھی لیکن کئی گواہوں نے مائنک کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ ڈرائیو کرے گا کیونکہ اس نے کم پی رکھی تھی۔ پھر اینڈی نے بار سے نکلتے وقت کار کی چابی اس کی طرف اچھال دی تھی۔''

ڈاکٹر نے پہلے ہمیں اور پھر جولی اور پیٹر کو دیکھا۔ ''پلیز، لڑنے جھگڑنے سے اب کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مسٹر اور مسز ٹام، میرے ساتھ آئیں۔'' وہ بولا۔

میں نے پلٹ کر جولی کو دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ مجھے اس کے شانے ہولے ہولے لرزتے ہوئے دکھائی دیے، وہ یقیناً رو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ایام حد درجہ اذیت ناک تھے۔ اینڈی بس چند لمحات کے لیے ہوش میں آتا اور پھر بے ہوش ہوجاتا۔

انشورنس کے تفتیش کار اور پولیس یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کار کون ڈرائیو کر رہا تھا؟ غلطی کس کی تھی؟ ان سوالوں کا جواب صرف اینڈی کے پاس تھا اور وہ اس قابل نہ تھا کہ ان سوالوں کا تسلی بخش جواب دیتا۔ ادھر مائنک کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں لیکن ہم یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ جنازے میں شریک ہوں یا نہ ہوں کیونکہ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ لوگ ہماری پذیرائی کریں گے بھی یا نہیں۔ ویسے بھی، وہ اینڈی کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ حالانکہ ہم تک پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق مائنک ہی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ جنازے میں شریک نہ ہوں۔ کیونکہ ممکن تھا ہماری موجودگی ان کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی چنانچہ ہم گھر پر ہی رہ کر اپنے طور پر مائنک کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے دعا کرتے رہے۔

حادثے کے ایک ہفتہ بعد اینڈی کو پوری طرح ہوش آگیا۔ اب وہ اٹھ کر بیٹھ بھی سکتا تھا۔ ٹام اور میں ہر روز اس کی عیادت کو جاتے تھے اور اب ہماری ذہنی پریشانیاں آہستہ آہستہ دور ہوتی جارہی تھیں۔ ایک روز میں جونہی اس کے کمرے میں داخل ہوئی، پختہ عمر کے ایک شخص کو وہاں سے رخصت ہوتے دیکھا۔ اس کے جسم پر سیاہ سوٹ تھا اور ہاتھ میں بریف کیس۔ میں آگے بڑھی تو اینڈی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''ارے کیا ہوا؟'' میں گھبرا گئی۔ ''کیا کوئی تکلیف ہے؟''

''میں نہیں جانتا تھا کہ مائنک ہلاک ہوگیا ہے۔ کسی نے بھی مجھے نہیں بتایا۔'' وہ سسکیاں لینے لگا۔

''ہم مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے، اینڈی!'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تاکہ تم یہ صدمہ سہہ سکو۔ تمہیں کس نے بتایا؟ کیا اس شخص نے جو ابھی یہاں سے رخصت ہوا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ انشورنس کمپنی کا تفتیش کار تھا۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میں حادثہ کے وقت کار ڈرائیو کر رہا تھا؟'' یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے دیکھا، وہ چادر کے حاشیہ کو مروڑ رہا تھا۔ اور اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ''ممی، پلیز، دروازہ بند کردیں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

میں نے ویسا ہی کیا لیکن میرا دل کسی انجانے خوف سے کانپنے لگا تھا۔ ''ممی، آپ مجھے چاہتی ہیں ناں؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔ ''آخر میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ اس بات پر تو بہت خوش ہیں ناں کہ میں حادثہ میں ہلاک نہیں ہوا، ہے ناں؟''

''ہاں، میری جان۔ میں بہت خوش ہوں۔'' میں نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم ہمارے جگر کا ٹکڑا ہو۔ ہم تمہیں بے حد چاہتے ہیں۔''

''میں نے اس تفتیش کار کو بتایا ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں، اس رات حادثہ کس طرح پیش آیا تھا۔ سب کچھ میرے حافظہ سے مٹ چکا ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ اس حادثے اور مائنک کی ہلاکت کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوسکتی ہے تو میں خوف زدہ ہوگیا کیونکہ نشے کی حالت میں ڈرائیو کرنے کے جرم میں مجھے پہلے بھی دوبار سزا ہوچکی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر میری زندگی کیا رہ جائے گی؟'' اس نے اپنی آنکھیں جھکالیں اور پھر میری جانب دیکھا۔ ''میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ کار میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ بار سے نکلنے کے بعد میں نے مائنک سے کہا تھا کہ میں بہتر محسوس کر رہا ہوں اور واقعی میں بہتر محسوس کر رہا تھا، لہٰذا کار میں ڈرائیو کروں گا۔''

مجھے یوں محسوس ہوا گویا موت کی سرد انگلیوں نے میرا سینہ پکڑ لیا ہو۔ میرا دماغ چکرانے لگا اور دم گھٹنے لگا۔ میں اسے ایک ٹک گھورتی چلی گئی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ جس کی ننھی سی تکلیف پر ہم ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے، کبھی اتنی بڑی مصیبت میں گھر جائے گا۔

''مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ہماری کار انتہائی تیز رفتاری سے اڑی جارہی تھی۔'' میری سماعت سے اس کی آواز ٹکرائی۔ ''مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں ہوا میں اڑ رہا ہوں اور پھر یکایک جیسے دنیا الٹ گئی ہو۔ آسمان زمین پر آرہا اور زمین آسمان پر چلی گئی۔ میرے کانوں سے کسی کی دردناک چیخ سنائی دی، ساتھ ہی دھات اور شیشے کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے شور اور دھماکے کی آواز سے میرے کان گویا بہرے ہوگئے۔ مجھے پیٹرول کی بو محسوس ہوئی اور میں نے خود کو سخت ناہموار زمین پر پایا۔ اس کے بعد میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔'' وہ خاموش ہوکر آنسو پونچھنے لگا۔ ''ممی خدا کے لیے کسی سے اس کا تذکرہ مت کیجیے گا۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں۔ وعدہ کریں کہ آپ کسی سے نہیں کہیں

گی۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔ "وعدہ کریں۔"
میرا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں لیکن میں نے بروقت اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن آواز نہ نکل سکی۔ حلق میں جیسے کوئی گولا پھنس گیا تھا۔
"مجھے کسی نہ کسی سے تو حقیقت بیان کرنی تھی۔" وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "ورنہ یہ جاننے کے بعد کہ میں نے مائیک کو ہلاک کر دیا ہے، میرا سینہ غم سے پھٹ جاتا۔ وہ میرا دوست ہی نہیں بھائی تھا۔ اب مجھے اس کے بغیر زندگی گزارنی ہوگی۔ میں تو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیا یہ قیامت نہیں؟ کیا یہ سزا کافی نہیں ہے؟ یہ بہت بڑی سزا ہے۔ میں مزید اس سزا کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کاش میں جیل کی سزا بھگت سکتا۔" اس کی آنکھیں میرے چہرے پر مرتکز تھیں۔ اور ان سے آنسو رواں تھے۔ وہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" میں نے بمشکل تمام تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا یہ راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔" مجھے اپنی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی۔ میں مزید کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی اسے تسلی دیتی رہی اور پھر واپس آگئی۔

☆☆☆

چند ہفتے بعد اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا لیکن وہ کلی طور پر صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے دودھ، غذا، کام اور آرام کا پورا چارٹ بنا کر دے دیا تھا اور اس پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ہمارے لیے زندگی معمول پر لوٹ آئی اور ہم نے سکھ کا گہرا سانس لیا۔ دن اور رات آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ اس طرح ایک مہینا گزر گیا۔ اس کے بعد ہم نے محسوس کرنا شروع کیا کہ حالات معمول پر نہیں آئے ہیں۔ اینڈی کے رویہ میں واضح تبدیلی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ روز بروز کم گو اور کم آمیز ہو چلا تھا۔ جب بھی گفتگو ہوتی تو خاص کر مجھ سے اس کا انداز خاصا جارحانہ ہوتا۔ میں شروع شروع میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر رہی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ میں اس کی رازدار ہوں۔ میں اب تک یہ سمجھتی آئی تھی کہ میری حد درجہ ناز برداری سے وہ خود کو قابل رحم تصور کرنے لگا ہے اور اسی احساس نے اسے چڑچڑا بنا دیا ہے چنانچہ میں اپنے ممتا کے جذبے کو لگام دینے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس پر قنوطیت طاری ہونے لگی تھی۔ اسے نہ تو نہانے کی فکر ہوتی، نہ کپڑے بدلنے کی اور نہ ہی اپنے کمرے کی صفائی کرنے کی۔ وہ ہر وقت نشہ میں چور ہوتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے سینے میں پوشیدہ کسی کرب کو شراب میں ڈبو دینا چاہتا ہے۔ وہ بالکل ناقابل برداشت ہو چلا تھا۔ میں صرف اسی کے بارے میں پریشان اور فکرمند نہیں تھی، مجھے اپنی عزیز ترین سہیلی جولی کا خیال بھی ہر دم پریشان کیے رکھتا تھا۔ میرا وجود گویا دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ اپنے بیٹے کے لیے تڑپتا تھا تو دوسرا جولی کے لیے کڑھتا تھا۔
ادھر کچھ دنوں سے ہم ایک دوسرے کی رفاقت میں تھوڑا بہت وقت گزارنے لگے تھے۔ میں جب بھی اسے دیکھتی میرا ضمیر گویا میری روح پر کوڑے برسانے لگتا۔ جوان بیٹے کی دردناک موت نے اسے کسی دھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچوڑ دیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی جولی ہے جو صرف چند ماہ پہلے تک زندگی سے بھرپور تھی۔ جس کی آنکھوں میں بجلیاں کوندتی تھیں اور لبوں پر تبسم کی کلیاں کھلی رہتی تھیں۔ اس کے بالوں میں چاندی جھلکنے لگی تھی۔ دل کا درد و کرب، پیشانی اور منہ کے گرد شکنوں کی صورت میں نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ سراپا تصویر الم بن کر رہ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور وہ ایسی اداس اور خالی خالی نظر آتی تھی گویا زندگی کی ساری امنگیں اور آرزوئیں ان آنکھوں کے ذریعہ بہہ گئی ہوں۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے اکثر کسی سرد اور تاریک آتش دان کا خیال آتا جس میں سب کچھ جل بجھا ہو لیکن راکھ کریدو تو ہاتھ جل جائے۔ رخسار کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں اور دونوں طرف مستقل سفید دھاریاں سی بن گئی تھیں جو اس امر کی غمازی کرتی تھیں کہ اشکوں کے قافلے کسی کی تلاش میں ان راہوں سے بکثرت گزرتے ہیں۔ اب گفتگو کا سارا لطف ہی غارت ہو گیا تھا۔ کہنے سننے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ غم سے نڈھال تھی اور میں خود کو مجرم تصور کرتی تھی۔ اس خیال نے مجھے حد درجہ ذہنی کوفت میں مبتلا کر رکھا تھا اور میرے سر میں ہر وقت درد رہنے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

☆☆☆

ایک روز ڈاکٹر موریس نے اینڈی کی تکلیف کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے مجھے فون کیا اور بتایا کہ اینڈی کو درد کی جو گولیاں دی گئی تھیں، وہ ساری گولیاں اس نے نصف مدت ہی میں ختم کر دی ہیں۔ اگر وہ اتنی تکلیف میں ہے تو اسے دوبارہ اسپتال میں داخل ہونا چاہیے۔

"لیکن ڈاکٹر، مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے کہ وہ اتنی گولیاں کھاتا رہا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ حد سے زیادہ پیتا بھی رہا ہے۔"
"پھر تو یہ دو آتشہ ہو گیا ہے، ایمی۔" اس نے خبردار کیا۔ "شراب اور ان گولیوں کا استعمال کسی بھی وقت اس کی جان لے سکتا ہے۔ تم اسے سختی سے تاکید کرو۔"
"بہتر ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔" میں نے بوکھلا کر کہا اور ریسیور رکھ کر کرسی پر گر گئی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنی زندگی سے کھیل رہا تھا اور آہستہ آہستہ موت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ شاید وہ اس طرح خود کو سزا دے رہا تھا۔ لیکن سزا کا یہ طریقہ غیر دانشمندانہ اور غیر فطری تھا۔ اس طرح سسک سسک کر مرنے کا کوئی عقلی یا منطقی جواز نہیں تھا۔ اس طرح نہ تو ضمیر کی خلش ہی دور ہو سکتی تھی اور نہ ہی روح پر پڑا ہوا بوجھ ہی ہلکا ہو سکتا تھا۔ میں کافی دیر تک سر پکڑے گم صم بیٹھی سوچتی رہی کہ آخر اسے کیسے سمجھاؤں، کیا کروں؟ یکا یک میں ایک فیصلے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے اس طرح مرتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ لمحات میری زندگی کے سب سے کٹھن لمحے تھے لیکن میں اپنے سینے پر پتھر رکھ کر پار اتر گئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ ممتا کی آزمائش تھی لیکن بعض اوقات ہمیں زہر کا گھونٹ بھی امرت سمجھ کر پینا پڑتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ٹام کو سب کچھ بتا دوں گی۔
وہ سہ پہر کا وقت۔ ہر سمت روشن دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ٹام کی واپسی میں چند گھنٹے باقی تھے۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ ٹام حسب معمول اپنے وقت پر گھر لوٹا اور فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔
"خیریت تو ہے۔ آج گھر میں سناٹا کچھ زیادہ ہی ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔
"ٹام مجھے تم سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔" میں نے اسے ایک کونے میں لے جا کر کہا۔ "مجھ سے ایک بھیانک غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ سمجھ کر مجھے معاف کر دو گے کہ میں ایک ماں ہوں۔"
"آخر ماجرہ کیا ہے؟" اس نے حیرت اور تشویش سے پوچھا۔
میں نے شروع سے آخر تک حادثہ کی ساری روداد اور اس کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال اس کی گوش گزار کر دی اور جب میں خاموش ہوئی تو یوں محسوس ہوا گویا دل سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کاش میں آج سے بہت پہلے ہی اسے ساری بات بتا دیتی اور وہ جو بھی مشورہ دیتا اس پر عمل کرتی۔ میری روداد سن کر وہ سناٹے میں آگیا۔ کئی لمحے اسی طرح بیت گئے۔ اس کے چہرے سے سخت کشمکش ظاہر ہو رہی تھی۔
"ایمی۔" بالآخر اس نے مہر سکوت توڑی۔ "تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ پہلے میں تمہارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔"
میں ایک لمحہ کے لیے جھجکی۔ "ٹام، میں ایک ماں ہوں۔" میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "لیکن میں نے ایک ماں بن کر فیصلہ نہیں کیا ہے۔ مجھ سے اب یہ اذیت برداشت نہیں ہوتی۔ میرا ضمیر مجھے ہر لمحہ ملامت کرتا رہتا ہے اور میں خود کو جولی اور پیٹر کی نگاہ میں اور خود اپنی نگاہ میں اپنے بیٹے کا شریک جرم تصور کرتی ہوں۔ یہ سب ناقابل برداشت ہے۔ اگر یہ صورتحال برقرار رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی یا کسی روز خودکشی کر لوں گی۔ اینڈی بے شک

ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے لیکن وہ ایک مجرم ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ قانون اپنا فرض پورا کرے۔ میں قانون کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

”بے شک“، اس نے پرزور لہجے میں میری تائید کی۔ ”اگر تم یہ فیصلہ نہ کرتیں تو میں کرتا۔ پولیس کو طلب کرلو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ کس قدر کرب ناک ہوگا لیکن اسے بہر صورت گرفتار ہونا ہے اور اپنے دوست کی موت کی سزا بھگتنی ہے۔ وہ خود بھی اس پر عمل کررہا ہے لیکن اس طرح اس کا ضمیر ہرگز مطمئن نہیں ہوسکتا۔ بعض اوقات انسان کو اپنے ضمیر کی آواز پر بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ فیصلہ میرا یا تمہارا نہیں ہمارے ضمیر کا ہے۔ مجھے اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے فرض کو آگ لگا رہے ہیں لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہ بے حد ضروری ہے۔ اگر ہم نے یہ قدم نہ اٹھایا تو نہ صرف خود کو زندگی بھر معاف نہیں کرسکیں گے بلکہ اینڈی بھی خود کو کبھی معاف نہیں کرسکے گا۔“

میں نے اس کا ایک ایک لفظ غور سے سنا اور حیرت سے سوچنے لگی کہ کیا اینڈی کو اپنے دل کی گہرائیوں میں سکون قلب حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ نظر آیا تھا لیکن میں اسے اس طرح مرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے کمرے تک گئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہورہی تھی۔ وہ بالکل مرجھایا ہوا پھول لگ رہا تھا۔ میرے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ میرا بیٹا...... میری آنکھوں کا نور...... وہ اب بھی نیند میں کسی معصوم بچے کی مانند لگ رہا تھا۔ میرا دل پھٹنے لگا، میں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور پنجوں کے بل چلتی ہوئی کچن میں آگئی۔ یہاں فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر پولیس چیف کا نمبر ملایا اور رابطہ ملنے پر اس حادثے کے حوالے سے سارا قصہ اس کے علم میں لاکر اس سے کہا کہ وہ ہمارے بیٹے کو گرفتار کرلے۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہے۔

اس کے بعد ہم نے اینڈی کو جگایا اور اپنے کمرے میں آنے کی ہدایت کی۔ وہ ہمارے کمرے میں آیا تو میں نے اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پلکوں ہی پر روکتے ہوئے کہا۔ ”میں سارا واقعہ تمہارے باپ کو بیان کرچکی ہوں اور ہم دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ تم اپنا جرم قبول کرلو۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ خود کو سزا دینے سے بہتر ہے کہ قانون کو اپنا فرض پورا کرنے کا موقع دیا جائے اور وہ جو سزا بھی تجویز کرے اسے تہ دل سے قبول کیا جائے۔ اسی صورت میں سکون قلب حاصل کیا جاسکتا ہے ورنہ اگر ضمیر مجرم ہو تو زندگی موت سے بدتر ہوجاتی ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح یہ صدمہ سہہ لیں گے لیکن کم از کم اس طرح معاشرے میں سر جھکا کر نہیں، سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوجائیں گے اور پھر ہمارا ضمیر بھی ہمیں ملامت نہیں کرے گا۔ ہم نے پولیس کو طلب کرلیا ہے اور وہ چند ہی لمحوں میں یہاں پہنچنے والی ہے۔“

اس نے میری بات سن کر سکون کی ایک گہری سانس لی اور ہم نے ایک مدت کے بعد اس کے پژمردہ ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ دیکھی۔ ”ممی آپ نے میری مشکل آسان کردی۔“ وہ گہری طمانیت سے بولا۔ ”اب میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کررہا ہوں۔ جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں اپنے دوست کا قرض اتارنا چاہتا تھا اور یہ اچھا ہوا کہ آپ نے میری رہنمائی کی ورنہ میں اپنے ضمیر کی خلش کے ساتھ نہ جانے کب تک تاریکی میں بھٹکتا رہتا۔ اور کسی نہ کسی روز اس تاریکی کی نذر ہوجاتا۔ مجھے امید ہے کہ میرے پیارے دوست کی روح اب مجھے معاف کردے گی۔“

اس کی آواز بھرا گئی اور ہماری آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہوگئے۔ لیکن پھر وہ مسکرانے لگا۔ چند ہی لمحوں کے بعد پولیس آگئی اور اسے حراست میں لے لیا گیا۔ ہم پولیس کی وین میں اینڈی کے ساتھ پولیس اسٹیشن گئے اور اینڈی نے اپنا تحریری بیان دے دیا۔

☆☆☆

اس پر مقدمہ چلا اور عدالت نے اسے ملزم قرار دے کر کئی سال کے لیے جیل بھیج دیا۔ اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی ضبط ہوگیا اور ہمیں بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ مطمئن ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ اسے یہ سزا بہت پہلے ملنی چاہیے تھی۔ ہمارا خیال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہمارے شب و روز بے حد اذیت ناک ہیں لیکن ہمارا ضمیر بالکل مطمئن ہے اور اب ہم جولی اور پیٹر سے شرمندہ نہیں ہیں۔ کیونکہ مجرم کو قانون کے تحت سزا مل گئی ہے جس کا وہ مستحق تھا اور ہمیں اخلاق و انسانیت کے تحت جو سزا ملی ہے، اس کے ہم مستحق تھے۔ ہم نے یہ سزا اپنے لیے خود تجویز کی تھی۔

شہنشاہ صحافت

شکیل صدیقی

اس کے قلم میں ایسا جادو تھا کہ حکومتیں لرزاں رہتیں۔ طنز کے تیر چلانے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ وہ شیریں پیرائے میں ایسی ایسی باتیں کرجاتا تھا کہ پڑھنے والے چونک چونک جاتے۔ یہ واحد قلمکار ہے جس کے شہ پارے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر بیک وقت دنیا کے اس کونے سے اس کونے کے اخبارات و رسائل میں لگتے۔

ایک ہر دل عزیز قلم کار کا مختصر سا تذکرہ

جہاں مزاح کا تذکرہ آئے وہاں آرٹ بکوالڈ کا نام نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سیاسی کالم نگار تھا اور اس کا کالم کہانیوں کی صورت میں امریکی اخبار ”واشنگ پوسٹ“ اور دنیا کے ساڑھے پانچ سو اخبارات میں بیک وقت شائع ہوتا تھا۔ سیاست کے پل صراط پر چلنا بے حد دشوار ہے۔ غلط پاؤں پڑ جائے تو ٹانگیں ہی نہیں کٹتیں بلکہ سر بھی کٹ جاتا ہے۔ میدان سیاست خشک، بنجر اور واقعاتی ہوتا ہے۔ اس میں قارئین کے لیے چاشنی گھولنا اور طنز و مزاح کے تیر چلانا اسی وقت ممکن ہے

جب کالم نگار کی گرفت بے حد مضبوط ہو۔ بکوالڈ واقعات و حالات کے علاوہ لفظوں سے مزاح پیدا کرتا تھا اسی لیے قارئین کو اس کے کالم کے شائع ہونے کا انتظار رہتا تھا۔ کالموں کے علاوہ اس کے مزاحیہ مقولے بھی زبانِ زدِ عام رہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے:

بھینس، جسے دیکھو بھینس کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اسے خطرناک بتاتا ہے۔ اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو امریکن بھینسوں سے اتنا نہیں مرتے جتنا حادثاتی طور پر گاڑیوں کے نیچے آنے سے مرتے ہیں۔

اس کے کالموں کے مجموعوں پر مبنی تقریباً تیس کتابیں شائع ہوئیں، اس کے علاوہ اس کی خود نوشت سوانح حیات بھی ہے۔ اس کی دو کتابیں بیسٹ سیلرز لسٹ میں بھی شامل ہیں۔ اپنی کتابوں سے اسے تین لاکھ ڈالر کی مجموعی آمدنی ہوئی۔ اس نے دو ناول اور ایک ڈراما بھی لکھا جو 1970ء میں براڈوے کے ایک تھیٹر میں پیش کیا گیا۔ دیکھنے والوں نے اسے پسندیدگی کی سند عطا کی۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ کہتے ہیں ”آرٹ بکوالڈ کا شمار امریکا کے معروف ترین کالم نگاروں میں ہوتا تھا۔ وہ کسی بھی واقعہ کے مضحکہ خیز پہلو کو دریافت کر لیتا تھا، جن تک پہنچنا کسی زیرک مزاح نگار اور طناز ہی کے لیے ممکن ہے۔

ہر چند کہ وہ قد آور نہیں تھا (اس لیے کہ اس کی قامت صرف پانچ فٹ آٹھ انچ تھی) لیکن وہ بلند قامت لوگوں کی طرح سے زندہ رہا اور اس نے کالم نویسی کی دنیا میں اپنا لوہا منوا لیا اور تقریباً پچاس برس تک کسی کو اپنے سے آگے نہ آنے دیا۔

ان پچاس برسوں میں اس نے تقریباً آٹھ ہزار کالم لکھے (اور دو لاکھ ڈالر فی سال کمائے) حکومت چاہے ریپبلکن ہو یا ڈیموکریٹکس سب اس کے قلم کے نشتروں کا نشانہ بنتے تھے۔ وہ دراصل کسی بھی حکمراں کے دورِ حکومت میں ہونے والی ناہمواریوں اور عوام کے خلاف ہونے والی ریشہ دوانیوں کو برداشت نہیں کر پاتا اور اس کے خلاف اپنا قلم بطور ہتھیار استعمال کرتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس نے سب سے زیادہ کالموں میں صدر نکسن کو اور پھر جارج ڈبلیو بش کو اپنی تحریروں کا نشانہ بنایا۔ جب صدر نکسن نے ویت نام سے امریکی فوجیوں کو واپس بلانے کے اقدامات کیے تو اس نے انہیں سراہا اور ان سے اتفاق کیا کہ امریکا ایک لاحاصل جنگ لڑ رہا ہے۔

اس کا اصل نام آرتھر بکوالڈ تھا، لیکن وہ اپنے ادبی نام ”آرٹ“ سے جانا جاتا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ اپنا کالم لکھنے کے لیے اتنے پھڑک دار آئیڈیے کہاں سے لاتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اخبارات کے تراشوں سے۔ مجھے جو بات اخبار میں دل چسپ معلوم ہوتی ہے میں اسے کاٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ یار دوست خبروں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ”ارے مسٹر بکوالڈ تم کو معلوم ہے کہ سال ختم ہونے کو آیا ہے اور ابھی کارزر حکومت نے دو لاکھ ڈالر تعلیم کے بجٹ میں سے بچا رکھے ہیں؟ میں سوچتا ہوں کہ اس خبر پر تو کھال ادھیڑ و قسم کا کالم لکھا جاسکتا ہے۔

وہ ہفتے میں تین کالم لکھتا تھا اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنا ایک کالم تقریباً 45 منٹ میں لکھ لیتا تھا۔ اگر وہ سیاسی کالم ہوتا تو اپنے دو یا تین دوستوں کو دکھا دیتا تھا تاکہ اس پر قانونی گرفت نہ کی جاسکے۔ پھر ساڑھے بارہ بجے رات کو وہ سان سوئی ریستوراں کی طرف جاتا تھا اور وہاں اپنی پسندیدہ چیزیں کھاتا اور برفیلی چائے پیتا تھا۔ وہاں وہ ہمیشہ 12 نمبر کی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ وہ وھائٹ ہاؤس سے بہت قریب ہے۔ اس لیے وہاں سیاسی شخصیات بھی بیٹھتی ہیں۔ بکوالڈ کن سوئیاں لیتا رہتا تھا اور اپنے آئندہ کالم کے لیے مواد اکٹھا کرتا رہتا تھا۔

آرٹ بکوالڈ 20 اکتوبر 1925ء کو ماؤنٹ ورنن، نیویارک میں پیدا ہوا۔ 1986ء میں اسے بہترین کالم نگاری کا پولٹزر انعام دیا گیا۔ اس کے علاوہ 1982ء میں اس کا انتخاب امریکن اکیڈمی اینڈ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرز کے نمائندے کی حیثیت سے کیا گیا۔

1988ء میں اس نے پیراماؤنٹ فلمز پر مقدمہ کر دیا۔ فلم ”کمنگ ٹو امریکا“ جس میں ایڈی مرفی ہیرو تھا کی کہانی اس کی کتاب سے لی گئی تھی اور فلمی ادارے نے اسے معاوضہ ادا کیے بغیر اور اس کا نام کہانی نویس کی حیثیت اسکرین پر دیے بغیر فلم ریلیز کر دی تھی۔ آرٹ بکوالڈ نے ادارے پر مقدمہ کر دیا اور مقدمہ جیت گیا۔ ادارے نے اسے سوا آٹھ لاکھ ڈالر بطور ہرجانہ ادا کیا۔

وہ ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا جو آسٹریا سے ہجرت کر کے امریکا آیا تھا۔ اس کا باپ جوزف بکوالڈ تھا جس کی پردوں کی دکان تھی۔ اس کے بنائے ہوئے پردے انتہائی نفیس اور دیدہ زیب ہوا کرتے تھے۔ اس کی ماں کا نام ہیلن کلینی برگر تھا جو دماغی عارضے میں مبتلا ہوگئی اور اس نے

پینتیس برس ایک اسپتال میں گزارے۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ آرٹ بکوالڈ کی تین بہنیں ایلس، ایڈتھ اور ڈورس اس سے بڑی اور وہ سب سے چھوٹا تھا۔ چونکہ اس کی ماں نے ساری زندگی اسپتال میں گزاری تھی، اس لیے بکوالڈ اس کی شفقت سے محروم ہی رہا۔ اس نے نہایت دردناک لہجے میں بتایا۔ ”بچپن میں جب بھی اپنی ماں سے ملنا چاہتا تھا، میرے ڈیڈی کہتے تھے کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ جب میں بالغ ہوا تو میری طبیعت ان سے ملنے کو خود نہ چاہی۔“

گھریلو حالات خراب ہونے پر اس کے باپ نے سب بچوں کو ایک یتیم خانے میں داخل کرا دیا تھا۔ بکوالڈ ایک کے بعد دوسرے یتیم خانے میں داخل ہوا پھر اسے کوئین بورڈنگ ہاؤس میں رکھا گیا اس لیے کہ وہ سخت بیمار تھا۔ اس کا علاج سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ میں کیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ بکوالڈ کے باپ جوزف کو مذہب پر یقین نہیں تھا، اس لیے جب وہ اپنے بچوں کو ”یسوع مسیح مجھ سے محبت کرتے ہیں“ گاتے ہوئے سنتا تھا تو انہیں وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیتا۔ سب بہنیں اور باپ گاہے گاہے ملا کرتے تھے۔ اس کے باپ نے ایک کمیونٹی سینٹر میں رہائش اختیار کر لی تھی، جہاں بچوں کے لیے گنجائش نہیں تھی۔

جب بکوالڈ صحت مند ہوگیا تو اسے فورسٹ ہلز ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ امریکا میں ابتدائی تعلیم مفت دی جاتی ہے، اس لیے بچوں کو کسی بھی اسکول میں داخل کرایا جاسکتا ہے۔ جہاں سے اس نے سترہ برس کی عمر میں راہ فرار اختیار کر لیا۔

وہ پڑھائی میں کم زور نہیں تھا۔ اس نے ایک بار کاؤبوائے پر ایک مزاحیہ نظم لکھی تھی۔ اس کی ٹیچر نے اسے پڑھ کر ناگواری کا اظہار کیا اور یہ الزام لگایا کہ اس نے نظم کو کہیں سے نقل کیا ہے۔ جب بکوالڈ اسے یقین دلانے میں کام یاب ہوگیا کہ نظم اس نے خود لکھی ہے تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے ایک خوب صورت قلم اسے انعام میں دیا۔ بکوالڈ کا کہنا ہے کہ وہ قلم کافی دنوں تک اس کے پاس رہا اور اس نے اسے اپنے استعمال میں نہیں لیا۔ بس ڈھکن کھول کر وہ دوسرے طالب علموں کو اس کا دیدار کرا دیتا تھا۔

زندگی کے آلام و مصائب کا اسے حقیقت میں اسی وقت پتا چل چکا تھا، لہٰذا فالتو اوقات میں وہ زیرِ زمین ریلوے میں اخبار فروخت کرتا، ایک گولف کے کیفے میں اس نے ملازمت کی اور کھلاڑیوں کو کافی پیش کرنا بھی سیکھ لیا، اس کے علاوہ وہ لوگوں کو پھول سپلائی کرتا تھا، جس سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس نے اعتراف کیا۔ ”میں شادی سے پیشتر کنوارا نہیں تھا، اس لیے کہ 15 برس کی عمر (1941ء) میں ایک ہوٹل کی ملازمہ نے رات کے وقت شراب پی کر ادھم مچایا اور بے تکلفی سے میرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی اور مجھ پر اس انداز سے گر گئی کہ میں کوشش کے باوجود اٹھ نہ سکا۔ صبح میں اپنے آپ سے نادم تھا اس لیے میں اپنی معصومیت اور کنوارپن گنوا بیٹھا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران اس نے امریکی بحریہ میں درخواست دی۔ وہ عمر کے لحاظ سے چھوٹا تھا، اس لیے والد کا اجازت نامہ ہونا ضروری تھا۔ وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ وقت پر آدمی گدھے کو بھی اپنا باپ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ اس نے ہمہ وقت نشے میں دھت رہنے والے ایک شخص روچیسٹر کو شراب کا ایک پوّا بطور رشوت دے کر اپنا باپ بنا لیا اور فارم پر دستخط کرا لیے۔ اس طرح اس نے اکتوبر 42ء سے اکتوبر 45ء تک بحریہ کی خدمت کی اور اس کے مشاہدات میں اضافہ ہوا۔ اس کی ڈیوٹی بحر اوقیانوس میں ایک جزیرے پر لگائی گئی تھی۔ وہ طیاروں اور توپوں کی صفائی کیا کرتا تھا۔ جب اس نے جنگ کے بعد ملازمت چھوڑی تو وہ سارجنٹ بن چکا تھا۔

یہ اٹل حقیقت ہے کہ امریکا میں کوئی شخص جاہل نہیں رہ سکتا۔ آپ زندگی کے کسی بھی شعبے میں داخل ہو جائیں اور ترقی کر کے کسی بھی مرتبے پر پہنچ جائیں۔ ضرورت پڑنے پر آپ سے تعلیمی اسناد کے بارے میں اگر سوال کیا گیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ آپ کی تعلیم ادھوری ہے تو آپ کو ہدایت دی جائے گی کہ اپنی تعلیم مکمل کریں۔ وطنِ عزیز کی طرح کوئی جاہل اور کندۂ ناتراش شخص سیاست تو دور کی بات ہے فلم اور آرٹ کے شعبے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔

امریکا میں اس کی ایک بڑی مثال فلم اسٹار ڈیمی مور ہے۔ جب وہ بڑی اداکاروں میں شمار ہونے لگی تو معلوم ہوا کہ اس نے مکمل تعلیم حاصل نہیں کی ہے، لہٰذا ڈائرکٹر نے زیرِ تکمیل فلم کو مکمل کرنے سے انکار کر دیا اور ڈیمی کو ہدایت کی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرے اس دوران فلم کی شوٹنگ نہیں کی جائے گی۔ جب وہ ڈگری لے لے گی تو شوٹنگ دوبارہ شروع کی جائے گی۔ ڈائرکٹر اس کا پابند ہوگا کہ کسی اور اداکارہ کو فلم میں بطور ہیروئن کاسٹ نہیں کرے گا اور فلم کی ہیروئن وہی رہے گی۔ ڈیمی نے اپنی تعلیم سکون و اطمینان

کے ساتھ مکمل کی اور امتحان پاس کرنے کے بعد دوبارہ صف اول کی اداکارہ بن گئی۔

آرٹ بکوالڈ کو بھی اس کا احساس تھا، اس لیے اس نے لاس اینجلس کی یونی ورسٹی آف سدرن کیلیفورنیا میں داخلہ لے لیا۔ ہر چند کہ اس کے پاس ہائی اسکول کا ڈپلوما نہیں تھا، اس کے باوجود یونی ورسٹی نے ایک چھوٹا سا امتحان لینے کے بعد اسے تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس کا منفرد انداز تحریر دیکھنے کے بعد میگزین ایڈیٹر نے اسے یونی ورسٹی کے میگزین "واہمس" میں منیجنگ ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کا تقرر کر لیا۔ یونی ورسٹی سے ایک روزنامہ "ٹروجن" بھی شائع ہوتا تھا۔ بکوالڈ نے اس روزنامے میں ایک کالم لکھنا شروع کر دیا، جسے طالب علموں کی طرف سے پسندیدگی کی سند حاصل ہو گئی۔ بکوالڈ کی خوشیاں دوچند ہو گئیں۔ اسے اپنی پیٹھ ٹھونکنے والا کوئی نہیں ملا تو اس نے اپنی پیٹھ خود ہی ٹھونک لی۔

1933ء میں اسے یونی ورسٹی نے اعزازی ڈگری سے نوازا۔ 1948ء میں اس نے پیرس کا یک طرفہ ٹکٹ لیا اور وہاں جا کر ایک میگزین "ورائٹی" میں ملازمت حاصل کر لی۔ اسے ڈاک کی ترسیل پر مامور کیا گیا تھا۔ ملازمت کے دوران اس نے فرانسیسی سیکھنے کے لیے الہلیان فرانس میں داخلہ لیا۔ وہ چاہتا تو کورس مکمل کر سکتا تھا، لیکن اس نے چھ ماہ بعد کلرک کو رشوت دی اور ایک سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کیفوں میں جاتا تھا اور امریکا سے آئے ہوئے طالب علموں میں گھل مل جایا کرتا تھا اور لڑکیوں سے فلرٹ کرتا تھا۔ ان سے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں گفتگو کرنے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پندرہ برس تک پیرس میں مقیم رہا، لیکن اس نے اتنے طویل عرصے میں بھی فرانسیسی نہیں سیکھی اور روانی سے گفتگو کرنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔

لکھنے کا سودا اس کے سر میں سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک کالم لکھا اور نیویارک ہیرالڈ ٹری بیون کے پیرس سے نکلنے والے یورپی ایڈیشن کے ایڈیٹر کی میز پر رکھ دیا۔ اس کالم کا عنوان اس نے "پیرس غروب آفتاب کے بعد" رکھا تھا۔ اس میں وہ ساری باتیں لکھیں، جو عام طور پر نہیں لکھی جاتیں۔ فحاشی، آوارگی اور بدکاری! گویا اس نے مہذب اور ترقی یافتہ پیرس کو آئینہ دکھایا تھا مگر ایڈیٹر کو اس میں کوئی "خاص بات" دکھائی نہیں دی، لہٰذا اس نے مضمون ایک طرف ڈال دیا اور جب بکوالڈ نے دوسرے دن اس سے استفسار کیا تو اس نے کورا سا جواب دیا۔

اس نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرے ایڈیٹر جیوف پرس سے رابطہ قائم کیا (اس زمانے میں اخبار کے دو ایڈیٹر ہوتے تھے۔) جیوف اس کالم کو پڑھ کر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے آرٹ بکوالڈ کو ملازمت کی پیشکش کر ڈالی، جو اس نے قبول کر لی۔ اسے روزگار ملنے کا سال 1952ء تھا۔ اس کے ذمے یہ تھا کہ وہ ہفتے میں دو کالم لکھے۔ ایک فلم پر تبصرہ اور دوسرا پیرس کی رات کی زندگی جو غروب آفتاب کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس کے کالم شائع ہوئے تو پسند کیے گئے۔ جلد ہی اس نے ایڈیٹر کی فرمائش پر دوسرا کالم لکھا جو اس نے شائع کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ بکوالڈ کو تنخواہ کے نام پر 25 ڈالر فی ہفتہ رقم مل رہی تھی جس سے وہ بہ مشکل اپنا گزارا کر رہا تھا، لیکن وہ خوش تھا کہ اس کا کالم بحر اوقیانوس کے دونوں کناروں کے واقع ممالک میں پڑھا جا رہا ہے۔ (اوقیانوس کے ایک کنارے پر یورپ اور دوسرے پر امریکا ہے۔ ٹریبون دونوں جگہوں سے بیک وقت شائع ہوتا تھا)

فلم کے مبصر کی حیثیت سے اس نے اپنے لیے جگہ بنا لی۔ جب فلم کا پہلا شو ہوتا اور اداکاروں کو پارٹی دی جاتی تو وہ بھی اس میں "اچھا" لباس پہن کر شریک ہوتا اور خوب کھاتا پیتا۔

اس کے ایک کالم پر انگشت نمائی کی گئی۔ جب کہ صدر امریکا کے سیکریٹری جم ہیگرٹی نے پریس کانفرنس بلا کر کہا کہ پریس کے لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ صدر امریکا کیا ناشتا کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہیرالڈ ٹریبون کے کالم نگار آرٹ بکوالڈ نے اپنے ایک کالم میں لکھا ہے کہ صدر صاحب سڑا ہوا ناشتا نہیں کرتے۔

آرٹ بکوالڈ نے اپنے دوسرے کالم میں لکھا کہ میں نے تو لکھا تھا کہ صدر صاحب سڑا ہوا ناشتا کرتے ہیں۔ ایک عام آدمی کو ایسا ناشتا کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ اس کالم کی اشاعت کے بعد کافی دنوں تک ہاہو مچی رہی اور بکوالڈ پر انگلی اٹھائی جاتی رہی۔ بکوالڈ دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ پھر اس نے تردید کی کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی، صدر صاحب سڑا ہوا ناشتا نہیں کرتے۔ دل چسپ بات یہ کہ خود صدر آئزن ہاور کو یہ کالم پسند آیا۔

24 اگست 1959ء میں ہفت روزہ "دنیا تم میگزین" نے اپنے ایک مضمون میں ہیرالڈ ٹریبون کے یورپی ایڈیشن کا جائزہ لیتے ہوئے انکشاف کیا کہ آرٹ بکوالڈ کے کالم پڑھے لکھے لوگوں میں پسند کیے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ نو وارد کالم نگار ہے، لیکن قلم پر اس کی گرفت بے حد مضبوط ہے۔

دوسری طرف پیرس میں اس وقت بکوالڈ نے دھوم مچا دی جب اس نے عالمی شہرت یافتہ گلوکار ایلوس پریسلے کا انٹرویو اس کے ہوٹل میں کیا۔ جہاں سے ایلوس جرمنی جانے والا اور سارجنٹ کی حیثیت سے فوج کی خدمت کرنے والا تھا۔ بذات خود بکوالڈ بھی مشرقی جرمنی گیا اور وہاں یکم مئی کی ایک پریڈ میں شامل ہوا۔ یہ دیکھنے کے لیے ترکی کے غسل خانوں میں کیا کچھ ہوتا ہے، وہ ترکی گیا، لیکن وہاں اسے ایسا کوئی غسل خانہ نہیں ملا جہاں غسل کے علاوہ بھی "کچھ" ہوتا ہو۔

معاشرتی کالم نویسی کے دوران اسے احساس ہو گیا کہ اگر وہ سیاست پر قلم آزمائی کرے گا تو زیادہ کام یاب ہوگا۔ لیکن روایتی کالم نگاری سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس نے کہانیاں بنانی شروع کر دیں۔ لوگوں نے بکوالڈ کو نہیں، اس کے انداز بیاں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کا کالم 185 اخبارات میں شائع ہونے لگا۔

مارلن منرو کا ایک زمانہ عاشق تھا اور اب یہ برملا کہا جاتا ہے کہ امریکی صدر جان ایف کینیڈی بھی چھپ چھپ کر اس کی رہائش گاہ پر جایا کرتے تھے اور اس کی بانہوں میں سکون و آشتی تلاش کرتے تھے۔ آرٹ بکوالڈ کے بارے میں بھی مشہور تھا کہ اس نے بھی مارلن منرو سے عشق لڑایا تھا اور اس سے فیضیاب ہوا۔ اس نے مارلن منرو کے کردار پر ایک ناول 1958ء میں لکھا تھا۔ یہ کام کوئی ادیب جب ہی کرتا ہے جب کسی سے بے پناہ متاثر ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے بارے میں اس کے خیالات کچھ یوں تھے "وقت اور موسم کسی مرد کا انتظار نہیں کرتے، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب عورت کسی مرد کی ہو جاتی ہے تو وقت ٹھہر جاتا ہے؟

اپنی پہلی محبت کے بعد اس نے دوسری محبت این میک گیرے سے کی اور اس سے 1952ء میں عقد بھی کر لیا۔ یہ عقد لندن میں ہوا تھا۔ شادی کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ شادی سے پیشتر انسان دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھتا ہے (حسینوں کو) اور اس کی نگاہوں کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ مگر شادی کے بعد وہ صرف سامنے دیکھتا ہے (صرف اپنی شریک حیات کی آنکھوں میں)۔

الینا سے اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بکوالڈ نے اس رشتے کو وجہ تنازعہ نہیں بنایا اور تین بچوں کو گود لیا، جوئل، کونی اور

ٹائن بی، آرنلڈ جوزف

(1889-1975)

برطانوی مورخ۔ لندن میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ 1919ء تا 1924ء لندن یونیورسٹی میں بازنطینی اور جدید یونانی زبانوں، ادبیات اور تاریخ کے پروفیسر رہے۔ 1925ء میں لندن اسکول آف اکنامکس میں بین الاقوامی تاریخ کے محقق مقرر ہوئے۔ 1943ء میں دفتر خارجہ میں محکمہ تحقیق کے ناظم بنائے گئے۔ 1957ء اور 1960ء میں پاکستان کا دورہ کیا اور تاریخی موضوعات پر لیکچرز دیے۔ ادب، تاریخ اور زبانوں میں متعدد اعزازات حاصل کیے۔ مشہور تصنیف A Study of History (10 جلدیں۔ 1934-54) ہے۔

مرسلہ: نعمان شیخ، کمال پور

مارشل ٹیٹو

(1892-1980)

سابق یوگوسلاویہ کے سیاسی لیڈر۔ بارہ سال کی عمر میں تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور کھیتوں میں مزدوری کرنے لگے۔ اس کے بعد ایک ہوٹل میں برتن دھونے کا کام مل گیا، پھر فوج میں بھرتی ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے سارجنٹ میجر کے عہدے تک پہنچے۔ انقلاب روس سے متاثر ہو کر یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اسی بنا پر 1930ء میں چھ سال کے لیے قید ہوئے۔ رہائی پر اسپین کی خانہ جنگی میں جمہوریت پسندوں کے ساتھ مل کر لڑے۔ 1941ء میں جرمنی نے یوگوسلاویہ پر قبضہ کر لیا تو ٹیٹو نے "قومی محاذ آزادی" کے نام سے ایک خفیہ سیاسی جماعت قائم کی اور چھاپے مار فوج بنا کر نازیوں کا مقابلہ کیا۔ 1945ء میں جرمنی کی شکست کے بعد یوگوسلاویہ آزاد ہوا تو ملک میں جمہوریت قائم کر دی گئی اور مارشل ٹیٹو نئی حکومت کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ 1953ء کے انتخابات میں یوگوسلاویہ کے صدر منتخب ہوئے

مرسلہ: نسرین حیات، لاہور

جنیفر۔ جس میں سے جوئل فرانس سے کونی اسپین اور جنیفر آئر لینڈ سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ چالیس برس تک ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے رہے، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ (چالیس برس بہت ہوتے ہیں۔ امریکا میں تو لوگ اس سے کم عرصے میں ایک دوسرے کی صورت سے اکتا جاتے ہیں) این کی موت سے دو برس پیشتر اچانک بکوالڈ کو احساس ہوا کہ این کسمپرسی کی حالت میں ہے، لہٰذا اس نے دوبارہ اس سے رجوع کر لیا۔ امریکا میں ایسے افراد کی تعداد کم ہے، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ کمیاب ہیں جو دوسری تیسری شادی نہیں کرتے اور محض ایک بیوی پر گزارا کرتے ہیں۔ بکوالڈ اور این ان کمیاب جوڑوں میں سے ایک تھے۔

۳ جولائی 1984ء کو واشنگٹن ڈی سی والے مکان میں این کا انتقال ہوگیا۔ موت کے وقت این کی عمر 74 برس تھی۔ اس کی موت پھیپڑوں کے سرطان سے ہوئی تھی۔ یہ مکان تین منزلہ تھا اور 1888ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بکوالڈ یہودی تھا جب کہ این کیتھولک تھی، لیکن انہوں نے ایک دوسرے کے مذہبی معاملات میں دخل نہ دیتے ہوئے ہموار اور شگفتہ زندگی گزار دی۔

واشنگٹن پوسٹ کے شمارہ 5 جولائی 1994ء میں این نے بکوالڈ سے پہلی ملاقات کا احوال کچھ یوں لکھا ہے۔:

مجھے ایک ٹائپ رائٹر کی ضرورت تھی۔ میرے ایک دوست نے اس کا انتظام کیا اور مجھے فون کیا کہ آ کر لے جاؤں۔ میں تیاری کر کے فلیٹ سے نکلنے ہی والی تھی کہ اس دوست کا دوبارہ فون آیا کہ اس کے فلیٹ میں اس کا ایک دوست کرسی پر سو رہا ہے، اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ بے ضرر سا آدمی ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔

میں اس دوست کے مکان پر ٹائپ رائٹر لینے گئی تو ایزی چیئر پر ایک اسمارٹ سا شخص نیم دراز دکھائی دیا۔ آہٹ پا کر وہ جاگ گیا اور معذرت کرنے لگا۔ میں نے کہا کہ میں نے قطعی برا نہیں مانا، اس لیے کہ میں بھی ایزی چیئر پر سو جاتی ہوں۔ اس شخص کے جسم پر معقول سا لباس تھا اور وہ ہیٹ لگائے ہوئے تھا معلوم ہوا کہ وہ واشنگٹن پوسٹ میں کچھ لکھتا ہے۔ میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ واشنگٹن پوسٹ میں تو نہ معلوم کتنے لوگ لکھتے رہتے ہیں۔ یہ کون سے تیس مار خاں ہوں گے؟

بعد میں پتا چلا کہ وہ تو کافی مشہور ہے اور اس کے نام کے چہار عالم میں ڈنکے بجتے ہیں۔ چنانچہ میں قدرے متاثر ہوگئی۔ مصنفوں سے میری پہلے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اس لیے کہ میں لٹریری ایجنٹ کے طور پر کام کرتی تھی اور کمیشن لے کر ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں شائع کرواتی تھی۔ اس کے علاوہ میں بوتیکوں میں کام کرتی تھی اور پبلسٹی سے بھی لگاؤ تھا۔ میں بچوں کے لیے تین کتابیں بھی لکھ چکی تھی اور تھوڑی سی مشہور ہو چکی تھی۔

لاشعوری اور شعوری دو چار ملاقاتیں اور ہوئیں تو وہ مجھے قابلِ قبول معلوم ہوا۔ پھر ہم ہاتھ میں ہاتھ دے کر گھومنے لگے اور ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ بکوالڈ نے مجھے اس لیے قبول کر لیا کہ میرا تعلق بھی ادب سے تھا اور اگر میں نے صحافت میں تیر نہیں مارے تھے تو ادبی ذہن بہرحال رکھتی تھی۔

یہ شادی 12 اکتوبر 1952ء کو لندن کے ویسٹ منسٹر کیتھڈرل میں ہوئی تھی اور دونوں طرف سے مشہور و معروف ہستیاں آئی تھیں۔ این کا کہنا ہے "وہ دن بہت اچھے تھے جب پسینا گلاب تھا۔ ہم یورپ میں گھومتے پھرتے تھے۔ ویسے زیادہ وقت ہم نے پیرس ہی میں گزارا۔ کئی فلیٹ تبدیل کیے۔ کسی ایک جگہ ٹک کر رہنا ہماری سرشت میں شامل ہی نہیں تھا۔ معلوم نہیں کتنے فلیٹوں کی تزئین و آرائش ہم نے کر ڈالی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بچوں کو کہاں لے جا کر ان کی پرورش کریں؟ پیرس ہی میں یا امریکا؟ بالآخر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ امریکا میں رہنا چاہیے۔ اب وہاں جان ایف کینیڈی صدر تھے اور ہم دونوں انہیں پسند کرتے تھے۔"

16 برس پیرس میں گزارنے کے بعد، 1962ء میں بکوالڈ واپس امریکا آ گیا اور اس نے ایک سنڈیکیٹ بنا کر اس کے تحت کالم نگاری شروع کر دی۔ اس کا کالم اب ساڑھے پانچ سو اخبارات کی زینت بننے لگا اور اسے پلیٹزر انعام سے نوازا گیا۔ اپنی موت سے پیشتر جب وہ پیرس گیا تو اسے گولڈ میڈل سے نوازا گیا کہ اس نے اپنے قلم سے عام لوگوں کی تفریح کا سامان کیا۔

بکوالڈ واشنگٹن ڈی سی میں اپنی بیوی این میک گرے کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ گرمیوں میں انگوروں کے باغ میں قیام کرتا تھا، جو اپنی ٹھنڈک اور نت نئی شرابوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اپنی شادی کے بارے اس کے تاثرات تھے کہ اگر زندگی کی چھوٹی چھوٹی ناہمواریوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میری شادی کامیاب تھی۔ یہ دوسری بات کہ این پر حملۂ قلب ہوا تھا اور اسے پھیپڑوں کا سرطان بھی ہوا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ وہ غصہ ہو جو اس نے میرے خلاف اپنے سینے میں دبا رکھا تھا۔

2000ء میں جب کہ بکوالڈ کی عمر 74 برس ہو چکی تھی۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا اور اسے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا، جہاں اس کا دو ماہ تک علاج ہوتا رہا۔ ۱۶ فروری 2006ء میں ایک اخبار نے خبر شائع کی کہ دورانِ خون میں رکاوٹ کے باعث اس کی دائیں ٹانگ کو گھٹنے کے نیچے سے کاٹ دیا گیا۔ اس لیے کہ رگوں میں خون کے تھکے پڑنے لگے تھے اور خون رگوں میں جم گیا تھا جس کی وجہ سے دورانِ خون رک گیا تھا اور ٹانگ بے جان ہو چکی تھی۔

26 فروری کو بکوالڈ نے ایک پریس کانفرنس کی اور ریڈیو ٹاک شو کی نمائندہ ڈائنا ریہم کو اجازت دی کہ وہ اس سے انٹرویو لے سکتی ہے۔ دورانِ انٹرویو اس نے انکشاف کیا کہ اب وہ ڈائی لیسس نہیں کرائے گا جو گردوں کے فیل ہوتے پر ڈاکٹروں نے لازمی قرار دے دی تھی۔ ڈائی لیسس میں ہر ماہ بعد مشینوں کے ذریعے سے نیا اور تازہ خون جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اسے مرنا ہی ہے تو پھر اتنے آلات اپنے سرہانے لگا کر کیوں رکھے؟ اب وہ میکڈا نلڈ کے بڑ کر پابندی سے کھا رہا ہے اور اپنی مرضی سے زندہ ہے۔

31 مارچ 2006ء میں اس نے سی این این کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں اب بھی کالم لکھ رہا ہوں۔ مگر میں نے اپنے ڈاکٹروں کو ہدایت کر دی ہے کہ اگر میں بے ہوش ہو جاؤں اور آخری سانسیں لینے لگوں تو وہ فکر مند نہ ہوں اور میرے جسم میں آلات گھسیڑنے کی کوشش نہ کریں اور مجھے سہولت سے مر جانے دیں۔ اس نے اپنے ایک خواب کا تذکرہ بھی کیا کہ ایک طیارہ آنے والا ہے اور وہ اس میں سوار ہو کر دوسری دنیا میں چلا جائے گا اس لیے کہ ڈاکٹر بھی میری طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور انہوں نے پیش گوئی بھی کر دی ہے۔

اس نے بتایا کہ اس کے گردے ٹھیک کام کر رہے ہیں اور وہ عنقریب مصنوعی ٹانگ لگوا لے گا اور مارتھا کے انگوروں کے باغ میں چلا جائے گا۔

جولائی 2006ء میں وہ انگوروں کے باغ میں چلا گیا جہاں اس نے اپنی خود نوشت لکھی۔ اس کی بیماری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور یہ بھی کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ دو تین ہفتے مزید زندہ رہے گا۔ یہ اطلاع پا کر رفقائے کار اس کے گھر پر آنے لگے۔ لکھنے والے، ٹیلی وژن اور فلم والے، سیاست سے تعلق رکھنے والے (حالانکہ ان لوگوں کو بکوالڈ نے بہت چٹکیاں کاٹی تھیں)۔ اس دوران میں اس کے جو چاہنے والے بیرونِ ملک رہتے تھے، انہوں نے خطوط لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اسے دو ہزار خطوط ارسال کیے گئے۔

17 جنوری 2007ء میں جب کہ اس کی عمر اکیاسی برس تھی، اس کا انتقال اپنے بیٹے کے گھر واشنگٹن ڈی سی پر ہوگیا۔ نیویارک ٹائمز نے ایک ویڈیو میں اس کو کہتے سنایا "آہم! میں آرٹ بکوالڈ ہوں اور ابھی ابھی اس دارِ فانی سے کوچ کر چکا ہوں۔" بہرحال اس نے ڈاکٹروں کو شکست فاش دی اور مزید پانچ ماہ تک زندہ رہا اور قہقہوں کی پھلجڑیاں بکھیرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ مرنا آسان ہے اس کی نسبت کہ اسپتال میں رہا جائے۔ چنانچہ میں مرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

ڈاکٹروں نے اس کی موت کا سبب گردوں کا فیل ہو جانا بتایا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اسے این کے پہلو میں دفن کیا جائے۔

آرٹ بکوالڈ کا خیال تھا کہ اگر چارلی چیپلن نے اسکرین پر لوگوں کو ہنسایا ہے تو میں نے اپنے کالموں سے یہی کام لیا ہے۔ چنانچہ میں چارلی چیپلن ثانی ہوں۔ مجھے اپنے کام کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے لہٰذا آپ نے دیکھا ہوگا کہ لکھنے کے مشغلے کے سوا میں نے کوئی اور مشغلہ نہیں پالا۔ البتہ سگار میری کمزوری ہے اور یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں شطرنج اور ٹینس کھیلتا ہوں۔ میرے مشغلوں میں اپنی بیٹی کی تعلیم کی طرف سے فکر مند ہونا بھی شامل ہے۔ میں اس بات پر پریشان رہتا ہوں کہ اس کا گریڈ اتنا کم کیوں آتا ہے؟ وہ تعلیم میں پیچھے کیوں رہتی ہے؟ اس تشویش پر میرا بلڈ پریشر بھی بڑھ جاتا ہے۔ بلڈ پریشر اس بات پر بھی بڑھتا ہے کہ آئندہ کالم کے لیے عنوان کہاں سے لاؤں؟ دراصل موجودہ صدر جمی کارٹر نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ اس کی ذات میں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے کہ میں اس پر کالم لکھوں۔

بکوالڈ کے ایک قدیم دوست ویلس نے جو سی بی ایس ٹیلی وژن کا نمائندہ بھی ہے، ایک بار کہا تھا کہ بکوالڈ لوگوں کو ہنسانا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کا کالم پڑھ کر غور و خوض کریں۔ محض ہنسی ٹھٹھا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ مشفق، مہربان اور نجیب الطرفین تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں دوسرا آرٹ بکوالڈ شاید ہی مل سکے۔

متلاشیانِ علم کی مدارات

محمد ایاز راہی

دورتن

اکبر بادشاہ کے دربار میں نورتن تھے۔ ان کے بارے میں آپ بھی بخوبی جانتے ہوں گے۔ اس بار خصوصی طور پر دو ایسے رتنوں کا تذکرہ پیش ہے جن پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا۔ علم میں اضافے کے لیے اس جامع مگر مختصر مضمون کو شاملِ اشاعت کیا ہے۔

لفظ 'نورتن' کا تفصیلی تعارف و معنی اور اس موضوع پر چار مضامین سرگزشت کے قارئین ملاحظہ کر چکے ہیں جن کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے 1۔نورتن (فروری 2006ء) 2۔شگفتلا (اگست 2009ء) 3۔دورتن (مئی 2010ء) اور 4۔سات رتن (اگست 2010ء) نورتن سے متعلق مزید دو نکات نذرِ قارئین ہیں۔

1۔معروف افسانہ نگار آن جہانی اوپندر ناتھ اشک کے افسانوی مجموعے کا نام بھی "نورتن" ہے جس میں ان کے نو افسانے شامل ہیں۔ اوپندر ناتھ اشک افسانہ نگاری کے امام سعادت حسن منٹو مرحوم کے ہم عصر بلکہ ہم جلیس تھے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے دونوں ادیب ریڈیو دلی میں ملازم تھے۔ شعبہ تھا تمثیل نگاری، مضمون نگاری، تقاریر لکھنا۔ اس وقت پطرس بخاری مرحوم ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ شومیٔ قسمت کہ اوپندر ناتھ اشک، منٹو کے معاملے میں شدید حسد و رقابت کا شکار تھے۔ انہوں نے منٹو کی بھرپور مخالفت کی۔ ہر طرح سے انہیں تنگ کیا، بالآخر منٹو کو دلی چھوڑنے پہ مجبور کر دیا۔ اس بات کا اعتراف آن جہانی اوپندر ناتھ اشک نے آخری عمر میں برملا کیا، جب وہ تعصب کے اندھیرے سے نکل کر سچائی کی اجلی روشنی میں آگئے تھے۔ لکھتے ہیں "منٹو بہت بڑا اور سچا فن کار تھا مگر میرے ناروا سلوک نے اسے چین نہ لینے دیا۔ نوبت یہ کہ وہ ریڈیو دلی چھوڑ گیا۔" اشک مزید لکھتے ہیں۔ "ان دنوں میں سمجھتا تھا کہ میں منٹو کے رنگ میں لکھ سکتا ہوں اور ایک آدھ افسانہ لکھا بھی مگر پھر

چھوڑ دیا کہ اس وقت یہ اسلوب مجھے گھٹیا اور کم تر لگتا تھا جو یقیناً میری کم فہمی رہی تھی۔" قصہ مختصر یہ کہ منٹو جیسے تخلیق کار کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اوچھے ہتھ کنڈوں میں الجھتے اور اپنا وقت ضائع کرتے۔ انہوں نے طرح دینے اور آخر کار زہریلی فضا سے نکل جانے کو بہتر سمجھا۔ کیونکہ وہ اشک کی سطح تک نہیں اتر سکتے تھے۔ بہرکیف انہی اوپندر ناتھ اشک کے افسانوی مجموعے کا نام "نورتن" ہے۔

قدیم اردو سے متعلق اعلیٰ روایتی ادب کی ایک کتاب کا عنوان بھی نورتن ہے، جو آج سے دو سو برس پہلے 1814ء عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مصنف شیخ محمد بخش مہجور تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور مہجور تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد حکیم خیر اللہ پہلے فتح پور ہنسوا میں رہتے تھے مگر پھر لکھنو میں ٹھکانا کیا۔ چنانچہ محمد بخش لکھنو میں ہی 1777ء عیسوی کے قریب پیدا ہوئے۔ مروجہ تعلیم بھی یہیں پائی۔ اپنے والد کی طرح خود بھی طبیب تھے لیکن نوجوانی میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ پہلے شیخ قلندر بخش جرأت (وفات 1810ء) کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا پھر مرزا خانی نوازش سے اصلاح لینے لگے۔ مہجور تقی گنج، لکھنو میں رہتے تھے۔ 1824ء میں بہ عمر پچاس برس دورانِ حج مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔ نورتن کا کچھ حصہ تو طبع زاد ہے باقی مواد مختلف ذرائع سے لیا گیا ہے جن میں سے کئی کہانیاں ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ قدیم زمانے میں سنسکرت کی ایک کتاب شکاسب تتی تھی اس کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں، انہی میں سے کچھ کہانیاں پہلے مولانا ضیاء الدین بخشی نے 1330ء میں، طوطی نامہ کے عنوان سے فارسی میں ترجمہ کیں اور کتابی شکل دی۔ طوطی نامہ بخشی کے فارسی خلاصے بھی بعد میں شائع ہوئے۔ ایک خلاصہ سید محمد قادری نے بھی مرتب کیا۔ پھر سید حیدر بخش حیدری نے اس فارسی طوطی نامہ کے خلاصے کو 'طوطا کہانی' کے عنوان سے اردو کا جامہ پہنایا۔ طوطا کہانی (اردو) کے محرک فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے۔ پہلا ایڈیشن 1804 عیسوی میں فورٹ ولیم کالج سے ہی شائع ہوا۔ طوطا کہانی کے دس برس بعد محمد بخش مہجور نے نورتن لکھی اور چراغ سے چراغ جلایا۔ لکھنوی ادب میں 1857ء سے پہلے نثر کی صرف تین کتابیں مقبول و ممتاز تھیں۔ 1۔نورتن۔ 2۔فسانہ عجائب اور 3۔ بستان حکمت۔ آخری کتاب بستان حکمت، ترجمہ تھی جبکہ پہلی دو کتابیں (نورتن اور فسانہ عجائب) دیگر تصانیف سے خوشہ چینی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بہرحال نورتن، کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے۔ فسانہ عجائب، نورتن کے دس سال بعد 1824ء میں لکھی گئی۔

نورتن کا زمانۂ تصنیف نواب غازی الدین حیدر کا عہد تھا۔ اشاعت سے پہلے ہی یہ کتاب بہت مقبول تھی اور لوگ اس کی نقلوں کو سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ نورتن کی تصنیف کے چھ سال بعد 1820ء میں غلام ہمدانی مصحفی (وفات 1824ء) نے اپنا تذکرہ ریاض الفصحا، مکمل کیا نو نورتن، کے بارے میں یوں خامہ آرائی کی۔ "دوستان معنی پرست اکثر نقل ہائش برداشتہ برطاق دلش جا دادند۔"

نورتن کا اولین نسخہ محمد مصطفیٰ خان نے اپنے مطبع مصطفائی لکھنو سے 1851ء میں طبع کر کے شائع کیا۔ دراصل نورتن محض دلچسپ قصے کہانیوں پر ہی مشتمل ایک کتاب ہے جو اس وقت کے لحاظ سے مقبولِ عام تصنیف تھی جس میں صرف ذہنی دلچسپی کو ہی مدِنظر رکھا گیا تھا چنانچہ نورتن کی ایک کہانی کا محمد بخش مہجور یوں آغاز کرتے ہیں۔ "خلافتِ شہنشاہ اکبر بادشاہ میں ایک قاضی زادہ خاص لکھنو کا باشندہ برائے سیر کوچہ و بازار ہمراہ یارانِ غم گسار گھر سے باہر نکلا۔ یہاں مصنف نورتن کا قلم بری طرح ٹھوکر کھاتا ہے کیونکہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں لکھنو تھا ہی نہیں۔ محمد بخش مہجور چونکہ شاعر بھی تھے لہٰذا ان کے کلام کا خاصا حصہ نورتن میں محفوظ ہے۔ یہ اشعار کہانیوں کی دلچسپی دوچند کرتے انہیں آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں مگر مہجور کے آزاد اشعار زیادہ جان دار اور پُرلطف ہیں۔ ان آزاد اشعار کا انتخاب غلام ہمدانی مصحفی، عبدالحیٔ صفا بدایونی (صاحبِ شمیم سخن) اور عبدالغفور خان نساخ (صاحبِ سخن شعرا) نے شائع کیا۔ نورتن میں کچھ گم نام شعرا کے نایاب اشعار بھی شامل ہیں اس کے علاوہ مہجور کے برادر نسبتی حکیم حیات اللہ قلاش کا فارسی کلام بھی درج ہے۔ محمد بخش مہجور کی دیگر تصانیف یہ ہیں، 1۔انشائے گلشن نوبہار، 2۔ دیوان مہجور۔ 3۔انشائے چہار چمن۔ 4۔مثنوی در تعریف موتی باغ۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور نے دسمبر 1926ء میں 2100 کی تعداد کے ساتھ نورتن حاشی و مقدمہ سے شائع کی، جس کا مقدمہ خلیل الرحمان داؤدی نے لکھا تھا اور ناشر سید امتیاز علی تاج (ستارۂ امتیاز) ناظم مجلس ترقی ادب تھے۔ مطبع ریڈنگ پرنٹنگ پریس لاہور جبکہ سرورق زرین آرٹ پریس لاہور کا تیار کردہ ہے۔ سید وقار عظیم نے بہت پہلے نورتن پر مضمون لکھا تھا جو اب ان کے مجموعۂ مضامین 'ہماری داستانیں'، (ادارہ فروغ اردو، لاہور) میں شامل ہے اور اس میں صرف مطالب کتاب کا ہی ذکر ہے۔

سراب

راوی : شہبار ملک
تحریر: کاشف زبیر

74

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ایڈونچر کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے سیل کر کے ایمن کو بھی بلوا لیا۔ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... بکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ عبداللہ کی کوٹھی میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کر لیا۔ فاضلی قید میں تھا اور وسیم اسے ہیروئن کا انجکشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ میں عبداللہ سے ملنے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کر دیا پھر بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کر دی۔ میں کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کے لیے فون کر دیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کر لیا۔ اسے ہم ایذا دے رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی "پولیس"۔ ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیمیکل ڈال کر چپکا دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے نادر اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کر لیا۔ راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کر کے نادر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ ایک نئی کوٹھی کرائے پر لی تو وہ ڈاکوؤں کا اڈا ثابت ہوئی۔ ان کے چھپے ہوئے خزانے پر ہم نے قبضہ کر لیا۔ اور کوٹھی خالی کرا دی۔ ڈاکوؤں نے مکان مالک کو اغوا کر لیا۔ ہم اسے رہا کرانے ان کے مرکز پر پہنچے اور زبردست مقابلے کے بعد مکان مالک کو رہا کرا کر آ رہے تھے کہ کئی جیپوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔

اب آگے پڑھیں

سامنے سے نمودار ہونے والی دونوں گاڑیاں بڑی تھیں اور شروع میں مجھے لگا کہ انہوں نے راستہ روک کر سڑک بلاک کر دی ہے۔ مگر جب وہ نزدیک آئیں تو ان کے درمیان میں راستہ تھا۔ انہوں نے ہیلکس کو روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے دائیں بائیں سے گزرتی آگے چلی گئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کچھ آگے نکلتے ہی وہ ذرا گھوم کر رکیں اور پھر ایک گاڑی کی چھت سے ایک شخص ایل ایم جی سمیت نمودار ہوا۔ اس نے اس کا ٹرائی پوڈ چھت پر جماتے ہوئے اس کی نال کا رخ درگاہ مرشدیہ کی طرف سے آنے والی گاڑیوں کی طرف کیا اور پھر فائرنگ شروع کر دی۔ ان گاڑیوں کی روشنی میں وہ شخص صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ ان کا استقبال اس طرح کیا جائے گا۔ ایل ایم جی والا گاڑیوں کے ٹائروں اور سامنے والے حصوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں سامنے والی بڑی جیپ کے اگلے دونوں ٹائرز برسٹ ہو چکے تھے اور وہ گھوم کر سڑک سے اتر گئی۔ اس کے پیچھے والی گاڑی تقریباً رک چکی تھی مگر وہ بھی ایل ایم جی کی خوفناک مار کے اندر تھی۔ اس کا حشر نشر ہو گیا اور اس میں موجود افراد اتر کر واپس بھاگے تھے۔ مشین گنر جان بوجھ کر صرف گاڑیوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے کسی کو مارنے کی کوشش نہیں کی ورنہ ان میں سے کسی کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ ایل ایم جی کی گولی ایک فٹ موٹی کنکریٹ سے گزر جاتی ہے۔ گاڑیوں کی پتلی شیٹ کی تو اس کے سامنے کوئی اوقات ہی نہیں تھی۔

تیسری گاڑی جو سب سے پیچھے تھی وہ پہلے ہی واپسی کے لیے مڑ چکی تھی۔ کھیتوں میں اتر جانے والی گاڑی سے بھی لوگ نکل کر بھاگ رہے تھے۔ کسی نے جوابی کارروائی کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ ایک فائر کریں گے تو جواب میں گولیوں کی بارش ہو گی اور گولی بھی ایل ایم جی کی، جو فولادی چادر سے بے تکلف گزر جاتی ہے انسانی جسم کی تو اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ دوسری گاڑی کی چھت پر بھی ایک اور ایل ایم جی بردار موجود تھا مگر اس نے کارروائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ایک ہی کافی ثابت ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ آنے والی گاڑیوں کا کوئی فرد زخمی نہیں ہوا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی سے زیادہ ایل ایم جی استعمال کرنے والے کی مہارت تھی کہ اس نے صرف گاڑیوں کو ناکارہ کیا اور انہیں دہشت زدہ کیا تھا۔ ایاز نے اس دوران میں ہیلکس کو آگے بڑھا دیا تھا اور ہم ان دونوں گاڑیوں سے کوئی پانچ سو گز آگے نکل گئے تھے۔

اگرچہ یہ ایم ایل جی کے مار کے لحاظ سے دوری نہیں تھی مگر آنے والوں کا انداز دوستانہ تھا۔ اگر وہ ہمارے دشمن ہوتے تو ہمارے پاس سے یوں نہ گزر جاتے اور ہمارے پیچھے آنے والے دشمنوں کے خلاف کارروائی نہ کرتے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میدان صاف ہو گیا اور دونوں گاڑیاں پلٹ کر واپس آئیں۔ ایک ہم سے آگے نکل گئی اور دوسری ہیلکس کے پاس رکی اور اس سے ایک عورت باہر نکلی۔ حالات نے مجھے ہر حال میں پُرسکون رہنا سکھا دیا تھا اور مجھ پر سرپرائز ذرا کم اثر کرتے تھے لیکن اس وقت میں حیران ہوا تھا۔ وہ مہرو تھی۔ وہ بلا تکلف ایاز کے ساتھ والی سیٹ پر آ گئی اور بولی۔ "اب نکلو، پیچھے کوئی نہیں آئے گا لیکن امکان ہے آگے پولیس نہ آ جائے۔"

"تم کہاں سے آن ٹپکیں؟"

"بس آ گئی۔" اس نے کہا۔ "اگلی گاڑی میں کرنل ہے۔"

میں ایک بار پھر حیران ہوا تھا۔ چند دن پہلے تک کرنل شدید زخمی حالت میں ایبٹ آباد کے ایک اسپتال میں پڑا ہوا تھا اور بہ ظاہر خود اپنی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا مگر اس وقت جب ہمیں مدد کی ضرورت تھی وہ اچانک نمودار ہوا تھا۔ "کرنل کی حالت کیسی ہے؟ اور تم لوگوں کو ہمارے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"بتاتی ہوں۔" مہرو نے کہا اور اپنی ہلکی سی ہاف جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکالا۔ "سب ٹھیک ہے نا؟"

"آل کلیئر میڈم۔" دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ اس دوران میں مہرو کے ساتھ آنے والی دونوں گاڑیاں خاصی آگے نکل گئی تھیں۔ واکی ٹاکی رکھ کر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر چونکی۔

"وسیم کو کیا ہوا؟"

"اس کی ران میں گولی لگی ہے۔" میں نے بتایا۔

"ہم پندرہ منٹ میں اپنے ٹھکانے پہنچ جائیں گے، وہاں وسیم کو طبی مدد مل سکتی ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا ٹھکانا ہے اور زیادہ دور بھی نہیں ہے۔" میں نے انکار تو نہیں کیا لیکن اس پر واضح

کردیا کہ ہم اس کے ساتھ اس کے کسی ٹھکانے پر نہیں جائیں گے۔اس نے شانے اچکائے۔

"مرضی تمہاری لیکن ہم تمہارے اس ٹھکانے سے بے خبر نہیں ہیں درحقیقت اسی وجہ سے ہمیں تمہارے بارے میں پتا چلا اور جب تمہارے ساتھیوں سے پتا چلا کہ تم لوگ اس طرف آئے ہوئے ہو اور تم سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تو ہم وہاں سے چل پڑے تھے۔"

"ہمارے ٹھکانے کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ اتفاق سے ہم اس جگہ کے پاس ہی رکے ہوئے ہیں۔" مہرو بولی۔

"یہ لاؤ لشکر کہاں سے آیا؟"

"یہ کرنل کے خاص آدمی ہیں مگر یہیں موجود تھے۔ اگر یہ ساتھ ہوتے تو شاید کرنل زخمی نہ ہوتا۔"

"مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ کرنل اور تمہاری آپس میں کوئی سیٹنگ ہوگئی ہے؟"

"ہاں اس نے مجھے اپنی بیوی تسلیم کرلیا۔" مہرو نے مبہم سے انداز میں کہا۔ اس کی بات سے واضح نہیں تھا کہ کرنل نے صرف اسے بیوی تسلیم کیا ہے اور اس نے جو تبدیلیٔ مذہب اور نکاح کا ناٹک کیا تھا اس کا کیا ہوا۔ اگر اس کی نیت میں دھوکا تھا تو یہ شادی سرے سے ہوئی نہیں تھی۔ انہیں دوبارہ شادی کرنی تھی۔ مگر یہ اس کا خاصی حد تک ذاتی معاملہ تھا اور میں اس میں ایک حد سے زیادہ دخل نہیں دے سکتا تھا اور یہ موقع بھی ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی شادی کی مذہبی اور معاشرتی حیثیت لے کر بیٹھ جاتا۔ وسیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس کی ٹانگ کا زخم چیک نہیں کیا تھا مگر اس سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ جیسے ہی موبائل پر سگنل نمودار ہوئے میں نے کوٹھی کال کی اور وہاں وسیم کی حالت کے بارے میں بتایا۔

"کسی ڈاکٹر کا بندوبست کرو..... ایمرجنسی میں۔"

فون بند کرکے میں نے مہرو کی طرف دیکھا۔ "کتنے آدمی ہیں تمہارے ساتھ؟"

"چار آدمی ہیں، ایک کرنل اور ایک میں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے حیرت سے کہا۔ "بس تم لوگ چار آدمیوں کے ساتھ نکل آئے؟"

"ہاں یہ چار آدمی چالیس پر بھاری ہیں۔" وہ بولی۔ "تم نے دیکھا نہیں صرف ایک آدمی نے آنے والوں کو بھاگنے پر مجبور کردیا، ویسے یہ تھے کون؟"

"مرشد کا ٹولا تھا، ان لوگوں نے ہمارے ایک آدمی کو پکڑ لیا تھا، اسے چھڑانے آئے تھے مگر خود پھنس گئے۔ باہر نکلے تو مرشد کے اور آدمی آگئے۔ میں تو تمہیں بھی ان کا آدمی سمجھا تھا۔"

ہم کوٹھی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مہرو نے پھر وائی ٹاکی پر رابطہ کیا اور کرنل کو بتایا۔ "یہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

کرنل کی آواز آئی۔ "شہباز کسی پر اعتماد کرنے والا آدمی نہیں ہے۔"

"ہاں میں یا تو سو فیصد اعتماد کرتا ہوں یا بالکل نہیں کرتا۔" میں نے جواب دیا۔ "درمیان کی کوئی صورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو، ویسے میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا، ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

کوٹھی آگئی تھی۔ کرنل کی دونوں گاڑیاں وہیں رکی ہوئی تھیں۔ ایاز نے ہیلکس روکی تو مہرو نیچے اتر گئی۔ "بائے پھر ملیں گے۔"

"بائے۔" میں نے کہا تو وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے جاتے ہی ایاز نے گاڑی کوٹھی کی طرف بڑھا دی۔ گیٹ کھل گیا اور اندر وسیم کے آدمی موجود تھے۔ اسے اتار کر فوری طور پر اندر لے جایا گیا۔ ان میں سے جو طبی مدد کا ماہر تھا وہ وسیم کو دیکھنے لگا۔ میری ہدایت پر مالک مکان کو اندر پہنچا دیا تھا۔ ابھی تک اس پر غور نہیں کیا تھا کیونکہ مجھے وسیم کی فکر لگی تھی۔ اس کے پاؤں سے پٹی اور پھر پتلون کا پائنچا کاٹ کر اتارا گیا۔ گولی اندر ہی تھی۔ اسے نکالنے کے لیے ایک ڈاکٹر اور اوزاروں کی ضرورت تھی۔ وسیم کے دو آدمی ڈاکٹر لینے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ایک دودھ گرم کرکے لے آیا اور چمچ سے وسیم کے منہ میں ٹپکانے لگا۔ اس کا اچھا اثر ہوا اور وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وسیم کے آدمی ایک ڈاکٹر کو لے آئے۔ وہ اسے اس کے کلینک سے لائے تھے اور راستے میں اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اس لیے وہ سخت ہراساں دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں لا کر اس کی پٹی کھولی تو اس نے کہا۔ "اوہ بھائی تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو۔"

"فکر مت کریں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "آپ کو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ پٹی باندھنا بھی مجبوری تھی۔ آپ زخمی کو دیکھیں اور اسے ٹریٹ کریں۔"

اس نے وسیم کا زخم دیکھا اور مستعد ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے جراثیم کش سے زخم کی صفائی کی۔ خون صاف کیا تو اندر کی پوزیشن بہتر سامنے آئے۔ اس نے کہا۔ "گولی نکالنی ہے گرم پانی چاہیے۔"

ڈاکٹر کے پاس سب کچھ تھا۔ اسے فوری گرم پانی مہیا کر دیا گیا۔ اس نے پہلے وسیم کو سن کرنے والا انجکشن دیا اور پھر آلات جراحی کی مدد سے بہ آسانی گولی نکال لی۔ اس دوران میں خون دوبارہ بہنے لگا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "ہڈی کو نقصان تو نہیں ہوا ہے؟"

"نہیں ہڈی بچ گئی ہے۔ لیکن خون بہت بہا ہے، بلڈ پریشر کم ہے۔ انہیں طاقت کا انجکشن دے رہا ہوں لیکن تین چار دن احتیاط کریں۔ بیڈ ریسٹ کریں اور قوت والی لیکن زود ہضم خوراک لیں۔ دوائیاں لکھ کر دے رہا ہوں، وہ منگوا لیں۔"

"ڈریسنگ کا کیا ہوگا۔"

"کوئی دیکھ لے کہ میں کیسے ڈریسنگ کر رہا ہوں بعد میں اسی طرح ڈریسنگ کرنی ہے۔ تین دن بعد ضرورت نہیں پڑے گی صرف زخم کو رگڑ سے بچانے کے لیے اوپر سے پٹی لپیٹ دیں۔ ایک ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا مگر پندرہ دن تک احتیاط کرنی ہوگی۔ بھاگ دوڑ نہیں کرنی ہے اور نہ ہی اس ٹانگ پر زور دینا ہے۔"

وسیم ہوش میں تھا اور سن رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کو پورے احترام کے ساتھ چھوڑ آؤ اور ان کے فیس بھی دینی ہے۔"

جو ڈاکٹر کو لائے تھے وہی اسے چھوڑنے اور دوائی لینے چلے گئے۔ دوائی پنڈی سے ملتی کیونکہ اس وقت آس پاس کے سارے میڈیکل اسٹور بند ہو چکے ہوتے۔ ڈاکٹر کی انہیں فیض آباد سے ملا تھا۔ ٹریٹ منٹ کے بعد وسیم کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "وہاں سے نکلنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں کیونکہ غیر متوقع طور پر مہرو اور کرنل اپنے آدمیوں سمیت مدد کو آگئے تھے۔ باہر نکلنے پر مرشد کے آدمیوں نے گھیرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔"

وسیم چونکا۔ "مہرو اور کرنل؟ وہ کہاں سے آگئے؟"

"یہ تو تمہارے آدمی بتائیں گے کیونکہ وہ ان سے ملے تھے اور انہوں نے ہی انہیں بتایا تھا کہ ہم کہاں ہیں اور وہ مدد کے لیے چل پڑے۔"

کنگ سائز گلاس میں گرم دودھ نے وسیم کی توانائیاں بحال کردی تھیں۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے پوچھا اور پھر پتا چلا کہ شجاع باہر تھا کہ اس کی ملاقات مہرو سے ہوگئی۔ اس نے مہرو کو سب بتا دیا یہ بھی کہ ہم کہاں ہیں۔ وہ مجھ سے ملنے چلی آئی اور جب اسے پتا چلا کہ ہم مہم پر نکلے ہوئے ہیں اور خاصی دیر ہوگئی ہے تو وہ ہماری مدد کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ وسیم نے شجاع کو جھاڑا اور وہ بے چارہ کان دبائے سنتا رہا پھر میں نے مداخلت کی۔ "چل یار جانے دے، نادانستگی میں ہو گیا اور پھر ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ڈسپلن بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس طرح سب اپنی مرضی سے فیصلے کرتے رہے تو ہمارا بیڑا غرق ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔"

وسیم کو ٹھنڈا کرکے میں باہر آیا تب مجھے بے چارے مالک مکان کا خیال آیا۔ وہ بھی زخمی تھا اور اسے طبی امداد کی ضرورت تھی، میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس کی مرہم پٹی کردی گئی تھی اور دوسرا لباس دے دیا تھا۔ میں کمرے میں آیا تو وہ مکھن لگے سلائس چائے کے ساتھ کھا رہا تھا۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا اور مجھے اس کے نقوش جانے پہچانے لگے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی بڑھی ہوئی ڈاڑھی تھی اور پھر مار پیٹ کے نشانات بھی تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ ان لوگوں کی قید سے نکالا لیکن اب مجھے گھر جانے دیں، میرے بیوی بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

میں نے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "آپ فکر نہ کریں آپ آج ہی اپنے گھر میں ہوں گے۔"

"میرا نام فرخ شاہ ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ میں چونکا اب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب میں نیا نیا اس مصیبت میں پڑا تھا اور مرشد سے چھپتا پھر رہا تھا۔ راجا عمر دراز نے مجھے اسلام آباد میں ایک شخص کے پاس بھیجا تھا جو میری اور میرے ساتھیوں کی مدد کرتا۔ اگرچہ اس سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی تھی اور دوبارہ ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے نقوش میرے ذہن

میں تھے لیکن نام اور موقع بھول گیا تھا۔ اس نے نام بتایا تو مجھے یاد آ گیا۔

''آپ کو شہباز ملک یاد ہے؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک آئی۔ اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ''میرے خدا..... میں بھی سوچ رہا تھا کہ آپ کیوں جانے پہچانے لگ رہے ہیں۔''

''میں نے بھی آپ کو نام سے پہچانا..... اس ایک ملاقات کے بعد دوبارہ موقع نہیں ملا تھا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''راجا صاحب نے دوبارہ خدمت کا موقع نہیں دیا۔ آپ کے بارے میں اخبارات میں پڑھتا رہا ہوں۔''

''ان لوگوں نے آپ کو کہاں سے اٹھایا؟''

''آپ نے بھارہ کہو میں میرا غریب خانہ دیکھا ہے، بس اس سے نکلا تھا کہ ان لوگوں نے راستہ روک لیا اور زبردستی ساتھ لے آئے۔ میرے خدا بعض اوقات یہ لوگ بالکل وحشی ہو جاتے تھے۔ وہ آپ لوگوں کے بارے میں جاننے کے لیے پاگل ہو رہے تھے اور میرے پاس انہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ آخری بار مجھے وارننگ دی تھی کہ اگر میں نے آپ لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا تو میرے ہاتھوں کی انگلیاں ایک ایک کرکے کاٹ دی جائیں گی۔ میرے پاس بس چند گھنٹے کی مہلت تھی، پھر خدا نے مدد کی اور ان کے پاس کہیں باہر سے عورتیں آ گئیں اور وہ مجھے بھول کر ان میں لگ گئے تھے۔ پھر آپ لوگ فرشتے بن کر آ گئے۔''

میں فکر مند ہو گیا تھا۔ اگر یہ لوگ فرخ شاہ کو اس کے گھر کے پاس سے اٹھا لائے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے گھر سے واقف تھے۔ وہ دوبارہ وہاں جا سکتے تھے اور فرخ شاہ نہیں ملتا تو اس کی بیوی اور بچیوں کو لے جاتے۔ میں نے فرخ شاہ کو اس خدشے سے خبردار کیا تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اس نے گھبرا کر کہا۔ ''تب مجھے فوری جانا ہوگا۔''

''صرف جانا نہیں ہوگا بلکہ آپ کو وہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔ کیا کوئی اور جگہ ہے بلکہ ہو سکے تو فی الحال اسلام آباد سے چلے جائیں۔''

''میرا سارا خاندان لاہور میں ہے۔''

''نہیں کسی ایسی جگہ جائیں جہاں یہ نہ پہنچ سکیں۔ لاہور اور رشتے داروں تک جانا تو بہت آسان ہوگا۔'' میں نے کہا۔

فرخ شاہ اب سوچ میں تھا اس نے کہا۔ ''ٹھیک... میں کر لوں گا لیکن اب مجھے فوری گھر پہنچنا ہوگا اس سے پ... کہ.....''

''میں اپنے آدمی آپ کے ساتھ کر رہا ہوں، وہ... وقت تک آپ کی اور گھر والوں کی حفاظت کریں گے جب... آپ خطرے سے نہیں نکل جاتے۔''

میں نے حبیب اور شجاع کو بلایا اور انہیں فرخ... کے ساتھ جانے اور اس کی حفاظت کرنے کو کہا۔ فرخ... اب بے چین تھا اس لیے وہ وسیم سے ملے بغیر روانہ ہو... رات کا آخری پہر قریب تھا اور میری آنکھیں جل رہی تھ... لیکن سونے سے پہلے میں نے غسل کیا اور پھر وسیم ... آدمیوں کو چوکس رہنے کا کہہ کر وسیم والے بیڈ روم میں ... آیا۔ یہاں فرش پر قالین اور تکیے وغیرہ تھے۔ سردی تھی لیکن... کمبل کی ضرورت نہیں تھی، کھیس سے بھی کام چل سکتا تھا۔... میری آنکھ کھلی تو وسیم تکیے کے سہارے بیٹھا چائے نوشی کر ر... تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''صبح بہ خیر جناب کیا چائے ... کہوں؟''

''نہیں یار پہلے منہ ہاتھ دھو لوں۔'' میں نے انگڑائی لی۔ ''تکلیف کیسی ہے؟''

''بہت کم رہ گئی ہے، میں نے رات میں دوا لی تھی اب دوبارہ لینی ہے۔ مگر ناشتے کے بعد، آپ واش روم سے ہو آئیں ناشتا آنے والا ہے۔''

میں واش روم سے آیا تو دسترخوان بچھ رہا تھا اور ... سے گرما گرم پراٹھے، تلے ہوئے انڈے، سوجی کا حلوہ اور ... تہ والی ملائی آ گئی۔ رات ہلکا کھانا کھایا تھا اس لیے زبردست بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتے کے دوران وسیم نے فرخ شاہ کی رپورٹ دی۔ حبیب اور شجاع اسے موٹر وے تک چھوڑ آئے تھے۔ وہ اپنے بیوی بچوں سمیت کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس بارے میں اس نے ان دونوں کو بھی نہیں بتایا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ اچھی بات ہے کہ وہ دشمن کے توجہ دینے سے پہلے نکل گیا ورنہ اس کا بھی صابر کے گھر والوں جیسا حشر ہو سکتا تھا۔''

''میں جان کر حیران ہوا کہ وہ آپ کا واقف کار ...''

''میری تو صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی، وہ اصل میں راجا صاحب کا جاننے والا ہے۔ انہوں نے مجھے ا... کے پاس بھیجا تھا۔''

''اچھا ہوا کہ ہم نے اسے بچا لیا۔'' وسیم خوش نظر آنے لگا۔ ''اب مجھے اپنے زخم کا افسوس بھی نہیں ہے۔''

''یہ تو تقدیر میں تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا ایک ہفتہ لگے گا ٹھیک ہونے میں، اس دوران میں تم آرام کرو گے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کام بہت زیادہ ہیں۔ اب یہ جگہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں کہیں اور شفٹ ہونا ہوگا۔ یہاں سے دشمن زیادہ دور نہیں ہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہی سڑک گزرگاہ ہے۔ اس سے خطرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔''

وسیم نے اچھا نکتہ اٹھایا تھا۔ مرشد کی درگاہ کی طرف یہی سڑک جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی اور اس کے آدمیوں کی آمد و رفت یہیں سے ہوتی تھی۔ اتفاقاً آمنا سامنا ہونے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ میں نے ناشتے کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔ ''تب بہتر ہے ہم یہاں سے کوچ کر جائیں، میرا مطلب ہے میں اور تم۔ اپنے کچھ ساتھی بھی ساتھ لے لو اور باقی کو یہیں چھوڑ دو، یہ کم سے کم باہر نکلیں اس سے خطرہ کم ہو جائے گا جب تک ہم کوئی دوسری جگہ نہیں تلاش کر لیتے یہ یہیں رہیں۔''

ناشتے کے بعد چائے آئی تھی اور ساتھ ہی عبداللہ بھی آ گیا۔ اسے رات کو ہی پتا چل گیا تھا کہ وسیم زخمی ہوا ہے لیکن ہمارا مشن کامیاب رہا تھا۔ فرخ شاہ کا سن کر وہ حیران ہوا تھا۔ ''میں اسے جانتا ہوں..... کسی زمانے میں راجا صاحب کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ بھی اصل میں اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ مگر اب یہ کام چھوڑ چکا ہے۔''

''بس اتفاق کیسے کیسے لوگوں کو سامنے لے آتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب وہ کسی محفوظ مقام پر جا چکا ہوگا۔''

''جناب میں ایک تجویز لایا ہوں؟''

''کیسی تجویز؟''

''ہمارے پاس تقریباً نو کروڑ روپے کی کرنسی اور سونا ہے اور اتنی دولت گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ یہ رقم بنک میں جمع کرا دی جائے۔''

''جب ہمیں ضرورت ہوگی تو کیا کریں گے؟'' وسیم نے پوچھا۔

''میری تجویز ہے کہ یہ رقم چار یا پانچ اکاؤنٹس میں ڈال دی جائے اور سب کے اے ٹی ایم کارڈز بنوا لیے جائیں گے۔ اس کے ..... علاوہ کریڈٹ کارڈز بھی بنوائے جا سکتے ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ بہت رسکی ہے۔ ہم آئے دن دشمن کے ہاتھ لگتے رہتے ہیں۔ اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈز ان کے ہاتھ آئیں گے تو ہمارے بارے میں سراغ مل جائے گا۔ پھر بار بار اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ بنوانا بھی مسئلہ ہے۔ نقد رقم سب سے بہتر ہوتی ہے۔ تم ایک کام کرو کہ تمام رقم کو ہزار اور پانچ ہزار کی بینک والی گڈیوں میں تبدیل کرا لو۔ زیادہ رقم پانچ ہزار کی گڈیوں کی صورت میں ہو۔ اسی طرح سونا بھی کیش کرا لو۔''

''یہ ساری رقم کہاں رکھی جائے؟'' وسیم نے پوچھا۔

''کسی تجوری میں۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی چھوٹی لیکن مضبوط اور جدید قسم کی تجوری لے لو۔ یہ لاکر بھی مضبوط ہے لیکن اتنی بڑی رقم کے لیے زیادہ حفاظت کی ضرورت ہو گی۔''

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے ایسا کرتے ہیں۔''

''بینکوں میں خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں کیمرے اور پولیس والے بھی ہوتے ہیں۔ نیٹ ورک کا حصہ ہونے کی وجہ سے مرشد جیسے طاقتور اور بارسوخ سیاست دان کے لیے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کر لینا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔'' میں نے ذرا تفصیل سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا تو عبداللہ مطمئن نظر آنے لگا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، کیش ہی سب سے بہتر ہے۔''

وسیم ہنسا۔ ''اور یہ کون سا ہمارے حق حلال کی کمائی ہے جس کے لیے فکر مند ہوں۔''

عبداللہ گاڑی لے آیا تھا، ناشتے کے بعد میں اور وسیم اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ایاز اب کوٹھی کا انچارج تھا اور وسیم نے اس کے ذمے نئے ٹھکانے کی تلاش کا کام لگا دیا تھا۔ ''جیسے ہی ٹھکانا ملے یہاں سے شفٹ ہونا ہے۔''

''میں آج ہی تلاش شروع کر دیتا ہوں۔'' ایاز نے کہا۔ ''بھگوال میں میرے کچھ جاننے والے رہتے ہیں وہاں فارم ہاؤس ہیں۔ شہر سے زیادہ دور نہیں ہے اور سہولتیں بھی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں وہاں تلاش کروں۔''

میں نے بھگوال دیکھا تھا۔ یہ مری روڈ پر بھارہ کہو سے نکلنے والی سنگلی ڈیم روڈ پر کوئی تین چار کلومیٹرز کے بعد تھا۔ یہ مری کے ذیلی پہاڑیوں کا علاقہ تھا۔ مگر زمین بہت زیادہ اونچی نیچی نہیں تھی اور لوگوں نے اسے جا بہ جا آباد کر

رکھا تھا۔شہر سے زیادہ دور نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے عافیت اور سکون پسند لوگوں نے یہاں زمین لے کر فارم ہاؤس بنالیے تھے جہاں وہ اہلِ خانہ اور دوست احباب کے ہمراہ پکنک منانے یا چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔ مجھے ایاز کی تجویز اچھی لگی۔ یہ شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔البتہ آنے جانے کے لیے واحد قابلِ بھروسا راستہ مری ہائی وے ہی تھا باقی سڑکیں ناقابلِ بھروسا اور بہت گھوم پھر کر پنڈی تک آتی تھیں۔ہم عبداللہ کے ہمراہ اس کی کوٹھی پر آئے۔وسیم کو بہت احتیاط سے اور زبردستی اٹھا کر گاڑی میں بٹھایا۔ زبردستی اس لیے کہ وہ خود چل کر جانے پر مُصر تھا۔اسی طرح اسے اٹھا کر کوٹھی کے اندر بھی لے گئے تھے۔عبداللہ نے اس کے لیے ایک واکر منگوالیا تھا۔اس کی مدد سے وہ پاؤں پر زور ڈالے بغیر چل پھر سکتا تھا اور واش روم جا سکتا تھا۔میں نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے انٹرنیٹ کی مدد سے ندیم کو کال کی۔ وہ راستے میں تھا۔میری آواز سنتے ہی اس نے حسبِ معمول گالیاں دیں۔پھر بولا۔"شکر ہے تیرا کیس ری فائل ہو گیا ہے۔"

"شکر ہے۔"

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیس دوسرے بھی بن سکتے ہیں۔" اس نے خبردار کیا۔"میں نے تجھ سے کہا تھا یہاں سے دفع ہو جا لیکن تو اب تک یہیں ہے۔"

"میں فاٹا سے بات کر رہا ہوں۔"

"بکواس نہ کر..... تیرے اس نہ ہونے والے سالے کا فون آیا تھا صبح صبح.... موڈ اور ناشتا دونوں خراب کر دیے۔"

"مرشد کی بات کر رہا ہے؟"

"ہاں گرج برس رہا تھا کہ گزشتہ رات تو نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ بیوی بچے سامنے تھے اس لیے میں کھل کر نہیں پوچھ سکا بس یہی کہا کہ شہباز نے ایسا کیا کیا اور کہاں کیا ہے۔"

"مرشد بم کی طرح پھٹا ہوگا؟" میں ہنسا۔

"اس سے بھی کچھ آگے..... تجھے بھول گیا اور مجھے دھمکیاں دینے لگا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا جب وہ بک بک کر کے چپ ہو گیا تو میں نے کہا کہ سرکار کال ریکارڈ ہو رہی تھی اب یہ سند رہے گی اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے گی۔"

"اس کے طیش کا غبارہ پھٹ گیا ہوگا؟"

ندیم نے ناقابلِ بیان الفاظ میں بتایا کہ یہ سن کر مرشد کا کیا پھٹا تھا۔"وہ بالکل الف سیدھا ہو گیا اور بہت میٹھے لہجے میں بولا۔ وکیل صاحب ناراض کیوں ہوتے ہو الفاظ ہی ہیں نا.... میں واپس لے لیتا ہوں جیسے تم عدالت میں اپنے الفاظ واپس لیتے ہو۔میں نے اسے بتایا کہ مجھے شہباز کا کچھ پتا نہیں ہے میں صرف عدالت میں اس کے معاملات کا ذمے دار ہوں۔"

"اس نے اور کچھ نہیں کہا؟"

"اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ اگر تیری طرف سے اس سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی تو کیس ری فائل خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"تو کیا کہتا ہے سچ مچ خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیا ایک بار وہ کیس واپس لے کر دوبارہ عدالت میں جا سکتا ہے؟"

"یار یہ پاکستان ہے یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آج کل عدالتیں مضبوط ہو رہی ہیں لیکن نیچے تو سارے وہی لوگ بیٹھے ہیں۔ نئے کیس پیدا کرنا کیا مسئلہ ہے۔اس لیے اگر تو کچھ کر رہا ہے تو مہربانی کر کے ایک مہینا صبر سے بیٹھا رہ اسی لیے تجھ سے کہہ رہا ہوں کہیں اور چلا جا' نہ یہاں ہوگا اور نہ دشمنوں سے پنگا ہوگا۔ باقی لواحقین کو تو ویسے ہی حویلی بھیج چکا ہے۔"

"یار میں نے کچھ نہیں کیا۔" میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔"مرشد کے اور دشمن بھی ہوں گے ان میں سے کسی نے کچھ کیا ہوگا وہ میرے سر ڈال رہا ہے۔"

"بیٹے تو اتنا شریف نہیں ہے جتنا بن رہا ہے، کوئی نہ کوئی حرامی پن تجھ سے سرزد ہوتا رہتا ہے۔ بہر حال اپنے خرچ پر خوش رہ..... پکڑا گیا تو ہم موجود ہیں عدالت میں بھیجنے کے لیے۔"

میرا اندازہ تھا کہ مرشد کو جاننے میں دشواری نہیں ہو گی کہ یہ کارروائی ہماری ہے اور اس کے پاس رابطے کا ایک ہی ذریعہ تھا اس نے اسی سے رابطہ کیا۔ میں نے سوچا کہ مرشد سے بات کروں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اس بارے میں غور کرنا چاہتا تھا، نادر کا معاملہ طول کھینچ رہا تھا۔اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ مر جاتا تو ہمارے ہاتھ سے ایک مہرہ کھسک جاتا اور مرشد کے مزے ہو جاتے۔" نادر کی موت کا ذمے دار ہمیں قرار دیتا اور اس کے رشتے داروں اور مریدوں کے غیظ و غضب کا نشانہ ہم

بننے۔ جب سے نادر ہماری تحویل میں آیا تھا میں نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں خود اس کی حالت دیکھوں۔ میرا کام ہونے تک اس کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ میں نے عبداللہ کو تلاش کیا۔ وہ نیچے ایک کمرے میں تھا۔ میں نے نادر کے بارے میں پوچھا۔"اس کی حالت کیسی ہے؟"

"اچھی نہیں ہے، دو دن سے کچھ نہیں کھا رہا ہے مجبوراً ڈرپ کی مدد سے اسے طاقتور دوائیں دینا پڑ رہی ہیں۔"

"اس وقت سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے جاگ رہا ہوگا۔ ایک گھنٹا پہلے ڈاکٹر اسے دیکھ کر گیا ہے۔"

نادر نچلے حصے کے ایک کمرے میں تھا۔ عبداللہ کے آدمی اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے مگر طویل قید، تنہائی اور معذوری نے اسے زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اب نادر سے ایک ملاقات کر لینی چاہیے۔ ممکن ہے وہ زیادہ عرصے بعد ہمارے پاس نہ رہے یا اس دنیا میں نہ رہے۔ میں اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا تو وہ مریضوں کے لیے مخصوص بیڈ پر لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا اس کی کھلی آنکھیں ساکت تھیں اور ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ وہ مر چکا ہے لیکن فوراً ہی اس نے سر گھما کر دیکھا اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کوئی حیرت کا تاثر نہیں آیا تھا۔ گویا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ میری قید میں ہے۔

"شہباز ملک۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ چہرہ ستا گیا تھا اور آنکھیں جیسے گڑھوں میں بدل گئی تھیں۔ شیو بڑھنے سے اس کی بے چارگی کے تاثر میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے دنیا میں جن چند لوگوں سے شدید نفرت تھی وہ ان میں سے ایک تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس کی وجہ سے مجھ پر ابتلا کا دروازہ کھلا۔ میرے پیاروں کی اور میری زندگی مسلسل آزمائش بن گئی۔ اس نے مونا کے لیے غلیظ عزائم کا اظہار کیا۔ اس نے میرا ہاتھ ناکارہ کرنے کی کوشش کی۔ دونوں بار اللہ نے ہمیں اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ پھر اس نے دشمنی کا رخ میرے خاندان کی طرف موڑ دیا۔ شاہد بھائی کا قتل نادر نے کرایا تھا۔ میرے دفتر کے چوکیدار گل خان سے لے کر بے شمار بے گناہ لوگوں کے مارے جانے کا براہِ راست ذمے دار یہی شخص تھا۔ اس کے ساتھ میں نے برا نہیں کیا تھا جو کیا قدرت نے کیا۔ اس کے باوجود اس کے جرائم اتنے تھے کہ میں اسے قتل کر دیتا تو یہ عین انصاف ہوتا۔ اس کمرے میں آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ اسے سامنے پا کر میری نفرت بھڑک نہ جائے مگر جب میں نے اسے دیکھا تو میرے اندر اس کے خلاف جلنے والی آگ مدھم پڑنے لگی تھی۔ یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ میں ایک کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم جانتے تھے کہ میری قید میں ہو؟"

اس نے سر ہلایا اور مسکرانے کی کوشش کی۔"تمہارے ساتھیوں نے ایجنسی والے بن کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر کچھ عرصے بعد میں نے جان لیا تھا کہ میں تمہارے قبضے میں ہوں۔"

"تمہیں خوف نہیں آیا کہ تم میرے قبضے میں ہو اور مجھے تم سے بہت سے حساب بے باک کرنے ہیں۔"

وہ ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔"اس لحاظ سے خوف نہیں آیا کہ تم مجھ پر تشدد کرو گے یا زندگی کو میرے لیے مشکل کر دو گے۔ مجھے معلوم ہے اگر تم نے میری موت کا فیصلہ کیا تو کم سے کم تکلیف کے ساتھ مجھے موت کے گھاٹ اتار دو گے۔"

"یعنی تم مجھے شریف دشمن قرار دے رہے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔"کیا تم نے کبھی سوچا کہ تمہیں بھی دشمنی کے آداب نبھانے چاہئیں؟"

"نہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔"بات سوچ کی نہیں فطرت اور تربیت کی ہوتی ہے۔ تم نے وہ کیا جس کی تم نے تربیت حاصل کی اور میں نے وہ کیا جس کی تربیت مجھے ملی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں نے کس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ جہاں انسان کو انسان نہیں صرف غلام سمجھا جاتا ہے۔ جہاں عورت رشتے کا نہیں جسم کا نام ہو۔ جہاں دوسروں کو ذلیل کر کے اپنے تکبر کی تسکین کی جاتی ہو۔ بے حساب دولت اور حرام کی دولت اور اسے حرام میں خرچ کرنے کے بے شمار طریقے تھے۔"

"میں نے جہاں پرورش پائی وہاں انسان کو انسان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ہر شخص عزت اور احترام کا مستحق ہو یا نہ ہو لیکن اسے بے عزت نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مجھے بچپن سے حرام حلال کا فرق اتنی شدت سے بتایا گیا کہ میں سب بھول جاؤں تب بھی یہ چیز نہیں بھول سکتا۔ عورت ہمارے ہاں صرف رشتے کا نہیں بلکہ عزت کا نام ہے۔ اس سے وابستہ ہر رشتہ عزت کا دوسرا نام ہے۔ انسانیت، رحم، مروت اور صبر میری تعلیم میں شامل ہے۔"

"تب ہی تم ایسے ہو۔" نادر نے سرد آہ بھری۔ "تمہاری اس قید میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میرا اتنا ہی خیال رکھا گیا ہے جتنا کہ میرے اپنے گھر میں رکھا جا سکتا تھا۔ کسی نے مجھے ذلیل نہیں کیا۔ کسی نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا، حتیٰ کہ گالی تک نہیں دی۔ تمہارے ساتھی اپنا آرام چھوڑ کر میری دیکھ بھال کرتے رہے۔ میرے لیے مستقل ڈاکٹر آتا ہے۔ لیکن شہباز ملک میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا۔" وہ بولتے بولتے رکا تو مجھے اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں نمی کی جھلک نظر آئی تھی۔

"کیوں؟"

"اگر تم مجھے ذلیل کرتے.... مجھ پر تشدد کرتے.... اپنا بدلہ لیتے تو میں اندر سے مضبوط رہتا.... کبھی تمہارے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا.... لیکن شہباز.... تمہاری شرافت نے مجھے مار دیا ہے۔ میں تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں مجبور ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اب موت مجھے ساتھ لے جائے۔"

"اتنی مایوسی کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے، اگر تمہارے بارے میں موت کا فیصلہ ہوا تو تمہیں بِنا کسی تکلیف کے موت دی جائے گی مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ میری مرشد سے بات چل رہی ہے۔ امید ہے جلد ہمارے درمیان تصفیہ ہو جائے گا اور تمہیں اس قید سے رہائی مل جائے گی۔"

مرشد کا نام سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ "وہ میری رہائی کے لیے تم سے بات کر رہا ہے؟"

"تو اور کون کرے گا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اس دنیا میں وہی تمہارا والی وارث ہے۔"

"وہ میرا دشمن ہے۔" نادر نے تلخی سے کہا۔ "اس کا بس چلے تو مجھے مار کر میرا ابھی مزار بنا دے.... اگر وہ تم سے کوئی معاہدہ کرنا چاہ رہا ہے تو میں تمہیں بتا دوں اس میں سو فیصد دھوکا ہوگا۔ وہ تمہارا ایسا دشمن ہے جو کبھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔"

"میری اصل دشمنی تو تم سے تھی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھ سے نہیں تھی.... اس دشمنی کو یہاں تک پہنچانے کا سہرا بھی مرشد کے سر ہے۔ اس نے مجھے اکسایا کہ تم لوگوں سے بدلہ لوں۔ وہ چالاکی سے خود گدی نشین اور قابلِ احترام شخصیت بنا ہوا تھا اور مجھے اس نے بدمعاشی کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے لیے لڑوں اور اس کے دشمنوں کا خاتمہ کروں۔"

"یعنی وہ تمہیں اپنی فورس کے سربراہ کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔"

"ہاں جب تک میں ٹھیک تھا اس کے لیے کارآمد تھا لیکن اب میں اس کے لیے ناکارہ ہو چکا ہوں اگر تم نے مجھے اس کے حوالے کیا تو وہ مجھے مار دے گا۔"

"میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو تمہاری ہی خواہش پوری کرے گا۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "تم بھی تو مرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں لیکن ایسے نہیں۔" اس نے التجا آمیز انداز میں کہا۔ "اس سے بہتر ہے تم مجھے مار کر کسی گم نام جگہ دفنا دو۔ وہ مجھے مارے گا اور پھر میرا مزار بنا دے گا۔ اس سے بھی کمائی کرے گا۔"

"لیکن وہ تمہیں آزاد کرانے کے لیے بے چین ہے اس کا کہنا ہے خاندان اور مریدوں کا اس پر دباؤ ہے۔"

"خاندان والے اپنے چکر میں ہیں لیکن وہ مرشد پر دباؤ نہیں ڈال سکتے اور جہاں تک مریدوں کا تعلق ہے وہ عقل کے اندھے اس کے غلام ہیں، ان کے پاس دماغ ہی کہاں ہے کہ سوچ سکیں۔" نادر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے جلد از جلد زندگی کی قید سے آزاد کرنے کے لیے بے چین ہے تاکہ گدی کا ایک ممکنہ امیدوار کم ہو، ویسے بھی اس کی اپنی اولاد جوان ہو رہی ہے۔ کچھ عرصے بعد اسے ویسے ہی میری ضرورت نہ رہتی۔"

مجھے خیال آیا۔ "مرشد کے پاس فاضلی بھی تو ہے۔"

"اس کی حرامی اولاد۔" نادر نے حقارت سے کہا۔ "وہ سمجھتا ہے کہ یہ بات دوسرے نہیں جانتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے۔ فاضلی کی ماں ایک زمانے میں مرشد کی ذاتی خادمہ تھی۔"

"تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے لیکن تم کوئی پارسا آدمی نہیں ہو تم نے کبھی سوچا کہ تمہاری بھی ایسی کتنی ہی اولادیں نہ جانے کہاں کہاں ہوں گی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر میں ایسا سوچنے والا ہوتا تو یہ سب کیوں کرتا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں جانے لگا تو اس نے التجا کی۔ "شہباز خدا کے لیے مجھے مرشد کے حوالے مت کرنا۔ اس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا صرف مرشد کا فائدہ ہوگا۔"

"میں اس پر غور کروں گا۔ لیکن تم اپنا خیال رکھو، زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور کوئی بھی نقصان اسے کھونے کا جواز نہیں رکھتا ہے۔ ہاں جب آدمی عزت سے زندہ رہنے کا حوصلہ کھو دے تب اسے مر جانا چاہیے۔"

"میں اس لفظ کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا۔" اس نے پیچھے سے کہا۔

"تب تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔" میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ نادر سے اس ملاقات سے میرے دل پر بوجھ سا آیا تھا۔ انسان بعض اوقات کیسے بدل جاتا ہے، اس کے احساسات اور جذبات بدل جاتے ہیں۔ اگرچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نادر میں یہ تبدیلی سچ مچ آئی تھی یا صرف ماحول کا اثر تھا۔ وہ واپس اپنے ماحول میں جاتا تو دوبارہ ویسا ہی ہو جاتا۔ مگر اس وقت مجھے اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہوئی تھی۔ میں وسیم کے کمرے میں آیا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ شاہ جی اس کے لیے دیسی چوزے کی یخنی بنا کر لایا تھا۔ اس کا خاصا خون بہا تھا اور اسے قوت بخش غذاؤں کی ضرورت تھی۔ شاہ جی نے یہ ضرورت پوری کرنے کی ذمے داری سنبھال لی تھی، اس نے کہا۔ "ایک ہفتے میں یہ پہلے سے اچھے نہ ہو جائیں تو بے شک میرا نام بدل دیجیے گا۔"

"تمہارا نام بدل کر کیا رکھیں گے؟" وسیم نے شرارت سے کہا۔ "شاہ جی ویسے بھی تم پر سوٹ نہیں کرتا ہے۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "درست کہا جی، ہم جیسے غریبوں پر یہ نام کہاں اچھا لگے گا۔ اپنا نام تو اللہ رکھا یا خیر دین ہونا چاہیے تھا۔"

"شاہ جی نام میں کیا رکھا ہے اصل چیز تو بندے کا کام ہوتا ہے اور وہ تم لاجواب کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "خاص طور سے کافی واقعی لاجواب بناتے ہو۔"

"اتنی لمبی تمہید کیوں باندھ رہے ہیں جی۔" وہ مسکرایا۔ "کافی ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

وہ چلا گیا تو وسیم نے کہا۔ "بہت اچھا آدمی ہے۔"

"آدمی سارے اچھے ہوتے ہیں بس نفس بہکاتا ہے۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور پھر وسیم کو نادر کے بارے میں بتایا۔ "ابھی اس کے پاس سے آ رہا ہوں خاصا بندے کا پُتر بنا ہوا ہے۔"

"اس جیسے لوگ کبھی بندے کا پُتر نہیں بنتے...."

وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ "قید میں رہ کر اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں رہا ہے اور اس کے سر میں موجود فرعونیت کے کیڑے بے دم ہو گئے ہیں لیکن جیسے ہی یہ آزاد ہوگا اس کا دماغ ٹھکانے پر آجائے گا اور یہ پہلے کی طرح فرعون بن جائے گا۔ سارے کیڑے پھر سے تندرست و توانا ہو جائیں گے۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے، وہ اب پہلے والا نادر نہیں رہا ہے۔"

"شہباز صاحب، اس کی حالت سے دھوکا مت کھائیں، میں تو کہہ رہا ہوں یہ سانپ ہمارے قابو میں ہے اس کا سر کچل دیں۔ اگر مارنا نہیں چاہتے تو اسے بچہ بنانے والا انجکشن دے دیں۔ ذرا غور کریں یہ اتنے عرصے سے ہماری قید میں ہے لیکن اس نے ایک بار بھی مرشد کے خلاف کوئی کام کی بات نہیں بتائی۔ صرف وہی کچھ بتایا جو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اصل میں یہ ہمیں بے وقوف سمجھ رہا ہے، اس لیے خود پر مظلومیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ کھانا پینا چھوڑ دیا ہے، مرنے کی باتیں کر رہا ہے۔ ابھی اسے آزاد کر دیں تو پھر اس کا اصل روپ سامنے آئے گا۔"

وسیم کی باتوں میں یہ بات قابلِ غور تھی کہ نادر نے اب تک ہمیں کوئی ایسی بات نہیں بتائی تھی جو مرشد کے خلاف سچ مچ ہماری مدد کرتی۔ اس کے باوجود میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی آئی ہے۔ وسیم مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ "شہباز صاحب کیا آپ نادر کو کوئی رعایت دینا چاہتے ہیں؟"

"نہیں.... اگر اس میں کوئی تبدیلی آئی ہے تو یہ اس کے لیے ہے، ہم تو اس کا فیصلہ اس کے جرائم کو مدِنظر رکھ کر کریں گے۔ ویسے اس کا کہنا ہے کہ مرشد ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ اسے اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اس سے چھٹکارا پالے۔"

"اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔ اگر مرشد کا بس چلے تو وہ ہمیں ذرا بھی رعایت نہ دے۔" وسیم نے کہا۔ "لیکن اس وقت وہ مجبور ہے اس لیے ہم اس سے جو فائدہ اٹھا سکتے ہیں ضرور اٹھائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے کہا۔ اتنے میں عبداللہ آ گیا اور ہم گپ شپ کرنے لگے۔ پھر وسیم کی دوا کا وقت ہو گیا تھا۔ اس میں جو پین کلر تھی اسے کھانے سے غنودگی آتی تھی

اس لیے ہم اسے سونے کا کہہ کر نیچے آ گئے۔ میں نے عبداللہ کو نادر سے ہونے والی اور پھر اپنی وسیم سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ بھی وسیم سے متفق نظر آنے لگا۔ ”وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اس نے تائید کی پھر کہا۔ ”اس نے منع کیا ہے کہ سعدیہ کو اس کی حالت کے بارے میں نہ بتایا جائے ورنہ وہ پریشان ہوگی۔“

”اچھا کیا اس نے بتا دیا ورنہ شاید میں بتا دیتا۔“

”وہ یہاں آنے پر اصرار کرے گی اور وسیم اسے بلانا نہیں چاہتا ہے۔“

”میں سوچ رہا ہوں کہ تین چار دن بعد جب وسیم لمبے سفر کے قابل ہو جائے تو اسے حویلی بھیج دوں اور سفیر کو بلوا لوں۔“

”ہاں اسے آرام کی ضرورت ہے اور سفیر نے بہت آرام کر لیا ہے۔ بیتو اور مانی کو بھی بلوا لیں۔ میں سوچ رہا ہوں اس کوٹھی کی الیکٹرانک سیکیورٹی مضبوط ہونی چاہیے، ابھی تو ہم عام طریقے سے کام چلا رہے ہیں۔ مانی یہ کام بہتر طور پر کر سکے گا۔“

”ٹھیک ہے وسیم سے بات کر لو اور تین دن بعد اسے بھیج دینا۔ سفیر، مانی اور بیتو ساتھ آ جائیں گے۔“

”آپ کا مطلب ہے جو وسیم کو چھوڑنے جائیں گے وہی انہیں لے آئیں گے۔“

”بالکل اس معاملے میں سیکیورٹی پوری رکھنی ہے۔ یہاں ہم دشمن کی نظروں میں نہیں ہیں لیکن حویلی پر ان کی نگرانی ضرور ہوگی، بے شک آس پاس نہیں ہوں گے لیکن آنے جانے کے راستوں پر ضرور نظر رکھے ہوں گے۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”کیوں نہ ہیلی کاپٹر استعمال کیا جائے۔“

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب سفیر، مونا اور سعدیہ ہیلی کاپٹر میں تھے اور اسے گن سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے سب محفوظ رہے تھے سوائے مونا اور سفیر کے ہونے والے بچے کے کسی کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، ہیلی کاپٹر والا آئیڈیا ٹھیک نہیں ہے۔ روڈ کا سفر محفوظ رہے گا۔“

”ٹھیک ہے میں پلان کرتا ہوں کہ کیسے جائیں گے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”آپ وسیم سے بات کر لیں کیونکہ وہ اتنی آسانی سے نہیں مانے گا۔“

”آسانی سے نہیں مانے گا تو زبردستی بھیج دیں گے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”آپ بھیج سکتے ہیں۔“ عبداللہ مسکرایا۔ ”میں نے دیکھا ہے کہ وسیم آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے وسیم دوستوں کا دوست ہے تم کبھی کہہ کر دیکھو وہ تمہاری بات کو بھی اتنی ہی اہمیت دے گا۔“ میں نے یقین سے کہا۔

”نادر کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟“

”ہاں اسے اس وقت تک آزاد نہیں کرنا ہے جب تک مرشد میرے کیس ختم نہیں کر دیتا۔ ندیم بتا رہا تھا کیس ری فائل ہو گئے ہیں اور اگر پولیس نے تعاون کیا تو ایک سے ڈیڑھ مہینے میں سارے کیس ختم ہو سکتے ہیں۔“

”پولیس اس وقت حرکت میں آئے گی جب اس پر مرشد کا دباؤ ہوگا۔ آپ بتا رہے ہیں کہ اس نے ندیم کو بھی دھمکیاں دی ہیں۔“

”ہاں مگر وہ وکیل ہے۔ مرشد اس سے الجھنے سے گریز کرے گا۔ اس نے اس کو مناسب جواب دیا ہے۔“

”آپ مرشد سے بات کریں گے۔ کیونکہ وہ کل رات کے واقعات پر جھنجلایا ہوا ہوگا۔“

”مجھے اس بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس جگہ کا بہ ظاہر مرشد سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر اس نے کہا تو میں انجان بن جاؤں گا۔ ہاں اس سے بات ضرور کرنا چاہوں گا۔ اس کا ردِعمل جاننا ضروری ہے اور دھمکانا بھی۔ ورنہ ممکن ہے وہ کوئی حرکت کرنے کا سوچ رہا ہو۔“

میں اوپر آیا۔ انٹرنیٹ سے کال ملاتے ہوئے میں نے مانی کو دعا دی، اس کی وجہ سے یہ بڑی سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ اب دشمن سے بغیر کسی نمبر کے بھی بات کی جا سکتی ہے بغیر اس خوف کے کہ وہ میرا سراغ لگا لے گا۔ مرشد کا پرانا موبائل نمبر میرے ذہن میں تھا میں نے وہی ملایا لیکن وہ بند جا رہا تھا مجبوراً مجھے مرشد ہاؤس کے نمبر پر کال کرنا پڑی۔ اس بار نستعلیق سیکریٹری کے بجائے کسی ملازم نے کال ریسیو کی۔ ”کون ہے جی؟“

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مرشد نے دنیا کے ہر کام کے لیے ملازم رکھے ہوئے تھے تو اس نے مرشد ہاؤس میں ایک کال آپریٹر رکھنے کی زحمت کیوں نہیں کی تھی۔ وہ سیاست دان اور معروف گدی نشین تھا اور یقیناً اسے کال کرنے والوں کی کمی نہیں ہوگی لیکن مرشد ہاؤس میں کال سیکریٹری یا کوئی ملازم ہی ریسیو کرتا تھا۔ میں نے رعب سے کہا۔ ”مجھے مرشد سے بات کرنی ہے۔“

”سرکار سے۔“ ملازم نے میری بے ادبی پر جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

”سرکار ہوگا وہ تمہاری ماں کا۔“ اس بار میں نے شرافت بالائے طاق رکھتے ہوئے غرا کر کہا۔ ”اسے بولو اس کے باپ کی کال ہے۔“

ملازم غالباً دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتا ہوا مرشد کو بتانے گیا اور خود گیا تھا کیونکہ اس جاہل کو فون کال ٹرانسفر کرنا بھی نہیں آتی تھی۔ کچھ دیر بعد مرشد کی آواز آئی۔ ”ہیلو.....“

اس نے میرا نام نہیں لیا تھا لیکن سمجھ گیا ہوگا کہ اس طرح کال کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ ”تم ایک ڈھنگ کی فون آپریٹر نہیں رکھ سکتے؟“

”شہباز تم حد سے بڑھ رہے ہو؟“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

میں سمجھا کہ اس کا اشارہ کل والے واقعے کی طرف ہوگا اس لیے میں پہلے سے طے شدہ پالیسی کے تحت انجان بن گیا۔ ”میں سمجھا نہیں؟“

”تمہیں ایک معمولی ملازم سے میرے بارے میں اس طرح کہنے کی کیا ضرورت تھی، اس اُلو کے پٹھے نے بھی چار لوگوں کے سامنے تمہاری بات دہرا دی۔“

مرشد کی حالت کا سوچ کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ ”اس میں بھی تمہارا قصور ہے، میں نے پہلے بھی کہا ہے کوئی فون آپریٹر رکھ لو اس طرح روز روز کی بے عزتی سے بچ جاؤ گے۔“

”پہلی بار میرے کسی ملازم نے ایسی بے وقوفی کی ہے۔“

”اب اس بے چارے کا کیا ہوگا تم نے اسے یقیناً اپنے جلادوں کے حوالے کر دیا ہوگا۔“

مرشد ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر رکھائی سے بولا۔ ”تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔ تم نے کل رات میرے ایک ٹھکانے پر حملہ کر کے اچھا نہیں کیا ہے۔ میرے چار آدمی مارے گئے اور ایک درجن زخمی ہوئے ہیں۔“

”کل رات.....“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”مرشد کل تم نے یقیناً اپنی درگاہ کے لنگر کا کھانا کھایا ہوگا اور تمہارا پیٹ خراب ہوگا جبھی تمہیں ایسا خواب آیا۔ کل رات میں اپنے بستر میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔“

”مجھے احمق مت سمجھو، میرے ساتھی احمق تھے جو تمہیں پہچان نہیں سکے۔ لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ یہ تمہاری کارروائی ہو سکتی ہے۔ فرخ شاہ کے بارے میں بھی مجھے بعد میں پتا چلا ورنہ اس کی لاش بھی نہ ملتی۔“

”کون فرخ شاہ؟“ میں نے ایک بار پھر کمالِ سادگی کا مظاہرہ کیا۔

”میں اس فرخ شاہ کی بات کر رہا ہوں جو ایک زمانے میں راجا عمر دراز کا ایجنٹ تھا۔“

”اگر ایسا کوئی فرخ شاہ تھا تب بھی ضروری نہیں ہے میں اس سے واقف ہوں اور بائی دی وے.... فرخ شاہ سے تمہارا کیا تعلق؟“

”وہ میرے آدمیوں کے قبضے میں تھا لیکن تم لوگوں نے اسے چھڑا لیا اور اس کے بیوی بچوں سمیت اسے کہیں اور منتقل کر دیا۔ میرے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں اور وہ زیادہ دن چھپا نہیں رہے گا۔“

”ممکن ہے مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”شہباز تم جھوٹ بول رہے ہو۔ فرخ شاہ نے خود قبولا تھا کہ اس نے کن لوگوں کو اپنا مکان کرائے پر دیا تھا۔ وہ تمہارے ساتھی تھے۔“

”تم ایک ایسے شخص کی بات پر یقین کرتے ہوئے مجھے الزام دے رہے ہو جسے میں جانتا بھی نہیں ہوں۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے تمہاری نیت میں کوئی فتور آ گیا ہے اور تم اپنے ہی معاہدے سے پیچھے ہٹنا چاہ رہے ہو۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ مرشد جھنجلا گیا۔ ”تم میرے ساتھ چالاکی سے کام لے رہے ہو، ایک طرف میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے ہیں اور دوسری طرف تم میرے خلاف کارروائی کے لیے آزاد ہو۔“

”مرشد میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں اگر اس بہانے تم نے میرے یا میرے کسی ساتھی کے خلاف کوئی کارروائی کی تو اس کے نتائج تمہارے حق میں نہایت سنگین ہوں گے۔ اس لیے کچھ کرنے سے پہلے خوب سوچ لینا۔“

”میرا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں ہے لیکن میں تمہیں بھی خبردار کر رہا ہوں اگر تمہاری طرف سے پھر ایسی کوئی کارروائی ہوئی تو کیس ری فائل کا کام رک جائے گا۔“

”تب تم اس بہانے یہی کرنا چاہتے ہو۔“ میں نے

اپنا انداز برقرار رکھا۔ ”مرشد تمہارے چچازاد بھائی کا نام کیا ہے۔ شاید ارشاد علی ہے۔“

”ہاں۔“ اس کے لہجے میں تشویش آگئی۔ ”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ایسے ہی .... جس طرح تم میرے بارے میں ساری خبریں رکھتے ہو اسی طرح میرا حق بھی ہے کہ تمہارے بارے میں مکمل معلومات رکھوں۔“

”شہباز تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ اس کے لہجے کی تشویش بڑھ گئی تھی۔ ”تم جانتے ہو کہ میرے اپنے چچازاد بھائیوں سے تعلقات اچھے نہیں ہیں اس لیے تم ان سے ملنے کی بات کر رہے ہو؟“

”یہ بھی ایک آپشن ہے۔“ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”مجھے امید ہے تم مجھے مجبور نہیں کرو گے کہ میں ان کی طرف جاؤں۔ ویسے مجھے کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود تم سے اور تمہارے سارے خاندان سے نمٹ سکتا ہوں۔“

”اب تم دعوے کر رہے ہو؟“

”نہیں، دعویٰ نہیں ہے۔“ میں نے تردید کی۔ ”یہ حقیقت ہے۔“

”نادر کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے، اس نے جینے کی امید چھوڑ دی ہے لیکن تم جانتے ہو آج کل آدمی اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتا ہے، اسے زندہ رکھنے کے کئی طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ تم فکر مت کرو اسے زندہ ہی تمہارے حوالے کیا جائے گا۔ ہاں تم اس کی جان لے لو تو الگ بات ہے۔“

”میں اس کی جان کیوں لوں گا، وہ میرا ایک ہی تو بھائی ہے۔“ وہ چالاکی سے بولا۔

”تمہارے بھائی نے تمہیں اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ تمہارے حوالے کرنے کے بجائے میں اسے اپنے ہاتھ سے مار دوں۔“

”وہ دشمنوں کی باتوں میں آگیا ہے۔“

”اگر تمہارا اشارہ ہماری طرف ہے تو میں یقین دلاتا ہوں ہم نے نادر کا ذرا بھی برین واش نہیں کیا ہے۔“

”میں اپنے چچازادوں کی بات کر رہا ہوں، میں نے بے وقوفی کی تھی جب نادر کو مرشد ہاؤس سے دور بھیجا اور ان لوگوں کو موقع مل گیا۔“

”تم ان سے خوفزدہ ہو؟“

”نہیں۔“ وہ جھنجلا گیا۔ ”مجھے صرف رشتے داری کا خیال ہے ورنہ میں ان کو ایک دن میں مٹادوں۔“

مرشد یقیناً غصے میں تھا ورنہ وہ میرے سامنے اور فون پر اس طرح کی بات نہ کرتا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا اس لیے اس نے جلدی سے بات بدل دی۔ ”شہباز.... اب میں اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتا ہوں۔“

”اپنا پورا زور لگاؤ اور کیسوں کی واپسی کا عمل تیز کرو۔ جیسے ہی مجھے ان سے چھٹکارا ملے گا میں نادر کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“ میں نے کہا پھر مجھے صابر کا خیال آیا۔ ”مرشد تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو لیکن خود تم کیا کر رہے ہو۔ صابر کو کس نے مارا ہے؟“

”صابر....؟“ وہ بوکھلایا پھر سنبھل کر ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا میں نے بھی اخبار میں اس کے بارے میں پڑھا ہے۔“

”مرشد وہ تم سے بچتا پھر رہا تھا اور تمہارے آدمی اس کے پیچھے تھے۔ اس کے دو غدار ساتھی تو ہمارے ہاتھ لگ گئے تھے اور انہوں نے خود تم سے گٹھ جوڑ کا اعتراف کیا تھا۔ صابر کے گھر میں جو ہوا وہ تمہارے کہنے پر ہوا اور اس میں تمہارے ساتھی بھی شامل تھے۔“

”تم جو چاہے کہتے رہو۔“ اس نے اس بار سکون سے کہا۔ ”تمہارے کہنے سے کوئی جرم میرے کھاتے میں شامل نہیں ہوگا۔“

”کیونکہ تم ایک بارسوخ سیاست دان اور جاگیر دار، گدی نشین ہو۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم نے یہ سوچا کہ باقی ہر لحاظ سے ایک عام آدمی ہو۔ تمہیں بالکل کسی ایسی وجہ سے موت آسکتی ہے جو کسی عام آدمی کی موت کی وجہ ہو سکتی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے تکبّر سے کہا۔ ”ایک عام آدمی اور مجھ میں بہت فرق ہے۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ”ایک عام آدمی کتنا بھی برا ہو جائے وہ تمہارے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔“

”میرا خیال ہے تمہارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں رہی ہے۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”نہیں ایک بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آئندہ میرے وکیل کو غیر متعلقہ باتوں کے لیے کال مت کرنا۔ اس

نے مجھ سے کہا کہ میرے مقدمات بھی بھاڑ میں جائیں مگر تمہاری آئندہ ایسی کسی حرکت کے جواب میں وہ تمہیں عدالت میں گھسیٹ لے گا۔ تم سوچ سکتے ہو اس قسم کی مقدمے بازی تمہاری سیاسی ساکھ کے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

”وہ بلاوجہ بھڑک رہا ہے، میں نے اسے ایسا کیا کہہ دیا؟“ مرشد نے ناگواری سے کہا۔

”مرشد میں نے تمہاری ریکارڈنگ سنی ہے۔ تم اپنے کسی ایمان فروش مرید سے نہیں ایک معزز وکیل سے بات کر رہے تھے اگر بات عدالت تک گئی تو جج بھی اس فرق کو نوٹ کرے گا۔ سب منظرِ عام پر آئے گا۔“

”ٹھیک ہے اب میں اسے کال نہیں کروں گا۔“ مرشد نے جلدی سے کہا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”دوسرے اپنے وکیل سے کہو کہ اپنے سپریم کورٹ کا وکیل ہونے کا خناس ذہن سے نکال دے اور اس معاملے میں وہی کرے جو ندیم اسے کہے، بلاوجہ اپنی قابلیت نہ جھاڑے۔“

”تم فکر مت کرو اسے پہلے ہی ہدایت دے چکا ہوں اور وہ تمہارے وکیل سے مکمل تعاون کر رہا ہے۔“

”ندیم نے بھی یہی بتایا ہے مگر تم ایک بار پھر اسے کہہ دو۔ دوسرے نیا تفتیشی افسر شیر شاہ تمہارے آدمیوں میں شامل ہے؟“

”وہ میرے آدمیوں میں نہیں ہے لیکن اس سے جو اوپر بیٹھے ہیں ان سے تعلق ہے۔“

”دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ نیا تفتیشی افسر کیسوں کی ری فائلنگ میں روڑے اٹکائے گا تو یہ تمہارا قصور نہیں ہوگا۔“

”تم بلاوجہ بدگمان ہو رہے ہو۔ میں نے کب کہا کہ وہ روڑے اٹکائے گا۔ وہ اپنے اوپر والوں کے حکم سے انکار نہیں کر سکتا...... ویسے تم نے اکرم چشتی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت کام کا آدمی تھا، یوں سمجھ لو میں اسے براہِ راست حکم دے سکتا تھا لیکن ہر پولیس افسر اس طرح آنکھ بند کر کے میری بات نہیں مانے گا۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے لیکن سنا ہے دشمنوں نے ڈی ایس پی صاحب کو کسی قابل نہیں چھوڑا ہے سوائے بیوی کے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”وہ کیا کہتے ہیں مکافاتِ عمل.... شاید ان کی رسی کھینچنے کا وقت آگیا تھا۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور تمہیں بھی افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس کا محکمہ ایسی کالی بھیڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اب تک کسی نے اکرم چشتی کی جگہ لینے کی درخواست نہیں کی تم سے؟“

وہ ہنسا۔ ”کئی آئے تھے مگر فی الحال میں نے سب کو ٹال دیا ہے۔ ایک بار ان کو منہ لگا لو تو یہ آئے دن دھرنا دیے بیٹھے ہوتے ہیں حرام کھانے کے چکر میں۔“

”اور تمہارے پاس حرام ہی حرام ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”گدھ بھی تو وہیں آتے ہیں جہاں مردار ہوتا ہے۔ خیر چھوڑو، اپنے فاضلی صاحب کا حال احوال سناؤ۔ میرا خیال ہے خیر سے صحت مند ہو گئے ہوں گے۔“

”فاضلی کو میں باہر بھیج رہا ہوں۔“ اس نے گویا مجھے آگاہ کیا۔ ”صحت یاب ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا۔“

”افسوس کہ تم نے ابھی اسے پہچانا نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مرشد تم میرے دشمن ہو لیکن میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں تم اپنی آستین میں سانپ نہیں اژدھا پال رہے ہو۔“

”تم مجھے فاضلی کے بارے میں نہیں بہکا سکتے، میں اسے تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”اس کی قید میں، میں رہا ہوں تم نہیں اس لیے تم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”بہرحال تمہاری مرضی۔“

میں نے کال کاٹ دی۔ اگر مرشد نے سچ کہا تھا تو اسے یقیناً فاضلی سے کوئی انسیت تھی ورنہ وہ اسے ہم سے بچانے کے لیے یوں کہیں دور نہ بھیجتا اور اس کا امکان بھی تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہو۔ ویسے فاضلی بھی مجھے کہیں جانے والا نہیں لگتا تھا۔ اس کے عزائم بہت اونچے تھے اور مرشد کو ان کی بھنک پڑ جاتی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے مینا اُڑ جاتے اور وہ فاضلی سے اپنی انسیت بھول کر اسے ملک سے باہر بھیجنے کے بجائے دنیا سے بھیجنے پر تل جاتا۔ وہ میرے کہنے پر کبھی یقین نہ کرتا لیکن مجھے یقین تھا کہ جلد وقت خود اسے فاضلی کی اصلیت بتا دے گا۔ مرشد کسی پر یقین کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ جو اپنے سگے بھائی کے درپے ہو جائے وہ اپنی ناجائز اولاد کو کیوں بخشے گا۔ صرف اتنا یقین ہونے کی دیر تھی کہ فاضلی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا

کہ اس کے بعد مرشد اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرے گا۔ معاف کرنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ میں نے اس معاملے کو مرشد اور فاضلی کی قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔

اس سے بات کرکے یہ تصدیق ہوگئی تھی کہ اکرم چشتی بچ مچ بیکار ہوگیا تھا۔ اگر اسے نوکری سے نہ نکالا گیا تو کسی ایسی ڈیوٹی پر لگا دیا جائے گا جہاں وہ بیٹھ کر مکھیاں مار سکے۔ ویسے اس کے لیے سب سے موزوں جاب شکایات سننے کی ہوسکتی تھی۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ اکرم چشتی کا بہ چشم خود معائنہ کیا جائے لیکن فوراً ہی میں نے خیال جھٹک دیا۔ اکرم چشتی اندھا اور بہرا ہوا تھا۔ باقی پولیس فورس کی آنکھیں بالکل سلامت تھیں۔ ایک بار میں اکرم چشتی کو دیکھنے جاتا تو واپسی کیسے ہوتی۔ مرشد کے لہجے میں گزشتہ رات کی کارروائی کی جھنجلاہٹ تھی۔ لیکن وہ اس معاملے میں اتنا... برافروختہ بھی نہیں تھا کہ مجھ سے کیا معاہدہ توڑ دیتا۔ ظاہر ہے یہ اس کا براہِ راست نقصان نہیں تھا بلکہ اس کے پالتو ڈاکوؤں کا ذاتی نقصان تھا اور ظاہر ہے مرشد کو اس کی کیا پروا ہوسکتی تھی۔ اس سے گفتگو کرکے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جلد از جلد نادر کو حاصل کرنے کے لیے میرے خلاف کیسوں کو جلد ختم کرنے میں سنجیدہ ہے۔

وسیم سو رہا تھا اور عبداللہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے اکیلے ہی لنچ کیا اور پھر حویلی کال کی۔ سب سے بات ہوئی۔ سفیر کو میں نے اشارے کنائے میں سمجھا دیا تھا کہ وسیم آنے والا ہے اور وہ اس کی جگہ یہاں آئے گا۔ وہ تاڑ گیا کہ کوئی چکر ہے جب میں نے فون بند کیا تو سفیر کے نمبر سے کال آگئی۔ وہ اس وقت کہیں اور سے بول رہا تھا۔ ”شہباز کیا ہوا ہے؟“

”یار ایک مہم پر گئے تھے مہم تو کامیاب رہی اور اس سے پہلے ایک بڑا خزانہ بھی ہاتھ لگا لیکن اس مہم کے دوران وسیم کی ران میں گولی لگی ہے۔ ویسے ٹھیک ہے مگر مکمل ٹھیک ہونے میں پندرہ دن لگ سکتے ہیں۔“

”اچھا! صبح تو سعدیہ کی اس سے بات ہوئی ہے۔“ سفیر نے حیرت سے کہا۔ ”اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا۔“

”وسیم منجھا ہوا شوہر ہے یار۔ بہرحال تو بھاپ بھی مت نکالنا، میرا اشارہ مونا کی طرف ہے، تیرے پیٹ میں کوئی بات نہیں ٹکتی ہے۔“

سفیر کھسیا گیا۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ وسیم کب تک آئے گا؟“

”چند دنوں میں۔“ میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ ”لیکن تم لوگ ایک گھنٹے کے نوٹس پر روانگی کے لیے تیار رہنا۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں مانی اور بیتو سے نہیں کہوں گا وہ اپنی دیدیوں کو پھوٹ دیں گے۔“

”بیتو کی دیدی تو سادی ہے، یہ مانی کی دیدی کون ہے؟“

”مونا... آج کل حویلی میدان جنگ بنی ہوئی ہے۔ سعدیہ اور مانی کی ٹھنی رہتی ہے۔ مونا اپنے بھائی کی حمایت کرتی ہے اور بیتو اپنی دیدی کی۔“

میں ہنسا۔ ”وہی تیری ہوتی ہوگی۔“

”کم بختی ہے بھائی اگر غلطی سے بھی کسی دوسرے کی حمایت کردو تو کوئی نہ کوئی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔“

”یہ کوئی مونا ہی ہوتی ہوگی۔“

”ہاں یار فارم میں آگئی ہے۔“

”یہ اچھا ہے سفیر، وہ باہمت لڑکی ہے ورنہ اس کا دکھ معمولی نہیں تھا۔ اولاد کا دکھ ہر دکھ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔“

سفیر چپ ہوگیا پھر اس نے سرد آہ بھری۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے اس بچے کے لیے نہ جانے کیا کیا سوچ لیا تھا جو ابھی ماں کے پیٹ میں شاید مہینے کا بھی نہیں ہوا تھا.... مجھے اس کا خیال آتا ہے تو یقین کر دل میں جیسے سوئی سی چبھ جاتی ہے۔“ سفیر کا لہجہ بدل گیا۔ ”مونا کی خاطر میں معمول کے مطابق رہتا ہوں۔“

”حوصلہ کر یار۔“ میں نے اسے پیار سے سمجھایا۔ ”اسی سے مونا کے دکھ کا اندازہ کرلے۔ ماں کا دکھ باپ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اولاد کے لیے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے، جبھی میری آنکھ کھلتی ہے تو مونا سوتی بن جاتی ہے پر یار اس کے چہرے پر آنسو ہوتے ہیں۔“

”سفیر وہ بچہ اللہ کی امانت تھی اور جو آیندہ دے گا وہ بھی اسی کی امانت ہوں گے۔ جب چاہے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔ مجھے یقین ہے اس بچے کے بدلے تم دونوں کو اولاد کی بہت ساری خوشیاں دے گا۔“

”انشا اللہ۔“ اس نے کہا۔

”اگر مونا سیٹ ہے تب آجا ورنہ ابھی وہیں رہ، یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ہم ہاتھ پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہیں۔“

”یار میں سوچ رہا ہوں کہ تیرے پاس آنے کے بہانے ایک چکر دبئی کا لگا لوں۔ وہاں میں نے کمپنی بنائی تھی کچھ اس کے معاملات بھی دیکھوں گا اور وہاں موجود رقم کے ٹرانسفر کا بندوبست بھی کروں گا۔ ویسے وہ رقم میں یہاں سے بھی نکال سکتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے اس رقم کو وہیں رہنے دے بلکہ ہوسکے تو کسی نفع بخش کام میں لگا دے۔ ایسے ہی پڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

”میں سوچ رہا ہوں اسے گولڈ میں تبدیل کرلوں۔ سنا ہے آنے والے چند سالوں میں سونے کی قیمت دوگنی ہو جائے گی۔“

”سنا تو میں نے بھی یہی ہے اور پھر سونے میں تبدیل کرانے سے نقصان بھی نہیں ہوگا یہ بہت آسانی سے کیش ہو جانے والی چیز ہے۔“

سفیر کو یاد آیا۔ ”تو کسی خزانے کا ذکر کر رہا تھا۔“

میں نے اسے ڈاکوؤں سے ملنے والی رقم اور سونے کے بارے میں بتایا۔ ”تقریباً ساڑھے سات کروڑ روپے مالیت کی چیزیں ہیں۔“

”عبداللہ سے کہو کہ سونا فروخت کرنے کے بجائے اسے چھوٹی بارز میں تبدیل کرالے۔ کسی لاکر میں رکھوا دینا۔ بعد میں کام آئیں گی۔“

”بعد میں کب؟“

”جب ان چکروں سے جان چھوٹ جائے گی تو اپنا گھر اور بزنس بھی تو اسٹیبلش کرنا ہوگا۔“

”یار یہ دولت حلال کی نہیں ہے۔ اسے عام استعمال میں نہیں لانا ہے۔ اس سے فی الحال ہمارے اخراجات پورے ہو رہے ہیں اور اگر باقی بچی تو لوگوں میں بانٹ دیں گے۔“

”چل کوئی بات نہیں، ہیروں والی رقم تو ہے۔“

”نہیں وہ تیری اور مونا کی ہے۔“

”تب تو کیا کرے گا؟“ سفیر خفگی سے بولا۔ ”محنت مزدوری کرے گا۔“

”وہ بھی کرلوں گا۔“ میں ہنسا۔ ”ویسے میری خاصی رقم ندیم کے پاس پڑی ہے، اگر اس کی فیس سے بچ گئی تو اپنا کام دوبارہ شروع کروں گا تو جانتا ہے یہ صرف کام نہیں ہے بلکہ میرا شوق بھی ہے۔ اگر رقم نہیں ہوئی تو تجھ سے ادھار لے لوں گا۔“

”بکواس نہ کر اس میں تیرا اور وسیم کا حصہ بھی ہے۔“

”اس طرح تو بیتو بھی ہوا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”وہ بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھا جس میں ہیرے ملے تھے۔“

”ہاں وہ بھی ہے۔ چار حصے دار ہیں اس رقم کے۔“

”بس تو آجا اور دبئی جا کر یہ کام کرلے۔“ میں نے کہا۔ ”مونا کو نہیں بتائے گا۔“

”اسے بتایا تو وہ حویلی سے نہیں نکلنے دے گی۔“

سفیر سے گفتگو کے دوران عبداللہ آگیا تھا اس نے ایک بڑا سا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ بیگ میرے سامنے میز پر رکھ کر وہ اندر چلا گیا۔ شاید اس نے کھانا نہیں کھایا تھا جب تک میں نے سفیر سے بات کی وہ واپس آگیا۔ موبائل بند کرکے میں نے اس سے پوچھا۔ ”کہاں گئے تھے؟“

”گیا تو ایک اور کام سے تھا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کی تجویز پر عمل درآمد شروع کر دیا جائے۔ میں دس لاکھ لے گیا تھا انہیں پانچ ہزار کے نوٹوں میں تبدیل کرا لایا ہوں۔“

اس نے بیگ سے پانچ ہزار کے نوٹوں والی دو گڈیاں نکالیں۔ ”ایک جاننے والا بنک منیجر ہے میں نے اس سے بات کی ہے۔ تھوڑی تھوڑی کرکے ساری رقم اسی طرح کرا لوں گا۔“

”یہ اچھا کام شروع کیا ہے تم نے۔“ میں نے کہا اور اسے سفیر کی تجویز کے بارے میں بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔

”اتفاق سے میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا اس لیے سامان لینے گیا تھا۔“ اس نے بیگ سے وہ مخصوص برتن نکالا جس میں سونا پگھلایا جاتا تھا اور اس کام کے باقی اوزار بھی تھے۔ وہ سو گرام کے بار کی ڈائی بھی لایا تھا۔ یہ سامان عام نہیں ملتا ہے لیکن مل جاتا ہے۔ عبداللہ نے شاہ جی کو بلا لیا اور زیورات کو پگھلا کر بار میں تبدیل کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ یہ کام اوپر میرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تو میں دلچسپی لیتا رہا لیکن پھر بوریت ہونے لگی تو وسیم کے کمرے میں آیا۔ وہ جاگ گیا تھا اس نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیے تھے۔ کپڑوں میں وہ آرام دہ ...ٹی شرٹ اور کھلا شارٹ پہن رہا تھا کیونکہ زخم کی وجہ سے وہ پتلون نہیں پہن سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ عبداللہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے دلچسپی سے کہا۔ ”اچھا میں بھی دیکھ کر آتا ہوں۔“

وہ واکر کے سہارے چلا گیا اور حسبِ توقع دس منٹ بعد بور ہو کر واپس آ گیا۔ ”بڑا مشکل کام ہے، ابھی تک صرف ایک درجن بارز بنی ہیں۔“

”کم سے کم سو بارز بنیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”اتنا سونا تو ہے۔“

”میری سعدیہ سے بات ہوئی تھی۔“

”میری بھی سب سے بات ہوئی ہے۔ میں نے سفیر کو بتا دیا ہے۔ تم ایک دو دن میں جیسے ہی سفر کے قابل ہوئے حویلی روانہ ہو جانا۔ وہاں سے سفیر، مانی اور بیتو آجائیں گے۔“

”میرا کیا کام ہے وہاں؟“

”تم آرام کرو گے اور سعدیہ کے ساتھ رہو گے۔ جب تک مکمل فٹ نہیں ہو جاتے۔“

”لیکن.....“ اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

”وسیم یہ میرا حکم ہے۔ دوسرے سفیر کو آنا ہے وہ دبئی جائے گا اپنے بعض معاملات نمٹانے کے لیے۔“

”دبئی۔“ وسیم فکر مند ہو گیا۔ ”آپ کو یاد نہیں ہے ہم وہاں سے کس طرح نکلے تھے اور پولیس ہماری تلاش میں تھی؟“

”تمہاری نہیں سعدیہ کی تلاش میں کیونکہ اسی کے خلاف وہاں رپورٹ ہوئی تھی کہ اس کا پاسپورٹ اصلی نہیں ہے۔ سفیر، مونا اور تمہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سفیر کے پاس بزنس ویزا ہے۔ وہ جب چاہے آجا سکتا ہے۔“

”تب ٹھیک ہے بلکہ اس لحاظ سے اچھا ہے کہ ہمارے پاس ایک متبادل ٹھکانا برقرار رہے گا۔ اگر یہاں مسائل زیادہ ہو جائیں تو ہم وہاں بھی جا سکتے ہیں۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ ہم اس پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ سکتے کہ مرشد اینڈ کمپنی ہم سے دشمنی ترک کر دے گی۔ ہمیں متبادل طریقوں پر کام کرنا ہوگا۔ جیسے ہی میرے مقدمات ختم ہوں گے میں بھی دبئی کا ویزا حاصل کر لوں گا۔“

”میرا ایک مشورہ ہے۔ رقم کی کمی نہیں ہے۔ آپ اور میں بھی بزنس ویزا حاصل کر لیتے ہیں۔ اس پر چار دوسرے افراد کو لے جانے کی بھی اجازت ہے۔ بزنس ویزے میں فیملی بھی آجاتی ہے۔ ہم تین، ایک درجن دوسرے افراد کو بھی لے جا سکتے ہیں۔“

”بالکل، سفیر آتا ہے تو میں اس سے انہی خطوط پر بات کرتا ہوں ویسے میرا اندازہ ہے وہ بھی اسی لیے جا رہا ہے۔“

وسیم نے اظہار نہیں کیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ حویلی اور سعدیہ کے پاس جانے کا سن کر خوش ہو گیا تھا۔ رات ڈاکٹر نے اس کے زخم کی دوسری ڈریسنگ کی۔ عبداللہ نے کہا کہ خود کرنے کے بجائے بہتر ہے ڈاکٹر کو دکھا لیا جائے تا کہ زخم میں کوئی معمولی سا مسئلہ ہو رہا ہو تو اسے بروقت دیکھ لیا جائے۔ مگر زخم درست انداز میں بھر رہا تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر تھا جو نادر کو دیکھنے آتا تھا اور عبداللہ نے اس سے کنٹریکٹ کر رکھا تھا۔ اس نے مزید احتیاط کے طور پر وسیم کو ایک اینٹی بایوٹک انجکشن بھی دے دیا۔ اس کے اثر سے زخم بھرنے کی رفتار مزید بڑھ جاتی۔ مسلسل آرام، خوراک اور علاج سے وسیم کی حالت کہیں بہتر ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اگلے چھتیس گھنٹے میں سفر کے لیے تیار ہو جاتا۔ یعنی اسے پرسوں کسی وقت روانہ کیا جا سکتا تھا۔ عبداللہ نے طے کیا تھا کہ وہ ایاز اور چھ دوسرے محافظوں کے ہمراہ جائے گا جو پوری طرح مسلح ہوں گے۔ وہ تین گاڑیوں میں جائیں گے اور اسی طرح سفیر، مانی اور بیتو کو لے آئیں گے۔

عبداللہ نے اگلا دن بھی لگا کر تمام سونا بارز میں بدل لیا تھا۔ سو گرام خالص سونے کی ایک سو اٹھارہ بارز تیار ہوئی تھیں۔ یعنی تقریباً بارہ کلو گرام سونا تھا۔ اس سونے کے لیے کسی بنک میں لاکر لینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ رقم کے لیے کسی تجوری کے بجائے اسی لاکر پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ایک تو بھاری بھرکم تجوری کی نقل و حرکت کسی ہنگامی موقع پر مسئلہ بن جاتی۔ رقم لاکر میں بھی محفوظ تھی اور بہ وقت ضرورت اسے کہیں لے جانا بھی اتنا مشکل نہیں تھا۔ اس کا لاک سسٹم کسی تجوری سے کم محفوظ نہیں تھا۔ عبداللہ رقم کو بڑے نوٹوں میں تبدیل کرا لیتا تو وزن کا مسئلہ بھی نہ رہتا۔ ایاز بھگوال گیا تھا اور وہاں اس نے کوئی جگہ دیکھ لی تھی۔ کیونکہ معاملہ اس پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے طور پر جگہ دیکھ کر فیصلہ کر لے۔ اس لیے اس نے جگہ لے لی اور پھر وسیم کو اطلاع کی تھی۔ یہ پرانا حویلی طرز کا دو منزلہ مکان تھا۔ یہاں بجلی کے ساتھ گیس کی سہولت بھی تھی۔ ساتھ میں ایک چھوٹی سی جھیل بھی تھی جس میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا۔ ایک پرانے جاگیردار گھرانے کی حویلی تھی مگر مقدمے بازیوں اور دشمنی میں سب بک گیا تھا یہی حویلی بچی تھی۔ خاندان کے لوگ شہروں میں جا بسے تھے۔ حویلی خالی پڑی تھی اسی لیے اسے کرائے پر دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جس آدمی نے ایاز کو حویلی کا بتایا تھا اس نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ حویلی آسیب زدہ تھی۔ ایاز نے وسیم کو بتاتے ہوئے کہا۔

”جب ہم جائیں گے تو سارے بھوت خود بھاگ جائیں گے۔“

طے ہوا تھا کہ ایاز وسیم کو لے کر جائے گا اور اس دوران میں عبداللہ باقی آدمیوں کے ساتھ مل کر کوٹھی سے سامان اس حویلی میں شفٹ کرے گا۔ میں گھر میں رہتا۔ سفیر اور بیتو براہِ راست حویلی جاتے جسے عبداللہ نے ابھی سے بھوت بنگلے کا نام دے دیا تھا۔ مانی یہاں آتا کیونکہ اسے اس کوٹھی کی ہی سیکیورٹی کرنی تھی۔ میں نے کہا۔

”یارو... میں کیا کروں گا؟“

”آپ کوٹھی میں رہیں گے اور یہاں کے معاملات دیکھیں گے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”آپ جتنا کم باہر نکلیں اتنا اچھا ہے۔“ وسیم نے اس کی تائید کی۔

تیسرے دن تک وسیم کا زخم تقریباً خشک ہو چلا تھا اور اب وہ اس ٹانگ پر کسی قدر دباؤ بھی ڈال سکتا تھا۔ طے ہوا کہ وہ سب دوپہر تک روانہ ہو جائیں گے۔ تقریباً چار گھنٹے کا سفر تھا۔ وہ شام تک حویلی پہنچ جاتے، رات وہیں قیام کرتے اور اگلی صبح سفیر، مانی اور بیتو کو لے کر واپس آجاتے۔ دوپہر کو لنچ کے فوراً بعد ایاز وسیم کو لے کر چلا گیا اور عبداللہ باقی افراد کے ہمراہ سامان کوٹھی سے بھوت بنگلے میں شفٹ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں گھر میں ہی آرام کر رہا تھا۔ اس دن صبح سے بادل تھے مگر بارش کے آثار نہیں لگ رہے تھے۔ اس لیے شام کے وقت اچانک تیز بارش ہوئی تو یہ حیرت انگیز ہی تھی۔ اسلام آباد راولپنڈی میں اپریل کا آخر عام طور سے خوشگوار ہوتا ہے، سردی ختم ہو جاتی ہے مگر بارش ہو جائے تو موسم خنک ہو جاتا ہے اگرچہ یہ باقاعدہ سردی نہیں کہلا سکتی ہے مگر سردی کا مزہ ضرور آنے لگتا ہے۔

زیادہ تر آدمی عبداللہ کے ساتھ چلے گئے تھے اور اب کوٹھی میں شاہ جی سمیت صرف تین ملازم تھے۔ ان میں سے ایک گیٹ پر تھا اور باقی دو دوسرے کاموں کے لیے تھے۔ ان میں سے کوئی لڑنے بھڑنے والا بندہ نہیں تھا۔ ویسے ہر طرف امن و سکون تھا۔ اس لیے مجھے یا عبداللہ کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ یہاں بہت زیادہ حفاظتی انتظامات کیے جاتے۔ ملازموں میں سے ایک کنٹرول روم میں مانیٹرز کی نگرانی کر رہا تھا۔ کوٹھی میں چار پانچ کیمرے لگے تھے۔ ان کو دیکھنے کے لیے دو مانیٹرز تھے جن پر مینول طریقے سے نظر رکھی جا سکتی تھی۔ مانی آ کر اس سسٹم کو مزید ایڈوانس کر سکتا تھا۔ شام کے وقت عبداللہ نے مجھے کال کر کے بتایا کہ انہوں نے کوٹھی چھوڑ دی ہے اور اب وہ حویلی میں تھے۔

”میں ایک دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔ آپ نے کچھ منگوانا ہو تو بتا دیں میں آتے ہوئے لیتا آؤں گا۔“

”کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وسیم اور ایاز کی طرف سے ابھی تک اطلاع نہیں آئی ہے۔“

”آپ کال کر کے معلوم کر لیں۔ ممکن ہے کہیں راستہ خراب ہو تو انہیں دیر ہوئی ہو۔“

چند سال پہلے تک یہاں ہائی ویز کا نظام بہت اچھا نہیں تھا اور خاص طور پر میانوالی کی سڑکیں خستہ حالی کا شکار رہتی تھیں۔ مگر سٹی گورنمنٹس کے قیام سے سڑکوں کے نظام میں خاصی بہتری آئی تھی۔ پھر مرمت کے کام چلتے رہتے تھے اور اس وجہ سے ٹریفک میں خلل لازمی آتا تھا۔ عبداللہ سے بات کر کے میں نے وسیم کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”جی شہباز صاحب..... ابھی راستے میں ہیں۔ سڑک کئی جگہ بہت خراب ملی اور ٹریفک جام تھا۔ ایاز کا کہنا ہے کہ اب ایک گھنٹے کا سفر باقی ہے۔“

”دوسرا کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں ابھی تک دشمنوں کی منحوس صورت یا ان کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن ہم ہوشیار ہیں۔“

”ہوشیار ہی رہنا اور حویلی پہنچتے ہی اطلاع کرنا۔“ میں نے کہا۔

”آپ بے فکر رہیں۔“

وسیم سے بات کر کے مجھے اطمینان ہوا تھا۔ حالات بہت عرصے بعد بہتری کی طرف آئے تھے۔ بریف کیس کا مسئلہ حل ہوا تھا اگرچہ یہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں تھا لیکن پھر بھی یہ میرے نام کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور آنے والے وقت میں یہ مسئلہ بن بھی سکتا تھا۔ اب اس کا امکان نہیں رہا تھا۔ مرشد دباؤ کے آگے مجبور ہوا تھا اور اس نے میرے کیس ری فائل کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی اور کیس ری فائل کی درخواست بھی دے دی گئی تھی۔ ندیم کا کہنا تھا کہ اگر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو ایک سے ڈیڑھ مہینے میں میرے خلاف تمام کیسز

خارج کر دیے جائیں گے۔اس کے بعد مجھ پر قانون کی گرفت نہ رہتی۔ میں حرکت کرنے اور ملک سے باہر جانے کے لیے آزاد ہو جاتا۔ میں نادر کو ناکارہ بنا کر مرشد کے حوالے کر دیتا اور اگر مستقبل میں مرشد کوئی شرارت کرتا تو اس سے نمٹا جا سکتا تھا۔

فتح خان ہیروں کے ساتھ بریف کیس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور فی الحال نہ گھر کا نہ گھاٹ کا تھا۔اس کے کچھ ساتھی آرمی انٹیلی جنس کی گرفت میں تھے اور ممکن ہے اب اس کی بھی تلاش کی جا رہی ہو۔ڈیوڈ شا وادی سے ناکام واپسی کے بعد خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ حکیم قاؤس کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کا معجزاتی دواؤں کے فارمولوں کا خواب بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ویسے بھی اس دوا کا بنیادی جز اصل میں ہمالیائی وادی میں ملتا تھا۔ گویا میرے تقریباً تمام دشمن بے دست و پا تھے یا پھر خاموش بیٹھے رہنے پر مجبور تھے۔

مگر میں ایک دشمن کو بھول رہا تھا جسے ہمارے ہاتھوں دو مرتبہ شدید زک لگی تھی ایک مرتبہ مالی اور ایک مرتبہ جانی زک پہنچی تھی۔ جان کا تو اتنا مسئلہ نہیں تھا مگر ان کی تمام زندگی کی جمع پونجی ہم ہتھیا چکے تھے اور وہ دولت کے پیچھے جان لینے اور دینے والے لوگوں میں سے تھے۔یعنی جیدا اینڈ کو اور وہ اس دولت کی واپسی کے لیے مرتے دم ہمارا پیچھا کرتا۔اس وقت ہم نے ایک بات اور نظر انداز کی تھی کہ جیدا بے شک ہمارے بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن مرشد ہمارے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا اور جیدا گروپ کا اس سے تعلق تھا۔ وہ اسے ہمارے بارے میں بتا سکتا تھا۔ نہ صرف بتا سکتا تھا بلکہ انہیں اکسا کر اپنے سہارے کا یقین دلا کر انہیں ہمارے پیچھے لگا سکتا تھا۔ مرشد نے جذباتی ہو کر ندیم کو کال کر دی تھی اور اس طرح اس نے خود جیدا گروپ سے تعلق کا اعتراف کر لیا تھا۔ اب اگر وہ ہمارے خلاف کارروائی کرتے تو مرشد ان سے لاتعلقی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔اگر وہ جذباتی نہ ہوتا تو جیدا گروپ کو ہمارے خلاف کھل کر استعمال کر سکتا تھا اور ہم اسے الزام بھی نہ دے پاتے۔ مگر اب بھی اس کا امکان تھا۔ میں اس بارے میں غور کر رہا تھا اور مجھے احساس ہوا کہ کوٹھی میں مجھ سمیت صرف چار افراد تھے اور صرف میں ہتھیار استعمال کر سکتا تھا اور کسی مشکل موقع پر کوٹھی کا دفاع کرنا پڑتا اور اگر دشمن زیادہ قوت کے ساتھ حملہ کرتا تو میں اکیلا کیسے مقابلہ کرتا۔ جب کہ یہاں نہ صرف نادر تھا بلکہ وہ دولت بھی تھی جس کے لیے جیدا گروپ پاگل ہو رہا تھا۔

یہ خیالات آتے ہی میرے اندر بے چینی سی ابھرنے لگی تھی۔ میں نے اٹھ کر کوٹھی کا چکر لگایا۔ دونوں گیٹس پر ایک ہی آدمی تھا وہ بڑی گلی والے گیٹ پر تھا لیکن یہاں سے پچھلی گلی والے گیٹ پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ دوسرا آدمی اندر کیمروں پر نگران تھا اور شاہ جی ظاہر ہے کچن دیکھنے میں لگا ہوا تھا۔ ساڑھے چھ بجے سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور کچھ دیر میں اندھیرا چھا جاتا۔ میں نے شاہ جی سے چائے کا کہا اور کوٹھی کی چھت پر آیا۔ یہاں سے چاروں طرف دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ بڑی کوٹھیوں کا علاقہ تھا اور بیشتر کوٹھیاں یک منزلہ تھیں اور دور تک دیکھنے میں رکاوٹ نہیں تھیں سر شام ہی روشنیاں جل اٹھی تھیں اور گلیاں روشن تھیں۔ بچے کھیل رہے تھے لوگ آ جا رہے تھے۔ پھل سبزی اور دوسری چیزیں فروخت کرنے والے بھی رواں دواں تھے لیکن ان میں مجھے کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آیا۔ سب معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔

شاہ جی مجھے تلاش کرتا چائے اوپر ہی لے آیا تھا۔ اس نے چائے کے ساتھ ٹرے میں گھر میں بنائے چھوٹے چائنیز سموسے بھی چٹنی کے ساتھ رکھے تھے۔ ”یہ تم نے نیکی کا کام کیا ہے شاہ جی۔“ میں نے اس سے ٹرے لی۔ ”نیچے موجود دونوں آدمیوں کو کہو کہ پوری طرح ہوشیار رہیں۔“

”میں کہہ دوں گا صاحب۔“

میں اوپر ہی رہا، مجھے عبداللہ کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد وسیم کی کال آئی۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”یہ اچھا ہوا.....لیکن یہاں کوٹھی میں صرف میں ہوں اور تین نوکر ہیں۔ ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ ہم جیدا پارٹی کی طرف سے کچھ زیادہ ہی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں کیونکہ ان کے لیے یہ زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی دولت واپس حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر سکتے ہیں۔“

”لیکن وہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں اور فرخ شاہ ان کی گرفت سے دور جا چکا ہے۔“

”تم بھول رہے ہو مرشد ہمارے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے اور جیدا اصل میں اسی کا آدمی ہے!“

وسیم سوچ میں پڑ گیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر مرشد ہمارے اس ٹھکانے سے بے خبر ہے۔“

”ہاں یہ اطمینان کی بات ہے ورنہ اب تک وہ یہاں چڑھائی کر چکا ہوتا۔“

”دراصل اسے فاضلی کے غیر فعال ہونے سے نقصان ہوا ہے۔ وہ اس قسم کے کاموں کا ماہر تھا ورنہ باقی مرشد کے پاس میرا خیال ہے جیدا جیسے نرے بدمعاش ہی ہیں۔“

”میں نے اس سے پہلے بھی مرشد کے پاس کوئی کام کا آدمی نہیں دیکھا۔ یہ تو اس کی قسمت کہ ڈیوڈ شا کی وجہ سے فتح خان جیسا آدمی مل گیا۔“

”فتح خان اب اس کا دشمن ہے۔ ویسے آپ کا کیا اندازہ ہے فتح خان کہاں ہوگا۔“

”فی الحال وہ روپوش ہوگا کیونکہ اس کے آدمی آرمی انٹیلی جنس کے ہاتھ لگے ہیں اور بریف کیس والے معاملے میں اس کا نام آیا ہوگا۔ مگر اس کے بارے میں کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا..... وہ اکثر مجھے حیران کر دیتا ہے۔“

”مہرو یا کرنل کی طرف سے دوبارہ رابطہ نہیں ہوا؟“

”نہیں اور اگر ان کی طرف سے رابطہ کیا بھی گیا تو میری طرف سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی۔ میں ان دونوں میاں بیوی سے دور رہنا چاہتا ہوں۔“

وسیم نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں ان لوگوں سے دور رہا جائے۔“

”مجھے کرنل پسند ہی نہیں ہے۔ جو شخص مذہب کے معاملے میں اس طرح سے دھوکا کرے وہ میرے نزدیک کسی صورتِ قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتا..... مہرو کی وجہ سے مجبور ہو کر میں نے اس کی مدد کر دی تھی۔ اگر وہ پوچھ کر ہماری مدد کرنا چاہتا تو میں یقیناً انکار کر دیتا۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے، اس حالت میں بھی کسی کا باپ ہمیں نہیں روک سکتا تھا۔“

”بہرحال تمہارے آدمیوں نے وہ کوٹھی چھوڑ دی ہے۔ عبداللہ ان کے ساتھ ہے وہ بھوت بنگلے شفٹ ہو چکے ہیں۔“

”بھوت بنگلا۔“ وسیم ہنسا۔ ”اچھا نام ہے۔“

”سادی خوش ہے؟“

”ہاں مگر زخم دیکھ کر اس نے بہت سنائی ہیں۔“

”زخمی ہونے پر؟“

”نہیں اسے نہ بتانے پر۔“

ابھی بات کر رہا تھا کہ نیچے دو گاڑیاں آ کر رکیں۔ عبداللہ اپنے آدمیوں سمیت واپس آ گیا تھا۔ میں بات ختم کر کے نیچے آیا۔ عبداللہ اندر آ گیا تھا اور اس کے آدمیوں نے اپنی اپنی جگہوں پر ڈیوٹیاں سنبھال لی تھیں۔ عبداللہ نے آتے ہی معذرت کی۔ ”سوری شہباز صاحب، میں سارے آدمی لے گیا تھا لیکن اسی صورت منتقلی تیزی سے اور محفوظ طریقے سے ہو سکتی تھی۔“

”کوئی بات نہیں یار.....ویسے میں ہوشیار تھا۔“

”میں نے تعاقب کا خاص خیال رکھا تھا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ مرشد نہ سہی مگر کرنل کے آدمی ہماری نگرانی کر سکتے ہیں مگر اب مجھے یقین ہے ہمارے اس نئے ٹھکانے سے کوئی واقف نہیں ہے۔ حویلی اچھی ہے، صاف ستھری اور تمام سہولیات کے ساتھ ہے۔ آس پاس کوئی دو سو گز تک کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔ شہر آنے کے دو تین راستے ہیں۔ میں دوسرے راستے سے ہو کر آیا ہوں، یہ اسلام آباد ایکسپریس وے پر نکلتا ہے۔“

”یہ اچھا ہوا سفیر اور بیتو وہیں جائیں گے۔ تم سفیر کے لیے دبئی کا ائر ٹکٹ لے لو۔ میں چاہتا ہوں وہ جلد از جلد دبئی چلا جائے۔“

”صرف سفیر جائے گا۔“

”ہاں اسے وہاں اپنے معاملات نمٹانے ہیں۔“ میں نے کہا پھر اسے وسیم کے بارے میں بتایا۔ گفتگو کا رخ وسیم کی طرف مڑا تو عبداللہ نے کہا۔

”میرا خیال ہے وسیم کی ایک بہن بھی ہے۔“

”سونیا۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن بہت عرصے سے اس سے رابطہ نہیں ہے۔ صرف وسیم جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے؟“

”اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہے ورنہ ہمارے دشمن اس تک پہنچ جاتے۔ وہ سکون سے اپنے گھر میں ہے ویسے اس بے چاری نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔“

”یہ ناصر اگر اتنا ہی اچھا صحافی ہے تو ہمارے کام آ سکتا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر اسے ہمارے کام آنا ہوتا تو وہ بہت پہلے خود ساتھ دیتا۔ میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا کہ وہ میری جنگ میں میرا ساتھ دے۔ تم اور دوسرے سب اپنے خلوص اور اپنی رضامندی سے میرے ساتھ آئے ہو۔ میں اسے الزام نہیں دے رہا لیکن وہ لڑنے بھڑنے

والا آدمی نہیں تھا۔"

"اس طرح تو ندیم بھی ہے لیکن اس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔"

"ندیم درمیان میں شامل نہیں ہوا ہے، وہ شروع سے میرا دوست اور وکیل رہا ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہر کوئی اس طرح سے ساتھ نہیں دے سکتا۔" عبداللہ نے سر ہلایا۔ "لیکن لاہور میں تو اس نے آپ کا بہت ساتھ دیا تھا۔"

"وہ ایک فوری اور ہنگامی ضرورت تھی۔ جب میں وہاں سے نکل گیا تو وہ وہیں رہ گیا تھا۔"

"آپ کے غائب ہونے اور بھارت میں دریافت ہونے تک ہم میں سے کسی کو صورتِ حال کا درست اندازہ نہیں تھا۔ ان دنوں میں ناصر سے مسلسل رابطے میں تھا۔ لیکن جب راجا صاحب یہاں سے چلے گئے اور پھر مجھے بھی اسلام آباد جانا پڑا تو پھر اس سے رابطہ نہیں رہا۔ بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ سونیا اور ناصر نے شادی کرلی ہے۔"

"ہمارے حالات بھی ایسے رہے کہ وسیم سے پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ اس کا سونیا سے رابطہ ہے یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے رابطہ ہے۔ خود وسیم نے بھی اپنی بہن کو الگ کر دیا ہے۔ اس لیے وہ اس کا ذکر بھی نہیں کرتا ہے۔"

"لیکن وہ اس سے ملنے بھی نہیں جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہمیں تو پتا چلتا۔"

"دشمنوں کو اس سے دور رکھنے کے لیے وہ خود اس سے ملنے سے گریز کرتا ہوگا۔" عبداللہ نے کہا۔

"پھر بھی یار مجھے شرمندگی ہو رہی ہے سونیا کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل گیا اور میں نے کبھی وسیم سے اس کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ وہ بھی کیا سوچتا ہوگا کہ مجھے اب اس کی بہن اور بہنوئی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"حالات جناب۔" عبداللہ نے مجھے تسلی دی۔ "ہم میں سب سے زیادہ مشکلات کا شکار آپ ہی ہوتے ہیں، آئے دن آپ دشمنوں کی قید میں ہوتے ہیں اور وہاں سے چھوٹ کر چند دن سکون کا سانس لیتے ہیں تو کچھ دن بعد کوئی دوسرا دشمن آپ کو لے جاتا ہے۔ ویسے میرا ایک مشورہ ہے؟"

"وہ کیا؟"

"آپ لاہور چلے جائیں کچھ دن کے لیے۔"

"لاہور.... وہاں جا کر کیا کروں گا؟"

"کچھ نہیں آرام کیجیے گا۔ وہاں دشمن نہیں ہوگا اس لیے خطرات بھی کم ہوں گے۔"

"لیکن وہاں تم لوگ بھی تو نہیں ہوگے۔"

"آپ بیتو اور سفیر کو لے جائیے گا۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "یار تم کسی خاص وجہ سے یہ سب کہہ رہے ہو؟"

عبداللہ مسکرایا۔ "ارے نہیں .... بس ایسے ہی خیال آگیا۔ آپ جانتے ہیں لاہور میں بھی راجا صاحب کا سیٹ اپ ہے وہاں آپ کو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔"

"نہیں یار مجھے چیزوں کے ساتھ مزہ نہیں آتا.... مجھے اپنوں کے ساتھ مزہ آتا ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی، ویسے سچی بات ہے ہمیں بھی آپ کے ساتھ مزہ آتا ہے، جب آپ غائب ہوتے ہیں تو ہم بھی بور ہو رہے ہوتے ہیں۔"

☆☆☆

اگلے دن ایاز سفیر، مانی اور بیتو کو لے آیا تھا۔ سفیر اور بیتو نے بھوت بنگلے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ میرے پاس آنا چاہتے تھے۔ تینوں اور خاص طور سے بیتو آکر مجھ سے ایسا چمٹا کہ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔ "بھائی میں کہیں بھاگا تھوڑی جا رہا ہوں۔"

"بس اب ہم آپ کو نہیں چھوڑے گا۔" بیتو نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "آپ اچانک غائب ہو جاتا ہے، اس بار آپ غائب ہوا تو ہم بھی آپ کے ساتھ غائب ہوگا۔"

"لے بھائی۔" سفیر نے قہقہہ لگایا۔ "تیرا ازدواجی مستقبل ابھی سے تاریک نظر آ رہا ہے۔ جب یہ ایسے چمٹا رہے گا تو بیوی کے لیے جگہ ہی کہاں بچے گی۔"

میں اور بیتو دونوں ہی جھینپ گئے۔ بیتو جلدی سے الگ ہو گیا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ "یہ سفیر بھائی بہت تنگ کرتا ہے وہاں بھی ایسا ہی کرتا تھا۔"

"ایسے لوگوں کے لیے اس موسم میں کپڑوں سمیت غسل موزوں ہوتا ہے۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ سفیر نے بھانپ کر فرار ہونا چاہا تھا لیکن میں نے اسے پکڑا، بیتو اور مانی رضا کار بن کر آئے اور ہم نے سفیر کو زبردستی لے جا کر شاور کے نیچے کھڑا کر دیا۔ وہ اس سے باہر آنے کی کوشش کرتا تو ہم اسے واپس دھکیل دیتے۔ سفیر برا بھلا کہہ رہا تھا اور ساتھ ساتھ منتیں بھی کر رہا تھا۔ مگر جب تک وہ بھیگ نہیں گیا ہم نے اسے شاور کے نیچے سے نکلنے نہیں دیا۔ ہم باہر آئے تو وہ بھی بکتا جھکتا اور چھینکتا ہوا باہر آیا۔ عبداللہ کو ذرا دیر سے اطلاع ملی تھی اس لیے وہ محظوظ ہونے سے رہ گیا لیکن کچھ دیر بعد جب سفیر کپڑے بدل کر آگیا تھا تو اسے مزید تپانے کے لیے بیتو اور مانی نے سارا واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ بالآخر یہ طوفانِ بدتمیزی ختم ہوئی۔ مانی کو عبداللہ لے گیا اور بیتو اونگھنے لگا تھا۔ وہ سہ پہر کے وقت یہاں پہنچے تھے اس لیے کھانا راستے میں کھا لیا تھا۔ یہاں چائے کے ساتھ ری فریشمنٹ لی تھی۔

"اب بتا تیرا کیا ارادہ ہے؟" میں نے سفیر سے پوچھا۔

وہ چائے کا سپ لے کر بولا۔ "میں دبئی جا کر اپنا سیٹ اپ دیکھوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں مونا کے ساتھ دبئی میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ دوسری صورت میں مجھے اس کو حویلی میں رکھنا پڑے گا اور حویلی کا ماحول اس جیسی شہری خاتون کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ اس ماحول میں نہیں رہ سکے گی۔ یار مجھے تو تیری حویلی کے ماحول پر رشک آتا ہے۔ بے شک وہاں بھی روایات اور دیہی تہذیب کا پورا خیال رکھا جاتا ہے، پر ذرا بھی گھٹن اور جبر کا احساس نہیں ہوتا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ میں وہاں جا کر بور ہو جاؤں گا پر میرا واپس آنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"یہ بابا کا بنایا ہوا ماحول ہے۔ بعض معاملات میں وہ بہت سخت ہیں لیکن مجموعی طور پر انہوں نے ہمیں پوری آزادی دی۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں ہے لیکن صغراں آپا کو بابا نے خود اصرار کر کے گریجویشن کرایا۔ اب ثمی گریجویشن کر رہی ہے۔"

"یہ دونوں بہت بدمعاش ہیں۔" سفیر نے مانی اور بیتو کی طرف اشارہ کیا۔ "جب تک چاچا جی حویلی میں ہوتے یہ شرافت سے مردانے میں رہتے تھے اور ان کے جاتے ہی خواتین کے پاس پہنچ جاتے۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ چاچا جی کو بھی پتا تھا لیکن وہ نظر انداز کرتے تھے۔"

"خواتین سے مجھے یاد آیا شازیہ کیسی ہے اب؟"

"ٹھیک ہے، اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ وہ سادی سے بہت اٹیچ ہو گئی ہے۔"

"مانی اس میں دلچسپی لے رہا ہے؟"

"ہاں کچھ محسوس تو کیا تھا لیکن جب میں نے پوچھا تو صاف مکر گیا۔"

"تمہارے سامنے اقرار کر کے اس نے اپنی جان عذاب میں ڈالنی تھی۔"

"یار میں ایسا بھی جلاد نہیں ہوں۔" سفیر بھنا گیا تھا۔ "ان دونوں نے مجھے بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔"

"خیر چھوڑ ان کو، یہ بتا کہ جائے گا کیسے؟"

"ظاہر ہے بائی ائر۔"

"بیٹے تمہارے خیال میں ائرپورٹ پر مرشد کی نگرانی نہیں ہوگی۔ وہ حکومت میں شامل رہا ہے اور اب بھی اس کا اثر و رسوخ ہے۔"

"تب کیا پیدل چلا جاؤں؟"

"نہیں، میں نے سوچا ہے تم یہاں سے نہیں بلکہ لاہور سے جاؤ گے۔"

"یار وہاں سے ٹکٹ کرانے کا مسئلہ ہوگا۔"

"نہیں ہوگا، یہ بتا پاسپورٹ اور دوسری چیزیں ساتھ لایا ہے؟"

"بالکل۔"

"بس تو ہم یہاں سے نکلیں گے اور لاہور میں کسی ٹریول ایجنٹ سے کام کرائیں گے۔"

"ہم....؟" سفیر چونکا۔ "تم بھی چلو گے؟"

"لاہور تک۔" میں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ بیتو بھی ہوگا۔"

"یہ مصیبت ساتھ جائے گی۔"

"آپ خود مصیبت ہے۔" بیتو نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔ "ہم نے مونا دیدی کو کہتے سنا تھا۔"

سفیر مزید بھنا گیا تھا۔ "دیکھی تم نے اس شخص کی اخلاقی حالت؟.... میاں بیوی کی باتیں چھپ چھپ کر سنتا ہے۔"

"ہم نے اپنے کمرے میں سنا تھا۔" بیتو اسی طرح بولا۔ "مونا دیدی چلا کر کہہ رہا تھا۔"

میں ہنس رہا تھا اور بڑی مشکل سے ان کا جھگڑا ختم کرایا۔ طے ہوا کہ ہم کل صبح سویرے لاہور کے لیے نکل جائیں گے۔ مانی کو پتا چلا کہ بیتو ہمارے ساتھ جا رہا ہے تو وہ دوڑا آیا۔ "شوبی میں بھی چلوں گا۔"

"سفیر دبئی جا رہا ہے، حج کرنے نہیں جو پورا خاندان اسے ائرپورٹ چھوڑنے جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا یہاں کام ہے اس لیے تم یہیں رکو گے۔"

مانی نے منہ بسورا۔ "بوریت...."

”بیٹے جب راستے میں گولیاں چلیں گی اور دشمن بم وغیرہ پھینکیں گے تب تمہیں مزہ آئے گا۔“

”گولیاں، بم۔“ مانی نے بدک کر کہا۔ ”یہ کہاں سے آگئیں۔“

”جب برسیں گی تب پتا چل جائے گا کہ کہاں سے آ رہی ہیں۔“ سفیر نے اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”تب میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ مانی نے فوراً فیصلہ واپس لے لیا۔

عبداللہ کو ہمارے اس فیصلے سے اختلاف تھا اس نے کہا۔ ”صرف تین افراد کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ تین چار محافظ لے کر جائیں۔“

”نہیں یار بھیڑ بھاڑ سے ہم نظر میں آسکتے ہیں اور ایک بار دشمن کی نظر میں آجائیں تو پھر زیادہ آدمیوں سے بھی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہ اسی لحاظ سے اپنا پلان بنا لے گا۔ ہم جتنی خاموشی سے نکلیں گے اتنا ہی کم امکان ہوگا دشمن کی نظر میں آنے کا۔“

سفیر حامی تھا اس نے کہا۔ ”شوبی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اپنی کسی گاڑی کے بجائے پرائیویٹ گاڑی لے لینی چاہیے۔“

”بالکل ڈرائیور سمیت کار مل جاتی ہے۔ ہم دو دن کے لیے ہائر کرلیں گے اور امید ہے کہ دو دن میں سفیر روانہ ہوجائے گا۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن آپ مجھ سے مستقل رابطے میں رہیے گا۔“

”مستقل تو مشکل ہے لیکن دن میں چار پانچ بار تم سے رابطہ کریں گے۔“

کیونکہ صبح سویرے نکلنا تھا اس لیے رات سے تیاری شروع کردی۔ بیتو بہت خوش تھا کہ اسے میرے ساتھ پھر سفر کا موقع مل رہا ہے۔ اسے لاہور دیکھنے کا شوق تھا اور اس نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ ”شوبی کیا سچ جو لاہور نہیں دیکھتا وہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔“

”یہ محاورہ ہے منّے۔“ سفیر نے کہا اور پھر بیتو کو سمجھانے لگا کہ محاورہ کسے کہتے ہیں۔ سفیر نے ایک اچھا کام یہ کیا تھا کہ ایک اخباری اشتہار دیکھ کر ایک رینٹ اے کار والے سے بات کرلی تھی۔ اب وہ صبح آٹھ بجے فیض آباد کے ایک معروف کیفے کے سامنے ہمارا انتظار کرتا۔ اگر ہم صبح ہی کار تلاش کرتے تو بہت مشکل ہوتی کیونکہ اس قسم کی دکانیں کھلتی ہی گیارہ بجے کے آس پاس تھیں۔ عبداللہ وقت ضائع کیے بغیر کوٹھی کی الیکٹرانک سیکیورٹی کرانے میں لگ گیا تھا اور وہ مانی کے ساتھ رات گئے تک گھومتا رہا تھا اور آلات خریدتا رہا تھا۔ جب وہ آیا تو ہم کچھ دیر بیٹھے اور پھر سونے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ عبداللہ نے پھر کہا کہ ہم راجا صاحب کی کوٹھی میں رکیں مگر میں نے انکار کیا۔

”یہ بلاوجہ نظروں میں آنے والی بات ہوگی۔ راجا صاحب کی کوٹھی سے دشمن اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن تم وہاں موجود ذمے دار کا نمبر دے دینا اگر مجھے ضرورت پڑی تو میں اس سے رابطہ کرلوں گا۔“

عبداللہ نے مجھے نمبر دیا۔ ”خالد رفیق نام ہے۔ کام کا آدمی ہے، لڑنے والا نہیں ہے لیکن ضرورت پڑنے پر سامان اور بندے مہیا کرسکتا ہے۔ اس کا ایک بھائی اندرونِ لاہور میں اکھاڑا چلاتا ہے۔“

”یعنی بدمعاشی کا اڈا؟“ میں نے عبداللہ کی بات پر غور کیا۔

”ظاہر ہے شرافت سے اکھاڑا کون چلاتا ہے آج کل۔“

”ٹھیک ہے، ضرورت پڑے گی تو میں اس سے رابطہ کرلوں گا۔“

صبح بیتو نے مجھے بیدار کیا۔ ”شوبی اٹھ جائیں اور تیار ہوجائیں ناشتا بھی تیار ہو رہا ہے۔“

میں مختصر غسل کر کے اور لباس بدل کر نیچے آیا۔ سفیر اور بیتو پہلے ہی ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ سفیر نے کہا۔ ”گاڑی والے کی کال آگئی تھی وہ وقت پر پہنچ جائے گا۔“

ساڑھے سات بج چکے تھے اس لیے عجلت میں ناشتا نمٹایا گیا۔ عبداللہ رقم نکال لایا۔ اس نے دس لاکھ روپے سفیر کو دیے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ رقم یہیں سے لے کر جائے اور دبئی میں موجود سرمائے کو نہ چھیڑے۔ یہ پانچ ہزار کی دو گڈیوں کی صورت میں تھے۔ مجھے عبداللہ نے پانچ ہزار، ہزار اور پانچ سو کے الگ الگ نوٹوں کی صورت میں کوئی ایک لاکھ روپے دیے۔ میرے خیال میں اتنی رقم کافی تھی۔ بیتو کے پاس کچھ رقم موجود تھی اس لیے اس نے مزید لینے سے انکار کردیا۔ کیونکہ ہم کسی اور کے ساتھ جا رہے تھے اس لیے ہم نے چھوٹے ہتھیار رکھے۔ پھر بھی بیتو نے حفظ

ماتقدم کے طور پر ایک چھوٹا مشین پسٹل اپنے بیگ میں کپڑوں کے نیچے رکھ لیا۔ یہ اس میں آرام سے آگیا تھا۔ عبداللہ نے ہمیں مین روڈ تک چھوڑا۔ ہمیں گرم جوشی سے رخصت کر کے وہ واپس کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ ہم پیدل ہی کیفے کی طرف چل پڑے جہاں کار والا ہمارا منتظر تھا ٹھیک آٹھ بجے ہم اس کے سامنے تھے۔ وہ سانولے رنگ کا دبلا اور ذرا شوقین نظر آنے والا نوجوان تھا۔ اس کا ہیئر اسٹائل کچھ عجیب سا تھا۔ سائیڈوں سے لیئر کٹ جیسے خواتین کرواتی ہیں اور پیچھے کے لمبے بال ایک ڈھیلی پونی کی صورت میں باندھے تھے۔ نام اس کا شاہد تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا۔ ”بس آپ تینوں نے جانا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور فرنٹ سیٹ پر آگیا۔ بیتو اور سفیر پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی تین سال پرانے ماڈل کی سیوک تھی اور بہت اچھی حالت میں تھی۔ شاہد ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔

”جناب میں ایک دن کا کرایہ پیشگی لیتا ہوں۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے اسے چار ہزار دیے۔ ”لیکن ہمیں لاہور میں دو دن کا کام ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔“

”کیوں نہیں جی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ریٹ آپ کو بتا چکا ہوں ایک دن کے چار ہزار ہوں گے اور اس میں، میں آپ کو سو میل تک کہیں بھی لے جا سکتا ہوں۔“

”اور اگر سو میل پورے ہوجائیں تو؟“

”اس کے بعد ہر میل کے پچاس روپے الگ چارج ہوں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میٹر نوٹ کرلیں۔“

یہ کام بیتو نے کیا اور مائلو میٹر کی ریڈنگ اپنے پاس لکھ لی۔ شاہد نے کار اسٹارٹ کی اور روانہ ہوگیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ میں بے چین ہو رہا تھا۔ زیادہ دیر کھلی جگہ اور رکے رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ مرشد کے آدمی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس لیے سفر کے آغاز سے مجھے سکون ملا تھا۔ جو گزشتہ کچھ عرصے سے میری زندگی میں عنقا ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کی حرکت وسیلہ ظفر ہوتی ہے میری حرکت بالآخر مجھے کسی نہ کسی مشکل میں لے جا کر پھنسا دیتی تھی۔ جس سے کسی نہ کسی طرح نکل بھی آتا تھا لیکن یہ ایک ٹام اینڈ جیری ٹائپ کی ریس تھی۔ جس نے اب مجھے بیزار کرنا شروع کردیا تھا اس لیے میری عافیت اسی میں تھی کہ میں دشمن سے ممکنہ حد تک دور رہوں۔ ہم میں طے ہوا تھا کہ دورانِ سفر کوئی غیر متعلقہ بات ڈرائیور کے سامنے نہیں کرنی ہے۔ اس لیے فی الحال سب منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ سفیر نے ایک اخبار لے لیا تھا اور میں نے نصف اخبار اس سے لے لیا۔ موسم خاصا گرم تھا اس لیے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی آن تھا۔ بیتو نے کچھ دیر بعد منمنا کر کہا۔ ”ہم کیا کرے؟“

”تم اپنے موبائل پر ویڈیو گیمز کھیلو۔“ سفیر نے مشورہ دیا اور بیتو نے عمل شروع کردیا۔ کار پنڈی شہر کے پُر ہجوم ٹریفک سے گزر رہی تھی۔ میں نے پہلے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کوئی ہمارے پیچھے تو نہیں ہے لیکن سیکڑوں کے حساب سے گاڑیوں میں کسی ایک مشکوک گاڑی کا پتا چلانا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے سے سوئی کو الگ سے شناخت کرنا اس لیے کچھ دیر بعد میں نے کوشش ترک کردی اور اخبار دیکھنے لگا۔ اس بہانے میں نے اپنا رخِ روشن بھی چھپا لیا تھا تاکہ اتفاق سے بھی کسی کی بد نظر نہ پڑے۔ ایک گھنٹے بعد ہم جی ٹی روڈ پر پنڈی شہر سے نکل چکے تھے اور اب مضافاتی علاقوں سے گزر رہے تھے۔ اس دوران میں، میں اور سفیر پورا اخبار چاٹ چکے تھے اس لیے اب میں نے وقت گزاری کے لیے کار کے ریڈیو سے رجوع کیا۔ شہر سے باہر آنے پر ایف ایم ریڈیو کے سگنل تو نہیں مل رہے تھے لیکن کئی میڈیم ویو ریڈیو آ رہے تھے البتہ معیار خراب تھا۔ شاہد نے کہا۔

”سر ایم پی تھری میں کئی ہزار سونگز ہیں آپ چاہیں تو اپنی پسند کا میوزک سن سکتے ہیں۔“

ایم پی تھری پلیئر سی ڈی پلیئر کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور کچھ غزلیں منتخب کر کے پلے کر دیں۔ کار کے اسپیکر بہت اعلیٰ درجے کے تھے اس لیے میوزک بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں، سفیر اور مونا کہیں جمع ہوتے تو ہم میوزک بھی سنتے تھے۔ اگر کوئی اچھی موی آتی تھی تو سب مل کر دیکھتے تھے۔ کبھی کبھار سینما بھی جاتے تھے۔ اب یہ ساری تفریحات کیے جیسے صدیاں گزر گئی تھیں، اس وقت میوزک سنتے ہوئے خیال آیا تھا کہ ہم میں کتنی تبدیلی آگئی ہے۔ میں نے سر جھٹک کر غزل کی جانب توجہ مبذول کرلی۔ اقبال بانو نے فیض کے الفاظ میں کہا۔ ”ہم دیکھیں گے.....“

”ہاں یار ہم دیکھیں گے۔“ سفیر نے پیچھے سے ٹکڑا لگایا۔ پھر ہم مل کر ہر مصرع کو دہرانے لگے۔ فیض کی یہ غزل ہر مظلوم کے دل کی آواز ہے۔ جو زبردستوں کے ظلم کا شکار

ہوتا ہے۔ خاصا سفر موسیقی کے سہارے گزر گیا۔ نہ جانے ڈرائیور نے موٹروے سے جانے کی کوشش کیوں نہیں کی، وہ جی ٹی روڈ پر سفر کر رہا تھا اگرچہ جی ٹی روڈ بھی اب ایک معیاری ہائی وے بن گئی ہے مگر یہ موٹروے کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ جی ٹی روڈ پر بسوں اور ویگنوں کا رش بہت زیادہ ہوتا ہے اور جا بہ جا مسافر لینے یا چھوڑنے کے لیے یہ رک جاتی ہیں اور اس سے ٹریفک کی روانی متاثر ہوتی ہے۔ پوٹھوہار کے ریجن میں اتنا ٹریفک نہیں تھا لیکن میدانی علاقہ شروع ہوتے ہیں ٹریفک کا دباؤ بڑھنے لگا۔ مجھے یاد ہے کالج کے دور میں جب میں پہلی بار لاہور آیا تھا تو جی ٹی روڈ کے دونوں طرف آبادی کم تھی۔ کھیت، جنگل اور میدان زیادہ تھے۔ مگر اب جہلم کے بعد آبادی کا ایک ایسا سلسلہ بن گیا ہے جو لاہور تک چلتا ہی رہتا ہے۔ رفتار سست تھی اور خدا خدا کر کے ہم ایک بجے کے قریب لاہور میں داخل ہوئے تو سب کا بھوک سے برا حال تھا۔

اس لیے پہلے ایک ہوٹل میں لنچ کیا۔ اس کے بعد ہم ٹریول ایجنٹس کی تلاش کے لیے نکلے۔ شاہد نے لاہور دیکھا ہوا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ٹریول ایجنٹس کہاں بیٹھتے ہیں۔ وہ ہمیں سیدھا وہیں لے گیا۔ تیسرے ٹریول ایجنٹ نے دبئی کے لیے اگلے روز کی فلائٹ میں جگہ نکال لی۔ فلائٹ رات نو بجے تھی۔ تب تک ہمیں کہیں ٹھہرنا تھا۔ ابھی ہم رہائش کے بارے میں بحث کر رہے تھے کہ شاہد نے مداخلت کی۔

"جناب میں ایک تجویز دے سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں برخوردار ضرور دو۔" میں نے کہا۔

"ادھر مال روڈ پر ذرا اندر ایک ہاسٹل ہے وہاں روز کے لیے بھی کمرے کرائے پر ملتے ہیں۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں ہے سنگل بیڈ کا ہزار روپے اور ڈبل کا پندرہ سو روپے ہے۔"

"بس تو وہیں لے چلو.... ویسے بھی ایک دو دن کی بات ہے۔"

ہاسٹل زیادہ دور نہیں تھا اور کوئی پانچ منزلہ جدید طرز کی عمارت تھی۔ یہاں زیادہ تر ایسے ملازم پیشہ رہتے تھے جن کے گھر لاہور میں نہیں تھے اور وہ اچھی اور پُرسکون رہائش کے خواہش مند تھے۔ یہاں دو کمرے لے لیے۔ ایک سنگل اور ایک ڈبل۔ شاہد اپنی کار کے ساتھ موجود ہوتا۔ ہاسٹل میں کھانے کا بندوبست صرف یہاں مستقل رہنے والوں کے لیے تھا جو عارضی مقیم ہوتے ان کو باہر جا کر کھانا پڑتا تھا۔ صبح سے سفر میں تھے اس لیے کچھ دیر آرام کر کے ہم رات کے کھانے کے لیے نکلے۔ شاہد سے ہمارا صرف کرائے کا معاہدہ تھا اور اس کی مزید کوئی ذمے داری ہم پر نہیں تھی لیکن اس بار ہم نے اصرار کر کے اسے کھانے میں شامل کر لیا۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنے بارے میں بتایا اس کا باپ اس وقت مر گیا تھا جب وہ صرف سولہ برس کا تھا۔ اس نے ٹیکسی چلانا شروع کر دی کیونکہ صرف میٹرک پاس کو تو چپراسی کی ملازمت بھی نہیں ملتی ہے۔ دس سال ٹیکسی چلا کر اس نے اپنی بہنوں کی شادی کی پھر اتنی رقم جمع کی جس سے اس نے یہ کار خرید لی۔

"اب اللہ کا شکر ہے جی، اس گاڑی سے کم دھکے کھا کر زیادہ مل جاتا ہے ٹیکسی میں تو صبح سے شام تک لگے رہنا پڑتا تھا۔"

"ہمارے ساتھ بھی تو مستقل ہو۔"

"نہیں جی، دیکھیں نا مزے میں ہوں۔ اچھی جگہوں پر جاتا ہوں۔ آپ جیسے مہربان صاحب لوگ مل جاتے ہیں جو ساتھ بٹھا کر کھلا لیتے ہیں۔ گاڑی بھی کم چلتی ہے۔ ابھی آپ سے اتنا مل جائے گا کہ واپس جا کر ایک دو دن کام نہ ملے تب بھی فرق نہیں پڑے گا۔ ماں کے پاس رہوں گا۔"

"شادی نہیں کی برخوردار؟"

وہ شرمایا۔ "جی شادی بھی اسی سال ہو جائے گی۔ منگنی ہو گئی ہے۔"

ڈنر کر کے ہم واپس آنے کے بجائے لاہور کی سڑکوں پر سیر کرتے رہے۔ ایک جگہ ہم نے کافی پی اور پھر ایک جگہ فالودہ کھایا۔ واپسی میں پشاوری آئس کریم سے دل پشوری کی۔ اندر جانے سے پہلے میں نے شاہد سے رات کا پوچھا۔ "تم کہاں سوؤ گے؟"

"میں گاڑی میں سو جاؤں گا۔ میں جب اسی طرح دنوں کے حساب سے کسی کے ساتھ ہوتا ہوں تو گاڑی میں سوتا ہوں آپ کا جب دل چاہے مجھے اٹھا لینا۔"

"سو جاؤ اب ہم خود صبح اٹھیں گے۔" میں نے کہا۔

ڈبل بیڈ روم میرے اور بیتو کے حصے میں آیا تھا کیونکہ بیتو نے سفیر کے ساتھ ٹھہرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سفیر بھنا گیا تھا۔ "کیا میں تمہیں کھا جاؤں گا؟"

"آپ ہم کو تنگ کرتا ہے۔" بیتو بولا۔

"میں کہاں تنگ کرتا ہوں برخوردار۔" سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ "جب کسی خاتون سے پالا پڑے گا تب معلوم ہوگا کہ تنگ کرنا کسے کہتے ہیں۔"

"ہم مونا دیدی کو بتائے گا۔"

"بتا دینا فی الحال ہم تمہاری مونا دیدی سے نہیں ڈرتا۔"

تو بیتو میرے ساتھ تھا۔ ہم حلق تک بھرے ہوئے تھے اس لیے تھکن کے ساتھ نیند سے بھی برا حال تھا۔ میں جوتے اتار کر جو لیٹا تو صبح بیتو کے ہلانے پر اٹھا تھا۔ "شوبی اٹھ جاؤ ابھی ناشتا کرنا ہے۔ سفیر بھائی کہہ رہا ہے کہ کرنسی بھی چینج کرانا ہے۔"

ہم اٹھے اور تیار ہو کر نیچے آئے تو شاہد مستعدی سے گاڑی کی صفائی میں لگا ہوا تھا۔ اس نے نزدیکی ہوٹل سے ناشتا کر لیا تھا اور بہ قول اس کے ناشتا بہت اچھا تھا اس لیے ہم بھی مارچ کرتے اسی ہوٹل کی طرف چلے گئے۔ گزشتہ روز سے اپنے معاملات پر بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کبھی شاہد ہوتا تھا اور کبھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ناشتے کی میز پر سفیر نے کہا۔ "یار ہمارے دشمنوں کی طرف سے بالکل خاموشی ہے ہم ایسے گھوم پھر رہے ہیں جیسے بالکل معمول کی زندگی میں ہوں۔"

"بیٹے اس پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ تم خیر سے دبئی سدھارو تو ہم بھی واپس جائیں۔"

"نہیں یار یہ خاموشی مجھے عجیب سی لگ رہی ہے۔"

بچی بات تھی کہ مجھے بھی عجیب ہی لگ رہی تھی مگر اب لازمی نہیں تھا کہ ہمارے دشمن ہمہ وقت ہماری تلاش میں ہوں اور وہ بھی لاہور میں۔ اتفاقات کی بات الگ تھی مگر ہر بار دشمن سے سامنا ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ بیتو نے سفیر کی تائید کی۔ "ہاں شوبی ایسا لگ رہا ہے سب دشمن اچانک مر گیا ہے اور اب کوئی ہمارے پیچھے نہیں آئے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے صدقِ دل سے کہا۔ "اب میں ایک عام انسان کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ اس مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ سے تنگ آ گیا ہوں۔"

"ویسے یار جب ہم اپنی زندگی میں واپس آئیں گے تو یہ دن بھی کتنے یاد آئیں گے۔ جب ہم سب مل کر بیٹھیں گے تو ان یادوں کو دہرائیں گے۔"

"اللہ وہ دن بھی جلدی لائے۔" اس بار بھی میں نے پورے دل سے کہا۔ سفیر نے کسی قدر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"تو اس زندگی سے بیزار لگ رہا ہے؟"

آندھی

جھکڑ، طوفان باد۔ ہوا کا بہت تیزی سے چلنا۔ آندھیاں عام طور پر گرم خشک علاقوں میں آتی ہیں، جہاں گرمی کی شدت سے ہوا گرم ہو کر پھیلتی اور اوپر کو اٹھتی ہے اور اس کی جگہ لینے کے لیے اوپر اور آس پاس کی ہوا تیزی سے اس علاقے کی طرف بڑھتی ہے۔ یہ ہوا اپنے ساتھ گرد و غبار کو اڑا لاتی ہے۔ اس کی تندی کا اندازہ بیرومیٹر سے لگایا جاتا ہے۔ یہ طوفان باد شمالی منطقوں میں الٹے اور جنوبی منطقوں میں سیدھے (گھڑی کے رخ) چلتے ہیں۔ اس کے چکر بہت شدید ہوتے ہیں اور قطب شمالی کی طرف بڑھتے بڑھتے ختم ہو جاتے ہیں۔ جو طوفان باد غرب الہند میں چلتے ہیں، ان کو ہری کین (hurricane) کہا جاتا ہے۔ یہ اگست، ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں آتے ہیں۔ جزائر شرق الہند میں چلنے والے طوفان باد کو ٹائی فون (طوفان) کہتے ہیں۔ یہ جولائی سے اکتوبر تک چلتے ہیں اور جزائر فلپین اور فارموسا میں تباہی مچاتے ہیں۔

مرسلہ: رانا اخلاق احمد، سیالکوٹ

"ہاں یار.... میں کوئی سپر ہیرو نہیں ہوں جس نے سماج سدھارنے کا ٹھیکا لیا ہو اور نہ ہی میں ایک بے چین زندگی گزارنے پر یقین رکھتا ہوں۔"

"مگر یار تو اس زندگی میں بھی تو ناکام نہیں ہے بلکہ تو اس طرح تبدیل ہوا کہ ہم سب کو حیرت ہوتی ہے۔"

"میں تبدیل ہوا ہوں لیکن میں نے اسے ہمیشہ کے لیے قبول نہیں کیا ہے میرا مقصد آج بھی ایک عام زندگی جینا ہے۔ مجھے اپنا گھر بسانا ہے اور تم لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا ہے۔"

ناشتے کے بعد ہم چہل قدمی کرتے ہوئے واپس آئے

تھے۔ سفیر نے شاہد سے کہا۔ ”یار کسی منی چینجر کے پاس چلو۔“

”ادھر پاس ہی بہت سارے ہیں۔“ وہ بولا۔ اس نے دس منٹ بعد ہمیں ایک معروف منی چینجر کے دفتر پہنچا دیا۔ سفیر کو یو اے ای کے درہم کی ضرورت تھی۔ دس لاکھ روپے کے عوض اسے ساٹھ ہزار درہم مل جاتے کیونکہ اس وقت درہم سولہ یا سترہ روپے کا تھا۔ سفیر پندرہ منٹ بعد ہی واپس آگیا۔

”چلو کام ہوگیا ہے۔“

دوپہر تک ہم گھومتے پھرتے رہے۔ اب تک کچھ نہ ہونے سے بھی ہم ذرا بے پرواہ ہوگئے تھے۔ شالامار باغ اور مینار پاکستان دیکھا پھر مقبرہ جہانگیر گئے۔ شام کے قریب واپس ہاسٹل میں آگئے۔ سفیر نے پوچھا۔ ”تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”تمہیں سی آف کرکے شاہد کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ ہے۔“

”میں تو کہہ رہا ہوں حویلی کا ایک چکر لگا لے، ماں جی بہت تڑپتی ہیں تیرے لیے....“

”ہاں یار، ماں ہیں نا۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”لیکن ابھی حویلی جاکر میں خود کو اور دوسروں کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

بیتو کو لاہور اچھا لگا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”شوبی اتنا جلدی کیا ہے ابھی کچھ دن اور اِدھر رہو۔“

”دیکھ تو لیا ہے لاہور۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب کیا رہ گیا ہے۔“

”اِدھر باہر گھوم پھر تو سکتا ہے۔“ بیتو نے منہ بنایا۔ ”اُدھر بس گھر میں بیٹھے رہو۔“

”بیٹے یہ تمہارا مقدر ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”ورنہ یہاں کیوں آتے، کامی کے ساتھ چینی تمہیں بھی لے جاتے، مگر وہ بھی تمہیں کچرا سمجھ کر چھوڑ گئے۔“

بیتو خفا ہوگیا۔ ”ہم کیوں کچرا ہونے لگا۔ ایسا ہوتا تو شوبی ساتھ لاتا۔“

”بیٹے شوبی کو گلے میں ڈھول لٹکانے کا شوق ہے۔“

”بس۔“ میں نے جنگ چھڑنے سے پہلے سیز فائر کرایا۔ ”اب تک کے لیے اتنا کافی ہے باقی تیری واپسی کے بعد۔“

کچھ دیر بعد بیتو سفیر کو فہرست لکھوا رہا تھا کہ دبئی سے اس کے لیے کیا لانا تھا۔ سفیر نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اتنی لمبی فہرست تو کبھی موناؔ نے بھی نہیں لکھوائی۔“

”مونا دیدی کو پتا نہیں تھا ورنہ وہ اس سے بھی لمبا کاغذ لکھواتا۔“ بیتو نے دانت نکالے۔

”اوہ بھائی میں صرف دس لاکھ روپے کے مساوی کرنسی لے جارہا ہوں۔ اس میں یہ سب کہاں سے آئے گا۔“

”آپ چھوڑو۔“ بیتو نے خفا ہوکر سفیر سے کاغذ لینے کی کوشش کی۔ ”ہم یہیں سے لے لے گا۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو مُنّے۔“ سفیر نے کاغذ بچایا۔ ”لے آؤں گا سب، چاہے اس کے لیے مجھے دبئی کا ڈالرز والا اکاؤنٹ کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔“

”یار ایسا کیا لکھوا دیا بے چارے نے۔“

”خود دیکھ لو۔“ سفیر نے مجھے پرچہ تھمایا۔ ”برخوردار نے جدید ترین آئی فون منگوایا ہے اور دنیا کی مہنگی ترین چاکلیٹس کا آرڈر بھی ہے۔ باقی فہرست بھی دیکھ لو۔“

مجھے حیرت ہوئی بیتو کو ان سب چیزوں کا علم کیسے ہوا تھا؟ میں نے پوچھا تو اس نے سادگی سے کہا۔ ”ہم نے ٹی وی پر دیکھا۔“

”یہ سب ٹی وی ایڈورٹائزنگ کا کمال ہے۔“ میں نے فہرست سفیر کو واپس تھما دی۔ کیونکہ سفیر کو فلائٹ سے تین گھنٹے پہلے ائرپورٹ پہنچنا تھا اس لیے ہم جلدی تیار ہوکر نکل گئے۔ راستہ بھی طویل تھا۔ میں نے چیک آؤٹ کرلیا تھا کیونکہ سفیر کو چھوڑ کر ہم واپس پنڈی کے لیے روانہ ہو جاتے۔ شاید اس اطلاع پر خوش تھا اسے آج کے دن کی رقم بھی مل گئی تھی اور وہ رات اپنے گھر میں گزارتا۔ ان دنوں اتنی سختی نہیں تھی مسافروں کے ساتھ ان کو چھوڑنے والوں کو بھی اندر لاؤنج میں جانے کی اجازت تھی۔ ہم اندر آئے لیکن وہاں پولیس اور سیکیورٹی کو دیکھ کر سفیر کسی قدر پریشان ہوگیا تھا اس نے کہا۔

”یار تو نکل جا، یہاں کوئی جان پہچان والا نکل آیا تو مشکل پڑ جائے گی۔ جگہ ایسی ہے کہ آدمی مار دھاڑ کرکے بھی نہیں نکل سکتا۔“

خود میں بھی بے چینی محسوس کررہا تھا اس لیے سفیر کی بات سے اتفاق کیا ہم اس سے گلے ملے اور رخصت ہوکر باہر آگئے۔ پارکنگ ذرا فاصلے پر تھی۔ اب تک سب ٹھیک تھا لیکن ائرپورٹ آتے ہی میری چھٹی حس خطرے کا اشارہ دینے لگی تھی۔ اگرچہ آس پاس کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شاہد کار کے پاس موجود تھا۔ وہ ہمیں جلدی آتے دیکھ کر حیران اور خوش بھی ہوا تھا۔ خوش اس لیے کہ اب ہم اور جلدی واپس جا سکتے تھے۔ اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ ”چلیں صاحب؟“

”اتنی جلدی کیا ہے۔“ بیتو نے اسے گھورا۔ ”ابھی ہم کھانا کھائے گا ہم بھوکا ہے۔“

اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اگر ہم ساڑھے دس بجے بھی یہاں سے روانہ ہوتے تو ڈیڑھ بجے تک واپس پنڈی پہنچ جاتے۔ ائرپورٹ سے واپسی پر ایک جگہ اوپن ائر باغ نما ریستوران دکھائی دیا۔ میں نے شاہد سے وہیں رکنے کو کہا۔ شاہد نے بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ مگر اس نے ہاتھ ہلکا رکھا۔ ”ابھی مجھے چار گھنٹے کی ڈرائیو کرنی ہے۔“

”کوئی بات نہیں اگر تم راستے میں کہیں خمار محسوس کرو تو گاڑی روک کر کچھ دیر کے لیے سو بھی سکتے ہو۔“

”نہیں بس اب واپس جاکر ہی سوؤں گا۔“ شاہد نے کہا اور کار پارکنگ سے نکالنے لگا۔ وہ ریورس کررہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے ایک پراڈو نمودار ہوئی اور اس کا دایاں بمپر شاہد کی کار کے عقبی حصے کو چھو گیا۔ شیشے ٹوٹنے اور دھات کے رگڑ کھانے کی آوازیں آئیں۔ شاہد نے بے ساختہ گالی دی۔ ”سؤر دے....“

غلطی پراڈو والے کی تھی لیکن وہ پراڈو تھی جسے یقیناً کوئی بڑی شخصیت یا اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا اس لیے امکان یہی تھا کہ غلطی شاہد کی بنادی جائے گی۔ پراڈو ذرا آگے رک گئی تھی اور فوراً ہی اس کی اگلی نشستوں سے دو افراد اترے۔ ان میں ایک یقیناً ڈرائیور تھا اور دوسرا شاید گارڈ تھا لیکن حلیے سے دونوں ہی بدمعاش ٹائپ کے لگ رہے تھے۔ وہ اپنی گاڑی کا معائنہ کررہے تھے۔ پھر گارڈ ہماری طرف آیا۔ شاہد اب گھبرا رہا تھا اس نے کراہ کر کہا۔ ”یہ کیا مصیبت آرہی ہے۔“

یقیناً اسے بھی خیال آیا ہوگا کہ پراڈو کسی بڑے آدمی کی ہوگی اور وہ غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرے گا۔ اس نے سہمے لہجے میں کہا۔ ”بھاگ چلیں جناب؟“

”تم نے کیا کیا ہے؟“ بیتو بولا۔ ”غلطی ان لوگ کا ہے۔“

”باہر نکل کر اس سے بات کرو۔“ میں نے کہا۔ ”معاملہ رفع دفع کرو اگر معافی مانگنا پڑے تو مانگ لو تمہارا نقصان ہم پورا کریں گے۔“

میں نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ ایک خاص حد سے آگے جائے۔ اگر پولیس تک بات جاتی یا یہ ہی بدمعاشی پر اتر آتے تو ہم مشکل میں پڑ جاتے۔ ظاہر ہے ہمیں جواب دینا پڑتا جو مار دھاڑ پر مشتمل ہوتا۔ شاہد نیچے اترا تھا کہ آنے والے نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور دہاڑ کر بولا۔ ”اندھے ہو نظر نہیں آتا۔“

”جناب میرا کیا قصور ہے۔“ شاہد نے منمنا کر کہا۔ ”میں تو ریورس کررہا تھا۔“

”ریورس کا بچہ۔“ گارڈ نے اسے تھپڑ مارا۔ ”گاڑی کا بیڑا غرق کردیا ہے اب تیرا باپ نقصان بھرے گا۔“

”نقصان تو میرا ہوا ہے۔“ شاہد مشتعل ہوگیا۔ یہ فطری بات تھی وہ غریب تھا اور اس کا نقصان زیادہ تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ معافی مانگ لے مگر تھپڑ کھا کر وہ میری ہدایت بھول گیا تھا۔ جواب میں گارڈ نے اسے بے دریغ مارنا شروع کردیا۔ وہ بہت مضبوط اور طاقتور آدمی تھا جسے مار پیٹ کا وسیع تجربہ تھا جبکہ شاہد دبلا پتلا اور مرنجان مرنج قسم کا نوجوان تھا۔ بیتو نے کسمسا کر کہا۔

”شوبی ہم سے برداشت نہیں ہورہا ہے۔“

”تم آرام سے بیٹھو۔“ میں نے اس سے کہا اور خود نیچے اتر آیا۔ میں نے گارڈ کا ہاتھ پکڑ لیا جو مُکّے کی صورت میں شاہد کے لہولہان چہرے کی طرف جارہا تھا۔ گارڈ کے ہاتھ میں مخصوص منقش انگوٹھیاں تھیں جن کے نقش اب شاہد کے چہرے پر چھپ چکے تھے۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ گارڈ نے مشتعل ہوکر گالی دی اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن میری گرفت اتنی نرم نہیں تھی کہ وہ ہاتھ چھڑا لیتا۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ ذرا سا موڑا تو وہ بلبلا گیا اور یہ بلبلاہٹ اس کے منہ سے نکلی تھی۔ میں نے ہاتھ مزید مروڑا۔ ”لگتا ہے تم اپنی گالیوں سے اپنی کلائی تڑوالوگے۔“

ڈرائیور جو اب تک آرام سے کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا جب اس کا ساتھی بلبلانے لگا تو وہ اس کی مدد کو لپکا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بیتو راستے میں آیا اور اس کی ٹانگ کے آگے اپنی ٹانگ کردی۔ وہ منہ کے بل گرا اور بہت برے انداز میں گرا۔ اس کا منہ ناک سب برابر ہوگیا تھا اور دہاڑ کے ساتھ اور بھی بہت کچھ نکلا تھا مگر وہ ناقابلِ سماعت تھا۔ پہلا والا اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس سے پہلے ڈرائیور اٹھ کر کوئی کارروائی کرتا، پراڈو کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک نسوانی آواز نے کہا۔ ”بس....“

ڈرائیور کا جارحانہ انداز یک دم ختم ہو گیا اور گارڈ نے بھی مزاحمت ترک کر دی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں پراڈو کی طرف متوجہ ہوا جس سے پہلے ایک شفاف چاندنی جیسا پاؤں باہر آیا۔ یہ پاؤں پنڈلی تک نمایاں تھا۔ پھر اس پاؤں کی مالکہ باہر آئی۔ اس نے چاندنی جیسا سفید لباس پہن رکھا تھا اور یہ لباس خاصا جدید قسم کا تھا۔ یہ فراک نما لباس تھا جو دائیں طرف سے کٹاؤ لیے ہوئے تھا اور اسی سے دائیں پاؤں کی پنڈلی جھانک رہی تھی جب کہ اوپر سے یہ بائیں طرف سے ایک پٹی کے سہارے شانے سے ٹکا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اور بھی چاندنی جیسا بدن جھلک رہا تھا۔ میں دم بہ خود رہ گیا۔ اس کے حسن جہاں سوز کو دیکھ کر نہیں بلکہ اسے پہچان کر۔ وہ بنٹی تھی۔ وہی بنٹی جو مجھے شمالی علاقے کی ایک پہاڑی کوٹھی میں ملی تھی جب میں نے فتح خان سے بچنے کے لیے بھاگ بھری سمیت اس کے ہاں پناہ لی تھی اور پھر اسے اور اس کی بہن کو ان کے سیاسی مخالفین سے بچایا تھا جو دونوں بہنوں کی تصویریں لینے کا پورا اہتمام کر کے آئے تھے اور اس کے بعد بنٹی کا باپ میاں ممتاز حسین کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔ حالانکہ وہ سیاست دان تھا اور ہمارے سیاست دانوں کے نزدیک بے عزتی نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہر حال میں عوام کو منہ دکھا لیتے ہیں اور ووٹ بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

اس سیاست دان ممتاز کی دختر نیک اختر نور النسا عرف بنٹی تو بہ شکن انداز میں میرے سامنے تھی، اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی تقریب میں شرکت کرنے جا رہی ہے۔ مجھے دنگ دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ''تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔''

''ہاں تم بھولنے والی چیز نہیں ہو۔''

''جھوٹ مت بولو، بے مروت آدمی۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ ''تم حسین عورتوں کو یاد رکھنے کے قائل نہیں ہو۔''

''اچھا۔'' میں نے سر کھجایا۔ ''یہ حُسنِ ظن ہے تمہارا، ظ والا ظن نہ کہ ز والا زن۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' وہ بولی۔ اس کا ڈرائیور، گارڈ، شاہد اور بیتو سب حیران پریشان تھے کہ ابھی تو دونوں پارٹیوں کے درمیان مار دھاڑ کا امکان پیدا ہو چلا تھا اور اب ان کے بڑے آپس میں یوں بات کر رہے تھے جیسے پرانی جان پہچان اور بے تکلفی ہو۔ بنٹی ہمارے پاس چلی آئی تھی۔ شکر ہے وہاں اتنی روشنی نہیں تھی ورنہ اسے دیکھ کر لوگ جمع ہونا شروع ہو جاتے اور اچھا خاصا تماشا بن جاتا۔ بہر حال جتنی بھی روشنی تھی اس کے سراپے کو نزدیک سے دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ میں نے جب پہلے اسے دیکھا تھا تو وہ کسی قدر بھاری بدن والی لڑکی تھی۔ اگرچہ یہ بھاری پن موزوں مقامات پر تھا مگر وہ کسی قدر اوور ویٹ ضرور تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بھدی یا بدصورت تھی۔ اس وقت بھی وہ خاصی حسین اور دلکش لڑکی تھی۔ مگر اب وہ بالکل بدل گئی تھی۔ لباس میں مقید اس کا سانچے میں ڈھلا جسم بتا رہا تھا کہ وہ خاصی ریاضتوں کے بعد اس مقام تک پہنچا تھا۔ ماہرِ فن بیوٹیشن کا کمال اس کے چہرے اور بالوں سے جھلک رہا تھا۔ پہلے وہ ابھرتا سورج تھی تو اب اس کے حُسن کا سورج نصف النہار پر آ گیا تھا۔ بنٹی نے آتے ہی بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھاما۔ ''تم یہاں کہاں؟''

''بس ایک کام سے لاہور آیا تھا اور اب واپس جا رہا تھا کہ تم سے ٹکراؤ ہو گیا۔''

''کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور پھر اپنے آدمیوں کو گھورا۔ وہ اشارۂ ابرو کے تربیت یافتہ تھے فوراً دم دبا کر چلے گئے۔ بیتو شاہد کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے تو نہیں لیکن اس بے چارے کو خاصی چوٹیں آئی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' بنٹی نے پرس کھولا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے یہ ہمارے ساتھ ہے اور ہم اس کی دیکھ بھال کر لیں گے۔''

''نہیں نقصان میری وجہ سے ہوا ہے اس لیے تلافی بھی مجھے کرنی ہوگی۔''

اس بار میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے پرس بند کر دیا۔ ''ٹھیک ہے لیکن اب تم میرے ساتھ چلو گے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے....'' میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ دبوچ لیا۔

''میں ناممکن کو ممکن بنانا جانتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تم لاہور آؤ اور مجھے مل جاؤ اور پھر ایک دو دن میرے پاس رکے بغیر چلے جاؤ۔''

''بنٹی پلیز سمجھنے کی کوشش کرو، میں اپنے دشمنوں سے بچتا پھر رہا ہوں۔''

''تو میں تمہاری دشمن نہیں ہوں، میرے ساتھ چلو، ظاہر ہے تمہارے دشمن مجھے نہیں جانتے اس لیے میرے پاس تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔''

''تمہارے پاس نہ سہی لیکن ویسے تو تلاش کر رہے ہوں گے۔''

''کرتے رہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''بس میں نے کہہ دیا تم کم سے کم ایک دن میرے ساتھ رہو گے۔''

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ میری بات نہیں سنے گی اور اپنی منوانے کی پوری کوشش کرے گی۔ میں سوچ میں پڑا تو وہ جان گئی کہ اس نے مجھے تقریباً قائل کر لیا ہے۔ اس نے میرا دبوچا ہوا بازو کھینچا۔ ''تم چل رہے ہو۔''

''اچھا بابی لیکن ڈرائیور کو تو فارغ کرنے دو۔''

''فکر مت کرو اسے شارق فارغ کر دے گا وہ اس سے سوری بھی کرے گا۔''

''اچھا ایک منٹ، میرا ایک ساتھی اور سامان بھی ہے۔ وہ تو لینے دو۔''

بادلِ ناخواستہ اس نے مجھے چھوڑا جیسے اسے خطرہ ہو کہ ہاتھ چھوٹتے ہی میں دوڑ جاؤں گا حالانکہ میں دوڑنا چاہتا تو اس جیسی تین چار مل کر بھی مجھے نہیں روک سکتی تھیں۔ میں واپس شاہد اور بیتو کے پاس آیا۔ میں نے شاہد سے معذرت کی۔ ''سوری یار، تمہیں چوٹ برداشت کرنی پڑی لیکن اتفاق سے یہ جاننے والے نکل آئے ہیں۔'' میں نے اسے دس ہزار روپے اور دیے۔ ''کسی ڈاکٹر کو دکھا لینا اور اگر طبیعت ٹھیک نہ ہو تو آج آرام کر لینا کل چلے جانا۔''

''اور ہم شوبی بھائی؟'' بیتو نے پوچھا۔

''ہم ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔''

''کیا آپ کو اس پر پورا اعتماد ہے؟'' بیتو نے دبی زبان میں کہا۔

''ہاں یہ دوست ہیں دشمن نہیں ہیں۔''

شاہد زخمی ہونے کے باوجود خوش تھا کیونکہ اسے دس ہزار مزید مل گئے تھے۔ گاڑی کا نقصان وہ مشکل سے تین چار ہزار میں ٹھیک کرا لیتا اور اس کی ذاتی مرمت پر بھی زیادہ خرچ نہ آتا اسے تقریباً ایک دن کے برابر کمائی اور مل گئی تھی اس لیے وہ خوش تھا۔ بیتو نے میرا اور اپنا سامان اتارا۔ جس میں ہمارا اسلحہ بھی تھا۔ ڈرائیور نے لینا چاہا لیکن بیتو نے منع کر دیا۔ ''ہم اٹھا لے گا تم جگہ بتاؤ رکھنے کا۔''

بیتو اسلحے کی وجہ سے بیگ اس کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہ رہا تھا ڈرائیور نے پراڈو کا پچھلا حصہ کھولا جو سامان کے لیے مخصوص تھا۔ سامان رکھ کر ہم بنٹی کے ساتھ پچھلے حصے میں آ گئے۔ بنٹی ایک طرف تھی اور درمیان میں تھا میرے دائیں طرف بیتو تھا اس سپر لگژری گاڑی کی نشستیں بہت کشادہ اور آرام دہ تھیں یعنی اچھی خاصی جگہ تھی لیکن بنٹی جان بوجھ کر مجھ سے ذرا لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کے گداز اور ریشمی وجود کی نرمی گرمی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میں کسمسایا لیکن وہ ثابت قدمی سے بیٹھی رہی۔ گاڑی چلی تو اس نے کہا۔ ''تھینک یو، اگر تم سختی سے منع کر دیتے تو میں تمہیں کسی طرح مجبور نہیں کر سکتی تھی۔''

''ماضی میں ہمارا تعلق دوستوں والا رہا ہے اور انسان دوست کو ایک حد تک ہی انکار کر سکتا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بائی دی وے تم کہیں جا رہی تھیں شاید؟''

''ہاں اب نہیں جا رہی۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''خاص پارٹی نہیں ہے، ہمارے سرکل کی ایک فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ میں گھر میں بور ہو رہی تھی اس لیے جا رہی تھی۔''

میں نے محسوس کیا کہ پراڈو ائرپورٹ سے گزر کر لاہور سے باہر جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دیہی علاقہ شروع ہو جاتا۔ میں نے بنٹی سے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ہماری حویلی ممتاز ہاؤس، لاہور سے کچھ ہی کلومیٹرز دور ہے وہاں ہماری زمین بھی ہے۔''

ممتاز حسین صوبائی سطح کا طاقتور سیاست دان تھا۔ اس کے مقابلے میں مرشد ایسا ہی تھا جیسے علاقے کے بدمعاش کے مقابلے میں گلی کا لفنگا۔ یہ جدی پشتی جاگیردار تھے اور انگریزوں نے انہیں زمینوں سے نوازا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ خاندان کسی نہ کسی طرح سیاست میں شامل رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ لاہور میں رہتا ہو گا لیکن شاید اسے اپنے آبائی علاقے میں رہنا پسند تھا اور دوسرے یہ جگہ لاہور سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ لاہور سے کوئی پانچ یا چھ کلومیٹرز دور ممتاز حسین کی جاگیر تھی۔ یہ معلومات بنٹی نے فراہم کیں۔ میں نے پوچھا۔ ''لاہور میں تم لوگوں کی کوئی رہائش نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں ہے، ہماری دو کوٹھیاں ہیں۔ مگر پاپا ممتاز ہاؤس میں رہنا پسند کرتے ہیں، کبھی کبھی ہمارا دل چاہتا ہے تو لاہور آ جاتے ہیں جب دل بھر جاتا ہے تو واپس چلے

جاتے ہیں۔ تم سناؤ میں تمہارے بارے میں خبریں جمع کرتی رہتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تم تقریباً سب جانتی ہو۔"

"سب کیسے جان سکتی ہوں۔" اس نے انکار کیا۔ "مرشد کے بارے میں معلوم ہے۔ اس بار بھی وہ انتخاب میں نہیں کھڑا ہوا ہے لیکن اس کے حمایت یافتہ دو امیدوار جیت گئے ہیں۔"

میں چونکا۔ "انتخابات ہو گئے؟"

بنٹی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تم کس دنیا میں رہتے ہو، انتخابات ہوئے خاصے دن ہو چکے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تعلق بھی سیاست سے ہے اس لیے خبریں ساری ملتی ہیں۔ میں پاپا کو اسسٹ بھی کر رہی تھی۔"

"مرشد کیوں نہیں کھڑا ہوا انتخاب میں، سنا تو یہ تھا کہ اس بار پوری تیاری ہے۔"

"پنڈی کی نشستیں ہمیشہ پارٹیوں کو جاتی ہیں اور مرشد آزاد حیثیت میں کھڑا ہونا چاہتا تھا مگر پھر وہ اچانک دست بردار ہو گیا۔ اس نے ایک پارٹی کے امیدوار سے مک مکا کر لیا اور وہ جیت گیا جبکہ دوسرا امیدوار بھی مرشد کا حمایت یافتہ ہے۔"

میرے لیے یہ اچھی خبر تھی کہ مرشد خود کھڑا نہیں ہوا۔ شاید اس کے پسِ پشت ہم سے محاذ آرائی، خاندانی چپقلش اور مرشد کے دوسرے مسائل تھے جن کے ہوتے ہوئے اس کے لیے انتخاب میں کھڑے ہونا مشکل ہوتا جا رہا تھا اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ پہلے کی طرح بادشاہ گر بنا رہے اور دوسروں کو جتوا کر ان سے کام لے۔ ایک لحاظ سے یہ میرے لیے اطمینان بخش خبر تھی کیونکہ خود مرشد انتخاب جیت کر ایک اور حیثیت حاصل کر لیتا۔ اب اس کے پاس سرکاری حیثیت نہیں تھی مگر تشویش برقرار تھی کہ اس کے پیچھے کئی ایم این ایز اور ایم پی ایز آ چکے تھے اور اسے ان کی مکمل حمایت حاصل ہوتی۔

بیتو خاموش بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا میں نے اسے بنٹی کے بارے میں نہیں بتایا تھا، لیکن وہ عقل مند تھا اسے معلوم تھا کس موقع پر سوال کرنا چاہیے اور کب چپ رہنا چاہیے؟ اسے پتا تھا کہ جلد یا بدیر صورتِ حال اس کے سامنے واضح ہو جائے گی۔ بنٹی نے بھی اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ شاید اس کے خیال میں بیتو اس قابل نہیں تھا کہ وہ اس پر توجہ دیتی۔ کچھ دیر میں پراڈو ممتاز ہاؤس کے سامنے پہنچی۔ یہ دور تک پھیلی چار دیواری تھی جس کی قلعہ نما دیوار کم سے کم پندرہ فٹ اونچی تھی اور اس پر ڈیزائن والی خاردار گرل لگی تھی۔ چار دیواری پر ہر بیس فٹ بعد تیز روشنی والی دوہری لائٹس لگی تھیں جو اندر باہر یکساں روشنی کر رہی تھیں۔ گیٹ پر ہائی کلاس سیکیورٹی تھی۔ وہاں کم سے کم نصف درجن مسلح گارڈز تھے اور اپنے ڈیل ڈول اور انداز سے اصلی گارڈز لگ رہے تھے۔ پراڈو کو اندر جانے سے پہلے الیکٹرانک سیکیورٹی سے گزارا گیا۔ میں نے بنٹی سے کہا۔

"فرض کرو کوئی تم کو یرغمال بنا لے اور اندر لے جائے تو یہ سیکیورٹی کیا کرے گی؟"

"ایسی احمقانہ حرکت کوئی نہیں کرے گا۔" وہ بولی۔ "دوسرے انہوں نے ایسے ہی ہمیں اندر جانے نہیں دیا ہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ اس نے کوئی چھپا ہوا اشارہ کیا جو او کے کے مترادف تھا یہ اشارہ اس نے خود دیا یا کسی برقی طریقے سے دیا گیا تھا اس نے وضاحت نہیں کی۔ گاڑی اندر گھومتے راستوں سے اس محل نما سفید عمارت کی طرف جا رہی تھی جو نہ نظر آنے والی روشنیوں سے یوں جگمگا رہی تھی جیسے تاج محل جگمگاتا ہے۔ چاروں طرف وسیع و عریض لان تھا جس میں جا بہ جا الگ الگ باغ بنے ہوئے تھے۔ یہاں بارہ دری جیسی چیزیں بھی تھیں۔ ایک چھوٹی سی جھیل بھی عمارت کا حصہ تھی۔ احاطہ کم سے کم دس ہیکٹر رقبے پر محیط تھا۔ اسے ایک لاکھ مربع گز یا دو سو کنال سمجھ لیں۔ ممتاز ہاؤس بھی کم سے کم ایک ہیکٹر پر پھیلی عمارت تھی۔ یہ رہائش ایک صوبائی سیاست دان کی تھی جس کی حد وزیر مشیر سے زیادہ نہیں تھی۔ قارئین سوچ سکتے ہیں کہ قومی سطح کے سیاست دان جو اس سے اوپر کے عہدوں تک رسائی رکھتے ہوں گے ان کے کیا ٹھاٹ باٹ ہوں گے۔

پراڈو وسیع پورچ میں رکی اور ایک ملازم نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ پہلے بنٹی اتری تھی اس کے ساتھ میں بھی نیچے اتر آیا۔ بنٹی کے چہرے پر اچانک رعونت اور مالکانہ پن چھا گیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "شہباز تم میرے ساتھ آؤ۔"

"میرا ساتھی....."

"اسے ملازم دیکھ لیں گے۔"

"یہ میرے ساتھ رہے گا۔" میں نے دھیمے لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔

بنٹی نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

بیتو نے اس وقت بھی کسی کو بیگز نہیں اٹھانے دیے اور خود میرے اور اپنے بیگ اٹھا لیے۔ وہ ذرا پیچھے رہ گیا تھا۔ بنٹی نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"میرا ساتھی اور میرا سایہ سمجھ لو، یہ ہر جگہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ وسیم ہے یا سفیر....."

میں مسکرایا وہ میرے بارے میں سب جاننے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ وسیم یا سفیر نہیں ہے لیکن میرے لیے ان جیسا ہی ہے۔"

اس نے شانے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو۔ میری بلا سے۔ ممتاز ہاؤس اندر سے ویسا ہی تھا جیسا اس قسم کے محل نما مکان کو ہونا چاہیے تھا۔ ناقابلِ یقین حد تک آراستہ اور خوب صورت۔ ایک ایک چیز جیسے سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر رکھی گئی تھی، چاہے وہ فرنیچر ہو یا سجاوٹ کی کوئی چیز۔ بنٹی نے اندر جاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "کیسا لگا ممتاز ہاؤس۔"

"بہت خوب صورت اور بہت مہنگا۔" میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ "لیکن میرے نزدیک چیزوں اور مکانوں سے زیادہ انسانوں کی اہمیت ہے۔"

وہ ہمیں ایک چھوٹی سی نشست گاہ میں لائی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ حصہ کچھ الگ سا تھا۔ اس نے تصدیق کی۔ "یہ میرا حصہ ہے یوں سمجھ لو جیسے ہوٹل کے سوٹ ہوتے ہیں اس طرح یہ ممتاز ہاؤس میں میرا سوٹ ہے۔"

میں صوفے پر گر گیا۔ "یقیناً ہوگا۔"

"تم دونوں بیٹھو میں چینج کر کے آتی ہوں۔"

"اگرچہ یہ بھی خوب ہے لیکن تم بدلنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی ہے۔"

بنٹی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی بیتو نے سوالات شروع کیے تھے کہ میں نے اسے روکا۔ "برخوردار یہ میں تمہیں ذرا سکون سے بتاؤں گا بس اتنا سمجھ لو کہ ایک بار یہ ملی تھی اور ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی تھی۔ یہاں ہم محفوظ ہیں۔"

بیتو نے گویا سکون کا سانس لیا۔ "تب ٹھیک ہے شوبی، تم ویسے بھی یہاں رکنا چاہتا تھا۔ اب آرام سے سوئے گا۔" اس نے جماہی لی۔ ویسے بھی اس نے لاہوری چٹخارے اور کڑاہی سے دل کھول کر استفادہ کیا تھا۔ اس کا فطری نتیجہ اس کی آنکھوں سے خمار کی صورت میں جھلک رہا تھا اس لیے بنٹی واپس آئی تو میں نے اس سے کہا۔ "میرے ساتھی کو نیند آ رہی ہے بہتر ہے پہلے تم ہمیں ہمارا کمرا دکھا دو۔"

اس نے سر ہلایا اور ایک کال بیل بجائی۔ اس پر ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی جس نے حیدرآبادی انداز کا فراک اور پاجامہ پہن رکھا تھا اندر آئی۔ وہ کہیں سے خادمہ نہیں لگ رہی تھی مگر وہ خادمہ ہی تھی۔ بنٹی نے خادمہ بھی چن کر رکھی تھی اور وہ اس کی ذاتی خادمہ تھی۔ اس نے کہا۔ "بانو، انہیں لے جاؤ اور ساتھ والا...... بیڈ روم کھول دو۔"

بیتو بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ ان کے جاتے ہی بنٹی کا انداز بدل گیا۔ آنکھوں سے شوخی اور کسی قدر خمار جھلکنے لگا۔ اس نے ترغیب آمیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا پیو گے؟"

میں مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے یہاں حلال سے حرام تک اور سافٹ سے ہارڈ تک سب پینے کو ملے گا۔ مگر بندہ آج بھی سادہ پانی کے بعد صرف چائے کافی سے شغل کرتا ہے۔ اگر کافی مل جائے تو....."

"بانو بہت اچھی کافی بناتی ہے۔" اس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ "تم آج بھی نہیں بدلے ہو۔"

"تمہارے خیال میں مجھ میں کیا تبدیلی آنی چاہیے تھی؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"میں نے تو سنا ہے کہ جو لوگ مار دھاڑ میں پڑ جاتے ہیں اور گینگ بنا کر رہتے ہیں وہ پینے پلانے لگتے ہیں اور زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

اس کی معلومات نے ایک بار پھر مجھے محظوظ کیا تھا۔ "زندگی سے صحیح طرح سے لطف اندوز تو میں نے ان لوگوں کو بھی نہیں ہوتے دیکھا ہے جو اصل میں اسی لیے جیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بکھیڑوں میں پڑے رہتے ہیں اور اچانک دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ دوسرے میں نہ مار دھاڑ میں پڑا ہوں اور نہ میرا کوئی گینگ ہے۔ میں صرف اپنے دشمنوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں اور میرے کچھ مخلص ساتھی ہیں، ہم کسی طرح بھی گینگ نہیں ہیں۔"

"پھر بھی جو لوگ آؤٹ آف وے جا کر زندگی گزارتے ہیں وہ کچھ تو کرتے ہیں۔"

"افسوس کہ میں وہ بھی نہیں کرتا اور کیا تمہیں پتا نہیں ہے کہ اب عیاشی کی زندگی گزارنے کے لیے آؤٹ آف

دے جانا بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔“

بنٹی کچھ کہتے جارہی تھی کہ بانو اندر آئی۔ بنٹی نے اس بار اسے کافی اور ساتھ میں کچھ لوازمات لانے کا حکم دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ہمیں بلکہ مجھے کسی وجہ سے ساتھ لائی ہے۔ اس میں تو شک نہیں ہے کہ ہماری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی لیکن اس کے بعد اس نے جس طرح اصرار کیا تھا اور مجھے تقریباً زبردستی ساتھ لے آئی تھی۔ اس وقت میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب اس کا اصرار مجھے ضرورت سے زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کا تعلق جس طبقے سے تھا وہاں لوگوں میں شکر گزاری جیسی چیز نہایت قلیل مقدار میں پائی جاتی ہے۔ وہ شکریہ بھی اس طرح ادا کرتے ہیں جیسے بینک کا قرض ادا کر رہے ہوں یعنی بادلِ ناخواستہ اور بالکل مجبور ہو کر۔ بانو کے جاتے ہی میں نے پوچھا۔ ”بنٹی تمہیں توقع تھی کہ میری اور تمہاری ملاقات ہو جائے گی؟“

”بالکل بھی نہیں۔“

”تب اس غیر متوقع ملاقات کے نتیجے میں تم نے نہ صرف اپنا پروگرام ترک کر دیا بلکہ مجھے اصرار کر کے ساتھ لے آئیں۔“

اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ اس نے گہری سانس لی۔ ”شہباز تم بہت ذہین ہو، تم نے کیسے جانا کہ میں تمہیں ایسے ہی نہیں لائی ہوں؟“

میں اسے سچ بتا دیتا تو وہ ناراض ہو جاتی اس لیے میں نے ڈپلومیسی سے کام لیا۔ ”ابھی تم نے کہا نا میں بہت ذہین ہوں اور کچھ تمہارے انداز سے لگا۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دراصل پاپا تم سے ملنا چاہتے تھے، انہوں نے دوسرے ذرائع سے بھی کوشش کی اور تمہارے راجا عمر دراز سے بھی رابطہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا، اسے نہیں معلوم کہ تم اور تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔ پاپا کا کہنا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ اسلام آباد میں اس کے تمام وسائل تم لوگوں کے استعمال میں ہیں۔“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”اسے جھوٹ نہیں حکمتِ عملی کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اٹھ کر راجا عمر دراز جیسے آدمی سے میرے بارے میں پوچھے گا تو اسے یہی جواب ملے گا اور بائی دی وے تمہارے پاپا سیاست دان ہیں، کیا وہ صبح سے شام تک جو کہتے ہیں وہ سب سچ ہوتا ہے۔“

وہ کھسیا گئی۔ ”ایسا نہیں ہے لیکن.....“

”خیر چھوڑو، یہ بتاؤ تمہارے پاپا مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”یہ تو پاپا نے نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے وہ شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔“

بنٹی کے برعکس میرا نہیں خیال تھا کہ اس کے سیاست دان پاپا صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے بلا رہے تھے۔ بانو کافی اور اس کے ساتھ خشک میوے لائی تھی۔ یہ سب اعلیٰ درجے کا ڈرائی فروٹ تھا۔ کافی لاجواب تھی۔ میں نے اس کی خوشبو اور ذائقے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچا کہ کہیں اس کے پاپا کا مرشد سے تو کوئی گٹھ جوڑ نہیں ہو گیا تھا۔ مگر سیاسی لحاظ سے یہ ممکن نہیں کیونکہ مرشد جس پارٹی میں شامل ہوا تھا وہ میاں ممتاز کی پارٹی کی مخالف ہے اور یہ مخالفت ایسی ہے کہ ان کا مستقل بنیادوں میں ناممکنات میں سے ہے۔ مگر آج کل سیاست میں کچھ ناممکن بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے مرشد اور میاں ممتاز میں کوئی عارضی معاہدہ ہوا ہو میری خاطر۔ بنٹی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

”کیا تم پریشان ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا اور موضوع بدل دیا۔ ”تم میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ”اچھا، کیسی تبدیلیاں آئی ہیں؟“

”مثبت قسم کی۔ پہلے تمہارا وزن کسی قدر زیادہ تھا، تم نے کم کر لیا ہے۔ میک اپ اور ہیئر اسٹائل بھی اچھا ہے۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں پہلے سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہوں۔“

میں ہنسا۔ ”چلو تم خوش ہوتی ہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔“

وہ صوفے کے دوسرے کونے پر ایک خاص پوز میں بیٹھی تھی یہ سن کر میرے قریب کھسک آئی۔ ”تمہیں میری خوشی کا خیال ہے؟“

”ہاں۔“ میں ہچکچایا۔ ”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟“

”بتایا تو ہے خوب صورت لگ رہی ہو۔“ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا، ویسے اس کے انداز سے خطرے کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔

وہ جھنجلا گئی۔ ”وہ تو میں ہوں۔ میرا مطلب ہے تمہیں اچھی لگتی ہوں یا نہیں؟“

”یہ سوال ذرا مشکل ہے۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”اصل میں‘ میں خواتین پر زیادہ غور نہیں کرتا۔“

”کیوں.....“

”کیونکہ غور کرنے کے لیے میرے اپنے مسائل کم نہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دوسرے میں اس فطرت کا آدمی نہیں ہوں۔ تم میرے ساتھ رہ چکی ہو اور تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں کن حالوں میں بھی دیکھا ہے اس کے باوجود تمہیں میری فطرت کا اندازہ نہیں ہوا ہے۔“

”اسی سے تو اندازہ ہوا ہے، تم ان سب سے مختلف ہو جن سے میں اب تک ملی ہوں۔“

”تم اب تک اپنے طبقے سے ہٹ کر لوگوں سے نہیں ملی ہو اور اسی لیے میں تمہیں مختلف لگ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بائی دی وے تمہارے پاپا کہاں ہیں کیونکہ کل ہم لازمی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اس لیے آج ہی ان سے ملاقات ہو جائے تو.....“

”میں تمہیں اتنی جلدی جانے نہیں دوں گی۔“ اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ”پاپا سے ملاقات تو ہو جائے گی لیکن کم سے کم ایک دن تو میرے ساتھ رہو۔“

”یہ ممکن نہیں ہے‘ میں اپنے ساتھیوں کو اسلام آباد میں چھوڑ آیا ہوں وہ میری واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”وہ ایک دن انتظار کر سکتے ہیں۔“ اس نے اصرار کیا۔

وہ کمبل ہو رہی تھی۔ میں اسے سخت انداز میں منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں دس مردوں کا سامنا کر سکتا تھا اور ان سے اپنی بات منوا سکتا تھا مگر ایک عورت کے سامنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں جنس کے حوالے سے کمزور پڑ جاتا تھا۔ یہ سارا قصور میری تربیت کا تھا۔ مجھے عورتوں کے حوالے سے نرمی کی تربیت ملی تھی۔ بچپن سے میں دیکھتا تھا کہ ہم بھائیوں کے معاملے میں ہیرے کی طرح سخت بابا جان ماں جی اور صغراں آپا کے لیے ریشم کی طرح نرم پڑ جاتے تھے۔ اگر ہمیں بابا سے کچھ کہنا ہوتا تھا تو ماں جی یا آپا کے توسط سے کہتے تھے۔ یہ تربیت آج بھی اسی طرح برقرار تھی اور حویلی سے برسوں دور رہنے اور دنیا جہان کی عورتوں سے واسطہ پڑنے کے باوجود میں آج بھی عورت کے معاملے اسی طرح نرم پڑ جاتا تھا۔ ایسا [illegible] ہوا جب میں نے کسی کے ساتھ سختی کی ہو۔

”پلیز بنٹی مجھے مجبور مت کرو۔ میں ان دنوں مصروف ہوں‘ تم سے وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ ایک دن پورا تمہارے ساتھ رہوں..... ٹھیک ہے؟“

بادلِ ناخواستہ اس نے سر ہلایا۔ اسی لمحے موبائل کی بیل بجی، اس نے میز سے پرس اٹھا کر [illegible] نکالا اور اس کی پیشانی پر شکن آ گئی۔ اس نے [illegible] کہا۔ ”پاپا.....“ پھر اس نے کال ریسیو کی۔ ”یس پاپا آئی ایم ان ہوم..... یس..... ہی ..... می..... پاپا..... ناؤ..... اوکے۔“ اس نے آئی فون واپس [illegible] اور میری طرف دیکھا۔ ”پاپا گھر میں ہیں اور ان کو معلوم [illegible] کہ تم میرے ساتھ آئے ہو۔“

”کیا وہ مجھ سے ابھی ملنا چاہتے ہیں؟“ میں نے [illegible] کی یک طرفہ گفتگو سے نتیجہ اخذ کیا۔

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں..... وہ تمہارے منتظر ہیں۔“

”تو چلو۔“ میں نے کافی کا مگ میز پر رکھ دیا۔ ”[illegible] ہے ان سے ملاقات بھی ہو گئی ورنہ مجھے کل صبح جانا تھا۔ [illegible] ان کے پاس وقت نہ ہوتا تو یہ ملاقات رہ جاتی۔“

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”پاپا سے لوگ ملنے اور بات کرنے کے لیے [illegible] اور ہفتوں کا انتظار کرتے ہیں اور تم ایک دن نہیں رک سکتے۔“

”انہیں تمہارے پاپا سے ملنے کا شوق نہیں ہوتا [illegible] ان کی کوئی غرض ہوتی ہے اس لیے انتظار کرتے ہیں۔“

”پاپا تمہارے کام آ سکتے ہیں۔“ اس نے [illegible] آمیز لہجے میں کہا۔

”مس بنٹی‘ میں نے کبھی کسی سے مدد نہیں [illegible] صرف اللہ اور اپنے زورِ بازو پر بھروسا کیا ہے۔ میرا ایمان ہے ساری دنیا کے انسان مل کر بھی میری مدد نہیں کر سکتے [illegible] اللہ نہ چاہے اور ساری دنیا کے انسان مل کر بھی میرا [illegible] بگاڑ سکتے اگر اللہ نہ چاہے۔“

اس کا منہ بن گیا تھا۔ اس کا تعلق جس طبقے سے [illegible] انہیں اس قسم کی باتیں بے وقت کی راگنیاں لگتی ہیں اس [illegible] منہ بننا لازمی تھا۔ بہرحال وہ مجھے لیے اپنے عالی شان [illegible] کے ایک دوسرے حصے میں آئی۔ یہاں ایک وسیع و عریض نشست گاہ میں ممتاز حسین ایک شاہانہ کروفر کے انداز [illegible] بیٹھا تھا۔ میں نے اسے تصویروں اور ٹی وی میں دیکھا تھا البتہ ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ دیکھنے میں وہ بہت پالش کیا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔ اس کے سیاہی مائل براؤن بال قلموں سے سفید ہو رہے تھے اور یہ بھی ایک قسم کی کلر ٹیکنیک تھی۔ سرخ و سفید رنگت یوں دمک رہی تھی جیسے اس کے تلے نہایت صحت مند خون ہو۔ اس کا جسم درمیانہ تھا یعنی وہ دبلا نہیں تھا مگر بھاری بھر کم بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سفید ٹراؤزر اور اس کے ساتھ گاؤن نما شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سامنے میز پر مے نوشی کے لوازمات رکھے تھے۔ یہ روشن خیال گھرانا تھا اس لیے نہ بیٹی کو باپ کی مے نوشی پر اعتراض تھا اور نہ باپ کو بیٹی کے لباس پر اعتراض تھا۔ میرے سلام کا اس نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور بولا۔ ”بیٹھو شہباز ملک۔“ اس نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا تھا اچھا ہوا تم خود ہی چلے آئے۔“ مجھے لگا اس نے ”تم خود ہی چلے آئے“ کسی خاص معنوں میں کہا تھا۔

میں نے بیٹھ کر کہا۔ ”اچھا ہوا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی ورنہ صبح مجھے واپس جانا تھا۔“

وہ مسکرایا۔ ”اتنی جلدی کیا ہے پہلی بار آئے ہو کچھ دن یہاں رکو۔“

”شکریہ ممتاز صاحب۔“ میں نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔ ”میں ذرا مصروف ہوں، آپ بھی مصروف آدمی ہیں۔ پھر کبھی رکوں گا۔ ابھی تو آپ سے ملاقات ہو گئی۔“

اس نے اپنے لیے گلاس میں بوتل سے اسکاچ وہسکی نکالی اور گلاس کو پُرخیال نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں میرا خیال ہے ابھی تمہیں رکنا ہوگا۔“

میری چھٹی حس کسمسانے لگی تھی شاید..... ممتاز کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی۔ ”کیا آپ اس جملے کی وضاحت کریں گے؟“

جواب دینے سے پہلے اس نے بنٹی کی طرف دیکھا۔ ”بنٹی میرا خیال ہے رات بہت ہو گئی ہے اب تم آرام کرو۔“

بنٹی نے منہ بنایا اور ٹھنک کر بولی۔ ”میں ٹھیک ہوں پاپا.....“

”تب بھی آپ میرے کہنے پر آرام کریں‘ مجھے شہباز سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں.....“ ممتاز نے اس انداز میں کہا کہ بنٹی نے سمجھ لیا اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے جانے سے پہلے اس نے باپ کو رخسار پر پیار کیا اور آہستہ سے بولی۔

”پاپا پایادر کھیے گا شہباز ہمارا محسن ہے۔“

”میں جانتا ہوں.....“ ممتاز نے سر ہلایا مگر بنٹی کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ بنٹی نے ذرا پیچھے ہو کر انگلیوں کے اشارے سے ایک عدد فضائی بوسہ میری طرف روانہ کیا اور خود بھی لہراتی بل کھاتی روانہ ہو گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے جو تھے وہ بیتو کے پاس بیگ میں تھے اور وہ نہ جانے کہاں تھا۔ بنٹی کے جانے کے بعد ممتاز نے گلاس اٹھا لیا اور بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”شہباز ملک میں جانتا ہوں تم اور تمہارے ساتھی گزشتہ چھ سات مہینے کے دوران پاکستان اور اس سے باہر کیا کرتے رہے ہیں۔“

”ظاہر ہے آپ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے۔“ میں نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”مگر مجھے یہ سب بتانے کا مقصد؟“

”تم پولیس کو مطلوب ہو، صرف پاکستان نہیں بلکہ انڈیا میں بھی پولیس کو مطلوب ہو۔“

”ممتاز صاحب میں نے مقصد کا پوچھا ہے؟“ اس بار میں نے بھی لہجہ اسی کی طرح روکھا کر لیا۔

”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“ اس نے پینترا بدلا۔ ”میں چاہتا ہوں تم ان چکروں سے نکل جاؤ۔“

”اس کے لیے آپ کے ذہن میں شاید کوئی پلان بھی ہوگا۔“

وہ میرے انداز پر جھنجلا رہا تھا اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”نہیں یہ میری خواہش ہے۔“

”ممتاز صاحب آپ سیاست دان ہیں اور آپ کو یقیناً بات گھما پھرا کر کرنے کی عادت ہے لیکن میں سیدھا دو جمع دو برابر چار والا آدمی ہوں۔ میں سیدھی بات کرتا ہوں اور سامنے والے سے بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ سیدھی بات کرے۔“

اس کا چہرہ یوں تن گیا جیسے اس کے سامنے کسی چھوٹے مرتبے کے آدمی نے اپنے قد سے بڑی بات کہہ دی ہو۔ مگر یہ لمحاتی تاثر تھا اگلے لمحے اس کے چہرے پر سیاسی نقاب آ گیا تھا۔ ”میں تم سے سیدھی بات ہی کروں گا۔“

”ممتاز صاحب میرا پروگرام تو یہ ہے کہ میں کل صبح یہاں سے اپنے ساتھی سمیت روانہ ہو جاؤں گا اب آپ

بتائیں کہ میں ایسا کیوں نہیں کرسکوں گا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اگلے سانس میں گلاس میں موجود آتشیں سیال اپنے حلق میں انڈیل کر کہا۔ "بات یہ ہے شہباز کہ کسی نے مجھ سے تمہارے لیے رابطہ کیا ہے اور اس سے میرا تعلق ایسا ہے کہ میں اسے ٹال سکتا ہوں لیکن اسے انکار نہیں کرسکتا ہوں۔"

"میری بات کی ہے یا میری فرمائش کی ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور کیونکہ خوش قسمتی سے میں آپ کے ہاتھ آگیا ہوں اس لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ کسی کی فرمائش پوری کردیں۔"

"یہ فرمائش نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں اس کا اور تمہارا آمنا سامنا کرادوں۔"

"تو آپ مجھے اس لیے روک رہے ہیں کہ اس شخص سے میری ملاقات کرادیں اور لازمی بات ہے وہ میرے دشمنوں میں سے ہوگا تبھی اس نے آپ کو یہ زحمت دی ہے۔"

ممتاز نے سر ہلایا اور اگلے پیگ کی تیاری کرنے لگا۔ "اس کا کہنا یہی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا مرشد نے اس سے رابطہ کیا تھا اور وہ ضمانتی بننے کو تیار ہوا تھا۔ میں نے بے دھڑک پوچھ لیا۔ "کیا وہ شخص مرشد ہے؟"

"نہیں۔" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔ "اس شخص سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ مرشد کا ذکر یوں کر رہا تھا جیسے وہ کوئی معمولی درجے کا جرائم پیشہ ہو اور اس سے تعلق رکھنا..... ممتاز کی شان کے خلاف ہو۔ "تب آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ایسا کون سا شخص ہے جو مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے؟"

"جب ملاقات ہوگی تو تم دیکھ لوگے۔"

"اس صورت میں یہ ملاقات نہیں ہوسکے گی۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ مگر اس نے میری بات کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے آہستہ سے کہا۔

"شہباز تم یہاں سے نہیں جاسکتے۔"

"آپ کا مطلب ہے ہم یہاں اب قیدی ہیں؟"

"تم اس جگہ مہمان ہو۔"

"معذرت کے ساتھ ممتاز صاحب، کیا آپ ایسے ہی مہمان بناتے ہیں؟"

اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا، اس نے بدلے لہجے میں کہا۔ "شہباز تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم میرے تو... اس سے ملوگے ورنہ تم اس کے بارے میں نہیں جانتے... وہ بہت بڑی آفت ہے۔ مجھے دلچسپی ہے کہ آخر وہ تم سے کیوں ملنا چاہتا ہے کیونکہ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے۔"

"آپ مجھے اس کے حوالے کردیں گے؟" میں نے پوچھا ویسے میں اس کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے اس شخصیت کے بارے میں نہیں بتائے گا۔ اس لیے میں نے اس کے بارے میں دوبارہ پوچھا بھی نہیں۔

"نہیں جب تک میں پوری بات نہیں جان جاؤں اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔"

"ممتاز صاحب آپ کی بات سے لگ رہا ہے کہ آپ میری حوالگی کا فیصلہ بھی کرسکتے ہیں، ممکن ہے جس طرح آپ نے دوستی میں مجبور ہو کر یہ کام کیا ہے اسی طرح مزید مجبور ہو کر آپ مجھے اس کے حوالے کرسکتے ہیں۔"

"اب میں ایسا بھی مجبور نہیں ہوں، میں انکار بھی کرسکتا ہوں۔" اس نے لہجے میں بے نیازی برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ وہ سیاست دان تھا جو ویسے ہی بدنام ہوتا ہے، ہوا کے رخ کے ساتھ بدل جانا، اپنے قول و فعل کو کپڑوں کی طرح بدلنا، وعدے کرکے ڈھٹائی سے مکر جانے کو ہی ہمارے ہاں سیاست کہتے ہیں۔ ممتاز اسی قسم کا سیاست دان تھا۔ اس اور اس کی اولاد کی اخلاقی حالت میں دیکھ چکا تھا ایسے لوگوں کو صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ میں اس کی قید میں تھا اور اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ مجھے صفائی پیش کرتا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہوا تھا اور یہ مجبوری یقیناً اس کی بیٹی تھی۔ اب مجھے اس شخص کی فکر ہو رہی تھی جس نے ممتاز سے مجھ سے ملاقات کی فرمائش کی تھی۔ وہ کون ہوسکتا تھا۔ ممتاز انکاری تھا کہ وہ مرشد نہیں ہے اگر مرشد نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ دوسرے ضروری نہیں تھا کہ ..... ممتاز دیگر معاملات کی طرح اس بارے میں بھی سچ بول رہا ہو میں نے سوچا اور بہت ناپ تول کر کہا۔

"ممتاز صاحب..... آپ اچھی طرح جانتے ہیں انسان کو اپنے کیے ہر فعل کا کہیں نہ کہیں حساب اور جواب دینا پڑتا ہے۔"

"فی الحال تو ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو مجھ سے حساب اور جواب لے سکے۔" اس کے لہجے میں تکبر آگیا۔

"ممتاز صاحب..... اس کا پتا اس وقت چلتا ہے جب وقت آجاتا ہے۔ آپ اگر میرے بارے میں جانتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں اتنا لاوارث بھی نہیں ہوں۔ میرا ایک خاندان ہے۔ میرے کچھ سرپرست ہیں اور میرے کچھ ساتھی ہیں جو میری بازیابی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور جب ان کو معلوم ہوگا کہ میری گم شدگی میں کس کا ہاتھ ہے تو آپ....."

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" ممتاز کا چہرہ کسی قدر سرخ ہوگیا تھا۔

"میں آپ کو نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ سیاست دان ہیں حکومت سے باہر ہوں یا حکومت کے اندر، آپ جو کرتے ہیں اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر کرتے ہیں تاکہ آپ آئندہ کہیں پھنس نہ جائیں۔ مگر معذرت کے ساتھ میرے معاملے میں شاید آپ نے زیادہ غور فرمانا پسند نہیں کیا ہے۔"

"میں چھوٹے موٹے معاملات پر زیادہ غور نہیں کرتا۔"

"ایک بار پھر معذرت کے ساتھ، چھوٹے موٹے معاملات ہی اکثر اوقات آدمی کے گلے پڑ جاتے ہیں، ہاتھ کی لکھی ایک تحریر منتخب وزیراعظم کو ملک یا دنیا سے باہر پہنچا دیتی ہے جسے انہوں نے کسی وقت بہت معمولی سمجھا ہوتا ہے۔ میری آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس معاملے پر ایک بار پھر غور کرلیں۔" میرا لہجہ بہ ظاہر مؤدبانہ تھا اس کی تہ میں چھپی سختی یقیناً ممتاز نے محسوس کی تھی۔ تبھی اس کی کشادہ پیشانی پر لکیریں ابھر آئی تھیں۔ اس کا ہاتھ میز کی طرف گیا تھا میں سمجھا کہ شاید وہ گلاس اٹھا رہا ہے لیکن اس کے بجائے اس نے کچھ اور کیا جو میں دیکھ نہیں سکا میز کا کچھ حصہ میری نظروں سے اوجھل تھا کیونکہ فوراً ہی دو گارڈز آئے۔ ممتاز نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اسے لے جاؤ۔"

ممتاز ہاؤس کی مخصوص وردیوں میں ملبوس گارڈز تھے اور میں نے انہیں گارڈز کے عام معیار سے کہیں بہتر پایا تھا۔ وہ جوان، صحت مند اور ایک خاص چستی کے مالک تھے۔ ان کے پاس چھوٹی لیکن جدید ترین شاٹ گنز تھیں۔ یہ اندر کے محافظ تھے۔ بیرونی گارڈز کے پاس لانگ رینج خودکار رائفلیں تھیں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر بیکار سمجھتے ہوئے گارڈز کے ساتھ باہر آگیا۔ نہ جانے ممتاز نے انہیں کیا اشارہ دیا تھا کہ وہ میری طرف سے بہت چوکنا نظر آنے لگے تھے۔ کیونکہ ممتاز نے انہیں میرے سامنے کوئی ہدایت نہیں دی تھی اس لیے یہ واضح تھا کہ سب پہلے سے طے کرلیا گیا تھا۔ گارڈز کو معلوم تھا کہ مجھے کہاں لے جانا تھا اور میرے ساتھ کیا سلوک کرنا تھا۔ اب مجھے بیتو کی فکر ہو رہی تھی۔ جب مجھے قید کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو اسے اسلحے کے ساتھ آزاد کیسے چھوڑا جاسکتا تھا۔

وہ مجھے عمارت میں کہیں لے جا رہے تھے کہ اچانک ایک راہداری میں بنٹی ملی۔ وہ شاید میری ہی منتظر تھی کیونکہ اس نے گارڈز کو دیکھ کر سرد لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

ایک گارڈ نے معذرت کی۔ "بی بی صاحبہ..... ممتاز صاحب نے حکم دیا ہے۔ اسے بند کرنا ہے۔"

"اس کا ساتھی کہاں ہے؟"

"اسے بھی نو نمبر میں پہنچا دیا ہے؟"

"شہباز میرے ساتھ آؤ....." بنٹی نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔

"بی بی....."

"بکومت۔" بنٹی غرائی۔ "یہاں کھڑے رہو....."

بادلِ ناخواستہ انہوں نے بنٹی کا حکم مانا اور باہر رہ گئے۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں آیا۔ یہ بھی نشست گاہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ ممتاز ہاؤس کے نچلے فلور پر اسی قسم کے کمرے تھے اور رہائشی حصہ یعنی خواب گاہیں اوپر والے فلور پر تھیں۔ بنٹی نے لباس بدل لیا تھا۔ وہ اسکن فٹ جینز اور کسی ریشم جیسے کپڑے سے بنے کرتے میں تھی۔ کرتے کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کی طرف دیکھنا آسان کام نہیں تھا۔ اندر آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "پاپا سے کیا بات ہوئی؟"

"انہوں نے کسی کے فرمائشی پروگرام پر مجھے روکنے اور قید کرنے کا حکم صادر فرمادیا ہے۔ لیکن وہ اس کے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

بنٹی تشویش زدہ ہوگئی۔ "میری ابھی پاپا سے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے اس معاملے سے الگ رہنے کو کہا ہے۔"

"بنٹی مجھے لگ رہا ہے ممتاز صاحب میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرچکے ہیں۔ ان کے خیال میں میں نے تم دونوں کو بچا کر اگر کوئی احسان کیا تھا تو وہ بہت معمولی درجے کا تھا اس لیے انہیں میرا زیر بار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کے لیے اپنے دوست کی فرمائش پوری کرنا زیادہ اہم ہے۔"

”پاپا ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ کسی قدر برہمی سے بولی۔ ”اگر ان کے خیال میں تم نے کوئی احسان نہیں کیا ہے تو یہ ان کا خیال ہے، میں سمجھتی ہوں تم نے ہم پر احسان ہی کیا ہے اور میں تمہیں اتنی آسانی سے کسی کے حوالے نہیں کرنے دوں گی۔“

”اسی میں تم لوگوں کی بھی بہتری ہے۔ میں ممتاز صاحب کو بھی بتا چکا ہوں کہ میں کوئی لاوارث آدمی نہیں ہوں اور میرے لوگ مجھے تلاش کرلیں گے یقین کرو انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ جب معاملہ ان کے ہاتھ میں ہوگا تو وہ مجھے بازیاب کرانے کے لیے سب کر گزریں گے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

بنٹی نے اپنا لب مخصوص انداز میں دانتوں میں دبا لیا تھا جب وہ پریشان ہوتی تو ایسا ہی کرتی تھی۔ ”میں پاپا کی نسبت تمہارے بارے میں کہیں زیادہ جانتی ہوں کیونکہ مجھے تم سے دلچسپی رہی ہے۔ میں بھی سمجھتی ہوں پاپا غلطی کر رہے ہیں۔“

”تم جانتی ہو وہ کس کے لیے یہ سب کر رہے ہیں؟“

بنٹی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن وہ کوئی بھی ہو اتنا اہم نہیں ہو سکتا کہ پاپا اس کے لیے یہ سب کریں۔ میں پھر ان سے بات کرتی ہوں۔“

”میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ پاپا تمہاری بات سمجھ جائیں اور اس سے پہلے خرابی حد سے بڑھ جائے اس مسئلے کو حل کرلیا جائے۔“

بنٹی نے سر ہلایا۔ اس نے تالی بجائی تو دونوں گارڈز اندر آئے۔ ”تم فکر مت کرو اور جاکر آرام کرو۔“

میں گارڈز کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ مجھے عمارت کے عقبی حصے میں واقع ایک کمرے تک لائے۔ اندر لے جانے سے پہلے انہوں نے میری تلاشی لی تھی اور موبائل سمیت سب نکال لیا تھا۔ مجھے موقع نہیں ملا تھا کہ میں موبائل کو استعمال کرتے ہوئے کسی کو خبردار کرتا۔ بیتو محو خواب تھا۔ شاید اسے کسی طریقے سے سلا دیا گیا تھا کیونکہ اسلحے والے بیگ سمیت سب غائب تھا۔ یہ اس جگہ کے لحاظ سے معمولی سا کمرا تھا۔ فرش پر نارمل قالین اور وسط میں ایک بڑا ڈبل بیڈ تھا بیتو اسی پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک طرف کھڑکی تھی اس کے پٹ فکس کیے ہوئے تھے اور باہر کی طرف مضبوط فولادی گرل تھی۔ دروازہ نہایت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا واش روم تھا مگر اس میں سے بھی کہیں فرار کا راستہ نہیں تھا۔ یہ کمرا شاید معزز قسم کے قیدیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

آنے والا کل میرے لیے کیا لانے والا تھا اس کا کل ہی چلتا۔ اس لیے میں نے جاگتے رہنے سے بہتر سمجھا کہ سو جاؤں۔ میں بیتو کے برابر میں لیٹ گیا۔ کمرے میں اے سی تھا اس لیے گرمی کا احساس نہیں تھا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو باہر روشنی کا آغاز ہو رہا تھا۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی بلکہ آنکھ کسی وجہ سے کھلی تھی۔ میں نے غور کیا تو باہر سے ایک مشینی گڑگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی جیسے کوئی بڑا انجن چل رہا ہو۔ میں اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور پٹ سرکایا تو آواز کچھ واضح ہوگئی۔ یہ ہیلی کاپٹر تھا جو اتر گیا تھا کیونکہ اب اس کی آواز گھٹ رہی تھی اور پھر آواز آنا بند ہوگئی۔ صبح سویرے ہیلی کاپٹر آیا تھا۔ ممتاز کی حویلی اتنی بڑی تھی کہ یہاں آرام سے کئی ہیلی کاپٹر اتر سکتے تھے۔ میری چھٹی حس اشارہ دے رہی تھی کہ ہیلی کاپٹر سے آمد اور میری یہاں موجودگی کا آپس میں تعلق ہے۔ میں کھڑکی بند کرکے واپس آیا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور گارڈز نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ بیتو اس بار بیدار ہوگیا تھا۔ اس نے حیران ہوکر کہا۔

”ہم یہاں کیسے آیا اور آپ کہاں جاتا ہے؟“

”پتا نہیں مجھے بلایا ہے۔“ میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں قید ہیں۔ کیوں قید ہیں یہ میں آکر بتاتا ہوں اس دوران میں تم آرام کرو۔“

”دیر مت کرو جلدی کرو۔“ گارڈ نے سخت لہجے میں کہا تو اس کے طرز تخاطب سے میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کیا میرے حوالے سے کوئی فیصلہ ہوگیا تھا تب ہی گارڈز کا لہجہ بھی بدل گیا تھا ورنہ کل رات وہ نرمی سے بات کر رہے تھے۔ میں نے بیتو کو اشارہ دیا تھا کہ کوئی حرکت نہ کرے اور میری واپسی کا انتظار کرے۔ گارڈز مجھے لے کر کمرے سے باہر آئے اور عمارت کے اس حصے کی طرف جانے لگے جہاں گزشتہ رات میری ممتاز سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک راہداری سے گزرتے ہوئے میں نے حویلی کے پہلو میں کھلی جگہ کھڑے ہیلی کاپٹر کی جھلک دیکھی۔ یہ ایک چھوٹا اور جدید قسم کا ہیلی کاپٹر تھا۔ مجھے حویلی کے اسی کمرے میں لے جایا گیا جہاں ممتاز نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ ممتاز وہاں نہیں تھا لیکن وہاں موجود شخص کو دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

افسر قزلباش.........مسقط (اومان)
نہ جانے کتنے چراغوں کا خوں ہوا ہوگا
نہیں ہے سہل کسی دل کو بے وفا کہنا

توقیر تقی.........فیصل آباد
نیا ستم ہے کہ گویا ستم کی حد ہی نہیں
نہ پہلے صبح و مسا ہیں نہ آسماں نہ زمیں
(سلیم کامریڈ کھاٹاں کا جواب)

زاہد خان.........کوئٹہ
یا سحر آئی ہے اندازِ شبِ ہجر لیے
یا شبِ ہجر بہ اندازِ سحر آئی ہے

نوشین ملک.........ملتان
یہ پچھلے پہر کس نے ترانہ چھیڑا
عالم ہمہ تن درد ہوا جاتا ہے

صنوبر جمشید.........فیصل آباد
یہ چاندنی کا شہر، یہ بازار آئینہ
آؤ یہ شب مکان سے باہر بسر کریں

(مرزا ہادی بیگ حیدر آباد کا جواب)

اطہر علی کاظمی.........علمدار روڈ کوئٹہ
یہ آہ وزاری یہ سوگ واری ہر ایک چہرے پہ موت طاری
لٹی محبت لٹا سکوں ہے ہمارے ہاتھوں ہمارا خوں ہے

میمونہ عباسی.........حیدر آباد
یہ کھیل ایسا نہیں یونہی جیت ہوجائے
کسی مقام پہ ہستی کو ہارنا ہوگا

زاہد اسلم پیرانی.........سکھر
یہ کس کی زلف لہرائی فضا میں
کہ ہر جانب سے خوشبو آرہی ہے
(انصر علی ڈی آئی خان کا جواب)

اصغر بنگش.........ڈی آئی خان
میں تیری یاد سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں
قدم قدم پہ یہ دل تیرے اختیار میں ہے

(ظفر شاہ ملتان کا جواب)

نزہت پروین.........سکھر
زندگی ایک یتیم بچہ ہے
جیسے تیسے بھی پالنا ہوگا
(آسٹر رندھاوا کراچی کا جواب)

اسحاق دلبر.........دبئی
نثار کرکے مرے آنسوؤں کے نجم و گُہر
بساطِ ارضِ وطن کو سلام کہہ دینا
(شبیر احمد بھٹی بہاولپور کا جواب)

میمونہ سلطان.........میرپور
یاد میں کس کس کی اشکِ خوں نہ برسانا پڑے
کیسی کیسی ہستیاں اس خاک میں آباد ہیں

ایقان صدیقی.........پنڈ سلطان داد
یقیں آنے کو تو آجائے ان کے عہد وپیما کا
مگر چشمِ بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

نوشین ممتاز.........ملتان
یہ حوادث کا تلاطم یہ زمانہ ظالم
غم سے بجھتے ہوئے اشکوں کو ہوا دیتا ہے
(مرزا فرحان بیگ حیدر آباد کا جواب)

اسماعیل رند.........ملتان
ان کے آنے کی خبر پھول کے کھلنے سے ملی
چاندنی آج میرے آنگن میں اتر آئی ہے

نوشین ملک.........سکھر
اپنے مسکن سے نہیں ترک تعلق ممکن
ورنہ اس شہر میں جینے کے مواقع کم ہیں

عباس ملتانی.........ملتان
اب نہ مژگاں میں وہ زور ہے نہ نگاہوں میں توڑ
ترکش حسن میں اس کے نہ رہا تیر کوئی

شمیم احمد.........کراچی
آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

اشرف سیال.........جھنگ
اونچی پرواز ہے شاہین کے مقدر میں لکھا
اس کے پرواز کے پر دیکھنے والا میں کون
دانش احمد.........قلات
اب ہیں کانٹے میری زبان میں کیا؟
کچھ غلط کہہ دیا ہے شان میں کیا؟
(زاہد کراچی کا جواب)
لیاقت علی.........سمر سٹہ
ہر چیز دستیاب ہے دنیا جہان کی
لیکن تیری کمی کا ازالہ نہ ہو سکا
(تنویر آصف چوہدری جہلم کا جواب)
شمیم احمد.........کراچی
اس دور بے رخی میں اس قدر پاس وفا
بس یہی اک کام تھا جو ہم غلط کرتے رہے
(فتح علی میانوالی کا جواب)
طٰحہٰ یاسین.........حیدر آباد
کوئی نہیں جو بتا دے دلوں کی حالت کا
کہ سارے شہر کے اخبار ہیں خبر کے بغیر
(ناصر سید کا جواب)
بشیر احمد.........بہاولپور
سورج تو ساکت ہے فلک تلے
تھکی تو زمین ہوگی جو گردش میں ہے
(نازش نوید ملتان کا جواب)
محمد سعید قاسمی.........ڈلوال
نکال لایا ہے الزام پھر پرانے تُو
یہ ہم نے طے بھی کیا تھا کہ تُو بھلا دے گا
(نواز کریم پشاور کا جواب)
مرزا ہادی بیگ.........حیدر آباد
اشکوں سے ہماری ہے منور نئی دنیا
شبنم کو ضیا دی تو کرن ہم نے بنایا
نوازش خان.........سمر سٹہ
ان کو پانے کی سعی، ان کی تمنا بے سود
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

نثار اکرم چیلی.........کراچی
اپنی گلیاں اپنی سڑکیں اور جانے پہچانے لوگ
سب کچھ چھوٹ گیا ہے اپنا رہ گئے انجانے لوگ
(فریدہ تحسین ملتان کا جواب)
سلیم کامریڈ.........کھاناں
اب شب کی ظلمتوں میں کہیں آس پاس
صبحوں کے اہتمام ہیں تو جاگ تو سہی
فرید احسن.........جہانیاں
اب دل کے کھنڈروں میں بھلا کون آئے گا
تعمیر کس لیے نئے محراب و در کریں
(نوشین ملک سکھر کا جواب)
محمد عقیل چٹھہ.........حافظ آباد
نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے
(کونین فاطمہ کراچی کا جواب)
محمد عقیل چٹھہ.........حافظ آباد
اس میں شامل ہے میرے وقت کی تاریکی بھی
تم سیاہ رنگ جو پہنو گے تو یاد آؤں گا
(نصرت جاوید کا جواب)
ایم افضل کھرل.........ننکانہ صاحب
غم کی لو سے دھڑکتے دلوں کے کنول بجھ گئے
دھوپ میں کیسے کھلتے وہ جو چھاؤں کے پھول تھے
انعم فرید.........لاڑکانہ
غم کی طویل رات نہ بے شک سحر کریں
زندانِ شب میں چھوٹا سا روزن مگر کریں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 92

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 جون 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

کوہاٹ کے گاؤں شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ بذلہ سنجی میں مشہور تھے۔ خوش بیان خطیب تھے۔ خطبات کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ لاہور ہائی کورٹ کے جج بھی رہے۔ مشرقی پاکستان کے ایک ساحلی شہر میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

علمی آزمائش 90 کا جواب

رشید احمد صدیقی **1896**ء کو بھارت کے صوبہ اترپردیش کے ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی پھر اسی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ کافی عرصہ تک اسی یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ طنز نگاری میں بڑا نام کمایا۔ **1977** میں انتقال کیا۔

انعام یافتگان

1۔ نثار حسن، کوئٹہ **2**۔ ذیشان صادق کراچی **3**۔ فہیم الدین، کراچی

4۔ زاہد سرفراز، میاں چنوں **5**۔ احمد یار خان، پشاور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سید عزیز الدین، احمد کمال۔ راحیلہ رفیق، وجاہت وکیل، عثمان خان، شاہد آفتاب، نصرت حیدر، شمیم احمد، سمیع عزیز، ذوالفقار احمد خان، وجاہت وکیل، عثمان خان، محمد علی شاہد، سمرسٹہ سے عظمت علی رحمت علی۔ خانیوال سے افتخار شاہ۔ دینے طاہر حسن۔ صادق آباد سے عطاء اللہ اعوان۔ ارم اقبال رضوی، محمد علی مشاہد، فرزانہ پروین، انصار حسین، لعیق احمد، سرور احسن صدیقی عطیہ نورین، نیاز خانجی، بختیار شاہ، عارفہ سلطانہ، خالد عثمانی، کہکشاں تبسم، عروسہ انوار، عروج عالم، سید عزیز الدین، عنایت مسیح علی احمد رجب علی مرزا، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، فہیم احمد، انعام خان، افتخار احسن، وجاہت علی، کاوش اختر، تنویر حسین زیدی، نوازش علی شاہ، نغمہ اقبال رضوی، ناصر افروز، ممتاز الحسن، انصار حسین، قائم علی، ابرار احمد، نجم الدین حیدر، حکیم اللہ فہمی، منور علی، ملک سرفراز گل، کاشف حیدر، جاوید علی، مظفر محسن، پیام فاروقی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، خالد خان۔ لاہور سے صائمہ عمران، مسرت اسلم (جنگ نگر)، نعمان حیدر، کاشف عزیز، فرحت بتول ایم پی اسلم، ابرار الحسن، قدیر اللہ، ناصر فاروق، کاوش نسیم، کاشان صدیقی، الہ دینو آرائیں، گل زیب، پروین ضیائی، نثار اختر، ارشاد علی، احمد علی مشرق، ممتاز الحسن، عقیل سندھو، نعمان اشرف، خالد فاروقی، ارباز خان، اکرم صدیقی، ابرار احمد انعام، تابش عطاری، نیاز احمد ملک، برق ضیائی، الدعلی، احمد بشیر بٹ، فہیم مرزا، حدیقہ اشرف، ملک واحد الحق، ابرار احمد، نازش خان، ہما جبیں، حمیرا خاتون، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، نازش حسین، تابش اطہر۔ مظفر گڑھ سے رانا محمد سجاد (شاہ جمال)، بکھاتاں سے سلیم کامریڈ۔ اوکاڑہ سے سید احسن محمود۔ راولپنڈی سے رضوان احمد ہاشمی، شیراز ملک، ڈاکٹر علم یاسین، ناصر جاہ، تسنیم فاروق آرگلی، صادق حسن، نرجس علی، بخت خان، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، زویا بخاری، سید محمد نقی، تنویر الحسن، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، کائنات بانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، احمد خالد، ممتاز، انور یوسف زئی، برکت اللہ، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرضی، نعمت اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین اشفاق، سعید اختر، ردا ممتاز، انور یوسف زئی، شہناز فیضی، محمد متین، بشیر فاروقی، محمد شہزاد، بیدری اکرم۔ ملتان سے محمد یحییٰ معین، نورین افشاں، محمد بلال اقبالی، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، زندان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت منیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضلی خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، عبدالعزیز (سمندری) شوکت علی چاند۔ جھنگ سے فرحت بیگ۔ گوجرانوالہ سے نسیم شاہ۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، مسرت النسا۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمیٰ اکملی ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات، ثمینہ کوثر لطیف۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدرآباد سے مرزا ہادی بیگ، بابر خان، طہٰ یاسین۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ۔ پاک پتن سے زاہد علی خان۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ جہلم سے ندیمہ امتیاز۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ بہاؤ لنگر سے امتیاز شیخ معظم علی (چشیاں)۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔۔ بری پور سے خورشید احمد۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبیں فلک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ اٹک سے خالد چوہدری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، ثنا جبران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت فاطمہ ملک، سرفراز گل، ثناء اللہ، فرحت بابر زمان، سعید بھٹی، نثار فراز، سید اختر، سعید خان، شیخ ثنا، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ سمرسٹہ سے عظمت علی رحمت علی۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، یازخ بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ چکوال سے محمد جہانگیر۔ میانوالی سے نعمان نیازی (حلہ گنگ) احمد علی فوقی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی۔ بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منکیرا، زبیر شاہ، تقی بنگش۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوٹالہ، ناصر بھگیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، نثار علی، فہیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولارچی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، فہیم اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، جواد حسین بھٹی، خالد خان، ناصر انعم، ابرار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی واصف احمد۔ لیہ سیفا روق اعظم۔ پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، مانک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، شاہ وقار، منہال زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، نادر خان، اشرف حسن زئی، گل خان، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر شہنواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طوری بنگش، محمود اچکزئی، نزرانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ زیرآباد سے ندیم اکبر۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے نصیر خان۔ ممالک غیر سے زاہد خان، العین یو اے ای۔ عارف خان (جدہ سعودیہ۔ نگار سلطانہ، اونٹاریو (کینیڈا)۔ اسلم فتح پوری (یو کے)۔ فہد فاروق (ٹوکیو جاپان)۔

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
مودبانہ آداب!
میں نے اسکول لائف میں بہت لکھا۔ ایک بڑے روزنامہ اخبار کے صفحات پر ہر ہفتے میری تحریر ہوتی تھی لیکن شادی کے بعد زندگی کے بکھیڑوں نے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ تقریباً چالیس بیالیس سال بعد پھر سے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن اپنی ہی داستان قلم بند کی ہے۔

شہلا عارف
(کراچی)

میری شادی ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی جبکہ میں نے غربت کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ ہم چار بہنیں اور دو بھائی تھے۔ ابو کسی سرکاری محکمے میں کلرک تھے اور امی محلے والوں کے کپڑے سی کر گھر کی گاڑی چلانے میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ مجھ سے چھوٹی نادیہ پھر دو بھائی ارسلان اور نعمان اور ان سے چھوٹی دو بہنیں شازیہ اور شمسہ تھیں۔ سب بہن بھائی پڑھ رہے تھے۔ اس لیے اخراجات میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی خرچہ سامنے آجاتا۔ کسی کو کاپی چاہیے تو کوئی کیلکولیٹر کی ضد کر رہا ہے، کسی کا یونی فارم پھٹ گیا ہے تو کسی کے جوتے گھس گئے ہیں۔ ابو بے چارے نہ جانے کس طرح یہ اخراجات برداشت کرتے۔

گھر کے حالات نے ہم سب بہن بھائیوں کو بے حد حساس اور باشعور بنا دیا تھا اور ہم سب کی یہی کوشش ہوتی کہ انتہائی مجبوری میں اپنی ضرورت بیان کریں۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ حساس تھی اور گھر کے حالات دیکھ کر ہر وقت کڑھتی رہتی۔ میں نے یہ پختہ عزم کرلیا تھا کہ جیسے ہی کسی قابل ہوئی تو گھر کے حالات بہتر بنانے میں امی ابو کی بھرپور مدد کروں گی۔

میں نے میٹرک کے بعد محلے کے بچوں کو گھر پر پڑھانا شروع کردیا۔ پہلے روز دو بچے آئے پھر ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے دس تک پہنچ گئی۔ میں نے فی بچہ پچاس روپے فیس رکھی۔ اس طرح مجھے پانچ سو روپے مہینے کی آمدنی ہونے لگی۔ ابو کو میرا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ میرے کھیلنے کودنے کے دن ہیں اور مجھے اس چھوٹی عمر میں اپنے اوپر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں لینا چاہیے لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ کوئی ذمے داری نہیں لے رہی بلکہ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے کالج میں داخلہ لینا تھا اور جانتی تھی کہ ابو میرے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔

اس کے بعد کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور اپنی محدود آمدنی میں سے بہن بھائیوں کی ضروریات بھی پوری کرنے لگی۔

انٹر پاس کرنے کے بعد مجھے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی تو میں نے کالج جانا چھوڑ دیا اور پرائیویٹ بی اے کے امتحان کی تیاری کرنے لگی۔ اب نادیہ نے بھی میرے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے میٹرک کرنے کے بعد گھر پر بچوں کو پڑھانا شروع کردیا تھا۔ اتنی تگ و دو اور جدوجہد کے باوجود ہم بمشکل تمام سفید پوشی کا بھرم رکھنے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ ہمارے گھر میں کوئی لگژری آئٹم مثلاً فریج، ٹی وی، جوسر، گرائنڈر وغیرہ نہیں تھے۔ بعض اوقات ان چیزوں کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ یہ چیزیں ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ اگر کوئی معجزہ رونما ہوا اور ہمارے حالات بہتر ہوگئے تو شاید ہم بھی کبھی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوسکیں۔

میں نے کبھی اپنے آپ کو آئینے میں غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن اسکول میں سب کولیگز یہی کہا کرتیں کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ ان کے احساس دلانے پر میں نے بھی اپنے آپ پر توجہ دینا شروع کردی۔ ایک دو ڈھنگ کے جوڑے بنائے اور قاعدے قرینے سے تیار ہو کر اسکول جانے لگی۔ کچھ دنوں بعد وہاں میلاد کی تقریب ہونے والی تھی۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے یہ ذمے داری مجھے سونپ دی کہ اسکول کی بچیوں میں سے چند ایک کو نعت خوانی کے لیے منتخب کروں۔ میں نے محلے پڑوس میں میلاد کی کئی محفلوں میں شرکت کی تھی لیکن خود کبھی نعت یا میلاد نہیں پڑھا تھا۔ بہرحال تھوڑی سی کوشش کے بعد پانچ چھ لڑکیوں کا انتخاب کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اپنی نگرانی میں انہیں تیاری کروانے لگی البتہ میلاد پڑھنے والی خاتون کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے یہ ذمے داری بھی مجھے سونپ دی۔ قصہ مختصر یہ کہ میلاد کی تقریب بے حد کامیاب رہی۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے دل کھول کر میری تعریف کی اور کئی دنوں تک سب اسٹاف کے سامنے میری کوششوں کو سراہتی رہیں۔

اس تقریب کے چند روز بعد ہی دسویں جماعت کی طالبہ شائلہ جھجکتی ہوئی اسٹاف روم میں داخل ہوئی۔ وہ میرا خالی پیریڈ تھا اور میں وقت گزاری کے لیے اخبار کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ اس نے مجھے ادب سے سلام کیا اور بولی۔ ”مس! آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“

میں نے کچھ حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا اور بولی۔ ”ہاں، ہاں کہو کیا بات ہے؟“

”مس دراصل میری امی اس روز محفل میلاد میں آئی تھیں۔ وہ آپ کے پڑھنے کے انداز سے بہت متاثر ہوئیں۔ اگلے ہفتے ہمارے یہاں محفل میلاد ہو رہی ہے اور امی کی خواہش ہے کہ آپ بھی اس میں شرکت کریں۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بچی کی بات کا کیا جواب دوں۔ دراصل ہمارے گھر کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ ہم لوگ کہیں نہیں جاتے تھے اور ہمارے یہاں بھی چند ایک قریبی رشتے داروں کے سوا کوئی نہیں آتا تھا۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس لڑکی سے کہا۔ ”دیکھو بھئی۔ میں کہیں آتی جاتی نہیں ہوں لیکن تم نے اتنے خلوص سے دعوت دی ہے کہ انکار نہیں کرسکتی۔“

وہ لڑکی خوش ہوگئی اور بولی۔ ”تھینک یو مس۔ میں

آپ کو لینے آجاؤں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ تم اپنا پتا سمجھا دو، میں خود ہی پہنچ جاؤں گی۔"

وہ کسی کھاتے پیتے گھر کی لڑکی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہمارے گھر آئے جہاں اس کے بیٹھنے کے لیے کرسی بھی نہ تھی۔ وہ لڑکی میرا جواب سن کر مایوس ہوگئی۔ شاید وہ یہ سمجھی ہوگی کہ میں اسے ٹال رہی ہوں۔ لہٰذا دھیمے لہجے میں بولی "ٹھیک ہے مس! جیسے آپ کی مرضی لیکن بھولیے گا نہیں، ہفتے کی شام پانچ بجے، میں آپ کو ایک دن پہلے یاد دلا دوں گی۔"

"بے فکر رہو۔ جب میں نے کہہ دیا تو ضرور آؤں گی۔"

میں نے گھر آکر امی کے سامنے ذکر کیا تو وہ پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔ "نہ جانے کیسے لوگ ہوں گے۔ میں اجنبی جگہ پر تمہیں کیسے بھیج دوں۔"

"کیا آپ یہی چاہتی ہیں کہ ہم اسی طرح کنوئیں کے مینڈک بنے رہیں اور کوئی ہمارے گھر کا رخ نہ کرے۔"

"اللہ نہ کرے۔ میں ایسا کیوں چاہوں گی۔"

"تو پھر خوشی خوشی مجھے جانے کی اجازت دے دیں اور اگر دل میں کوئی وسوسہ ہے تو آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں اس لڑکی سے وعدہ کر چکی ہوں اس لیے ضرور جاؤں گی۔"

امی تو نہیں گئیں لیکن انہوں نے نادیہ کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ شمائلہ کا گھر زیادہ دور نہیں تھا پھر بھی میں نے رکشا کرلیا۔ ہم دونوں کی وہاں بہت آؤ بھگت ہوئی۔ شمائلہ کی امی میرے آگے بچھی جارہی تھیں۔ خدا جانے انہیں میری کون سی ادا پسند آگئی تھی۔ میں اپنی اس پذیرائی پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہورہی تھی تاہم میں نے اس بابرکت محفل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری دلجمعی کے ساتھ میلاد پڑھا اور یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ خواتین میرے اندازِ بیاں سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ خاص طور پر ایک محترمہ تو پوری محفل کے دوران مسلسل ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہیں۔ میلاد ختم ہونے کے بعد وہ میرے پاس آئیں اور بڑی شفقت سے بولیں۔ "ماشاء اللہ! بہت اچھا پڑھتی ہو۔ کیا میں امید کروں کہ کبھی تم ہمارے غریب خانے پر ہونے والی محفل کو بھی رونق بخشوگی۔"

"جی ضرور۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بلائیں اور میں نہ آؤں۔" میں نے ازراہِ اخلاق کہہ دیا کیونکہ میرا اندازہ تھا کہ لوگ رسماً یا اپنی اہمیت جتانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ بعد میں کسی کو یاد بھی نہیں رہتا پھر میں انکار کر کے اپنے آپ کو مغرور یا بداخلاق کیوں ظاہر کرتی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ اقرار آنے والے دنوں میں کیا گل کھلائے گا۔

ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ خاتون اپنی بیٹی اور شمائلہ کے ہمراہ ہمارے گھر پہنچ گئیں۔ دروازہ میں نے ہی کھولا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی یوں لگا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ جس خطرے سے بچنے کے لیے میں نے شمائلہ کو اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا وہی میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔ میرے منہ سے بمشکل اتنا نکل سکا "آنٹی آپ...!"

"ہاں۔ حیران کیوں ہورہی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہوگی؟"

"جی ہاں، ضرور، تشریف لائیے۔" میں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے شدید شرمندگی اور خفت ہورہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان تینوں کو کہاں بٹھاؤں۔ امی حسبِ معمول سلائی میں مصروف تھیں۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر حیران ہوگئیں اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں تو خود انہیں نہیں جانتی تھی پھر کیا تعارف کرواتی لیکن کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا لہٰذا سنبھلتے ہوئے بولی۔ "پچھلے دنوں شمائلہ کے یہاں محفلِ میلاد میں آنٹی سے ملاقات ہوئی تھی۔ شاید یہ بھی اسی سلسلے میں آئی ہیں۔"

شمائلہ بولی۔ "یہ میری خالہ فیروزہ اور ان کی بیٹی فرزانہ ہیں۔ خالہ نے جس دن سے مس کو دیکھا ہے ان پر فریفتہ ہوگئی ہیں اور مسلسل میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں کہ ان کے گھر لے کر چلو۔ میں ڈر رہی تھی کہ بغیر اطلاع آنے پر مس ناراض نہ ہوجائیں لیکن خالہ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، وہ سب سنبھال لیں گی۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے کیوں زحمت کی۔ شمائلہ سے کہلوا دیتیں تب بھی میں آجاتی۔"

"جانتی تھی لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں تمہیں میرے گھر آنے کی اجازت نہ ملے۔ اس لیے خود ہی تمہاری امی سے ملنے چلی آئی۔ پہلے سے اطلاع اس لیے نہیں دی کہ کہیں تم شمائلہ کی طرح مجھے بھی انکار نہ کردو۔"

"یہ گستاخی کیسے کرسکتی تھی۔" میں نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہ جگہ آپ لوگوں کے شایانِ

شان نہیں۔ بس اسی وجہ سے کسی کو اپنے گھر نہیں بلاتی۔"

"بیٹی، گھر در و دیوار اور ساز و سامان سے نہیں بلکہ مکینوں سے بنتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولیں "تم میرے لیے اچھی سی چائے بناؤ۔ تب تک میں تمہاری امی سے کچھ باتیں کرلوں۔"

مجھے ان کی سادگی اور اپنا پن بہت اچھا لگا۔ میں نے جلدی سے ارسلان کو بازار بھیج کر سموسے اور بسکٹ منگوائے اور چائے کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دیے۔ انہوں نے دل کھول کر چائے کی تعریف کی اور محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "ماشاء اللہ بہت سلیقہ مند ہو جس گھر میں جاؤ گی، اجالا بکھیر دوگی۔"

اس دوران شمائلہ اور فرزانہ معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکراتی رہیں لیکن میں فوری طور پر ان کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہی۔ ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ یہ محترمہ کس مقصد کے تحت آئی تھیں کیونکہ انہوں نے میلاد کے بارے میں تو کوئی بات ہی نہیں کی، ادھر امی بھی کسی گہری سوچ میں غرق نظر آئیں تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"یہ خاتون کس سلسلے میں آئی تھیں؟"

"کیا بتاؤں بیٹی، وہ ایسی بات کہہ گئی ہیں جس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیا جواب دوں۔"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا اور سوچنے لگی کہ آخر ایسی کیا بات ہوسکتی ہے جس کی وجہ سے امی اتنی پریشان نظر آرہی ہیں۔ میں نے امی سے پوچھا۔ "کیا ہوا، کیا کہہ رہی تھیں وہ؟"

"تمہیں اپنی بہو بنانا چاہ رہی ہیں۔" امی نے آہستہ سے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت سر پر آن گری ہو۔ میں نے حیران ہوکر کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ ہماری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بھلا کہیں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔"

"یہی بات میں نے بھی ان سے کہی تھی لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ حیثیت نہیں بلکہ لڑکی دیکھ کر اس گھر میں آئی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دولت مند گھرانے تو بہت مل جائیں گے لیکن تم جیسی لڑکی انہیں نہیں مل سکتی۔"

"مجھے تو ان خاتون کی ذہنی صحت پر شبہ ہورہا ہے۔ ان سے کہیں کہ وہ اپنے دماغ کا معائنہ کروائیں۔"

"بری بات ہے، بڑوں کے لیے ایسا نہیں کہتے۔" امی نے مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے ہمیں سوچنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنے اطمینان کے لیے پوری طرح چھان بین کرواسکتے ہیں۔ یہ لفافہ بھی دے گئی ہیں۔ اس میں ان کے بیٹے کی تصویر اور دیگر معلومات ہیں۔"

"لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ جب تک سب بہن بھائیوں کی تعلیم مکمل نہیں ہوجاتی۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ان کی تعلیم و تربیت ہماری ذمے داری ہے۔ تم صرف اپنے بارے میں سوچو۔"

"امی، اتنی مہلت تو دیں کہ ارسلان اور نعمان اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں۔"

"تب تک تم بوڑھی ہوجاؤ گی۔ شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔ یہ وقت نکل گیا تو کوئی نہیں پوچھے گا۔"

امی نے مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی مہلت دی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کردی کہ جذبات میں آکر کوئی فیصلہ نہ کروں کیونکہ ایسے رشتے قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ ہمارے جو حالات تھے۔ ان کو دیکھتے ہوئے کسی معمولی رشتے کی بھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں وہ لفافہ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ امی کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتی تو اتنا اچھا رشتہ ملنے پر خوشی سے اچھل پڑتی۔ ہر لڑکی بہتر زندگی گزارنے کی خواہش مند ہوتی ہے اور وہ یہی چاہتی ہے کہ اس کی شادی کسی اسمارٹ اور دولت مند لڑکے سے ہو جو اسے زندگی کی تمام آسائشیں دے سکے۔ سچ پوچھیں تو میرے لاشعور میں بھی ایسی خواہش جڑ پکڑ چکی تھی لیکن میں نے اسے دیوانے کا خواب سمجھ کر نظر انداز کردیا تھا۔

میں ایک دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف اتنا اچھا رشتہ تھا تو دوسری جانب اپنی ذمے داریوں کا احساس۔ امی نے تو کہہ دیا تھا کہ بہن بھائیوں کے بجائے اپنے بارے میں سوچوں لیکن انہوں نے محض ایک کتابی بات کہی تھی۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں جانتی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اخراجات بڑھتے جائیں گے اور ابو کے لیے تنہا اس ذمے داری کا بوجھ اٹھانا

ممکن نہ ہوگا۔ مجھے اس رشتے سے انکار نہیں تھا لیکن اپنے گھر کی کشتی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ گئی اور جب ذہن یکسو ہوگیا تو میں نے وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔

جن صاحب کا میرے لیے رشتہ آیا تھا وہ خاصے خوش شکل اور معقول نظر آرہے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ذاتی کاروبار تھا اور ان کے پاس ہر وہ چیز تھی جس کی ایک لڑکی تمنا کرسکتی ہے۔ تصویر کے ساتھ ایک وزیٹنگ کارڈ بھی تھا جس پر ان کے دفتر کا پتا اور فون نمبر درج تھا۔ میں نے ایک کاغذ پر ان کا فون نمبر لکھا اور سب چیزیں دوبارہ لفافہ میں رکھ کر آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگی۔

اس زمانے میں موبائل فون کا رواج نہیں تھا اور ٹیلی فون بھی بہت کم گھروں میں ہوا کرتا تھا۔ اسکول سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پی سی او تھا چنانچہ دوسرے روز چھٹی کے بعد اسکول سے واپس آتے ہوئے وہاں رک گئی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کو فون نہیں کیا تھا اس لیے کچھ گھبراہٹ محسوس ہورہی تھی۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور اللہ کا نام لے کر ان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھالیا گیا اور ایک شائستہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''جی فرمایئے۔''

''کیا میں عارف صاحب سے بات کرسکتی ہوں۔''

''میں عارف ہی بول رہا ہوں۔'' وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولے۔ ''آپ کون ہیں اور کس سلسلے میں بات کرنا چاہ رہی ہیں۔''

''جی... میرا نام شہلا ہے۔ دراصل آپ کی والدہ میرے لیے آپ کا رشتہ لے کر آئی تھیں اور امی نے مجھ سے دو دن کے اندر جواب مانگا ہے لیکن میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''کیا یہ بہت ضروری ہے؟''

''جی ہاں!'' کچھ معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتی ہوں۔ اس کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرپاؤں گی۔''

''اگر آپ جہیز وغیرہ کے سلسلے میں پریشان ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ یہ شادی انتہائی سادگی سے ہوگی۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔'' میں الجھتے ہوئے بولی۔ ''بات جہیز کی نہیں ہے بلکہ یہ ایک اور معاملہ ہے۔ کے لیے میں فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ جب کہیں اور جہاں کہیں حاضر ہوجاؤں گا۔''

''میں نہیں چاہتی کہ کسی کو اس ملاقات کا علم ہو۔ لیے بہتر ہوگا کہ ہم کہیں باہر ملیں۔'' میں نے اسے اسکول کے پاس ایک ریسٹورنٹ کا پتا بتاتے ہوئے کہا۔ ''کل دوپہر ایک بجے اس جگہ آپ کا انتظار کروں گی۔''

خدا جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ میں سب کچھ کرنے پر تیار ہوگئی جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ویسے تو میں عبایا پہنتی تھی لیکن چہرہ کھلا رہتا تھا۔ اس روز میں نے اسکول سے نکلتے وقت چہرے کو نقاب سے ڈھک لیا تاکہ کوئی مجھے ریستوران میں داخل ہوتے یا نکلتے ہوئے پہچان نہ سکے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ریستوران میں داخل ہوئی تو وہ صدر دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پاس ان کی تصویر تھی اس لیے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ وہ مجھے لے کر ایک کیبن میں چلے گئے اور بولے ''آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ میں کچھ کھانے کے لیے منگواتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' میں اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ کیونکہ مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ دیر ہوگئی تو امی کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہوجائے گا۔''

وہ مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوگا اور میرا بھی یہی حال ہے۔ میں کولڈ ڈرنک اور اسنیکس منگوا لیتا ہوں۔ اس دوران ہم باتیں کرتے رہیں گے۔''

انہوں نے بیرے کو بلا کر ان چیزوں کا آرڈر دیا اور اس کے جانے کے بعد بولے۔ ''اب بتائیں' وہ کون سی بات ہے جس کے لیے آپ اتنی پریشان ہورہی ہیں۔''

وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھے لگے تھے۔ ان کے انداز اور نرم رویّے سے میں بہت متاثر ہوئی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''عارف صاحب! پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ ہم آپ کے اندازے سے بھی بہت زیادہ غریب ہیں۔ جہیز دینا تو دور کی بات ہے' ہمارے لیے بعض اوقات روزمرہ اخراجات پورے کرنا مشکل

ہوجاتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی امی کو مجھ میں ایسی کیا خوبی نظر آگئی جو وہ رشتہ لے کر آگئیں۔ ان کی مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا پھر بھی میں آپ سے گزارش کروں گی کہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرلیں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔''

وہ بڑے غور اور توجہ سے میری بات سنتے رہے پھر بولے۔ ''نظرثانی کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس موضوع کو نہ چھیڑیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بات ہے تو بتائیں۔''

''جی' میں اسی طرف آرہی ہوں۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ میں نے انٹر پاس کرنے کے بعد اسکول میں ملازمت کرلی تھی تاکہ ابو کا تھوڑا سا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ شادی کے بعد ان کا یہ سہارا ختم ہوجائے گا اور میں یہی سوچ کر پریشان ہورہی ہوں کہ وہ اکیلے میرے پانچ بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات کیسے برداشت کرسکیں گے۔''

''میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''مدد نہیں مجھے تعاون چاہیے۔ کیا آپ مجھے یہ اجازت دیں گے کہ شادی کے بعد بھی میں ملازمت جاری رکھتے ہوئے اپنے والدین کی مدد کرسکوں۔''

''آپ کو ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کے بعد میرا سب کچھ آپ کا ہی ہوگا۔ آپ جس طرح چاہیں اپنے والدین کی مدد کرسکتی ہیں۔''

''جی نہیں۔ یہ مناسب نہ ہوگا اور نہ ہی وہ لوگ اسے گوارا کریں گے۔''

''ٹھیک ہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جب تک چاہیں اپنی ملازمت جاری رکھ سکتی ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ۔ مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔''

''دعا کریں کہ آئندہ بھی آپ کی توقعات پر پورا اترتا رہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔

بیرا کولڈ ڈرنک اور دیگر لوازمات لے کر آگیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کچھ رسمی باتیں ہوئیں پھر وہ اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے اپنی بات تو کہہ دی۔ اب میری بھی سن لیجیے۔''

''جی میں سن رہی ہوں۔''

''جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ شادی انتہائی سادگی سے ہوگی۔ اس لیے آپ لوگوں کو زیربار ہونے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ لوگ استطاعت نہ ہونے کے باوجود قرض لے کر شادی کے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن آپ لوگ ایسا نہیں کریں گے۔ مجھے جہیز نہیں چاہیے۔ نکاح، ولیمہ کے جوڑے اور زیور ہماری طرف سے آئے گا۔ برات میں چار پانچ لوگ ہوں گے اور رخصتی گھر سے ہی ہوگی۔ اگر آپ لوگوں نے اس سے زیادہ کچھ کیا تو میری طرف سے رشتہ ختم سمجھیے۔''

''بےفکر رہیں۔ وہی ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔ آپ نے یہ بات کہہ کر میری مشکل آسان کردی۔ بہتر ہوگا کہ آپ یہ بات اپنی والدہ کے ذریعے کہلوا دیں۔''

''میں ان سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں اور جب وہ آپ کے گھر بات پکی کرنے آئیں گی تو یہ معاملہ بھی طے ہوجائے گا۔''

اس کے بعد سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا۔ میں نے دوسرے روز ہی امی کو اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا۔ البتہ ابو تھوڑا سا پریشان تھے کہ جہیز اور شادی کے دیگر اخراجات کے لیے رقم کا بندوبست کس طرح ہوگا۔ وہ اگر کوشش کرکے دفتر سے قرض لیتے تب بھی چالیس پچاس ہزار سے زیادہ نہ ملتے۔ میں نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کررکھی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ عارف کی والدہ کے آنے کے بعد ابو کی پریشانی دور ہوجائے گی اور ایسا ہی ہوا۔

عارف کی امی ٹھیک ایک ہفتے بعد جواب لینے آگئیں۔ اس بار وہ تنہا ہی آئی تھیں اور جب امی نے انہیں بتایا کہ انہیں یہ رشتہ منظور ہے تو عارف کی امی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے پرس سے انگوٹھی نکالی اور میری انگلی میں پہناتے ہوئے بولیں ''اب شہلا اس گھر میں میری امانت ہے۔ آپ لگے ہاتھوں شادی کی تاریخ بھی طے کردیں۔''

''اتنی جلدی یہ کیسے ممکن ہے۔'' امی حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ ''ہمیں شادی کی تیاری کے لیے کچھ وقت تو چاہیے ہوگا۔''

''تیاری کیسی؟ بس لڑکی کو چار کپڑوں میں رخصت کردیں۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔''

''ہم غریب ضرور ہیں لیکن یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ بیٹی کو خالی ہاتھ ہی بھیج دیں۔ اس کے نصیب میں جو ہوگا... وہ ساتھ لے جائے گی۔''

''میں اور میرا بیٹا ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ آپ لوگ اس

شادی کے سلسلے میں زیر بار ہوں۔ عارف تو جہیز کے سخت خلاف ہے اور اس کی یہی شرط ہے کہ شادی انتہائی سادگی سے ہوگی۔ برات میں صرف ہمارے گھر کے لوگ ہوں گے اور رخصتی بھی گھر سے ہی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں شہلا کے ابو سے بات کرکے آپ کو بتادوں گی۔"

ابو نے پہلے تو روایتی انداز اختیار کیا اور بولے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو کچھ دیے بغیر ہی رخصت کردیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ پھر امی کے سمجھانے پر ان کی عقل میں یہ بات آگئی کہ عارف کی امی کی بات مان لینے میں انہی کا فائدہ ہے۔ اس کے بعد ابو نے فون کرکے عارف اور اس کے گھر والوں کو کھانے پر بلایا تاکہ وہ عارف کو دیکھ سکیں۔ عارف نے پہلے تو رسماً تکلف کیا کہ کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ویسے ہی کسی وقت آجائیں گے لیکن ابو کے اصرار پر وہ راضی ہوگئے۔ ان کا گھرانا کل پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ جس میں عارف کے علاوہ والدین اور دو چھوٹے بہن بھائی تھے۔ سب لوگ انتہائی بااخلاق اور مہذب معلوم ہورہے تھے۔ عارف کے والد کم گو انسان تھے۔ انہوں نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا البتہ کھانے کی دل کھول کر تعریف کی۔ اسی روز میری شادی کی تاریخ طے پاگئی اور اس طرح ایک ماہ بعد میں رخصت ہوکر عارف کے گھر آگئی۔

وہ گھر میرے اندازے سے بھی بڑا اور شاندار تھا۔ اسے مکان کی بجائے کوٹھی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کے یہاں ایک نہیں تین تین کاریں تھیں۔ گھر کے کام کاج کے لیے کل وقتی ملازمہ تھی لیکن کھانا عارف کی امی خود بناتی تھیں کیونکہ عارف اور ان کے ابو کو کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں تھا۔ میں نے اسکول سے صرف ایک ہفتہ کی چھٹی لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید عارف کی والدہ کو ملازمت جاری رکھنے پر اعتراض ہوگا لیکن وہ کچھ نہیں بولیں۔ ہوسکتا ہے کہ عارف نے انہیں سمجھا دیا ہو۔ ویسے بھی اس گھر میں کوئی کسی کے معاملے میں نہیں بولتا تھا۔ میری نند فرزانہ یونیورسٹی اور دیور آصف کالج میں پڑھ رہے تھے جبکہ سسر اور عارف صبح سویرے فیکٹری چلے جاتے اور ان کی واپسی شام کو ہی ہوتی۔ دوپہر کا کھانا ساس صاحبہ بناتیں اور شام کے کھانے کی ذمّے داری میں نے لے لی تھی۔ اس طرح ہنسی خوشی گزارہ ہورہا تھا۔

عارف بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ وہ بہت ذمّے دار اور خیال رکھنے والے شخص تھے۔ میری ہر ضرورت بن کہے پوری ہوجاتی تھی۔ مجھے ہر جگہ جانے کی آزادی تھی۔ وہ خود تو بے حد مصروف رہتے تھے لہٰذا میں خود ہی دوسرے تیسرے دن میکے چلی جاتی۔ شادی کے بعد جب مجھے اسکول سے پہلی تنخواہ ملی اور وہ پیسے میں نے امی کو دینا چاہے تو انہوں نے لینے سے صاف انکار کردیا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں عارف کے دیے ہوئے پیسوں میں سے انہیں کچھ دے رہی ہوں لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ میری تنخواہ کے پیسے ہیں تو وہ بہت حیران ہوئیں اور بولیں۔ "کیا تم اب بھی ملازمت کررہی ہو۔"

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں پوری بات بتادوں تاکہ مجھے بار بار وضاحت کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بولیں۔ "تمہارے سسرال والے کیا سوچیں گے کہ ہماری مدد کرنے کی خاطر تمہیں شادی کے بعد بھی ملازمت کرنا پڑرہی ہے۔"

"امی، وہ ایسے لوگ نہیں ہیں بلکہ ساس تو میری تعریف کرتی رہتی ہیں کہ شادی کے بعد بھی اپنے گھر والوں کا خیال رکھ رہی ہوں۔"

امی نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد وہ پیسے رکھ لیے اور یوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے پرائیویٹ طور پر پہلے بی اے اور پھر اکنامکس میں ایم اے کرلیا۔ اس کے بعد مجھے ایک کالج میں لیکچرار کی جاب مل گئی۔ اس دوران بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلے میری نند فرزانہ کی شادی ہوئی اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سسر کا ... انتقال ہوگیا۔ آصف کی تعلیم بھی مکمل ہوچکی تھی لیکن اسے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ ملک سے باہر جانے کے لیے پر تول رہا تھا چنانچہ کاروبار کی ساری ذمّے داری عارف کے کندھوں پر آگئی اور وہ پہلے سے زیادہ مصروف رہنے لگے۔

انہی دنوں مجھ سے چھوٹی نادیہ کے لیے ایک رشتہ آیا۔ جسے تھوڑی سی چھان بین کے بعد قبول کرلیا گیا۔ اس سے پہلے بھی کئی رشتے آچکے تھے لیکن ہمارے گھر کی حالت دیکھ کر کوئی بھی دوبارہ نہیں آیا لیکن اسلم کے گھر والوں کو نہ جانے نادیہ میں کیا خوبی نظر آئی کہ وہ پیچھے پڑ گئے۔ میں ذاتی طور پر اس رشتے کے حق میں نہیں تھی کیونکہ اسلم نے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما کر رکھا تھا اور کسی پرائیویٹ کمپنی میں

سپروائزر کے طور پر کام کررہا تھا۔ اسلم کے علاوہ گھر میں ماں باپ، دو بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔ میں ذاتی طور پر اس رشتے کے حق میں نہ تھی اور جب بھی عارف سے اسلم کا موازنہ کرتی تو ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا۔ فطری طور پر میری خواہش تھی کہ نادیہ کی شادی کسی اچھی جگہ پر ہو۔ اسی لیے میں نے امی کو مشورہ دیا کہ وہ اسلم کے گھر والوں کو منع کردیں اور نادیہ کے لیے کسی اچھے رشتے کا انتظار کریں لیکن انہوں نے میری بات نہ مانی اور بولیں کہ نادیہ کی عمر نکلی جارہی ہے اور اب وہ مزید انتظار نہیں کرسکتیں۔ اس طرح نادیہ اور اسلم کی شادی ہوگئی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس رشتے کی منظوری میں نادیہ کی مرضی بھی شامل تھی۔ وہ اسلم کو پسند کرتی تھی۔ اسلم نے نادیہ کو کسی شادی کی تقریب میں دیکھا اور اس پر لٹو ہوگیا۔

میری شادی کو دس سال ہوچکے تھے لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ ساس پوتا کھلانے کی آرزو لیے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ آصف امریکا چلا گیا اور اتنے بڑے گھر میں ہم دو میاں بیوی ہی رہ گئے۔ عارف بنیادی طور پر نیک اور شریف انسان تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی زبان سے اس محرومی کا اظہار نہیں کیا لیکن میں ان کے دکھ کو محسوس کرسکتی تھی۔ خود مجھے بھی اس کمی کا شدت سے احساس تھا۔ ہم نے نہ جانے کتنے ڈاکٹروں سے اپنا طبی معائنہ کروایا۔ کئی ٹیسٹ ہوئے لیکن سب رپورٹیں نارمل تھیں۔ سبھی ڈاکٹروں نے یہی کہا کہ ہم دونوں میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ بس قدرت کی طرف سے دیر ہورہی ہے۔ میں نے مایوس ہوکر پیروں فقیروں کا سہارا لیا ان کے بتائے ہوئے ٹوٹکوں پر عمل کرتی رہی جس کسی نے جو وظیفہ بتایا وہی پڑھنے بیٹھ گئی لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا البتہ اس مشق کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ میں پنج وقتہ نمازی بن گئی۔

ادھر نادیہ کے ہاں بچوں کی لائن لگ گئی۔ اس کے یہاں ہر سال ایک بچہ ہورہا تھا۔ وہ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کی ماں بن چکی تھی اور اب پانچویں کی آمد آمد تھی۔ اسلم نے پہلے دو بچوں کی پیدائش پر تو بہت خوشی کا اظہار کیا لیکن جب تیسری بار لڑکی پیدا ہوئی تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور اس سے اگلے سال بھی جب لڑکی ہی پیدا ہوئی تو اس نے اس معصوم کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور بکتا جھکتا اسپتال سے باہر چلا گیا۔ دراصل وہ مالی حالات کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ اس کی کوئی مستقل ملازمت نہیں تھی۔ جب کسی فلیٹ کا پروجیکٹ شروع ہوتا تو اسے کام مل جاتا اور پروجیکٹ مکمل ہونے پر اس کی چھٹی ہوجاتی اور بعض اوقات اسے کئی کئی مہینے فارغ بیٹھنا پڑتا تھا۔ اگر ساتھ میں اسٹیٹ ایجنسی کا کام نہ کررہا ہوتا تو نوبت فاقوں تک آجاتی۔

جب میری مایوسی حد سے بڑھ گئی تو عارف نے مجھے کوئی بچہ گود لینے کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح میری محرومی کا کسی حد تک ازالہ ہوجائے گا جبکہ میں اس کے حق میں نہیں تھی کیونکہ جانتی تھی کہ کسی غیر کی اولاد کو وہ پیار اور ممتا نہیں دے سکوں گی جو اپنی اولاد کو دیتی۔ میرے لیے وہ ہمیشہ غیر ہی رہے گا۔ میں یا عارف شرعی اور قانونی طور پر اسے اپنا نام نہیں دے سکیں گے لیکن عارف سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے یتیم خانے سے کوئی لاوارث بچہ گود لے کر اس کی پرورش کی اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کرکے معاشرے کا کارآمد شہری بنادیا تو یہ ایک نیکی کا کام ہوگا۔

ایک دن میں عارف کے ہمراہ میکے گئی تو نادیہ اور اسلم بھی وہاں موجود تھے اور دونوں کے درمیان زبردست جھگڑا چل رہا تھا۔ نادیہ نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ امید سے ہے جبکہ اسلم کو مزید بچوں کی خواہش نہیں ہے اور وہ ابارشن کے لیے کہہ رہا ہے جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی۔ اسلم نے اسے یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر اس نے ابارشن نہیں کروایا اور اس بار بھی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اسے کسی یتیم خانہ میں چھوڑ آئے گا، یہ سن کر مجھے اسلم کی پست ذہنیت پر افسوس ہونے لگا اور میں نے اسی وقت ایک فیصلہ کرلیا۔ میں اتنی جذباتی ہوگئی تھی کہ اس سلسلے میں عارف سے مشورہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

"اگر یہ بچہ تم لوگوں پر اتنا ہی بھاری ہے تو میں اسے گود لینے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے اسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی پرورش کروں گی، اس کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ کی تمام ذمّے داری مجھ پر ہوگی۔ اس کے عوض تمہیں تحریری طور پر اس کے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ وہ بچہ میرا ہوگا اور تم اسے کبھی اپنا نہ کہہ سکو گے۔"

اسلم کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اتنی بڑی بات کہہ دوں گی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور جذباتی انداز میں بولا۔ "میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ نے تو میری بہت بڑی مشکل حل کردی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بچہ آپ کو دوں گا اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ آپ جیسی چاہیں مجھ سے تحریر لے لیں۔"

نادیہ غصے سے بولی۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔“

”چپ رہو۔“ اسلم نے اسے ڈانٹا۔ ”تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس بچے کا باپ ہوں اور اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچنے کا حق صرف مجھے ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ باجی اس بچے کی پرورش کی ذمّے داری لے رہی ہیں۔“

نادیہ نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”باجی! آپ اتنی ظالم کب سے ہوگئیں۔ ایک ماں سے اس کے جگر گوشہ کو چھین رہی ہیں۔“

”میں تم پر کوئی ظلم نہیں کررہی ہوں بلکہ اس بچے کو ممکنہ خطرات سے بچانا چاہ رہی ہوں۔ اسلم نے دھمکی دی ہے کہ اگر تمہارے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اسے یتیم خانہ میں چھوڑ آئے گا۔ کیا تم یہ ظلم برداشت کرسکو گی؟“

”اور میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں۔“ اسلم گردن ٹیڑھی کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے، میں تیار ہوں لیکن آپ مجھے اس سے ملنے سے نہیں روکیں گی۔“

”تم جب چاہو اس سے مل سکتی ہو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔“

اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان یہ طے پاگیا کہ میں اسپتال سے ہی نومولود بچے کو لے کر اپنے گھر آجاؤں گی اور ماں بن کر اس کی پرورش کروں گی۔ وہ مجھے ممی اور عارف کو ڈیڈی کہے گا۔ اسی طرح نادیہ اور اسلم اس کے خالہ اور خالو کہلائیں گے۔ اس وقت میں جذبات میں آکر یہ بھول گئی تھی کہ قانونی اور شرعی طور پر اس رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ بچہ بے شک مجھے اپنی ماں اور عارف کو اپنا باپ سمجھتا رہے لیکن کاغذوں میں اس کی ولدیت تبدیل نہیں ہوسکتی۔ یہ بھید مجھ پر بعد میں کھلا لیکن تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔

اس معاہدہ کے بعد میں نے نادیہ پر خصوصی توجہ دینا شروع کردی۔ پہلے میں شاید سال میں ایک دو مرتبہ ہی اس کے گھر جایا کرتی تھی لیکن اب میں نے ہر دوسرے تیسرے دن وہاں کے چکر لگانا شروع کردیے۔ میں کھانے پینے کے سامان سے لدی پھندی اس کے گھر جاتی جس میں پھل، جوس، مٹھائی، کیک اور دیگر انواع واقسام کی چیزیں شامل ہوتیں۔ میں چاہتی تھی کہ نادیہ اپنے کھانے پینے کا خاص خیال رکھے تاکہ بچہ صحت مند پیدا ہو۔ مجھے موٹے تازے بچے اچھے لگتے تھے۔ شروع میں تو نادیہ نے تکلف سے کام لیا لیکن میرے اصرار پر وہ خاموش ہوگئی لیکن وہ زیادہ چیزیں اپنے بچوں میں بانٹ دیا کرتی تھی جو ان نعمتوں سے محروم تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے سامان کی مقدار بڑھادی۔

ڈلیوری وقت مقررہ پر نارمل طریقے سے ہوئی اور میں معاہدے کے تحت بچے کو لے کر اپنے گھر آگئی۔ مجھ سے زیادہ خوشی عارف کو ہورہی تھی۔ ان کی گرم جوشی دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ واقعی ان کا اپنا بچہ ہے۔ دوسری جانب نادیہ کا دکھ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ میں جانتی تھی کہ ایک ماں کے لیے اپنے کلیجے کا ٹکڑا کسی دوسرے کے حوالے کرنا بہت مشکل کام ہے۔ جیسے ہی میں نے بچے کو گود لیا تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ آپ اسے حقیقی ماں کا پیار دیں گی اور آپ کے گھر میں اس کی بہتر نگہداشت اور پرورش ہوسکے گی لیکن ایک وعدہ کریں جب کبھی محسوس ہو کہ یہ بچہ آپ پر بوجھ بن گیا ہے تو آپ میری امانت مجھے واپس کردیں گی۔“

میں اس کا اشارہ سمجھ گئی اور بولی۔ ”تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔ اگر میرے یہاں دس بچے ہوگئے تب بھی میں اسے حقیقی اولاد سے بڑھ کر پوری توجہ اور محبت دوں گی۔“

اسلم کو نادیہ کی بات پسند نہیں آئی اور وہ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ”باجی، آپ نادیہ کی بات کو دل پر نہ لیں۔ یہ تو یونہی الٹا سیدھا بولتی رہتی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، اب یہ بچہ آپ کا ہے۔ اس پر ہمارا کوئی حق نہیں۔“

قانوناً اور شرعاً یہ بچہ ہمارا نہیں ہے اور نہ ہی ہم اسے اپنا نام دے سکتے ہیں۔ اس کی ولدیت کے خانے میں بھی اسلم کا نام ہی لکھا جائے گا۔ ہم صرف اسے پالنے کے روادار ہوں گے۔ وہ ہمارے پاس رہے گا اور اس کے ہوتے ہوئے ہم اولاد کی محرومی کا دکھ بھول جائیں گے۔ اس وقت میں اسلم کا گیم نہ سمجھ سکی۔ اس کی نظریں عارف کی دولت پر تھیں جس پر وہ اس بچے کے ذریعے قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ بات مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی لیکن اس وقت تک بہت کچھ بدل چکا تھا۔

ہم نے بچے کا نام عدیل رکھا اور جی جان سے اس کی پرورش میں لگ گئے۔ عارف کو تو جیسے ایک کھلونا ہاتھ آگیا تھا۔ وہ دفتر سے واپس آنے کے بعد سارا وقت اسی کے ساتھ گزارتے۔ پہلے انہیں ٹیلی وژن دیکھنے کا بہت شوق تھا

خاص طور پر خبریں، ٹاک شوز اور کرکٹ میچ بڑی باقاعدگی سے دیکھا کرتے تھے لیکن اب ٹی وی کی جگہ عدیل نے لے لی تھی اور وہ بمشکل تمام دس پندرہ منٹ کے لیے نو بجے والی خبریں دیکھ لیا کرتے تھے۔ وہ ابھی شیر خوار تھا لیکن اس کے لیے انہوں نے کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا گیا تھا۔ ہم نے عدیل کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ بھی رکھ لی تھی جو صبح سے شام تک اس کے ساتھ رہا کرتی۔ نادیہ ہر دوسرے تیسرے دن عدیل سے ملنے آتی۔ اسے گھنٹوں گود میں لیے بیٹھی رہتی۔ بار بار اسے گلے لگا کر گالوں اور ماتھے پر بوسہ دیتی۔ کبھی کبھی اس کا والہانہ پن دیکھ کر مجھے ڈر لگنے لگتا کہ کہیں وہ بچے کی واپسی کا مطالبہ نہ کردے۔

اسلم کے مالی حالات دن بہ دن بگڑتے جارہے تھے اور اس کے لیے قلیل آمدنی میں گھر چلانا مشکل ہوگیا۔ اس نے بہتر ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ مجبوراً اس نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کیا اور سنجیدگی سے اس کے لیے دوڑ دھوپ کرنے لگا۔ چھ ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ اسے سعودی عرب میں ملازمت مل گئی تھی۔ فوری طور پر بیوی بچوں کو ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ پہلے وہ وہاں جاکر کام شروع کردے اور ویزوں کا بندوبست ہوجانے کے بعد فیملی کو بھی بلالے۔ نادیہ بہت گھبرا رہی تھی کہ اسلم کی غیر موجودگی میں وہ کس طرح گھر اور بچوں کو سنبھالے گی۔ اسلم نے جاتے ہوئے خاص طور پر مجھ سے ان لوگوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ اگر نہ کہتا تب بھی اپنا فرض ضرور ادا کرتی۔ نادیہ میری سگی بہن تھی۔ اس نے اپنے جگر کا ٹکڑا دے کر مجھ پر جو احسان کیا تھا، اس کے عوض یہ بہت معمولی خدمت تھی۔

میں نے اسلم کے جانے کے بعد نادیہ اور اس کے بچوں کا پورا پورا خیال رکھا۔ سب سے بڑا مسئلہ بازار سے سودا سلف لانے کا تھا۔ نادیہ کبھی اکیلے بازار نہیں گئی تھی اور باہر کے سارے کام اسلم ہی کیا کرتا تھا۔ اب یہ ذمّے داری میں نے لے لی تھی۔ میں دوسرے تیسرے دن نادیہ کے گھر جاتی اور اسے ساتھ لے کر سودا سلف لے آتی۔ اگر کسی مصروفیت کی وجہ سے جانا نہ ہوتا تو ڈرائیور کو بھیج دیا کرتی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ اسلم کی غیر موجودگی میں نادیہ کو کوئی تکلیف نہ ہو اور اس کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔

چھ ماہ بعد اسلم نے نادیہ اور بچوں کو بھی اپنے پاس بلالیا۔ نادیہ کو شوہر کے پاس جانے کی خوشی تھی تو ساتھ ہی عدیل سے بچھڑنے کا غم بھی۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ہر مہینے اسے عدیل کی نئی تصویر بھیجتی رہوں گی۔ میں نے اس کی یہ بچکانہ خواہش پوری کرنے کا وعدہ تو کرلیا لیکن دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ جب وہ اپنا بچہ مجھے دے چکی ہے تو اب کیوں اس پر اپنا حق جتارہی ہے۔ ایک بار پھر میرے دل میں یہ اندیشہ پروان چڑھنے لگا کہ معاشی حالات بہتر ہوجانے کے بعد کہیں وہ بچے کی واپسی کا مطالبہ نہ کردے۔

نادیہ کے جانے کے دو ماہ بعد مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی۔ ایک روز میں حسب معمول فجر کی نماز کے لیے اٹھی تو مجھے زور کی ابکائی آئی۔ میں تیزی سے باتھ روم کی جانب لپکی۔ پہلے تو میں سمجھی کہ شاید بدہضمی کی وجہ سے ایسا ہورہا ہے لیکن میں نے گزشتہ شب بہت ہلکی غذا لی تھی۔ اس لیے بدہضمی کا کوئی امکان نہ تھا پھر دوسری وجہ کیا ہوسکتی ہے اور جب اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو یقین نہیں آیا۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا بارہ سال بعد قدرت مجھ پر مہربان ہوسکتی ہے؟ یوں لگا جیسے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد عارف بیدار ہوئے تو میں نے انہیں یہ بات بتائی جسے سن کر ان کی آنکھوں میں بھی امید کے چراغ جگمگانے لگے۔ وہ بضد تھے کہ ناشتے کے بعد ڈاکٹر کے پاس چل کر معائنہ کروالوں لیکن میں ان کی مصروفیت سے آگاہ تھی اور دفتر سے ایک گھنٹے کی غیر حاضری بھی ان کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں یہ کہہ کر دفتر بھیج دیا کہ وہ اپنے کام کا ہرج نہ کریں۔ میں ڈرائیور کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں گی۔

اس روز میں بھی قائل ہوگئی کہ انسان کو کسی بھی حال میں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بارہ سال بعد میرے سونے آنگن میں بہار آجائے گی۔ لیڈی ڈاکٹر نے تفصیلی معائنہ کے بعد اعلان کردیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ مزید اطمینان کے لیے اس نے ایک دو ٹیسٹ بھی تجویز کردیے اور مجھے اپنا خیال رکھنے کی خاص طور پر ہدایت کی۔ اس وقت میری جو کیفیت تھی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ خوشی خوشی گھر آئی۔ سوچا کہ فون کرکے عارف کو یہ خوش خبری سنادوں لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ انہوں نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ کسی ہنگامی

ضرورت کے علاوہ انہیں دفتری اوقات میں فون نہ کیا جائے کیونکہ مصروفیت کے سبب وہ صرف انتہائی ضروری فون سنا کرتے تھے۔

شام کو عارف گھر آئے تو میں نے شرماتے اور جھجکتے ہوئے یہ خبر انہیں سنادی۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھے اور بولے۔ ”اللہ نے ہمیں نیکی کا صلہ دے دیا۔ یہ سب عدیل کے قدموں کی برکت ہے۔ تم نے دیکھا کہ وہ بچہ ہمارے لیے کتنا بھاگوان ثابت ہوا ہے۔ اب تم پر لازم ہے کہ اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھو، یہ نہ ہو کہ ماں بن جانے کے بعد اس کے لیے تمہاری توجہ اور پیار میں کمی آجائے۔“

مجھے ان کی یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ یہ خبر سنتے ہی مجھے اپنی بانہوں میں لے لیں گے اور کہیں گے کہ تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج ہم کسی اچھی جگہ چل کر ڈنر کریں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کی بجائے انہیں عدیل کی فکر ستانے لگی۔ اس لمحے پہلی بار مجھے عدیل غیر لگا۔ ابھی ڈاکٹر نے صرف ماں بننے کی خوش خبری دی تھی۔ میرا بچہ اس دنیا میں نہیں آیا تھا لیکن میرے دل میں عدیل کے لیے منفی جذبات ابھرنے لگے تھے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ عارف میرا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔ مجھے باقاعدگی سے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے جاتے۔ ان کی تاکید تھی کہ ڈاکٹر کی ہدایات پر سختی سے عمل کروں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ عدیل کو بھی زیادہ وقت دینے لگے تھے۔ دفتر سے آنے کے بعد اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتے اور اس سے لہک لہک کر باتیں کیا کرتے۔ ان کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی اپنے پسندیدہ کھلونوں سے کھیل رہا ہو۔ شاید ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ باپ بن جانے کے بعد کہیں عدیل کے لیے ان کی محبت میں کمی نہ آجائے۔ اسی لیے وہ اس اندیشے سے نمٹنے کے لیے شعوری کوشش کر رہے تھے۔

وہ میری زندگی کا ایک انتہائی خوشگوار اور یادگار دن تھا جب میں نے ایک خوبصورت سے بیٹے کو جنم دیا۔ عارف کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ ہم نے بچے کا نام احمر رکھا۔ عدیل اس وقت ڈھائی تین سال کا تھا۔ وہ بھی گھر میں نئے مہمان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہر وقت اس کے گرد منڈلاتا رہتا جبکہ میں اسے احمر سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ عدیل ناسمجھ اور معصوم تھا اور میں ڈرتی تھی کہ کہیں وہ جوش میں آکر اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ اسی لیے میں نے آیا کو خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ وہ عدیل کو احمر کے قریب نہ آنے دے۔

میں نے شعوری طور پر پوری کوشش کی کہ عدیل اور احمر کے درمیان کوئی فرق نہ رکھوں لیکن اس پر عمل نہ کر سکی اور فطری طور پر میری توجہ عدیل سے کم ہو کر احمر کی جانب بڑھنے لگی۔ میں نے نادیہ اور اسلم کو احمر کی پیدائش کی اطلاع تو دے دی تھی لیکن ساتھ ہی یہ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ کہیں عدیل کو واپس نہ مانگ لیں۔ اب ان کے حالات بدل چکے تھے اور وہ اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ ساتھ عدیل کی پرورش کا خرچ بھی برداشت کر سکتے تھے۔ نادیہ نے مجھے مبارکباد کا خط بھیجا لیکن اشارتاً بھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ وہ کہہ سکتی تھی کہ احمر کے آجانے کے بعد میری محرومی دور ہو چکی ہے عدیل کو اسے واپس کر دیا جائے۔ لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کیے ہوئے وعدے پر قائم ہے اور کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی جس سے میری دل آزاری ہو۔ اسے یہ بھی اطمینان ہوگا کہ میرے گھر میں عدیل شہزادوں کی طرح پرورش پا رہا ہے اور وہ حالات بہتر ہو جانے کے باوجود اسے یہ سہولتیں فراہم نہیں کر سکتی۔

عارف نے البتہ عدیل اور احمر میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ وہ اب بھی عدیل کو بھرپور توجہ اور محبت دے رہے تھے۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے اور اس کے ساتھ بالکل بڑے بیٹے جیسا سلوک کرتے تھے۔ وہ جب اسکول جانے کے قابل ہوا تو عارف نے اسے شہر کے سب سے مہنگے اور بہترین اسکول میں داخل کروادیا۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ ہم نے جو ذمے داری لی ہے، اسے احسن طریقے سے نبھائیں تاکہ عدیل معاشرے کا ایک کامیاب فرد بن جائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ عارف اپنے خون پسینے کی کمائی یوں ضائع کریں۔ عدیل کو کسی درمیانے درجے کے انگلش میڈیم اسکول میں بھی داخل کروایا جاسکتا تھا۔ دو تین سال بعد عمیر بھی اسکول جانے لگتا تو اخراجات اور بڑھ جاتے۔ میں نے دبی زبان سے یہ بات عارف سے کی تو وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ”تم بھی بعض اوقات بہت چھوٹی بات کر جاتی ہو۔ اگر میں تمہارے کہنے پر عمل کروں تو کل تم یہ برداشت کر لوگی کہ احمر بھی اسی درمیانے درجے کے اسکول میں جائے جہاں عدیل پڑھ رہا ہے۔“

انہوں نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ عدیل اور احمر میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک حقیقت وہ بھول رہے تھے کہ عدیل ان کی سگی اولاد نہیں ہے اور وہ کبھی بھی اسے اپنا نام نہیں دے سکتے۔ اسکول میں داخلے کے وقت ولدیت کے خانے میں اسلم کا نام ہی لکھا گیا۔ اس وقت عدیل کو یہ بات معلوم نہیں تھی لیکن جب پہلی بار وہ رپورٹ کارڈ لے کر گھر آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں پریشان ہوگئی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور ماتھا چومتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا میری جان؟ اتنے پریشان کیوں ہو؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟“

اس نے رپورٹ کارڈ مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”پاپا کا نام محمد عارف ہے پھر اس میں محمد اسلم کیوں لکھا ہوا ہے؟ کیا میں آپ لوگوں کا بیٹا نہیں ہوں؟“

”تم ہمارے ہی بیٹے ہو۔“ میں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی کہ تمہاری ولدیت کے خانے میں محمد اسلم کا نام کیوں لکھا ہوا ہے۔ ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔“

”میں سمجھ گیا، پاپا آپ کے دوسرے شوہر ہیں۔ میرے باپ کا نام محمد اسلم ہے۔“

”اپنے ذہن پر اتنا زور مت دو۔ تم ہماری ہی اولاد ہو۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو میں ساری بات تمہیں سمجھا دوں گی۔“

وہ تھوڑا سا مطمئن تو ہو گیا لیکن اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ شام کو عارف گھر آئے تو میں نے یہ قصہ انہیں سنایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے اور کہنے لگے۔ ”ہم لوگوں نے جذبات میں آکر اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا۔ اب اسے اس طرح کی باتوں سے نہیں بہلایا جاسکتا۔ اس کے ذہن میں گرہ پڑ چکی ہے۔ یہ تو اور بھی زیادہ خراب بات ہوگی کہ وہ مجھے اپنا سوتیلا باپ سمجھنے لگے۔ بہتر ہوگا کہ اسے اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔“

”بالکل نہیں۔“ میں نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مناسب نہ ہوگا اگر ہم نے اسے بتا دیا کہ وہ ہمارا نہیں بلکہ نادیہ اور اسلم کا بیٹا ہے تو وہ اپنے والدین کے پاس جانے کی ضد کر سکتا ہے۔“

Henrik,ibsen

1828-1906ء ناروے کا عظیم ڈراما نگار اور شاعر۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ نے ساری جائیداد عیاشی کی بھینٹ چڑھادی اور ابسن کو پندرہ برس کی عمر میں ایک فارمیسی کی ملازمت سے زندگی شروع کرنا پڑی۔ 1851ء میں نیشنل تھیٹر میں اسٹیج ڈائریکٹر بن گیا۔ 1864ء میں اپنے ملک کے سیاست دانوں کی پالیسی سے بےزار ہو کر جرمنی اور پھر اٹلی چلا گیا۔ 1891ء میں واپس ناروے آیا۔ پہلے پچیس سال میں تاریخی ڈرامے لکھے۔ معاشری مسائل پر توجہ دینے کا دور 1877ء سے شروع ہوتا ہے، جب اس نے مشہور ڈراما ”سماج کے معمار“ پیش کیا۔ ابسن کے ڈرامے دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

مرسلہ: زاہد خان، کراچی

”ایسی صورت میں ہم اس کی بات ماننے پر مجبور ہوں گے۔ اسے زبردستی تو اپنے ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔“

”ابھی رک جائیں۔ دیکھتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اس کا رویّہ ہمارے ساتھ کیسا ہوتا ہے؟“

اس روز کے بعد میں نے عدیل میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ مجھے تو وہ ماں ہی سمجھتا رہا لیکن عارف کے ساتھ اس کا رویّہ بدل گیا تھا۔ وہ ان سے دور دور رہنے لگا جیسے خوفزدہ ہو۔ شاید وہ انہیں اپنا سوتیلا باپ ہی سمجھنے لگا تھا۔ شاید اسکول میں کسی لڑکے نے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھادی ہو کہ تمہاری ماں نے دوسری شادی کی ہے اور تم اس کے پہلے شوہر کی اولاد ہو۔

عارف کے لیے یہ صورتِ حال بڑی پریشان کن تھی۔ وہ اسے بہت چاہتے تھے لیکن جس قدر وہ اس کے قریب آنے کی کوشش کرتے، اتنا ہی وہ ان سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اسی کشمکش میں چند سال اور گزر گئے۔ عدیل نے میٹرک پاس کر لیا تھا اور کالج میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس دوران نادیہ اور اسلم ایک مرتبہ بھی پاکستان نہیں آئے۔ نادیہ سے کبھی کبھی فون پر بات ہوتی تو وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ پوری فیملی کے ساتھ آنا بہت مشکل ہے۔ جوں جوں بچے بڑے ہو رہے ہیں، اخراجات بھی بڑھتے جا رہے

ہیں۔ اسلم کی یہی کوشش ہے کہ اتنے پیسے جمع کر لیں کہ پاکستان آنے کے بعد اپنا کوئی کاروبار شروع کر سکیں۔

عدیل بہت نیک، سمجھدار اور شریف واقع ہوا تھا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا۔ رمضان میں پورے روزے رکھتا اور اسکول سے آنے کے بعد باقی وقت گھر میں ہی گزارتا۔ اسے دوستوں کے ساتھ باہر گھومنے، فلمیں دیکھنے یا کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ فجر کی نماز کے بعد باقاعدگی سے واک ضرور کرتا۔ اس کے برعکس میرا بیٹا احمر انتہائی ضدی، خودسر اور بدتمیز تھا۔ بات بات پر ضد کرنا اور بے جا فرمائشیں کرنا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ میرے بے جا لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھتی رہی کہ بچہ ہے، بڑا ہو کر خود ہی عقل آجائے گی لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عادتیں بگڑتی جا رہی تھیں۔ وہ شام کو دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا جاتا اور اس کی واپسی مغرب سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ رات کو دیر تک ٹی وی دیکھتا رہتا۔ میں زبردستی اس کا ہوم ورک کرواتی ورنہ اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر عارف کچھ کہتے تو رونے بیٹھ جاتا۔ اسے یہی شکایت تھی کہ پاپا، عدیل کو زیادہ چاہتے ہیں اور اسے ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔

عارف کی بے پناہ محبت، چاہت اور شفقت رنگ لائی اور عدیل ایک بار پھر ان سے قریب ہونے لگا۔ میں نہیں جانتی کہ اس کے دل میں عارف کے لیے کیا جذبات تھے لیکن اب وہ ان سے خوفزدہ نہیں بلکہ ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح ان کی عزت کرنے لگا تھا۔ احمر کا لاابالی پن دیکھ کر عارف اس سے مایوس ہو چکے تھے اور اب ان کی ساری توجہ عدیل پر مرکوز تھی اور وہ اسے ہی اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھنے لگے تھے۔ میرے لیے یہ صورت حال قابل قبول نہیں تھی۔ عارف کا عدیل کی جانب حد درجہ التفات مجھے گراں گزرنے لگا بلکہ کبھی کبھی تو میں یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ عدیل کی وجہ سے احمر اپنے باپ کی توجہ سے محروم ہو گیا ہے۔ کئی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ عدیل کی تعلیم مکمل ہو جائے تو اسے نادیہ اور اسلم کے حوالے کر دوں۔ ہم نے عدیل کو پال پوس کر اس قابل کر دیا تھا کہ وہ اپنے والدین کا سہارا بن سکے۔ یہی بات جب میں نے عارف سے کہی تو وہ بھڑک اٹھے اور برہم ہوتے ہوئے بولے۔ ”آیندہ کبھی یہ بات زبان پر نہ لانا۔ عدیل ہمارا ہے اور ہمارا ہی رہے گا۔ یہ بات اسی وقت طے ہو گئی تھی جب ہم نے اسے گود لیا تھا۔“

”لیکن قانونی اور شرعی طور پر وہ انہی کی اولاد ہے۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں۔“

”یہ سوال تو اس وقت اٹھے گا جب وہ لوگ اس کی واپسی کا مطالبہ کریں گے، انہوں نے تو آج تک پلٹ کر اس کی خبر بھی نہیں لی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔“ میں زچ ہوتے ہوئے بولی۔ ”نادیہ تو ٹیلی فون پر عدیل ہی کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہے لیکن اپنے حالات کی وجہ سے مجبور ہو گئی ہے۔“

”اس کی بے چینی بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ اسلم کی ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ مستقل طور پر پاکستان آجائیں گے اور نادیہ جی بھر کر اسے دیکھ لے گی۔“

یہ بات سن کر میں ڈر گئی اور بولی۔ ”پھر تو ہمیں عدیل کو بتانا ہوگا کہ نادیہ اور اسلم ہی اس کے اصل والدین ہیں۔“

”کبھی نہ کبھی تو اسے یہ حقیقت بتانا ہی ہوگی۔ اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سب کچھ جان لینے کے بعد وہ ہمیں چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس چلا جائے۔“

”ہم اسے روک نہیں سکتے۔ وہ بالغ ہو چکا ہے اور اپنی مرضی سے جہاں چاہے رہ سکتا ہے۔“

سچ پوچھیں تو میں اس وقت خود کنفیوزڈ تھی۔ میں نے عدیل کو حقیقی ماں کی طرح پالا تھا اور مجھے اس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ احمر کے مقابلے میں عدیل کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ میں جانتی تھی کہ شرعاً اور قانوناً عدیل کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں بنتا لیکن میں عارف کی انصاف پسند طبیعت سے واقف تھی۔ وہ یقیناً وصیت میں اسے کچھ نہ کچھ ضرور دیتے اور میں یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ عدیل کی وجہ سے میرے بیٹے کا حصہ کم ہو جائے۔ یہ احسان کیا کم تھا کہ ہم نے اسے شہزادوں کی طرح پال پوس کر اس قابل کر دیا کہ وہ معاشرے کا کارآمد فرد بن سکے۔

میرے کہتے سننے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عارف نے احمر پر بھی توجہ دینا شروع کر دی۔ وہ اس کی تعلیم کی طرف سے بہت پریشان تھے حالانکہ وہ خاصا ذہین تھا اور ذرا سی توجہ دینے پر امتحان میں اس کے اچھے نمبر آسکتے تھے۔ عارف نے اس کے لیے ایک بہترین ٹیوٹر کا بندوبست کیا اور باقاعدگی سے اس کی پروگریس چیک کرنے لگے۔ اب وہ بڑی کلاس میں آ گیا تھا۔ اس لیے پڑھائی کی مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ سے دوستوں کے ساتھ گھومنے اور ٹی وی دیکھنے میں کمی آگئی تھی لیکن اس کی بدتمیزی اپنی جگہ موجود تھی۔ وہ دن بہ دن بدتمیز، بدزبان، مغرور اور ضدی ہوتا جا رہا تھا، گھر کے نوکر اس کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہ تھے۔ وہ تو عدیل کو بھی خاطر میں نہ لاتا اور اسے بڑے بھائی کی جگہ اپنا نوکر سمجھتا۔ عدیل اس کی فطرت سے واقف تھا۔ اس لیے خوشی خوشی اس کے سارے کام کر دیتا اور اس کے ساتھ ہمیشہ پیار محبت سے پیش آتا۔ احمر کی حرکتیں دیکھ کر میرا دل اندر سے بیٹھنے لگتا، عارف نے اسے پڑھائی کی جانب راغب کر لیا تھا لیکن اس کی تربیت تو میری ذمے داری تھی جس میں مجھ سے کوتاہی ہوئی اور اب میں یہی سوچ سوچ کر ڈرتی رہتی تھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

عدیل نے ایم بی اے کر لیا تو عارف نے اسے اپنی کمپنی میں انٹرن شپ دے دی۔ وہ اسے کسی بڑی پوسٹ پر بھی رکھ سکتے تھے لیکن یہاں بھی ان کی اصول پسندی آڑے آئی۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی بھی ذمے داری دینے سے پہلے اس کی مناسب تربیت ضروری ہے۔ عدیل نے باقاعدگی سے دفتر جانا شروع کر دیا۔ اس کی ٹریننگ شروع ہو گئی تھی۔ مہینا پورا ہوا تو کیشیئر نے اسے بھی ایک لفافہ تھما دیا جس میں دس ہزار روپے تھے۔ عدیل نے گھر آکر وہ لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا۔ ”مما! ابھی میری جاب شروع نہیں ہوئی پھر مجھے تنخواہ کیوں دی گئی ہے۔ میں یہ پیسے نہیں لے سکتا۔“

میں نے اسے سمجھایا کہ اس پر کوئی احسان نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ اس کے وقت کی قیمت ہے۔ عارف کی جگہ میں ہوتی تو تمہیں کسی پوسٹ پر تعینات کر کے کم از کم چالیس پچاس ہزار تنخواہ دیتی۔“

”لیکن مما، میں ان پیسوں کا کیا کروں گا، میری ساری ضرورتیں ویسے ہی پوری ہو جاتی ہیں۔ ڈیڈی سے کہیں کہ وہ یہ پیسے کسی ضرورت مند کو دے دیں۔“

”ان پیسوں کو اپنا جیب خرچ سمجھ کر رکھ لو۔ تم انہیں جیسے چاہو خرچ کر سکتے ہو۔“

میں دل ہی دل میں عدیل اور احمر کا موازنہ کرنے لگی۔ عدیل سارا دن دفتر میں سر کھپانے کے باوجود تنخواہ لیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ اس کے خیال میں وہ زیر تربیت تھا اور ابھی اس کی جاب شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس احمر کو ہر مہینے پانچ ہزار روپے بطور جیب خرچ ملتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ہر دوسرے تیسرے روز میرے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوتا۔ وہ کسی قسم کا نشہ نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اسے ہوٹلوں یا کلبوں میں جانے کی عادت تھی۔ البتہ وہ فضول خرچ ہو گیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ مل کر بے دردی سے پیسا لٹاتا اور اس کی جیب ہمیشہ خالی رہتی۔ البتہ مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ اس نے پڑھائی کی جانب توجہ دینا شروع کر دی تھی اور میڈیکل کے آخری سال میں پہنچ گیا تھا۔

ایک سال پلک جھپکتے گزر گیا تو عدیل کو ایک شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ عارف اسے کم از کم جنرل منیجر کا عہدہ ضرور دیں گے۔ جب میں نے ان سے یہ بات کہی تو وہ بولے۔ ”میں اگر چاہتا تو پہلے روز ہی اسے یہ پوسٹ دے سکتا تھا لیکن اونچی چھلانگ بعض اوقات خطرناک یا نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایک سیڑھی چڑھتا ہوا کامیابی کی منزل تک پہنچے۔“

احمر نے ایم بی بی ایس کرتے ہی ہاؤس جاب کا بھی انتظار نہ کیا اور باہر جانے کی ضد شروع کر دی۔ جبکہ عارف چاہتے تھے کہ وہ پہلے اپنے ملک میں ہی اسپیشلائزیشن کرے۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے باہر جائے۔ احمر نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی لیکن چپکے چپکے اپنی تیاریوں میں لگا رہا۔ اس نے امریکا کی کئی یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لیے درخواست بھیجی اور مطلوبہ امتحان بھی پاس کر لیا۔ ہمیں اس تمام کارروائی کا پتا اس وقت چلا جب اسے ویزے کے لیے انٹرویو دینے اسلام آباد جانا تھا۔ عارف نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے دماغ پر تو امریکا جانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور انٹرویو دینے اسلام آباد چلا گیا۔

احمر کے جانے کے بعد عارف بہت خاموش اور افسردہ رہنے لگے۔ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن میں جانتی تھی کہ انہیں احمر کی نافرمانی کا دکھ ہے۔ ایک روز وہ گھر آئے تو خاصے کمزور اور تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ میں ان کی حالت دیکھ کر ڈر گئی اور ضد کر کے زبردستی ڈاکٹر کے

پاس لے گئی۔ اس نے تفصیلی معائنہ کے بعد بتایا کہ شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے ان کی یہ کیفیت ہے اور اگر احتیاط نہ کی گئی تو انجائنا بھی ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر نے دوائیں لکھ دیں کچھ ٹیسٹ تجویز کیے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ عارف نے پہلی دو ہدایات پر تو عمل کیا لیکن آرام ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ چھٹی والے دن گھر کو بھی دفتر بنالیا کرتے تھے۔ اس موقع پر عدیل نے تھوڑی سی ہمت دکھائی اور عارف سے کہا کہ وہ کچھ دن آرام کرلیں۔ وہ ان کی غیر موجودگی میں دفتر کے معاملات دیکھ لے گا اور اگر کوئی مسئلہ درپیش ہوا تو انہیں بتادے گا۔ عارف نے عدیل کی بات مان لی تھی۔ ویسے بھی وہ اس پر بہت زیادہ بھروسا کرنے لگے تھے اور انہیں یقین تھا کہ عدیل ان کی غیر حاضری میں دفتر سنبھال سکتا ہے۔ عارف نے سختی سے تاکید کردی تھی کہ احمر کو ان کی بیماری کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ وہ بلاوجہ پردیس میں پریشان ہوگا جبکہ یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ احمر ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی ذات کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی نہیں ہوتی۔

کچھ دن بعد عارف کی طبیعت سنبھل گئی اور انہوں نے دوبارہ دفتر جانا شروع کردیا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ بہت تھک چکے ہیں اور انہیں اپنا کام دوسرے لوگوں میں بانٹ دینا چاہئے۔ عارف نے میرے مشورے پر اپنی بہت سی ذمّے داریاں عدیل کو سونپ دیں۔ اب وہ ان کے برابر والے کمرے میں بیٹھتا اور ایک طرح سے ان کے نائب کے طور پر کام کررہا تھا حالانکہ میری دلی خواہش تھی کہ یہ جگہ احمر کو ملتی۔ میں کسی صورت بھی عدیل کو احمر پر ترجیح نہیں دے سکتی تھی۔ احمر صحیح معنوں میں ہمارا وارث تھا اور عدیل کی حیثیت محض ایک لے پالک کی تھی۔ وہ عارف کی کمپنی میں بڑی سے بڑی پوسٹ پر کام کرسکتا تھا لیکن میں اسے باس کے روپ میں برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس جگہ پر احمر کا حق تھا لیکن وہ احمق ذمّے داریوں سے دامن بچا کر اپنی الگ دنیا بسانے امریکا چلا گیا۔

زندگی پل پل رنگ بدلتی ہے اور اس سفر میں بعض اوقات ایسے موڑ بھی آجاتے ہیں کہ انسان کے لیے صحیح راستے کا انتخاب کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ہمیں بھی ایسی ہی ایک آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ایک روز نادیہ نے فون پر اطلاع دی کہ اسلم کی ملازمت ختم ہوگئی ہے اور وہ لوگ عنقریب پاکستان آرہے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب تک ان کے لیے کسی مکان کا بندوبست نہیں ہوجاتا وہ لوگ ہمارے گھر ہی قیام کریں گے۔ میرے لیے یہ خبر بم کا گولہ ثابت ہوئی اور مجھے یوں لگا جیسے آسمان سر پر آن گرا ہو۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہی تھا کہ عدیل کو ان لوگوں کے بارے میں کیا بتایا جائے۔ اسے گود لیتے وقت یہی طے ہوا تھا کہ وہ نادیہ اور اسلم کو خالہ، خالو کہے گا لیکن عملاً ایسا کبھی نہیں تھا۔ اب تک وہ مجھے اپنی ماں اور عارف کو سوتیلا باپ ہی سمجھ رہا تھا لیکن اسلم کے آجانے کے بعد صورتِ حال بدل گئی تھی۔ عدیل کی ولدیت کے خانے میں بھی اسلم کا نام لکھا ہوا تھا اور ناموں کی یہ مماثلت کسی بھی الجھن کا سبب بن جاتی۔ اس کے علاوہ یہ ڈر بھی تھا کہ عدیل کی شاندار شخصیت اور پوزیشن کو دیکھ کر اسلم اور نادیہ کی نیت میں فتور آجائے اور اس کی واپسی کا تقاضا کردیں۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ میرا بیٹا اب جوان ہوگیا ہے اور اب مجھے عدیل کی ضرورت نہیں۔ نادیہ کے دونوں بڑے لڑکے نکھٹو نکلے اور انہوں نے واجبی سی تعلیم..... حاصل کی تھی۔ اسے لڑکیوں کی شادیاں بھی کرنی تھیں۔ اس لیے وہ عدیل کو اپنی امیدوں کا مرکز بناسکتی تھی۔

میں نے اس پریشانی کا ذکر عارف سے کیا تو وہ بڑی رسان سے بولے۔ ”اب وقت آگیا ہے کہ ہم عدیل کو حقیقت بتادیں۔ وہ ذہین اور سمجھ دار لڑکا ہے، یہ فیصلہ اس پر ہی چھوڑ دیا جائے کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔“

”اگر اس نے اپنے والدین کو ترجیح دی تو.....“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل تو سگی اولاد بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ تمہارا اپنا بیٹا میرے منع کرنے کے باوجود امریکا چلا گیا۔ عدیل کے جانے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ انسان اکیلا آتا ہے اور اکیلا ہی چلا جاتا ہے۔ اسے دنیا میں بھی اکیلے رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔“

اسی رات عارف نے عدیل کو اپنے کمرے میں بلایا اور میری موجودگی میں ساری حقیقت اسے بتادی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا اور جب عارف نے اپنی بات ختم کی تو آہستہ سے بولا۔ ”آپ لوگوں نے اچھا کیا کہ ان لوگوں کے آنے سے پہلے مجھے یہ بات بتادی۔ بے شک وہ میرے حقیقی والدین ہیں لیکن انہوں نے تو پلٹ کر میری خبر بھی نہ لی۔ میں اسی گھر میں پل بڑھ کر جوان ہوا ہوں۔ آپ لوگوں نے سگی اولاد سے بڑھ کر میری پرورش اور تربیت کی پھر میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں۔ احمر کے آنے تک تو میں یہیں رہوں گا۔ اس کے آنے کے بعد آپ لوگ جو فیصلہ کریں وہ مجھے قبول ہوگا۔“

”ہماری خواہش تو یہی ہے کہ تم ہمیشہ ہمارے پاس ہی رہو۔ آگے تمہاری مرضی۔“

”بے فکر رہیں۔ وہی ہوگا جو آپ لوگ چاہیں گے۔“

نادیہ اور اسلم اپنے بچوں کے ہمراہ آئے تو ہمارا گھر جنجال پورہ کا منظر پیش کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ پچیس سال بعد عدیل کو دیکھ کر نادیہ اور اسلم اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں گے اور والہانہ انداز میں اس پر پیار نچھاور کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کی جانب سے عدیل کے لیے کوئی گرم جوشی دیکھنے میں نہیں آئی۔ وہ بالکل رسمی انداز میں اس سے ملے جیسے وہ ان کا بیٹا نہیں بلکہ دور پرے کا کوئی رشتے دار ہو۔ میں کوشش کے باوجود نہ سمجھ سکی کہ ان لوگوں نے عدیل کے ساتھ ایسا رویّہ کیوں اختیار کیا تھا۔ ان کے دوسرے بچے بھی عدیل کو اجنبی سمجھ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ نادیہ نے جیسے انہیں بتایا ہی نہیں کہ ان کا کوئی چھوٹا بھائی بھی ہے جسے اس کی خالہ نے بچپن میں ہی گود لے لیا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے نادیہ کے بچوں کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ عدیل کے سامنے وہ بالکل پینڈو لگ رہے تھے۔ نادیہ اور اسلم نے ان کی تعلیم و تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ دونوں بیٹے راحیل اور شرجیل محض انٹر پاس تھے اور کسی شاپنگ مال میں سیلز مین کی جاب کرتے تھے۔ نادیہ نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں بڑی مشکل سے اس کے ساتھ آئے ہیں اور چھٹی ختم ہونے پر واپس چلے جائیں گے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ان کا واپس جانا ہی بہتر ہے۔ یہاں تو انہیں پانچ ہزار کی ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ دونوں لڑکیوں راشدہ اور ریحانہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ رات کو دیر تک فلمیں یا ٹی وی دیکھتی رہتیں اور دن چڑھے تک سوتی رہتیں۔ ان کا ناشتا بارہ بجے اور دوپہر کا کھانا چار بجے ہوا کرتا تھا۔ اتنی کاہل اور کام چور تھیں کہ کھانے کے بعد میز پر سے برتن اٹھانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتیں۔ میں ان سب باتوں کی عادی نہ تھی اس لیے دو دن میں ہی گھبرا گئی۔ میرا خیال تھا کہ ہفتے دو ہفتے میں اسلم کوئی مکان دیکھ کر وہاں شفٹ ہوجائے گا لیکن یوں لگ رہا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ سارا دن اخبار پڑھتا، ٹی وی دیکھتا یا لمبی تان کر لیٹ جاتا۔ شام کو عارف دفتر سے تھکے ہارے گھر آتے تو ان کے کان کھانے بیٹھ جاتا۔ ہم لوگ پُرسکون ماحول میں زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ اس لیے یہ شور شرابہ ہم سے برداشت نہ ہوسکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عارف کی طبیعت ایک بار پھر خراب ہوگئی۔ اس بار حملہ شدید تھا۔ عارف کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ میں اور عدیل ان کی تیمارداری میں لگ گئے۔ اب گھر پر نادیہ اور اسلم کا راج تھا۔ ایک ہفتے میں ہی ان لوگوں نے ہر چیز تہس نہس کردی۔ خدا خدا کرکے عارف کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو ڈاکٹروں نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ انہیں کم از کم ایک ماہ تک گھر پر آرام کرنا ہوگا۔ عارف کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ ایک دن کے لیے بھی کام کا ناغہ نہیں کرسکتے تھے چنانچہ انہوں نے فیکٹری کا کام چلانے کے لیے عدیل کو مختارِ کل بنادیا۔

عدیل نے فوری طور پر نادیہ اور اسلم کے لیے ایک مکان کا بندوبست کیا اور انہیں وہاں شفٹ کردیا۔ اسلم نے ناک بھوں تو چڑھائی لیکن عدیل نے یہ کہہ کر اسے خاموش کردیا کہ عارف انکل کو مکمل سکون اور آرام کی ضرورت ہے جو آپ لوگوں کی موجودگی میں ممکن نہیں۔ ویسے بھی ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے پھر کیوں نہ ابھی شفٹ ہوجائیں تاکہ انکل ڈسٹرب نہ ہوں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا۔ عارف نے ایک بار پھر مجھے منع کردیا کہ احمر کو ان کی طبیعت کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ اس کی پڑھائی کا آخری سال چل رہا تھا اور عارف نہیں چاہتے تھے کہ اسے ڈسٹرب کیا جائے۔ عدیل اب بہت زیادہ مصروف ہوگیا تھا۔ وہ اکثر دیر سے گھر آنے لگا تھا۔ جبکہ عارف خواہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوتے لیکن شام کو ہمیشہ وقت پر آجاتے تھے۔ میں نے ایک دو دفعہ عدیل سے پوچھا تو اس نے یہی جواب دیا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے دیر تک فیکٹری میں رکنا پڑتا ہے۔

اسلم ناراض ہوگیا تھا۔ اس نے جانے کے بعد ایک دفعہ بھی عارف کا حال نہیں پوچھا۔ البتہ نادیہ کبھی کبھی ان کی خیریت معلوم کرنے آجاتی۔ اس کے دونوں بیٹے واپس چلے گئے تھے اور اب وہ بیٹیوں کے لیے رشتے تلاش کررہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اور اسلم بھی بیٹیوں کے پاس چلے جائیں گے کیونکہ اسلم کے پاس اتنا پیسا نہیں تھا کہ وہ کوئی کاروبار شروع کرسکتا اور نوکری کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

نادیہ کی کوششیں رنگ لائیں اور ایک دن اس نے مجھے فون پر بتایا کہ اس کی دونوں بیٹیوں کے رشتے طے ہو گئے ہیں۔ البتہ وہ شادی کے اخراجات کے لیے فکر مند تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اللہ کا نام لے کر تیاری شروع کر دے۔ ہم سے جو ہو سکا وہ ضرور کریں گے۔

مجھے عارف پر پورا بھروسا تھا کہ وہ اس معاملے میں میرا ساتھ دیں گے اور ایسا ہی ہوا جب میں نے ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو انہوں نے فوراً ہی عدیل کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ شادی کے انتظامات کے سلسلے میں نادیہ اور اسلم کی پوری پوری مدد کرے اور اس کے لیے جتنی رقم درکار ہو وہ اکاؤنٹ سے نکلوا سکتا ہے۔ انہوں نے عدیل سے یہ بھی کہا کہ راحیل اور شرجیل ملک سے باہر ہیں اس لیے وہ باقاعدگی سے وہاں جاتا رہے اور شادی کی خریداری میں نادیہ کا ہاتھ بٹائے۔ عدیل نے ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح ان کی ہدایات پر عمل شروع کر دیا۔ اب وہ دفتر سے واپسی پر نادیہ کے گھر چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے، یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔

عارف کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی، میں نے گھبرا کر احمر کو فون کیا کہ وہ جلد از جلد واپس آجائے لیکن اس نے بڑے خوبصورت انداز میں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسے ڈگری کے حصول کے لیے ایک ادارے میں انٹرن شپ کرنا پڑ رہی ہے، اس لیے وہ چھ ماہ سے پہلے وطن واپس نہیں آسکتا۔ ویسے بھی اس کا ارادہ امریکا میں ہی سیٹل ہونے کا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ پاکستان میں اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ وہ تو چاہتا تھا کہ ہم لوگ بھی سب کچھ سمیٹ کر اس کے پاس آجائیں لیکن یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ فی الحال تو میں عارف کی صحت یابی کے بارے میں پریشان تھی۔

نادیہ کی دونوں بیٹیوں کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ میرا خیال تھا کہ عدیل اس مصروفیت سے فارغ ہونے کے بعد پہلے کی طرح گھر کی جانب توجہ دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بعد میں بھی وہاں باقاعدگی سے جاتا رہا۔ لیکن مجھ سے اس نے جھوٹ بولا کہ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اسے گھر آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ مجھے تھوڑا سا شک ہوا۔ میں نے اپنے طور پر تحقیق کروائی تو پتا چلا کہ وہ معمول کے مطابق پانچ بجے دفتر سے نکل جاتا ہے۔ میرے دل میں اس کی جانب سے گرہ پڑ گئی۔ عدیل کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر وہ اپنے والدین سے ملنے جاتا ہے تو میں اسے کیوں روکتی۔

کچھ دنوں بعد نادیہ نے بتایا کہ ان کا ویزا آگیا ہے اور وہ اسلم کے ساتھ اپنے بیٹوں کے پاس دبئی جا رہی ہے۔ مجھے یہ خبر سن کر خوشی ہوئی کہ اگر وہ لوگ یہاں رہتے تو شاید عدیل مکمل طور پر ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا۔ ان لوگوں نے نہ جانے اس پر کیا جادو کر دیا تھا کہ اسے روزانہ وہاں جائے بغیر چین ہی نہیں آتا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سب مل کر کیا پلاننگ کر رہے ہیں اور جب مجھے اس کا علم ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

جس روز اسلم اور نادیہ کو جانا تھا اس سے ایک دن پہلے شام کے وقت عارف کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ ان کی حالت دیکھ کر میری نیند بھی غائب ہو گئی۔ رات دو بجے کے قریب پانی پینے کے لیے اٹھی تو مجھے عدیل کے کمرے سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رات کے اس پہر وہ کس سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ کہیں کسی لڑکی سے تو اس کا سلسلہ شروع نہیں ہو گیا۔ میں نے تجسس کے جذبے سے مجبور ہو کر لاؤنج میں رکھا فون اٹھایا اور ان کی باتیں سننے لگی گو کہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن میں جاننا چاہتی تھی کہ اگر عدیل کا کسی لڑکی سے تعلق قائم ہو گیا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہ کسی لڑکی سے نہیں بلکہ اسلم سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے کانوں نے جو کچھ سنا اس کے بعد میرے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ اسلم کہہ رہا تھا۔

”تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ عارف چند [illegible] دنوں کا مہمان ہے۔ اس کے مرنے کے بعد مختار نامہ کی قانونی حیثیت ختم ہو جائے گی اور احمر ہر چیز کا مالک بن جائے گا۔ وہی اس کا حقیقی وارث ہے۔ تم محض لے پالک ہو اور وراثت میں تمہارا کوئی حصہ نہیں بنتا۔ اس لیے موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور سب کچھ سمیٹ کر ان کی زندگی سے نکل جاؤ ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے اور تمہاری حیثیت ایک وفادار ملازم سے زیادہ نہ ہوگی۔“

میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسلم اور عدیل مل کر ایسی خوفناک سازش بھی کر سکتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے عدیل کا جواب سن کر میرے خدشات دور ہو گئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”آپ نے یہی کہنے کے لیے اس وقت فون کیا تھا۔

محض اتفاق ہے کہ میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اگر مما فون اٹھا لیتیں تو آپ اس وقت فون کرنے کا کیا جواز پیش کرتے۔ بہر حال مشورے کا شکریہ۔ میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ میرے لیے کیا بہتر ہے۔“

عدیل کا جواب سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں پانی پی کر اپنے کمرے میں چلی آئی لیکن میری نیند غائب ہو چکی تھی۔ اسلم نے جو چنگاری دکھائی تھی وہ کسی وقت بھی شعلہ بن سکتی تھی۔ اس وقت تو عدیل نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا تھا لیکن آدمی کا ذہن بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ اسلم نے عدیل کو جو راستہ دکھایا تھا اس پر چل کر بڑے سے بڑے پارسا کے قدم ڈگمگا سکتے تھے۔ اس وقت ہم لوگ مکمل طور پر عدیل کے رحم و کرم پر تھے۔ عارف کی حالت ایسی نہ تھی کہ میں انہیں مختار نامہ منسوخ کرنے اور دفتر جانے کا مشورہ دیتی۔ اس کا صرف ایک ہی حل تھا کہ کسی نہ کسی طرح فوری طور پر احمر کو واپس بلایا جائے اور عارف اپنی زندگی میں ہی کاروبار اسے سونپ دیں۔

میں نے دوسرے روز ہی احمر کو فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے فوری طور پر واپس آنے کی تاکید کی۔ میں نے اسے یہ بتا دیا کہ اگر اب بھی اس نے ٹال مٹول سے کام لیا اور عدیل کی نیت میں فتور آگیا تو ہم لوگ سڑک پر آجائیں گے۔ اس کی سمجھ میں بات آگئی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد پاکستان آنے کی کوشش کرے گا پھر بھی اسے دس پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔

میں نے عدیل کے رویّے میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں کی تو مجھے اطمینان ہو گیا کہ اسلم کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ فطرتاً نیک اور شریف تھا اور کسی کو دھوکا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ٹھیک ہے کہ وراثت میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا لیکن ہمارا یہ احسان کیا کم تھا کہ اس کی پرورش شہزادوں کی طرح کی۔ اپنے سگے بیٹے کی طرح اسے چاہا اور معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔ ہمارے لیے بہت آسان تھا کہ احمر کی پیدائش کے بعد اسے نادیہ اور اسلم کے حوالے کر دیتے اور پوری توجہ اپنے بیٹے پر مرکوز کر دیتے لیکن یہ احسان فراموشی اور عہد شکنی ہوتی۔ نادیہ نے اپنے جگر گوشے کو میرے حوالے کر دیا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میرے دس بیٹے ہوئے تب بھی عدیل کو بوجھ سمجھ کر واپس نہیں کروں گی۔ میں نے اپنا عہد نبھایا اور جو کہا، اس پر قائم رہی۔

احمر کے واپس آجانے سے ہمارے گھر میں بہار آگئی۔ اسے دیکھ کر عارف بھی بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور یوں ہشاش بشاش نظر آنے لگے جیسے انہیں کچھ ہوا ہی نہیں تھا البتہ عدیل نے احمر کی واپسی پر کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لگتا تھا کہ اسے احمر کے آنے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ احمر بالکل نہیں بدلا تھا۔ پہلے کی طرح اکھڑ، مغرور اور خود سر نظر آ رہا تھا۔ بس اس کی شخصیت میں ایک تبدیلی آئی تھی، وہ یہ کہ اب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ امریکی گرین کارڈ ہولڈر تھا۔ اس کے انداز و اطوار دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ بحالت مجبوری آیا ہے اور اسے واپس جانے کی جلدی ہے۔ وہ مجھے اور عارف کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہا تھا۔ اس نے آنے کے دو دن بعد ہی مجھ سے کہا کہ ہم لوگ یہ مکان، فیکٹری اور دیگر اثاثے فروخت کر کے امریکا شفٹ ہو جائیں۔ کیونکہ وہ کسی طور پر بھی پاکستان میں رہنے کے لیے تیار نہ تھا اور نہ ہی وہ ہمیں یہاں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ موقع دیکھ کر عارف سے بات کروں گی مجھے امید ہے کہ وہ مان جائیں گے۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک ہفتے بعد عارف کو دل کا دورہ پڑا، اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے اس کے شوہر کی ذات کتنی اہم ہوتی ہے۔ میں دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ سوم تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ چوتھے روز عدیل حسب معمول دفتر جانے کے لیے تیار ہوا تو میں ہوش کی دنیا میں واپس آگئی۔ میرے کانوں میں اسلم کے الفاظ گونجنے لگے ”عارف کے مرنے کے بعد مختار نامہ کی قانونی حیثیت ختم ہو جائے گی اور احمر قانون و شریعت کے مطابق عارف کے چھوڑے ہوئے ترکہ کا مالک بن جائے گا“ میں نے احمر سے کہا کہ وہ فیکٹری جانا شروع کر دے ورنہ مختار نامہ کی تجدید کروانا ہوگی۔ اس کے بغیر عدیل ایک دن بھی فیکٹری کے امور نہیں چلا سکتا۔ اس نے کہا کہ میں وکیل کو بلا کر مشورہ کر لوں کہ فیکٹری بیچنے کے لیے قانونی کارروائی مکمل کر لیں۔ کیونکہ اسے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں اور نہ ہی وہ اس جنجال میں پھنسنا چاہتا ہے۔

شام ہو گئی لیکن عدیل واپس نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ تین دن کی غیر حاضری کی وجہ سے کام جمع ہو گیا ہو گا اس لیے دیر ہو گئی لیکن جب دس بجے تک بھی وہ نہیں آیا تو مجھے

تشویش ہونے لگی، میں نے فیکٹری فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا گویا وہ فیکٹری میں نہیں تھا۔ اس کا کوئی ایسا دوست بھی نہیں تھا جس کے ساتھ وہ کلب یا ہوٹل چلا جاتا۔ بارہ بجے تک بھی وہ نہیں آیا تو میں پریشان ہوگئی۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ خدانخواستہ کہیں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا۔ میں نے مختلف اسپتالوں کو فون کرکے معلوم کیا لیکن کہیں سے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔

ساری رات اسی پریشانی میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو میں نے احمر سے کہا کہ وہ عدیل کا پتا کرے۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی بچہ نہیں جو کھو جائے گا۔ کہیں کسی کام سے چلا گیا ہوگا، میں اسے کہاں ڈھونڈوں'' میں فیکٹری فون کرنے والی تھی کہ صفائی کرنے والی ملازمہ نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا کہ یہ اسے عدیل کے بستر پر سے ملا ہے۔ میں نے وہ لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا خط پڑھا جسے پڑھ کر میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس نے لکھا تھا ''ممّا! ڈیڈی کی وفات اور احمر کے آجانے کے بعد میری ذمے داری ختم ہوگئی۔ جانتا ہوں کہ لے پالک ہونے کی وجہ سے میرا وراثت میں کوئی حصہ نہیں اور میں ملازم کی حیثیت سے فیکٹری میں کام نہیں کرسکتا اسی لیے اس شہر بلکہ ملک سے ہی جارہا ہوں۔ احمر کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اسی لیے میں نے فیکٹری بیچ کر اپنا حصہ وصول کرلیا ہے۔ میں نے آپ لوگوں کی جو خدمت کی ہے، اس کے عوض میرا ابھی کچھ حق بنتا تھا۔ امید ہے کہ آپ میری اس گستاخی کو نظر انداز کردیں گی۔ فقط آپ کا لے پالک بیٹا عدیل۔''

میں نے گھبرا کر بینک منیجر کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ فیکٹری اکاؤنٹ میں صرف پانچ ہزار روپے پڑے ہیں۔ یہ سن کر میں سکتے میں آگئی کیونکہ میرے حساب سے اس اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے ہونے چاہیے تھے۔ ظاہر ہے کہ عدیل نے یہ رقم ایک دن میں نہیں نکالی ہوگی۔ وہ نہ جانے کب سے اکاؤنٹ میں ہیرا پھیری کررہا ہوگا۔ میں نے وکیل صاحب کے ذریعے بینک اسٹیٹمنٹ منگوا کر چیک کیا تو پتا چلا کہ گزشتہ چھ ماہ کے دوران عدیل نے مختلف اکاؤنٹس میں بھاری رقوم ٹرانسفر کی تھیں۔ عدیل نے بہت بھاری چوٹ دی تھی۔ وہ فیکٹری کی فروخت سے حاصل ہونے والے کروڑوں روپوں کے ساتھ ساتھ بینک اکاؤنٹ کا بھی صفایا کرگیا۔ میرے پاس نادیہ کا فون نمبر تھا اور نہ ہی ایڈریس جو اس سے عدیل کے بارے میں معلوم کرتی۔ ویسے بھی اس سے کیا فائدہ ہوتا؟ یہ ساری آگ اسلم کی لگائی ہوئی تھی۔

شام کو وکیل صاحب آئے تو انہوں نے بتایا کہ عارف نے مرنے سے چند روز قبل ایک وصیت تیار کی تھی جس کے مطابق میں اور احمر ان کے حقیقی وارث ہیں۔ ان کی تمام دولت اور جائیداد میں ہمیں شریعت کے مطابق حصہ ملنا تھا۔ عارف نے ترکہ میں فیکٹری کے علاوہ دو مکان، دو فلیٹ، چھ دکانیں اور ذاتی اکاؤنٹ میں کافی رقم چھوڑی تھی، وہ جانتے تھے کہ احمر کو پاکستان میں نہیں رہنا اور اسے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں لہٰذا انہوں نے فیکٹری عدیل کے نام کردی کیونکہ منہ بولا بیٹا ہونے کے ناتے اس کا بھی کچھ حق بنتا تھا۔

عارف کی وصیت سن کر میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں تھا کہ عارف نے فیکٹری عدیل کے نام کیوں کی بلکہ میں سوچ رہی تھی کہ کاش عدیل نے جلد بازی سے کام نہ لیا ہوتا۔ اس نے اسلم کے بہکانے میں آکر اپنے ہی حق پر ڈاکا ڈال دیا۔ عارف نے اس پر اندھا اعتماد کیا اور یہ بھول گئے کہ آج کل سگا بیٹا اپنا نہیں ہوتا عدیل تو پھر غیر تھا۔ ہاں، میں اسے غیر ہی کہوں گی اگر اپنا ہوتا تو جس تھالی میں کھایا، اس میں چھید نہ کرتا۔

اس واقعہ کے بعد رشتوں پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ احمر نے بہت چاہا کہ میں ساری جائیداد بیچ کر اس کے ساتھ امریکا چلی جاؤں لیکن اب میں کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی تھی خواہ وہ سگا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، کیا پتا کل کو وہ بھی مجھے پردیس میں بے یار و مددگار چھوڑ کر کسی نئی منزل کی جانب نکل جائے۔ میں نے اپنے شوہر کی نشانیوں کے ساتھ تنہا رہنا سیکھ لیا ہے۔ وہ میرے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے ہیں کہ بقیہ زندگی آرام سے گزار سکتی ہوں۔ احمر بھی ہر مہینے ایک معقول رقم بھیجتا ہے۔ اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کل وقتی ملازمہ رکھ لی ہے۔ اس کے علاوہ ڈرائیور اور اوپر کے کام کاج کے لیے ایک لڑکا بھی ہے۔ میں نے اپنے گھر پر غریب بچوں کے لیے مفت ٹیوشن سینٹر بھی کھول لیا ہے۔ سارا دن انہی میں مگن رہتی ہوں۔ ان میں سے کچھ بچے تو اتنے پیارے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ کسی ایک کو گود لے لوں لیکن دوسرا تجربہ کرتے ہوئے ڈرتی ہوں۔

قطرہ قطرہ زندگی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں نے اس تحریر میں اپنے اور اپنی امی کے حالات سمودیے ہیں صرف اس لیے کہ آپ غور کریں، عوام سوچے کہ ہم کس سمت میں بڑھ رہے ہیں، دوسروں کے بہکاوے میں آکر ہم اپنی آنے والی نسل کے ساتھ دشمنی کررہے ہیں۔

فائزہ
(کراچی)

یہ سلسلہ آج کا نہیں ہے۔ بلکہ کئی برسوں پہلے شروع ہوا تھا۔

اس دن میری ماں نے کہا تھا۔ ''فائزہ بیٹی، تم آج میرے ساتھ چلنا۔''

''اماں، میں نہیں جارہی۔'' میں نے انکار کردیا۔ ''مجھے اسکول کا کام کرنا ہے۔ بہت سی کاپیاں لے کر آگئی ہوں۔''

''ارے، سمجھا کر۔ ڈیڑھ سو روپے روز کے ملتے

ہیں۔“ اماں نے کہا۔ ”بس صرف دو دن کا کام ہے۔ دو دن تو تیرے اسکول کی بھی چھٹی ہے۔ دو دنوں کے اگر تین سو مل جائیں تو اس میں کیا ہے۔“

اب سے سات آٹھ سال پہلے تین سو روپے بھی بہت ہوا کرتے تھے۔

”اماں، تمہارے ساتھ تو دوسری عورتیں بھی ہوا کرتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تو اس سے کیا ہوا۔ میں نے آفیسر سے کہہ کر تیرے لیے بھی جگہ بنالی ہے۔“ اماں نے بتایا۔

اماں ایک پولیو ورکر تھیں۔ یعنی گھر گھر جا کر بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے والی۔ وہ ایک مثبت سوچ رکھنے والی عورت تھیں۔

گرچہ ان کی تعلیم صرف میٹرک تھی۔ لیکن وہ ایک روشن ذہن کی عورت تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بچوں کو پولیو کے قطرے پلانا صرف ایک کام ہی نہیں بلکہ ایک عبادت بھی ہے۔

”یہ بہت ثواب کا کام ہے بیٹا۔“ وہ کہا کرتیں۔ ”ہم اس طرح نہ صرف اپنے ملک اور قوم کی بلکہ مسلمانوں کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ خود سوچو پولیو سے متاثرہ لنگڑاتا ہوا شخص زندگی کی بھاگ دوڑ میں کس طرح حصہ لے سکے گا۔ ایسا تو بہت کم ہوتا ہے کہ اس قسم کے بچے کوئی ہنر وغیرہ سیکھ کر اپنا کام کرنے لگیں۔ ورنہ عام طور پر تو وہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر آجایا کرتے ہیں۔“

تو ایسے تھے میری اماں کے خیالات۔ میں اس لیے انہیں ایک آئیڈیل عورت تصور کرتی تھی۔ ان کے پیروں میں اچھی جوتیاں نہ سہی، بدن پر قیمتی لباس نہ سہی لیکن وہ آئیڈیل تھیں۔

ان کا تعلق جس طبقے سے تھا اس میں لڑکیوں کی تعلیم کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے شوق سے میٹرک تک تعلیم حاصل کرلی تھی۔ یہ کوئی عام بات نہیں تھی۔

میں نے اماں کی بات مان لی اور ان کے ساتھ بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے نکل کھڑی ہوئی۔

یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے مجھے بہت کچھ سیکھنے اور دیکھنے کو ملا۔ ہماری ڈیوٹی ایسے علاقے میں لگائی گئی تھی جو زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا۔

ہمارے عمر رسیدہ آفیسر ڈاکٹر صادق نے لیکچر دیتے ہوئے بتایا تھا۔ ”دیکھیں شہر کے جو تعلیم یافتہ اور پوش ترین علاقے ہیں وہاں تو زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ ان کے پاس قدم قدم پر کلینکس ہیں، ہاسپٹلز ہیں، ڈاکٹرز ہیں۔ اس لیے ان کے سو فیصد بچے پولیو کے قطرے پیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس ہر قسم کی سہولیات حاصل ہوتی ہیں۔“

”جب سہولیات ہوتی ہیں ڈاکٹر صادق تو پھر ہماری کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”اسی لیے میں ان علاقوں کی بات نہیں کر رہا۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”بلکہ ان علاقوں کی بات کر رہا ہوں جہاں کم تعلیم یافتہ لوگ رہتے ہیں۔ اور یہاں اس قسم کی سہولیات نہیں ہوا کرتیں، آپ کو وہاں محنت کرنی ہے۔“

بہر حال تو ہم اس طرح قطرے پلانے نکل کھڑے ہوئے۔

ہمارے لیے لوگوں کے رویے عام طور پر مثبت ہی ہوا کرتے۔ ہمارے لیے دروازے کھول دیے جاتے۔ اندر بلا لیا جاتا۔ نوزائیدہ یا کم سن بچوں کو ہمارے سامنے کر دیا جاتا۔ کہیں کہیں تو ہمارے لیے چائے وغیرہ بھی آجاتی۔

یعنی لوگ ہمارے ساتھ پوری طرح تعاون کر رہے تھے۔ کہیں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ صرف ایک جگہ ہمارے دروازے پر دستک دینے پر ایک درشت مزاج شخص نے دروازہ کھول کر سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جناب، کیا آپ کے یہاں کوئی چھوٹا بچہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

اس نے بڑی کمینی اور گھناؤنی نگاہوں سے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی نگاہیں مجھے اپنے جسم میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”بتائیں جناب۔“ میں نے بے چین ہو کر کہا۔

”ہاں ہے، لیکن تمہارا کیا لینا دینا۔“

”ہم پولیو کے قطرے پلانے آئے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”نہیں، نہیں۔ ہم یہ حرام کام نہیں کرتے۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”پولیو کے قطرے پلانا ناجائز ہے۔“

”اچھا۔“ میں تپ کر رہ گئی۔ ”پولیو کے قطرے پلانا ناجائز ہے اور اس طرح گھور گھور کر کسی لڑکی کو دیکھنا تمہارے لیے جائز ہے کیوں؟“

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر لیا۔

”اماں، یہ کیسا آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔

”چھوڑ دو بیٹا، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ویسے یہ خود بھی اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔ چلو یہاں سے۔“ اور ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

نہ جانے یہ کیسی جہالت تھی۔ کیا نظریہ تھا؟ کس نے کہہ دیا تھا کہ قطرے پلانا ناجائز ہے۔ خدا جانے ہم ذہنی طور پر اتنے پس ماندہ کیوں ہوتے جا رہے تھے۔

واپس آکر میں ڈاکٹر صادق سے الجھ گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب، یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس شخص کے گھر میں اگر کوئی بچہ ہے اور اس کو قطرے نہیں پلائے گئے تو اس کا کیا مستقبل ہوگا۔“

”یہ بہت افسوس کی بات ہے بیٹا۔“ ڈاکٹر صاحب شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ”لیکن کیا کیا جائے۔ بدقسمتی ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔“

”ایسے لوگوں کے لیے تو باقاعدہ قانون سازی کرنی چاہیے کہ جو جان بوجھ کر اپنی پوری نسل کو برباد کر دینا چاہتے ہیں۔“

”کون بنائے گا قانون؟ بیٹا، تم ان گنتی کے افراد پر مت جاؤ۔ یہ اچھی بات ہے کہ اس ملک کے نوے فیصد لوگ اس مہم میں ہمارے ساتھ مکمل تعاون کر رہے ہیں۔“

دوسرے دن بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی ڈیوٹی مکمل کرلی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے پیسے بھی مل گئے تھے۔ جس سے اچھا خاصا کام نکل آیا تھا۔

میں یہ بتا چکی ہوں کہ اس زمانے میں یہ تین سو روپے بھی بہت اہم اور قیمتی ہوا کرتے تھے۔

کئی برس گزر گئے۔

میری شادی ہوگئی۔ دو بچے بھی ہوگئے لیکن اماں نے ابھی تک اپنا کام نہیں چھوڑا تھا۔ میں اور میرے شوہر احتشام انہیں منع بھی کیا کرتے۔ ”اماں، اب آپ رہنے بھی دیں۔ کہاں تک محنت کریں گی۔“

اماں پہلے ہی کے انداز میں جواب دیا کرتیں۔ ”بیٹا، یہ کوئی کام نہیں ہے عبادت ہے۔ میں تو عبادت کر رہی ہوں۔“

میں نے اس زمانے میں ایک کالج میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ یعنی میں باقاعدہ لیکچرر ہوگئی تھی۔ میری بھی اچھی خاصی تنخواہ تھی اور احتشام کی بھی۔

گھر میں بھی سب کچھ تھا۔ لیکن اماں اس کے باوجود اس کام میں لگی رہتی تھیں۔ اب روزانہ کی بنیاد پر تین سو مل رہے تھے۔ یعنی مہینے میں دو ڈھائی ہزار روپے اماں کو مل جاتے۔

لیکن میں یہ دیکھا کرتی کہ اماں کو جو کچھ بھی ملتا تھا وہ ہم پر اور بچوں پر خرچ کر دیا کرتیں۔ میں ان سے کہا کرتی۔ ”اماں، آپ یہ سب کیوں کرتی ہیں؟ اس طرح خود آپ کے پاس کیا بچتا ہوگا۔“

”میرے پاس تم دونوں جو بچ جاتے ہو۔“ اماں مسکرا دیتیں۔ ”اور دیکھو، تم مجھے ثواب سے مت روکا کرو...... ثواب کما رہی ہوں جو اس کمائی سے بہت افضل ہے۔“

ایک دن اماں اپنی اسی مہم پر نکلی ہوئی تھیں۔

میں اور احتشام لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک سلائڈ چلنے لگی۔ ”پولیو کے قطرے پلانے والی خواتین پر حملہ۔ دو خواتین موقع پر جاں بحق۔“

”خدا خیر کرے۔“ میں نے گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔ ”اماں بھی تو اسی علاقے کی طرف گئی تھیں۔“

”نہیں، نہیں، تم پریشان مت ہو۔ میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں۔“

احتشام کے جانے کے بعد میں نے رو رو کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ یارب! میری اماں کو محفوظ رکھ۔ یارب وہ بہت نیک عورت ہیں۔ تو تو جانتا ہے مولا۔ ان کی حفاظت فرما۔“

احتشام تقریباً دو گھنٹوں کے بعد واپس آئے تو ان کا چہرہ یہ بتا رہا تھا کہ ان کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ انہوں نے آکر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“

اتنا اشارہ کافی تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ جس حال میں تھی اسی حال میں اٹھ کر ان کے ساتھ ہولی۔ گھر کے باہر محلے کے بہت سے لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔

احتشام اپنے ساتھ ایک ٹیکسی لیتے آئے تھے۔ احتشام نے محلے کی ایک خاتون کو بھی ساتھ لے لیا تھا جو میرے پڑوس ہی میں رہتی تھیں۔

وہ مجھے سارے راستے خود سے چپکائے نہ جانے کیا

کیا کہتی رہیں۔ لیکن مجھے ہوش کہاں تھا جو اُن کی باتوں پر دھیان دیتی۔

ہم سول ہاسپٹل آ گئے۔ یہاں امی کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ وہ ماں جس نے ساری زندگی نیکی اور ایمانداری کی تعلیم دی۔ جو پولیو کے قطرے پلانے کو عبادت سمجھا کرتی۔ جس کی خواہش تھی کہ اس ملک میں پولیو زدہ کوئی بچہ نہ دکھائی دے۔ اس عورت کو صرف اس جرم پر گولی مار دی گئی تھی کہ اس نے ایسی جرأت کیوں کی تھی۔

وہ شہید تھیں۔ انہوں نے ایک نیک مقصد کے لیے جان دی تھی۔ اس لیے ان کے چہرے پر بلا کا نور برس رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔ خدا نے کیسا رتبہ دیا تھا اُن کو۔

بہر حال ان کی تدفین کر دی گئی جس میں بہت سے لوگ شریک ہوئے تھے۔ محکمۂ صحت کی طرف سے بھی رسمی کلمات ادا کیے گئے تھے۔

اس کے بعد ان کی موت بھلا دی گئی۔

اس تیز رفتار زمانے میں بڑے بڑوں کی موت بھلا دی جاتی ہے۔ اماں بے چاری کی کیا حیثیت تھی۔ وہ تو ایک غریب سی ورکر تھیں۔

گھر گھر جا کر پولیو کے قطرے پلانے کا کام تھا ان کا۔ اور یہ کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا۔ اتنا اہم مرتبہ نہیں تھا کہ جس کو یاد رکھنے کی زحمت کی جاتی۔

ہاں اتنا ہوا کہ محکمے کی طرف سے تھوڑے سے پیسے مل گئے تھے۔ بس اس سے زیادہ اور کیا ہونا تھا۔ میرے شوہر احتشام کو بہت زیادہ دکھ تھا۔

وہ اس بات سے پریشان رہا کرتے کہ دنیا والے کیا سوچیں گے کہ ایک بوڑھی ساس کی کفالت بھی نہیں کر سکا ہوں۔ اور وہ بے چاری گھر گھر جا کر پولیو کے قطرے پلایا کرتی تھیں۔

میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی۔ ”آپ اس واقعے کو اپنے دل پر نہ لیں۔ اماں اس کام کو عبادت سمجھ کر کرتی تھیں، پیسوں کے لیے نہیں۔“

”یہ تو ہم دونوں جانتے ہیں نا۔ لیکن بولنے والے تو بولتے رہیں گے۔“

”بولنے دیں سب کو۔ آپ اپنا دیکھیں۔“ میں کہا کرتی۔ ”کیا آپ کا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔“

”ہاں ضمیر تو مطمئن ہے لیکن...“

”پھر بھول جائیں سب کو، خود کو سنبھالیں۔ ورنہ مجھے بھی کہیں گے کہ کیسی بیٹی تھی جو ماں کو گھر بٹھا کر خود سے بھی معذور تھی۔“

کئی دنوں کے بعد میں نے یہ خبر پڑھی کہ پولیو ورکرز نے ان علاقوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ خود تو اس مشن کو جاری رکھنا چاہتی ہیں لیکن گھر والے اجازت نہیں دیتے۔

میں اور احتشام اکثر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ اس دوران ٹی وی کے کئی چینلو پر ایک گاؤں سے متعلق شارٹ فلم بھی کئی بار دکھائی گئی۔

پاکستان ہی میں ایک ایسا علاقہ بھی ہے جہاں کے رہنے والوں نے اس طرح پولیو کے قطرے اپنے بچوں کو پلوانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے کے بے شمار بچے پولیو زدہ ہو گئے تھے۔ ان بچوں کے انٹرویوز بھی آیا کرتے۔

احتشام بہت دکھ سے کہا کرتے۔ ”خود سوچو، والدین کی کم علمی اور غلط فہمیوں نے ان بچوں کا کیا حال کر دیا ہے۔ اب یہ بے چارے کیا کریں گے۔“

”آخر ہمارے ملک میں یہ سب کب تک چلتا رہے گا؟“

”جب تک پوری طرح تعلیم اور روشن خیالی نہ آ جائے۔“

”تم کیا سمجھتی ہو کہ ان علاقوں کے لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں جایا کرتے۔“

”بالکل جاتے ہیں لیکن ڈگری یافتہ ہونے اور تعلیم یافتہ ہونے میں بہت فرق ہوا کرتا ہے۔ ہم میں سے اکثر صرف ڈگری یافتہ ہیں۔ ہم تعلیم یافتہ نہیں ہو سکے ہیں۔“

میں جس کالج میں پڑھایا کرتی تھی، اس میں مخلوط تعلیم تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ہی پڑھا کرتے۔ شہر کے باوقار اور اچھے کالجز میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

مجھے اس بات پر فخر اور خوشی تھی کہ میرا تعلق بھی اس کالج سے ہے۔

اس زمانے میں نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا تھا۔ کالج میں نئے نئے داخلے ہو رہے تھے۔ اور جب نیا سیشن شروع ہوا تو میں نے ایک لڑکے کو دیکھا جو بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔

وہ ایک خوش شکل لڑکا تھا۔ اس کے چہرے پر نمایاں

تھا کہ وہ بیساکھی پر چلنے کے باوجود زندگی کی دوڑ میں حصہ لے کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

وہ میری ہی کلاس میں آیا تھا۔ اس کا نام ہمایوں تھا۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔ ”ہمایوں یہ کیا ہوا تھا تمہیں؟“

”پولیو ہو گیا تھا میڈم۔“ اس نے بتایا۔ ”میرے والدین نے شروع میں توجہ نہیں دی۔ اسی لیے میرا یہ حال ہو گیا۔“

”کیا تمہیں قطرے نہیں پلائے گئے تھے۔“

”نہیں میڈم، ہمارے علاقے میں قطروں کے خلاف بہت پراپیگنڈا کیا گیا تھا۔ اس لیے والدین نے قطرے نہیں پلوائے۔“

پھر اس نے بتایا کہ اس کا تعلق ملک کے کس علاقے سے ہے۔

”ہمایوں یہ تو بہت برا ہوا۔“ میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

”میڈم، اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تو اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میڈم، جب میں بچہ تھا۔ اس وقت تو مجھے زیادہ احساس نہیں تھا۔ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر چل پھر لیا کرتا۔ گاؤں کے کچھ اور بچے بھی ایسے تھے۔ میں یہ سنتا آیا تھا کہ اس گاؤں میں ایسی کوئی بیماری پھوٹ پڑی تھی جس کی وجہ سے ایسا حال ہو گیا۔“

”یہ بہت ہی غلط تصور تھا۔“

”ہاں میڈم۔“ اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ ”میں اسی کی سزا تو برداشت کر رہا ہوں۔ جب کچھ بڑا ہوا اور تھوڑا شعور آیا تو احساس ہوا کہ بیماری تو واقعی قدرت کی طرف سے ہوتی ہے۔ لیکن قدرت ساتھ ہی اس کا علاج بھی تجویز کر دیتی ہے۔ وہ اتنی بے رحم نہیں ہے کہ انسانوں کو بس یوں ہی چھوڑ دے۔ غلطی خود ہماری اپنی ہوتی ہے کہ ہم فائدہ نہیں اٹھاتے۔ احتیاط نہیں کرتے۔ علاج نہیں کراتے۔ اور جب تکلیف ہوتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی یہی مرضی ہے۔“

”یہی تو غلط ہے۔ خدا ایسا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”خدا کو اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ وہ تمہیں بیساکھی پر چلائے۔ یہ تو فرسودہ اور جاہلانہ تصور کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”جی میڈم، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اسی بات پر والدین سے میرا جھگڑا ہو گیا اور میں میٹرک کرنے کے بعد شہر آ گیا۔“

”کیا یہاں تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟“

”جی میڈم، ایک چاچا ہیں۔ وہ بہت پہلے شہر آ گئے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ ایک روشن خیال اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ میں ان ہی کے یہاں رہتا ہوں۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھوں۔“

”شکر ادا کرو کہ تم صحیح جگہ آ چکے ہو۔“

”جی ہاں میڈم۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”میں ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

میں نے جب احتشام کو یہ بتایا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ”وہ لڑکا اس لحاظ سے خوش نصیب ہے کہ اس کو سہارا دینے والا ایک گھر مل گیا۔ ورنہ اس قسم کے افراد تو سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر نظر آیا کرتے ہیں۔ زمانے کی ٹھوکروں میں ہوتے ہیں۔“

ہمایوں کو میں دیکھا کرتی۔ وہ دوسرے بچوں سے زیادہ ذہین تھا۔ محنت بھی بہت کیا کرتا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس کے دل میں واقعی آگ لگی ہوئی ہے۔ اور وہ اپنی اس کمزوری کے باوجود آگے بہت آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

میں اور احتشام اکثر اس کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔ ایک بار میں نے ہمایوں کو اپنے گھر پر بھی مدعو کیا تھا۔ اس لیے احتشام بھی اسے جان گئے تھے۔

احتشام اس کے لیے کہا کرتے۔ ”تم دیکھ لینا، یہ لڑکا بہت آگے جائے گا۔ یہ ایک بڑا انسان ہے۔“

اس نے انٹر کا امتحان بہت آسانی اور شاندار انداز میں پاس کر لیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”میڈم، میں پڑھائی چھوڑ رہا ہوں۔“

”پڑھائی چھوڑ رہے ہو۔ وہ کیوں؟“

”میڈم میں تعلیم کا سلسلہ تو ہمیشہ جاری رکھوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”علم تو میری زندگی ہے میڈم۔ میں اس کے بغیر تو زندہ نہیں رہ سکتا لیکن ریگولر نہیں ہو سکوں گا۔ پرائیویٹ امتحان دے دیا کروں گا۔“

”لیکن کیوں، اس کی کیا وجہ ہے۔ تم نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا؟“

”اس کی دو وجوہات ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”پہلی وجہ یہ ہے کہ چاچا مجھے محلے میں ایک دکان کھول کر دے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تجارت بہت اچھی چیز ہے۔ خدا اس

میں بہت برکت دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں دکان کو سنبھالتے ہوئے بھی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہوں۔ کم از کم پرائیویٹ تو بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

"تمہارے چاچا کی سوچ بری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہیں اپنے سبجیکٹس بدلنے ہوں گے۔"

"جی میڈم، وہ تو بدل ہی لوں گا۔"

"اور دوسری کیا وجہ ہے۔"

"دوسری وجہ یہ ہے میڈم کہ چاچا میری شادی اپنی بیٹی سے کر رہے ہیں اور اس کی دیکھ بھال کے لیے مجھے محلے کی دکان ہی پر رہنا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟ کس قسم کی دیکھ بھال۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اپنی عقل سے اندھی ہے میڈم۔" ہمایوں نے بتایا۔

"اوہ، یہ سن کر تو بہت دکھ ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ عقل سے اندھی ہونے کا کیا مطلب ہوا؟"

"بات اس کے نابینا ہونے کی نہیں ہے میڈم۔ بلکہ وہ ایک نمبر کی زبان دراز اور ضدی بھی ہے۔ چاچا اور چاچی نے اس کی عادتیں بگاڑ کر رکھ دی ہیں۔ وہ کسی کی کوئی بات مانتی ہی نہیں ہے۔ نہ جانے اس کے کتنے رشتے آئے۔ لیکن حرکتیں دیکھ کر ختم ہو گئے۔ کوئی بھی اسے اپنانے کو تیار نہیں ہے لیکن میری بات اور ہے میڈم۔ ایک تو مجھ پر ان کے احسانات ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ایک پولیو زدہ نوجوان ہوں میڈم! اور میرے اس پولیو کا پورا کریڈٹ میرے والدین کو جاتا ہے۔"

اس کے لیے میرا دل دکھ کر رہ گیا۔ اس نے جب کہا کہ میں ایک پولیو زدہ نوجوان ہوں تو کتنی بے بسی اور کتنا دکھ تھا اس کے لہجے میں۔

گھر واپس آکر میں بہت دیر تک ہمایوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ آخر یہ کیسا دستور تھا.... کسی کی سزا کسی اور کو کیوں مل رہی تھی۔

اس کے والدین نے اسے پولیو زدہ رکھا تھا۔ اسی لیے انہیں معذور ہو جانا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کہ وہ کتنا بڑا جرم اور گناہ کر گزرے ہیں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ شاید ہی انہیں اس بات کا احساس ہو..... ایسے لوگ اپنے نظریات پر پورے کٹر ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں روشنی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ کچھ اور، کسی اور طرف سوچنا ہی نہیں چاہتے۔ سوچ کر مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ خدا کی یہی مرضی تھی۔ جبکہ خدا کی ایسی مرضی ہرگز ہرگز نہیں ہوتی۔

بہرحال ہمایوں نے کالج چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے اس کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ لیکن وہ اپنی باتوں سے مجھے ایک راستے پر لگا گیا تھا۔

دو چار مہینوں کے بعد پھر پولیو سے بچاؤ کی مہم شروع ہوئی تو میں نے احتشام سے کہا۔ "احتشام، میں پولیو مہم میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" احتشام میری یہ بات سن کر حیران رہ گئے تھے۔

"ہاں، میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اس بار اس مہم میں ضرور شریک ہوں گی۔ میں اپنی مرحوم ماں کی روایت کو آگے بڑھانا چاہتی ہوں۔"

"لیکن کیوں، تم نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کر لیا؟"

"اس لیے کہ میں اس معاشرے میں کسی اور ایسے ہمایوں کو نہیں دیکھنا چاہتی، جو اپنی معذوری کی وجہ سے کسی پر بوجھ بن جائے۔ اور کسی کے احسان تلے دب کر اپنا مستقبل تباہ کر بیٹھے۔ میں اس پاک وطن کو ہمایوں جیسوں سے پاک دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اپنی ماں کی...... طرح خود بھی اس عبادت کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔"

"سوچ لو، آنٹی کے ساتھ کیا ہوا؟"

"موت تو ایک دن آنی ہی ہے احتشام۔" میں نے کہا۔ "چاہے کسی عنوان سے آئے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح کی موت شہادتِ عظیم ہوتی ہوگی۔ جس طرح اماں کی موت ہوئی تھی۔"

احتشام نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔

میں اب کئی برسوں سے اس مہم کا حصہ بنی ہوئی ہوں۔ میں ایک پڑھی لکھی عورت ہوں۔ اس کے باوجود گھر گھر جا کر یہ ثواب حاصل کر رہی ہوں۔

ابھی تک تو سب خیریت ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی دن میرے نام کی کوئی گولی بھی میری طرف آجائے۔ اس لیے اپنے پڑھنے والوں سے صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ جب کوئی عورت پولیو کے قطرے پلانے کے لیے آپ کے دروازے پر دستک دے تو اس کے ساتھ کم از کم نرمی کا سلوک ضرور کریں۔ □

قاتل جذبے

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
مردوں کے اس معاشرے میں عورتوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کیسے کیسے ہتھ کنڈے اپنائے جاتے ہیں اس کا ادراک ہر ذی شعور عورت کو ہوگا پھر بھی میں مردوں کے وہ تمام پینترے آپ کے سامنے لا رہی ہوں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بھی میں ہوں۔ امید ہے قارئین کو بھی یہ آپ بیتی پسند آئے گی۔

مہر نائلہ
(سیالکوٹ)

میری بیٹی ناظمہ کے طور طریقے کچھ دنوں سے بہت مختلف ہو رہے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے آتے ہی اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔

یا پھر مجھ سے دور جا کر کسی سے موبائل پر باتیں کیا کرتی۔ اس قسم کے آثار آپ اپنا اعلان ہوا کرتے ہیں۔ میں نے ایک دو بار اسے کریدنے کی کوشش کی لیکن اس نے صاف کہہ دیا۔ "نہیں امی، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس یوں ہی۔"

"میری جان، تمہارا جو رویہ آج کل ہو رہا ہے، وہ بس یوں ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

ناظمہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ چاہے کچھ بھی کہے، مجھے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ جذباتی، بہک جانے والی۔ کسی کی باتوں میں آکر اپنا آپ گنوا دینے والی۔

ویسے ناظمہ ہر لحاظ سے ایک فرماں بردار لڑکی رہی ہے۔ میں نے اس میں کبھی کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ وہ بات ماننے والی اور باحیا قسم کی لڑکی ہے۔

اس کے پاس تو موبائل ہی نہیں ہوا کرتا تھا۔ پچھلے سال گرمی پر اس کے ابو نے اسے موبائل سیٹ لاکر دیا تھا۔ میں نے مخالفت کی تو ہنس کر کہنے لگے۔ "جانے دو۔ پریشان مت ہو۔ میری ناظمہ دوسروں سے بہت الگ ہے۔ وہ کبھی ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گی۔"

لیکن انہیں کیا معلوم کہ ان کی ناظمہ نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا منصوبہ تیار کرلیا ہے۔ نہ جانے کون اسے اپنی راہ پر لانے کی کوشش کررہا ہے۔

بہرحال میں اس کے انکار پر خاموش بیٹھ جانے والی تو نہیں تھی۔ اس لیے میں نے چوری چوری اس کی نگرانی شروع کروادی۔

اس کے لیے میں نے اپنے بھائی یعنی ناظمہ کے ماموں کی مدد لی تھی۔ اس نے دو چار دنوں کے بعد آکر رپورٹ دی۔ "آپا، تمہارا اندیشہ صحیح نکلا۔ ناظمہ کسی آدمی کے چکر میں پڑگئی ہے۔"

"آدمی کے؟" میں نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں آپا آدمی۔" فرخ نے اپنی بات پر زور دیا۔ "میں اسے نوجوان یا لڑکا تو نہیں کہوں گا۔ وہ اچھی خاصی عمر کا ہے۔ ناظمہ سے کہیں بڑا۔"

"تم نے کیا دیکھا۔"

"میں نے ناظمہ کو کئی بار اس کی گاڑی میں بیٹھ کر کسی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

میرے لیے بس اتنا کافی تھا۔ میں نے بھی اس رات ناظمہ کو اس کے کمرے میں اس وقت پکڑلیا جب وہ موبائل پر بات کررہی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا تھا۔ "کمینی تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہاری یہ حرکتیں چھپی رہیں گی۔"

"امی... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، موبائل دیں مجھے"

"خاموش...!" میں نے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "اب یہ موبائل کبھی نہیں ملے گا۔ چوری اور سینہ زوری کررہی ہے۔ بتا کون ہے وہ؟"

"کون؟ آپ کس کے لیے پوچھ رہی ہیں۔"

"وہی، جس کے ساتھ تو اس کی گاڑی میں بیٹھ کر [illegible] کرتی ہے۔" میں نے کہا۔

ناظمہ اب بالکل چپ ہوگئی۔

"بتا، بتاتی کیوں نہیں ہے، کون ہے وہ؟"

"آپ اپنے غصے پر قابو پائیں اور اطمینان سے میری بات سن لیں تو پھر میں بتادوں گی۔"

"چل بتا۔" میں بستر پر بیٹھ گئی۔

"امی۔" اس نے میرے برابر بیٹھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں کبھی آپ کو دھوکا دے سکتی ہوں، یا آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتی ہوں۔ بتائیں، [illegible] میں آپ کی اور ابو کی عزت کی دھجیاں اڑا سکتی ہوں۔"

"جب یہ سب نہیں کرسکتی تو پھر کیا سلسلہ ہے۔"

"امی اس آدمی کا نام خاور ہے۔" اس نے بتایا۔

"کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"امی، وہ ایک انتہائی سلجھا ہوا پڑھا لکھا اور مہذب انسان ہے۔" ناظمہ نے بتایا۔

"آخر وہ ہے کون؟ جس کی تو اتنی تعریف کیے جارہی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"امی، صرف ایک بار۔ صرف ایک بار آپ اس سے مل لیں۔" ناظمہ نے کہا۔ "آپ خود اس بات کو تسلیم کرلیں گی کہ خاور کتنے اچھے آدمی ہیں۔"

"کیا اچھا آدمی ہے کہ ہر روز تیرے ساتھ تفریح کرتا پھرتا ہے۔ اگر وہ اتنا ہی سنجیدہ ہے تو سیدھا سیدھا رشتہ لے کر کیوں نہیں آجاتا۔"

"بہت سی باتیں ہیں امی...." اس نے کہا۔ "وہ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے آپ لوگ اس کے حق میں ہوجائیں۔ پھر وہ باقاعدہ رشتہ لے کر آجائیں گے۔"

میں کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑگئی۔

ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ ناظمہ بڑی ہوچکی تھی۔ وہ باشعور بھی تھی۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا قدم اٹھایا ہوگا۔ اور ویسے بھی آج کل کی نسل کے ساتھ سختی نہیں برتنی چاہیے۔ ان کے مزاج میں بغاوت کا عنصر ہوجاتا ہے۔ ایک بار اس شخص سے مل ہی لینا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم مجھے اس سے ملوادو۔"

ناظمہ ایک دم سے خوش ہوگئی۔ "امی، میں خاور کو کب لے کر آؤں۔"

"یہاں نہیں۔" میں نے منع کردیا۔ "پہلے میں خود ملاقات کروں گی۔ اس کے بعد تمہارے ابو سے ملاقات کرواؤں گی۔ ویسے یہ شخص کرتا کیا ہے۔"

"امی، آپ نے ان کا نام ضرور سن رکھا ہوگا۔ خاور حیات۔ بہت بڑے رائٹر ہیں۔ بہت مشہور آدمی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔"

"ہاں، یاد آگیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم سے کیسے ملاقات ہوگئی تھی۔"

"امی، ایک بار خاور صاحب مہمانِ خصوصی بن کر یونیورسٹی آئے تھے۔" ناظمہ نے بتایا۔ "اس کے بعد ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔"

"تم اس شخص کو ریالٹو ہوٹل میں بلوالینا۔"

ریالٹو وہ ہوٹل تھا جہاں میں اور ناظمہ کے ابو اکثر جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ناظمہ بھی ہمارے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اس لیے میں جانتی تھی کہ وہاں کا ماحول بہت پُرسکون ہے۔

"میری پیاری امی۔" ناظمہ لاڈ کرتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ "آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت گریٹ۔ میں کل ہی خاور صاحب سے آپ کی ملاقات کی بات کروں گی۔"

میں بوجھل قدموں اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

یہ کیسی بات ہوتی ہے۔ اولاد کو والدین سینے سے لگا کر پرورش کرتے ہیں۔ اس کے ہر دکھ درد کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور جب زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے کا وقت آتا ہے تو اولاد یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کرلیتی ہے۔

میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں فی الحال اس معاملے پر ناظمہ کے ابو کو کچھ نہیں بتاؤں گی جب تک خاور سے خود نہ ملاقات کرلوں۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ ناظمہ کا فیصلہ درست ہو۔ وہ چونکہ خود باشعور لڑکی تھی۔ اس لیے ہوسکتا تھا کہ اس نے انتخاب بھی درست کیا ہو۔

اب آنے والے دن کا انتظار تھا اور دیکھنا تھا کہ خاور کیسا آدمی ہے۔

میں اور ناظمہ مقرر وقت پر ریالٹو پہنچ گئے تھے۔ اس دوران ہمارے درمیان اس موضوع پر پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ ناظمہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔

ہم ہوٹل میں جاکر بیٹھے ہی تھے کہ خاور آگیا۔ اس شخص کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی تھی۔ وہ تو اچھی خاصی عمر کا تھا۔ میری ناظمہ سے کم از کم پندرہ سولہ برس زیادہ۔ چہرے پر بے پناہ سختی اور آدھے جھڑے ہوئے بال۔

میں تو اسے دیکھ کر پریشان ہی ہوگئی۔ ناظمہ کو کیا سوجھ گئی تھی۔ وہ مجھے بہت ادب کے ساتھ سلام کرکے اپنی گردن جھکا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اکیس سال کا شرمیلا نوجوان ہو۔

اب میں اس سے کیا بات کرتی۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ناظمہ ہی نے مجھے مخاطب کیا۔ "امی، یہی ہیں خاور حیات صاحب۔ آپ ان سے ملنا چاہتی تھیں نا۔"

"ہاں۔" میں نے اپنے آپ کو سمیٹ کر خاور کی طرف دیکھا۔ "خاور صاحب، کچھ اپنے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں۔"

"امی، میں آپ کو بتا تو چکی ہوں کہ خاور صاحب بہت مشہور رائٹر ہیں۔" ناظمہ نے کہا۔

"میں تم سے نہیں پوچھ رہی۔" میں جلدی سے بولی۔ "خاور صاحب سے بات کررہی ہوں۔"

"دیکھیں، میرا بیک گراؤنڈ یہ ہے کہ میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں۔" خاور نے بتانا شروع کیا۔ "اس معاشرے میں میری اپنی ایک حیثیت ہے۔ میری آمدنی اچھی خاصی ہے۔ کتابوں کی رائلٹی مل جاتی ہے۔ ٹی وی کے ڈراموں سے انکم ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ......"

"میں یہ سب نہیں پوچھ رہی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے یہ بتائیں، کیا اب تک آپ کی شادی نہیں ہوئی۔"

"نہیں تو، میری شادی تو ہوچکی ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "کیا ناظمہ نے آپ کو یہ نہیں بتایا۔"

"امی، میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئی تھی۔"

ناظمہ نے کہا۔ ”خاور حیات صاحب کی وائف ہیں۔ لیکن......“

”میں سمجھ گئی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہ اپنی بیوی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔“

”جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے۔“ خاور نے کہا۔

☆☆☆

میں اب سے کئی برسوں پیچھے چلی گئی تھی۔

ندیم نام تھا اس کا۔ خوبصورت آنکھیں، الجھے ہوئے بال۔ مہذب انداز اور دل کش گفتگو۔ بس ایک کمی یہ رہ گئی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ پولیو زدہ تھی۔ اس لیے وہ بیساکھی کے سہارے چلا کرتا۔ اس کے علاوہ اس میں اور کوئی کمی نہیں تھی۔

وہ میری بڑی بہن کا پھوپی زاد دیور تھا۔ شادی کی ایک مخلوط تقریب میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میری شادی.... نہیں ہوئی تھی، میں کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی، جبکہ آپا کی شادی دو برس پہلے ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شادی کی تقریبات جلدی شروع ہو کر جلدی ختم ہو جاتی تھیں اور مخلوط بھی نہیں ہوا کرتی تھیں۔

خواتین اور مردوں کے لیے الگ الگ انتظامات کیے جاتے تھے لیکن شادی کی اس تقریب میں سب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ کیونکہ زیادہ تر خاندان کے لوگ تھے۔

میں نے اسی تقریب میں ندیم کو دیکھا۔ وہ ان ہنگاموں سے الگ تھلگ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

میں نے آپا سے اس کے بارے میں پوچھا۔ ”آپا، وہ کون ہے جو بے چارہ سب سے الگ بیٹھا ہوا ہے۔“

”ارے تو اسے نہیں جانتی۔ وہ باسط کا پھوپی زاد ندیم ہے۔“ آپا نے بتایا۔ باسط میرے بہنوئی یعنی آپا کے شوہر کا نام تھا۔

”لیکن میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔“

”ہاں، وہ بے چارہ بہت کم کسی تقریب میں شرکت کرتا ہے۔“ آپا نے بتایا۔ ”بے چارہ بیساکھی سے چلتا ہے نا۔“

”بیساکھی سے؟“

”ہاں، اس کی ایک ٹانگ خراب ہے ویسے بہت پڑھا لکھا اور زندہ دل انسان ہے۔“ آپا نے بتایا۔ ”میں تجھے اس سے ملواتی ہوں۔“

آپا مجھے ندیم کے سامنے لے آئی۔

”ندیم، یہ میری چھوٹی بہن نائلہ ہے۔“ آپا نے میرا تعارف کروایا۔

”اوہ۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”پہلے ملاقات نہیں ہوئی۔“

اسی دوران کسی نے شاید آپا کو آواز دی۔ وہ اس طرف چلی گئیں جبکہ میں ندیم کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ واقعی بہت پڑھا لکھا اور باذوق انسان تھا۔ اس کی باتیں بھی بہت شگفتہ تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہو جاتا ہے۔ کچھ سوچنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کہیں گم ہو گیا ہو۔ مجھ سے جب برداشت نہیں ہوا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔ ”ندیم صاحب، یہ آپ باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی پرابلم ہے آپ کے ساتھ؟“

”نائلہ کیا یہ پرابلم نہیں ہے کہ میں ایک ادھورا انسان ہوں۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔ ”میں صحت مند انسانوں کی طرح چل پھر نہیں سکتا۔“

”اس سے کیا ہوا۔ اس سے آپ کی شخصیت میں کیا کمی ہو گئی ہے؟“

”یہ کمی نہیں تو اور کیا ہے۔“ اس کے لہجے میں تلخی بھی تھی اور دکھ بھی تھا۔ ”میں عام انسانوں کی طرح زندگی کی بھاگ دوڑ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ جس جگہ جاتا ہوں ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا ہوں اور....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

مجھے اس کی باتوں سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ اسی لیے اس کے خاموش ہو جانے پر پوچھ بیٹھی۔ ”آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ اور کیا کہنا چاہتے تھے۔“

”جانے دو نائلہ، یہ ایک تکلیف دہ موضوع ہے۔“

”نہیں بتائیں تو سہی۔“

”اپنی اس کمزوری نے مجھے دنیا کی سب سے اچھی خوشی سے محروم کر رکھا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور جانتی ہو وہ خوشی کیا ہو سکتی ہے۔ محبت کی، چاہت کی۔ کیا میرا حق نہیں ہے کہ میں کسی کا ہاتھ تھامے ساحل پر چہل قدمی کروں۔ کسی کے ساتھ واک کرتا رہوں۔ کسی کی مسکراہٹیں میرے لیے ہوں۔ لیکن کون آئے گا میری طرف۔ ایک لنگڑے کا مذاق تو اُڑایا جا سکتا ہے لیکن اس سے پیار نہیں کیا جا سکتا۔“

بولتے بولتے اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ بہرحال میں بہت بوجھل ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔

اس کے بعد مجھے اس کا دھیان رہنے لگا تھا۔ میں نے کئی بار اس کے بارے میں سوچا۔ اس کی بے بسی جب یاد آتی تو خود بھی اداس ہو کر رہ جاتی۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے کسی بہانے آپا سے اس کا موبائل نمبر بھی حاصل کر لیا۔ اس کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی دفتر میں ایک اچھے عہدے پر کام بھی کرتا ہے۔

اس نے تعلیم بھی اچھی حاصل کی تھی۔ اس لیے جاب کے سلسلے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کی تنہائی اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

میں نے ایک دن جب اس کے نمبر پر اس کو فون کیا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ ”نائلہ! یہ تم ہو۔ تم نے مجھے فون کیا ہے؟“

”ہاں، کیا مجھے فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”یقین کریں۔“ میں ہنس کر بولی۔ پھر سوچتی رہی کہ اب اس سے آگے میں اس سے کیا بات کروں۔

”کیا بات ہے نائلہ، اتنی خوشی دے کر اچانک خاموش کیوں ہو گئیں ہیں؟“

”کیا میرے فون کرنے سے آپ کو خوشی ملی ہے!“ میں نے پوچھا۔

”کاش تم قریب ہوتیں تو خود اندازہ کر لیتیں۔“ اس نے کہا۔ ”زندگی میں پہلی بار یہ سب ہوا ہے میرے ساتھ۔ ورنہ میں تو ایک نظر انداز کیے جانے والا ادھورا انسان ہوں۔“

اس کی اس بات نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ ”نہیں ندیم، آپ کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ اچھا یہ بتائیں، ہماری ملاقات کب ہو رہی ہے؟“

”کیا واقعی مجھ سے پھر ملنا چاہتی ہو۔“

”کیوں بچوں جیسی بات کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے آپ سے ملنا ہے بس۔ ایک بار نہیں، بلکہ بار بار۔“

”چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میں اپنے فلیٹ میں بلانے کی جرأت کر سکتا ہوں۔“

”کیوں نہیں۔ آپ ایڈریس بتا دیں، میں کسی دن آ جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

اس نے ایڈریس بتا دیا۔ میں دوسری ہی شام کو اس کے پاس پہنچ گئی۔ بہت سلیقے سے سجا ہوا فلیٹ تھا اس کا۔ اس دن پتا چلا کہ وہ ایک اکیلا انسان ہے۔ اس کے فلیٹ میں ایک ملازمہ آ کر سارا کام کر جایا کرتی ہے۔ اس کے رشتے دار گرچہ اسی شہر میں تھے لیکن وہ اس کی طرف بہت کم توجہ دیتے۔

”کون پوچھتا ہے۔“ اس کے لہجے میں پھر تلخی تھی۔ ”ایک ادھورے انسان کو تو اس کے رشتے دار بھی دیکھ دیکھ کر شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے کوئی میری طرف نہیں آتا۔“

”ارے اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ایسا ہونے میں آپ کا اپنا تو کوئی قصور نہیں ہے۔“

”اب یہ بات کون سمجھائے! اور کس کس کو سمجھائے۔ تمہاری مہربانی کہ تم مجھ پر اتنی توجہ دے رہی ہو۔“

وہ میرا پہلا دن تھا۔

شروع شروع میں مجھے اس سے ہمدردی ہوئی تھی۔ بہت گہری ہمدردی۔ پھر یہ گہری ہمدردی گہری محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس شخص سے شادی کروں گی۔ چاہے اس کے لیے پورے خاندان کی مخالفت ہی کیوں نہ مول لینی پڑے۔

☆☆☆

ناظمہ میری بیٹی میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ میں اس کی بات مان لوں۔ خاور حیات سے اس کی شادی کرا دوں، جبکہ میں اس رشتے کے خلاف ہو رہی تھی۔

”امی، آخر آپ کو ہوا کیا ہے۔ آپ نے خاور میں کون سی خرابی دیکھ لی ہے۔“

”بیٹا خرابی اس میں نہیں ہے۔ خرابی تمہارے اس احمقانہ جذبے میں ہے۔ جس کی وجہ سے تم زندگی بھر پریشان رہو گی۔“ میں نے کہا۔

”امی آپ نہیں جانتیں کہ وہ کتنا ٹوٹا ہوا انسان ہے۔“

”تو کیا تم نے اس ٹوٹے ہوئے انسان کو جوڑنے کا ٹھیکا لے لیا ہے۔“

”آپ اتنی بے رحم تو نہیں تھیں۔“

''ہاں، میں بے رحم نہیں تھی لیکن بنادی گئی۔'' میں نے کہا۔ ''اور بیٹا لڑکیوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ بے رحم بن جائیں۔''

''نہیں امی، میں ایسی باتوں کو نہیں مانتی۔ خاور حیات بہت اچھے آدمی ہیں۔ آپ کو یہ ماننا پڑے گا۔''

☆☆☆

بہت پہلے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

میں بھی سینہ تان کر اپنی ماں کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔

میں نے جب انہیں یہ بتایا کہ میں نے ندیم کو اپنے لیے پسند کرلیا ہے تو وہ سکتے میں رہ گئی تھیں۔ پھر انہوں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے درشتی سے کہا۔ ''لڑکی! کیا تجھے احساس ہے کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں میں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''امی، میں ایک باشعور لڑکی ہوں۔ اپنا اچھا برا خوب سمجھ سکتی ہوں۔''

''اسی بات کا تو رونا ہے کہ تو نہیں سمجھ رہی ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''یہ تو دیکھ کہ تو اس آدمی سے شادی کرنا چاہ رہی ہے جو بے چارہ معذور ہے۔ تیری زندگی برباد ہوکر رہ جائے گی۔''

''امی۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ندیم بہت اچھا اور معقول انسان ہے۔'' میں ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ ''وہ ایک بڑی فرم میں ایک اچھے عہدے پر ہے۔ سب کچھ ہے اس کے پاس۔ بس ایک ہلکی سی خرابی تو ہے۔ کیا آپ کے خیال میں ایسی کمزوری والے کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''بے وقوف لڑکی! میں یہ بات ہی نہیں کر رہی۔ اسے بھی خوش ہونے کا حق ہے۔ میں تو تیرے جذبے کی بات کررہی ہوں۔ جس نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔''

اماں سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھیں اور میں ماننے کے لیے۔ امی کی بے پناہ مخالفت سے پریشان ہوکر میں نے جب ندیم سے بات کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا ہی ہوتا آیا ہے میرے ساتھ۔ میں انسان کہاں ہوں۔ والدین تو رشتوں کے لیے مکمل انسان تلاش کرتے ہیں۔ میں بے چارہ تو ادھورا ہوں۔''

اس کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے میں زندگی کے سفر میں اس کا ضرور ساتھ دوں گی۔

بس ایک آخری بار گھر والوں سے بات کرکے دیکھ لوں۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ خدا کو جب روشنی دکھانی ہوتی ہے تو وہ راستے پیدا کر ہی دیتا ہے۔ ایسے ایسے اسباب نکال لاتا ہے کہ حیرت ہونے لگتی ہے۔

میری ایک دوست ہوا کرتی تھی، شاہینہ۔

بہت دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ اور میں بھی اپنے چکروں میں اس پر دھیان نہیں دے سکی تھی۔ حالانکہ اس دوران واقعات بہت تیز رفتار ہوچکے تھے۔

ندیم سے ملاقات۔ اس سے تعلقات میں تیزی۔ میرا فیصلہ۔ گھر والوں کی مخالفت وغیرہ۔ یہ ساری کہانی اسے سنانی تھی۔ اب جب وہ اچانک مل گئی تو میں اسے لے کر ایک ہوٹل میں آگئی۔

''یار، تو کہاں غائب ہوگئی تھی۔ تجھے بہت سی باتیں بتانی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن تم سے ملاقات ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔''

''کوئی بہت خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں بہت خاص۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن پہلے تم بتاؤ۔''

''نہیں شاہی، پہلے تم بتاؤ۔''

''یار، میری کہانی تو بہت سیدھی سادی ہے۔ میں شادی کرنے جارہی ہوں۔''

''اوہو، مبارک ہو۔ کون ہے وہ خوش نصیب جس نے تم جیسی لڑکی کو موم کرلیا ہے۔''

''ہاں یار تم اسے موم ہوجانا ہی سمجھ لو۔'' اس نے کہا۔ ''اس کی ایک ٹانگ خراب ہے۔ بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ پڑھا لکھا انسان ہے۔''

میں چونک اٹھی تھی۔ ''اور نام کیا ہے اس بندے کا؟''

''ندیم۔'' اس نے بتایا۔ پھر جلدی سے بولی۔ ''ہاں یاد آیا۔ وہ تمہاری بہن کے شوہر کا پھوپی زاد ہے۔ تم نے یقیناً اسے دیکھا ہوگا۔ دیکھنا کیا ہے بلکہ جانتی بھی ہوگی۔''

میرا دل جیسے ڈوبنے سا لگا تھا۔ ''تم سے کہاں ملاقات ہوئی تھی اس کی؟'' میری آواز ڈوب رہی تھی۔

"تمہاری بہن کی شادی کے موقع پر۔" اس نے بتایا۔ "وہ اکیلا اکیلا سا انسان مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے دو چار باتیں کیں۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔"

وہ اپنی اور ندیم کی ملاقاتوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتی رہی لیکن میں کہاں سن رہی تھی۔ میں تو اپنے ہوش ہی میں نہیں تھی۔ وہ آدمی کیسا دھوکا دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ تم کیوں خاموش ہو گئی ہو؟" شاہینہ نے پوچھا۔

یہ ضروری تھا کہ میں شاہینہ کو بھی سب کچھ بتا دوں۔ تا کہ وہ محتاط ہو جائے۔ "شاہینہ۔" میں نے کہا۔ "کیا تم یقین کرو گی کہ میری کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں بھی جس شخص سے شادی کرنے جا رہی ہوں۔ اس کی بھی ایک ٹانگ کمزور ہے۔ اور وہ بیساکھی کے سہارے چلا کرتا ہے۔"

"ارے! تعجب ہے۔"

"اور وہ وہی ہے۔ میرے بہنوئی کا پھوپی زاد ندیم۔"

"کیا؟" شاہینہ پریشان ہو گئی تھی۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ ایک دھوکے باز اور مکار انسان ہے۔ تم ایسا کرو، تم اس سے جا کر ملو۔ اس وقت میں بھی وہاں آ جاؤں گی۔ پھر دونوں مل کر اسے بتا دیں گے کہ خدا نے ہمیں اس کی مکاری اور دھوکے سے بچا لیا ہے۔"

"نائلہ، اگر ایسا ہے تو پھر تو وہ اس قابل ہے کہ اسے جوتوں سے مارا جائے۔" شاہینہ نے کہا۔

"ہاں، ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔"

پھر ایسا ہی ہوا۔ خدا نے ہم دونوں کو اس شخص کے فریب سے بچا لیا تھا۔ نہ جانے اس کے کیا ارادے تھے۔ شاید وہ ہم دونوں ہی کو بے وقوف بنا کر ہم دونوں سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

لیکن کس طرح۔ وہ کم بخت دونوں کو کس طرح مینج کرتا۔ بہرحال یہ اس کا مسئلہ تھا۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں اس کی مکاری اور فریب سے بچ گئے تھے۔

پروگرام کے مطابق میں اس وقت اس شخص کے فلیٹ پہنچ گئی جب وہ میری دوست شاہینہ کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ ہم دونوں ہی اسے بھلا برا کہہ کر واپس آ گئے تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ جس نے عین وقت پر ہماری آنکھیں کھول دی تھیں اور اس کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اور اب برسوں کے بعد میری بیٹی ناظمہ بھی کسی جال میں پھنسنے جا رہی تھی۔

میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح میں نے اس شخص سے نجات حاصل کر لی تھی اس طرح ناظمہ کو بھی خاور حیات کے چنگل سے نکال لاؤں گی۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔

تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرانے جا رہی تھی اور میں نے تاریخ کو بدل دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

ناظمہ کی ایک سہیلی تھی، مہوش۔ بہت خوبصورت اور اسمارٹ سی۔ میری ناظمہ سے کہیں زیادہ خوبصورت اور ذہین۔ میں اس لڑکی کی خود اعتمادی دیکھ کر اکثر حیران رہ جاتی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس نے اس بے رحم مردانہ معاشرے میں جینے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔

میں نے ناظمہ کی لاعلمی میں اسے فون کیا۔ وہ اکثر ہمارے یہاں آیا کرتی۔ اس لیے مجھے اس کا فون نمبر بھی معلوم تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "مہوش بیٹی، تم سے ایک ضروری کام ہے۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ارے آنٹی، اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ آپ حکم کریں، بلکہ رہنے دیں میں خود آ رہی ہوں۔"

"نہیں، یہ ملاقات گھر پر نہیں کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہاں اس کے بارے میں ناظمہ کو بھی پتا نہ چلے۔"

"خیریت تو ہے آنٹی۔" وہ حیران رہ گئی تھی۔

"ہاں، تم ملو گی تو بتاؤں گی۔ بات کچھ ایسی ہے۔"

"تو پھر کہاں ملیں گی۔" اس نے پوچھا۔ "بلکہ ایسا کریں نا شام کو آ جائیں۔ گھر والے کسی تقریب میں جا رہے ہیں۔ میں اکیلی رہوں گی۔"

"یہ اور بھی اچھا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "میں آ رہی ہوں۔"

"میں جب اس کے پاس پہنچی تو وہ بہت بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ظاہر ہے اس کو بھی کرید ہی گی ہو گی کہ آنٹی اس سے کیا چاہ رہی ہیں۔"

چائے پی لینے کے بعد اس نے پوچھا۔ "جی آنٹی فرمائیں۔"

"بیٹا، یہ ایک ایسا کام ہے جس کو سن کر ہو سکتا ہے کہ تم کو بہت برا لگے۔ تم ناراض ہی ہو جاؤ۔ لیکن میں یہ ناظمہ کی بھلائی کے لیے کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا کوئی ایسا سیریس معاملہ ہے آنٹی؟"

"ہاں بہت سیریس۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "بیٹا تم کو ناظمہ کی بھلائی کے لیے ایک آدمی سے فلرٹ کرنا ہو گا۔"

"کیا!" وہ جیسے اچھل ہی پڑی تھی۔ "آنٹی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میری بات سنتی رہو بیٹا۔ ناظمہ ایک ایسے بندے کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جو اس کی عمر سے دوگنا ہے اور پہلے سے شادی شدہ ہے۔"

"واہ آنٹی واہ! آپ اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے مجھے قربانی کا بکرا بنا رہی ہیں۔"

"نہیں بیٹی، میں اس معاشرے کی ہر لڑکی کو خاور جیسے آدمی کے چنگل سے بچانا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تم پر کوئی آنچ آنے دوں گی؟ ہرگز نہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اس شخص کو اس کا مکروہ چہرہ دکھا کر ناظمہ کو اس کے چنگل سے نکال لاؤں اور تمہارے ذریعے یہ ثابت کر دوں کہ وہ ایک عیاش اور ہوس زدہ انسان ہے۔"

"سمجھ گئی آنٹی۔" مہوش نے اپنی گردن ہلا دی۔ "ناظمہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا!"

"بیٹا، اس میں سارا قصور ناظمہ کا بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بلکہ عورت کی مخصوص جبلّت کا ہے۔ کچھ لوگ اتنے چالاک اور ریاکار ہوتے ہیں کہ عورت ان کی باتوں میں آ کر اپنے آپ کو تباہ کروا دیتی ہے۔ یہ خاور حیات بھی ایسا ہی آدمی ہے۔ میں ناظمہ کے کہنے پر ایک بار اس سے مل بھی چکی ہوں اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس بدبخت نے کس طرح میری بیٹی کو اپنے جال میں الجھایا ہو گا۔"

"آپ بتائیں آنٹی، وہ کم بخت کہاں رہتا ہے۔ کیا کرتا ہے۔"

"وہ ایک مشہور رائٹر ہے۔" میں نے بتایا۔

"کیا نام بتایا تھا آپ نے؟"

"خاور حیات۔" میں نے بتایا۔

"ہاں یاد آیا۔ آپ نے پہلی بار بتایا تھا تو اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ تو اچھا خاصا مشہور آدمی ہے۔"

"اور اس مشہور آدمی نے ناظمہ کو اپنے جال میں الجھا رکھا ہے۔" میں نے بتایا۔

"بس آپ فکر نہ کریں آنٹی۔" اس نے کہا۔ "میں اس کے ہوش ٹھکانے لگا دوں گی۔"

☆☆☆

تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا تو دیا لیکن بہت بے رحم انداز میں۔

بہت مختلف طریقے سے شاید میں نے دیر کر دی تھی یا مہوش سے دیر ہو گئی تھی۔ بہرحال ایک صبح جب ناظمہ یونیورسٹی گئی تو دوپہر کو اس کا فون آ گیا۔ "امی، میں نے خاور حیات سے کورٹ میرج کر لی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو۔"

"یہ سچ ہے امی۔" اس نے کہا۔ "میں جانتی تھی کہ آپ تو کبھی یہ شادی نہیں ہونے دیں گی۔ کیونکہ نہ جانے کیوں آپ کو خاور حیات سے چڑ ہے، نفرت ہے۔ جبکہ میں نے اس سے محبت کی ہے — میرے لیے بس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ ہم دونوں خاموشی سے شادی کر لیں۔"

"ناظمہ تو خود سوچ کہ تو نے کیا کر دیا۔ کیا ایسا کرتے ہوئے اپنے ابو کا بھی خیال نہیں آیا۔ وہ دل کے مریض ہیں۔ جب انہیں یہ پتا چلے گا تو ان پر کیا گزرے گی؟ اس کا بھی نہیں سوچا تو نے۔" میں بری طرح رو رہی تھی۔ ریسیور میرے ہاتھ میں کانپنے لگا تھا۔

"امی، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔" اس نے کہا۔ "ابو سے میں خود آ کر معافی مانگ لوں گی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں وہ معاف کر دیں گے مجھے۔"

"نہیں بیٹا، اب نہیں۔" میں روتی ہوئی بولی۔ "تو نے جب اپنا راستہ الگ کر ہی لیا ہے تو پھر الگ ہی رکھ۔ اس گھر میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"امی میری بات سنیں۔"

لیکن میں نے اس کی بات نہیں سنی۔ لائن کاٹ دی تھی۔

میں دل تھام کر بیٹھ گئی۔ کیا کر دیا تھا اس بدبخت نے۔ اب میں کس طرح اپنے شوہر کا سامنا کروں گی۔ کتنے ارمان تھے ان کے دل میں کہ بیٹی کی شادی اس طرح کریں گے۔ اُس طرح کریں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ اور اب سب کچھ ہی غارت ہو کر رہ گیا تھا۔

بتانا تو تھا۔ ناظمہ کے آنے کا اب کوئی امکان نہیں

تھا۔ یا شاید کئی دنوں کے بعد آتی۔ اس لیے یہی بہتر تھا کہ میں ناظمہ کے ابو کو سب کچھ بتا ہی دوں۔

شام کے وقت جب انہوں نے آکر ناظمہ کے بارے میں پوچھا تو میں نے رکتے رکتے آہستہ آہستہ دبے لفظوں میں انہیں سب کچھ بتا دیا۔

وہ سکتے میں رہ گئے تھے۔ ان سے کچھ بھی نہیں بولا جا رہا تھا۔ وہ تو ویسے ہی دل کے مریض تھے۔ اس خبر کو سن کر وہ بالکل ہی دل تھام کر بیٹھ گئے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

وہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ ہاسپٹل لے جاتے جاتے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں ایک دم سے بوڑھی ہو گئی۔

شوہر کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر گھر اپنا نہیں ہوتا اور میرے پاس تعلیم نہیں ہوتی تو شاید بھوکی مر جاتی۔

ناظمہ کے علاوہ کوئی اولاد بھی نہیں تھی جو اس وقت سہارا دیتی۔ اس لیے ایک اسکول میں ملازمت کر لی۔ میں نے اس کے پہلے اور آخری فون کے بعد ناظمہ کی کوئی خبر نہیں سنی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ اس نے بہت برا کیا تھا۔ بہت برا۔

میں ماں تھی۔ اس لیے اس کی نافرمانیوں اور ایسی ضد کے باوجود اس کے لیے بددعا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا برا نہیں سوچ سکتی تھی۔

بس یہی کہہ سکتی تھی کہ وہ جہاں رہے خوش رہے۔ اور خدا کرے کہ وہ خاور حیات اس کی امیدوں اور اس کے یقین پر پورا اترے۔

شاید چھ سات ماہ گزر چکے تھے۔ شوہر کے غم اور ناظمہ کے دکھ میں اب آنسو بہانے کا یارا بھی نہیں رہا تھا۔ اسکول کی زندگی اور وہاں کی مصروفیت میں خود کو الجھا لیا تھا۔

ایک جیسی زندگی گزر رہی تھی۔

صبح اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کو واپس آکر گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی یا پھر کتابیں پڑھا کرتی۔ کبھی کبھی محلے کی کوئی عورت آنکلتی تو اس سے کچھ دیر باتیں کر لیتی۔ بس یہ تھی میری زندگی۔

ایک رات دس ساڑھے دس بجے کے قریب دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ کون آسکتا تھا۔ بہرحال جا کر دروازہ کھولا تو ناظمہ ایک سوٹ کیس لیے دروازے پر کھڑی تھی۔

ذرا سی دیر میں جیسے صدیاں گزر گئی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ میری دھڑکنیں جیسے رکنے لگی تھیں۔ کیا کروں اس کا۔ گلا گھونٹ دوں یا سینے سے لگا لوں۔

وہ اچانک میرے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس سے بھی کچھ نہیں کہا جا رہا تھا۔ بالآخر وہی ہوا جو ماں کا مقدر ہوا کرتا ہے۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ماں تھی، اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔

اس نے اپنا سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیا۔ بہت کر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کن حالات میں یہاں آئی ہوگی۔

"امی، ابو... ابو کہاں ہیں؟"

اب میں رو رہی تھی۔ اس بدبخت اولاد کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں نے جب یہ بتایا تو وہ اس طرح بلبلا کر روئی ہے کہ اسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔

ہمارے رونے دھونے کا یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا تھا۔ پھر جب اس نے سنبھالا لیا تو یہ خبر سنائی کہ خاور حیات نے اسے طلاق دے دی تھی تو وہ اب کسی اور لڑکی کو اپنے گھر میں لانا چاہتا تھا۔

ویسے تو یہ کہانی بہت طویل ہو سکتی تھی۔

لیکن بدقسمتی کے شب و روز تو ایک ہی جیسے ہوا کرتے ہیں۔ بس کبھی کبھی ہنس لیے۔ کبھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیں۔ اس کے علاوہ اور کیا رہ جاتا ہے۔

لیکن اس کہانی کے ذریعے میں دنیا بھر کی لڑکیوں کو یہ پیغام دینا چاہتی ہوں کہ خدا کے لیے اپنے اس جذبے کا گلا گھونٹ دیں جسے مامتا کا جذبہ کہتے ہیں۔ اسے صرف اپنی اولاد کے لیے مخصوص رکھیں۔

ہوتا یہی ہے کہ ہر مظلوم اور کمزور کو دیکھ کر عورت کا یہ جذبہ بے دار ہو جاتا ہے اور چالاک قسم کے مرد اپنی مظلومیت کا رونا رو کر پہلے ہمدردی کے جذبات جگاتے ہیں اور عورت کی مامتا کو بے دار کر کے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ جس طرح ندیم نے میرے ساتھ یا خاور حیات نے میری بیٹی کے ساتھ کیا تھا۔

خدا جانے اس وقت بھی کتنی لڑکیاں ہمدردی کے چکر میں آکر برباد ہو رہی ہوں گی۔

*

ازالہ

باجی عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں عرصے سے سرگزشت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ گزشتہ مارچ کے شمارے میں لاہور کے عمران صاحب کی آپ بیتی "انگارا" پڑھی تو حوصلہ ملا کہ میں بھی اپنے عزیز دوست عامر کی آپ بیتی تحریر کروں۔ اس نے اچھا کیا یا برا یہ تو صرف قارئین بتا سکتے ہیں۔ تحریر بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ اسے شائع ضرور کریں گے۔

محمد ظفر حسین
(مقام نامعلوم)

گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ جوبن پر تھی۔ بس اسٹاپ سے آفشین کے اپارٹمنٹ کا فاصلہ کچھ ہی دیر کا تھا مگر وسط رمضان میں روزے کی حالت میں یہ فاصلہ میلوں دور کا محسوس ہوا تھا، اگرچہ عصر کا وقت ہو چلا تھا پھر بھی دھوپ میں کافی شدت تھی تپش کی لہریں چھو رہی تھیں آفشین کا اپارٹمنٹ گلشن میں عین لب سڑک دفتر کے راستے میں تھا۔ اس لیے دفتر سے آتے ہوئے میں اتر گیا تھا اور اب اس کے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں عبور کر رہا تھا۔

بالآخر فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا اور دستک دینے سے پہلے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپنگ بیگ فرش پر رکھ دیا پھر جیب سے رومال نکال کر پسینا خشک کیا۔

داخلی دروازے کے ساتھ کچن کی کھڑکی تھی۔ میرا ہاتھ ڈور بیل کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اندر سے ایک آواز آئی جو میرے کانوں کو چیرتی ہوئی دل میں اتر گئی۔ ایسا لگا جیسے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں انڈیل دیا گیا ہو۔ میری روح پر بھی سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

یہ آواز بینش کی تھی، بینش یعنی میری وائف کی چھوٹی بہن جو بمشکل 13، 14 سال کی ہوگی۔ میرے پاؤں منوں وزنی ہو گئے، میرا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔

بینش روتے ہوئے کہہ رہی تھی ”اگر آپ نے مجھے عید پر نیا جوڑا نہ بنوا کر دیا تو میں...... میں کچھ کرلوں گی ، میں کچھ کھا کر مرجاؤں گی......“

”ہاں، ہاں تم کچھ کھالینا اور ساتھ میں ہمیں بھی کچھ کھلا دینا تاکہ ہماری بھی جان چھوٹ جائے، بے شرم...“ یہ آواز میری ساس کی تھی۔

مختصر سے وقت میں دروازے پر کھڑے ہو کر جو گفتگو میں نے سنی اس کا خلاصہ یوں تھا کہ بینش اپنی والدہ سے عید پر نئے جوڑے کا تقاضا کررہی تھی اور اس کی والدہ اسے آنے والے اخراجات کے بارے میں بتا کر سمجھا بجھا کر اس کی ضد ختم کرنے کی کوشش کررہی تھیں کہ..... بینش نے انہیں اپنی جان ختم کرلینے کی دھمکی دے ڈالی۔ ان باتوں کو سن لینے کے بعد ان کے گھر میں داخل ہونا میرے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے ارادہ بدل لیا اور الٹے پاؤں دروازے سے پلٹ گیا۔

☆☆☆

افطار سے کچھ پہلے گھر پہنچا، امی، ابو اور چھوٹی بہن سیماب نے معنی خیز نظروں سے مجھے اور میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپر کو دیکھا۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ آج میں سسرال میں افطار کروں گا مگر کسی نے سوال نہیں کیا اور میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شاور لے کر فارغ ہوا تو افطار کا وقت ہو چلا تھا، افطار سے فارغ ہو کر وضو کر کے سیدھا مسجد کی راہ لی، نماز پڑھ کر مسجد کے صحن ہی میں بیٹھ گیا، یہاں پُرسکون روح پرور نورانی ماحول طاری تھا، مسجد کے صحن میں لگے ہوئے پلر پر کمر ٹکا کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے کانوں میں اب تک وہی آواز گونج رہی تھی، بینش کی آواز...... اور میں کئی سال پیچھے چلا گیا۔ وہ بھی ایسی ہی آواز تھی۔ آج سے دس سال پہلے ہمارے محلے میں ایک بیوہ خاتون اپنی تین لڑکیوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہنے کے لیے آئی تھیں۔ پتا چلا تھا کہ کسی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ شوہر کے انتقال کو سال بھی نہ بیتا تھا کہ سسر والوں نے گھر سے بے گھر کر دیا۔ یہ محنتی اور وضع دار خاتون جنہیں ہم زرینہ خالہ کہتے تھے، انہوں نے اسکول میں نوکری کرلی اور شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گزارہ کرنے لگیں۔ ان کی تینوں بچیاں بالترتیب 16، 14 اور 12 برس کی تھیں۔ زرینہ خالہ کا مکان گلی کے کنارے پر تھا، وہیں نیم کے درخت کے نیچے گلی کے بے فکرے لڑکوں کی بیٹھک ہوتی تھی۔

زرینہ خالہ کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ان کی کسی بھی لڑکی کو بلا ضرورت ہم نے دروازے پر نہ پایا۔ گھر میں پردے کا رواج تھا۔ گھر کی کوئی آواز باہر نہ آتی تھی۔ ماسوائے ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کے سبق یاد کرنے کی آواز کے۔ یہی بچے ان کے گھر کا چھوٹا موٹا سودا سلف بھی لا دیا کرتے تھے۔

پندرہویں روزے کی بات ہے۔ تراویح پڑھ کر مسجد سے آنے کے بعد کھانا کھاتے ہی میں نے گھر والوں کو بتا دیا کہ آج کرکٹ کا نائٹ میچ ہے اور میں دیر سے واپس آؤں گا۔ ان دنوں رمضان میں نائٹ کرکٹ کا رواج تھا۔ ہماری ٹیم بھی ایک میچ جیت کر دوسرے راؤنڈ میں پہنچ گئی تھی۔ 27 رمضان کو فائنل تھا۔ میچ سے واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ گھر پہنچتے پہنچتے تین بج گئے۔

دور کہیں سے ڈھول پیٹ کر جگانے والے کی آواز بھی آنا شروع ہو گئی تھی۔ گلی کے کنارے ایستادہ نیم کے درخت کے نیچے چبوترے پر کوئی نہیں تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، سوچا کچھ دیر یہاں بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کا لطف لے لوں، تھکن اتار کر فریش ہولوں پھر گھر جاؤں گا۔ زرینہ خالہ کے کچن کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ وہاں روشنی نظر آرہی تھی، ابھی مجھے بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محسوس ہوا جیسے کسی کے تیز لہجے میں باتیں کرنے کی آواز آرہی ہے یا شاید سناٹے میں وہ آوازیں مجھے تیز لگ رہی تھیں پھر وہ آوازیں بلند ہونے لگیں اور یوں لگا کہ جیسے دو افراد آپس میں تکرار کررہے ہوں، گو کہ کسی کی باتیں سننا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے مگر نہ جانے کیوں ایک تعجب بھرا اشتیاق مجھے وہ باتیں سننے پر مجبور کرنے لگا، میں ٹہلنے کے انداز میں اٹھا اور

دانستہ کھڑکی کے نزدیک چلا گیا، یہ حرکت نامناسب تھی۔ زرینہ خالہ کی سب سے چھوٹی لڑکی اپنی والدہ سے پُرزور لہجے میں تقاضا کررہی تھی کہ وہ عید پر نئے کپڑے، نئے جوتے اور چوڑیاں لے گی۔ جبکہ اس کی والدہ دبے ہوئے لہجے میں اسے گھر کے اخراجات، تعلیم اور مکان کے کرائے کی بابت بتا کر اسے سمجھا رہی تھیں اور اس بات پر آمادہ کررہی تھیں کہ ان کی پرانی مگر قابلِ استعمال قیمتی ساڑی کو کاٹ کر وہ سب بہنوں کے کُرتے بنوا دیں گی جو کہ بالکل نئے جیسے ہوں گے۔ مگر وہ بچی مسلسل اصرار کررہی تھی کہ وہ نئے کپڑے بنوائے گی اور ساتھ میں جوتے اور میچنگ کی چوڑیاں بھی لے گی۔ والدہ کے مسلسل سمجھانے کے باوجود آہستہ آہستہ اس کی آواز رونے میں بدل گئی۔ انتہائی مایوس اور غمزدہ لہجے میں اس نے دل گرفتگی کے ساتھ کہا۔ ”اگر مجھے نئے کپڑے نہ ملے تو اللہ کرے میں عید کے دن مرجاؤں۔“ پھر ایک طمانچے کی آواز آئی اور وہ بچی پھوٹ پھوٹ کے بلند آواز میں رونے لگی۔

وہ جس طرح دردناک انداز میں رو رہی تھی اس نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔ مجھ سے ہلا تک نہیں جارہا تھا۔ حالانکہ میں کوئی ایسا دردمند دل رکھنے والا اور غریبوں مسکینوں کا ہمدرد نہیں تھا مگر اس بچی کی رقت بھری آواز میں ایسا اثر تھا جس نے میری روح تک کو ہلا دیا تھا۔ اچانک برابر والے گھر میں روشنی ہوئی اور میں نے چونک کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور گھر کی طرف لوٹ چلا۔

☆☆☆

دوسرے دن کالج میں اپنے دوستوں سے اس واقع کا ذکر کیا۔ سب نے تاسف کا اظہار کیا، کسی نے معاشرے کی بے حسی کا ذکر کیا تو کسی نے حکومت کو اس بات کا موردِ الزام ٹھہرایا کہ ہمارے ہاں زکواۃ کا نظام ہوتے ہوئے بھی غریب اور مستحق لوگ اس سے محروم ہیں۔ زکواۃ کے ذکر پر میرے کان کھڑے ہوئے، میں نے گھر آکر امی سے بات کرنے کا ارادہ کیا، ان کے زیورات کی اچھی خاصی زکواۃ نکل سکتی تھی اور یہ رقم سلیقے اور مناسب انداز میں پردہ داری کے ساتھ ان بیوہ خاتون تک پہنچ کر ان کے مسائل کسی حد تک کم کرسکتی تھی، اگر محلے کے کچھ گھر یہ تہیہ کرلیں میں ان کی زکواۃ اور امداد پروفیشنل قسم کے فقیروں، مسٹنڈوں تک تقسیم ہونے کے بجائے ضرورت مند سفید پوش افراد تک پہنچ جائے تو کسی کو کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت نہ پڑے، مگر ضرورت ہے اس کے لیے کونسلنگ کی اور آگاہی کی۔ امی سے گھر آکر میں نے بات کی تو وہ بولیں، ارے بیٹا یہ زیور تو امانت ہے، تمہاری اور تمہاری بہن کی شادی کے لیے اٹھا رکھے ہیں۔

ہماری قوم کی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم اپنے مال پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اللہ نے ان قوموں کو تباہ و برباد کر دیا جو کہ دنیا بھر کی دولت و خزانے اور آسائشات کی مالک تھیں، ہم نے اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا ہے اور بے لگام نفسانی اور دنیاوی خواہشات کی دوڑ میں اپنے آس پاس بنا دیکھے بھالے ہر چیز کو پھلانگ کر مادہ پرستی کا لبادہ اوڑھے اونچائی پر چھا جانا چاہتے ہیں، بہرحال کچھ دن تک تو میں اس کاز کے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھا، ہم دوستوں نے اس پر بڑی ڈیبیٹ کیں، سرمایہ داری نظام، استعماری قوتوں سے لے کر امریکا تک کو موردِ الزام ٹھہرایا، جذباتی تقاریر اور زبانی جمع خرچ کیا۔ کئی تجاویز اور مستقبل کے لیے منصوبے بنائے کیونکہ ہم ایک جذباتی اور جوشیلی قوم تو ہیں مگر باعمل نہیں، حسبِ معمول اصل بات اقدامات سے بہت پیچھے رہ گئی اور ہماری زبانی کلامی منصوبہ بندی آگے نکل گئی۔

ٹورنامنٹ میں ہماری ٹیم مسلسل کامیابیاں حاصل کر کے آگے بڑھتی گئی۔ عید کی تیاریوں کے ساتھ ٹورنامنٹ کی مصروفیت اور فائنل میں جگہ بنانے کی لگن، روزہ، عبادات اور جیت کی دھن میں کچھ یاد نہ رہا، بالآخر چاند رات آگئی۔

گھر والوں کی فرمائش پر انہیں لے کر بازار جا پہنچا۔ انہیں آئسکریم کھلائی، سیماب نے مہندی لگوائی۔ درزی کے ہاں سے کپڑے لیے۔ سب کو گھر چھوڑا اور پھر دوبارہ دوستوں کے لے کر فضول سی شاپنگ کے لیے بازاروں کی خاک چھاننے نکل پڑا۔ فجر سے کچھ قبل نائی سے شیو وغیرہ بنوائی اور گھر لوٹا۔

نماز کے لیے بار بار امی کے اٹھانے پر بڑی مشکل سے اٹھ کر غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے، نئے کپڑے پہن کر شیر خورمے سے منہ میٹھا کیا اور عیدگاہ جا پہنچے۔ خدا خدا کر کے خطبہ شروع ہوا۔ ذہن پہ ایسی خماری چھا رہی تھی کہ پتا ہی نہیں چلا کہ کب نماز پڑھی کب خطبہ ختم ہوا، ہوش آیا تو سب لوگ گلے مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ گلے ملنے میں، میں سدا کا چور رہا ہوں لہٰذا سیدھا

سائیڈ پکڑ کر محلے میں آن پہنچا، یہاں بھی تقریباً آدھے سے زیادہ اشخاص عیدگاہ سے نماز پڑھ کر آچکے تھے اور ایک دوسرے سے گلے مل کر عید کی مبارکباد دے رہے تھے۔ جن لوگوں سے ہفتوں مہینوں ملاقات نہیں ہوتی، شکل تک نظر نہیں آتی ان سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ابو نے پہلے ہی سے دس والے نوٹوں کی گڈی جیب میں ڈال رکھی تھی اور محلے کے بے شمار بچوں میں عیدی تقسیم کرچکے تھے۔ پڑوس کے دو چار بزرگوں سے عیدی ملنے کے دوران اچانک میری نظر زرینہ خالہ کے کونے والے گھر پر پڑی۔ دروازے کی اوٹ سے ایک حسرت زدہ چہرہ پردے کے پیچھے اپنا آپ چھپائے جھانک رہا تھا۔ اتنی دور سے بھی مجھے ان اداس حسرت بھری آنکھوں میں چھپی ویرانی کی ان کہی داستان سنا گئی، بہت کچھ سمجھا گئی، شاید اس دن اس عید کی صبح وہ آنکھیں بہت روئی ہوں، بہت فریاد کرتی رہی ہوں، خوشیوں کو ترستی ان آنکھوں میں چھپے کتنے سوال تھے۔ اچانک مجھ سے نظریں چار ہوئیں، مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چہرہ ہڑ بڑا کر پردے کی اوٹ میں غائب ہوگیا۔

گھر میں داخل ہوئے تو امی نے پیار کیا، بلائیں لیں اور عید مبارک کہہ کر عیدی دی۔ سیماب نے اپنا نیا کرتہ اور دوپٹا لہرا کر داد طلب کی اور امی کی طرف سے دی گئی عیدی فوراً ہتھیالی۔

ناشتے کے بعد نیند کا ایسا خمار چڑھا کہ کمرے میں پہنچ کر بستر پر جا گرا پھر ہوش نہ رہا، گھر والوں کو بھی اندازہ تھا کہ رات کا جاگا ہوا ہوں اس لیے دیر تک سوتا رہوں گا۔ ظہر سے کچھ دیر پہلے آنکھ کھلی، شاور لینے کے بعد فریش ہوکر ڈرائنگ روم میں آکر ٹی وی کھولا تبھی سیماب نے آکر کہا کہ بھائی امی نے ٹی وی کھولنے سے منع کیا ہے۔

"کیوں منع کیا ہے؟ آج عید کا دن ہے، امی ہیں کہاں؟"

"امی تعزیت کے لیے گئی ہیں۔ زرینہ آنٹی کے ہاں۔" سیماب نے کمرے سے جاتے ہوئے گویا میرے سر پر بم گرادیا۔

یا اللہ آج عید کے دن تعزیت، خیر تو ہے کیا ہوا آخر...... ڈوبتے دل اور اندیشوں کے ساتھ گھر سے باہر آیا تو زرینہ خالہ کے گھر کے پاس ٹینٹ لگا ہوا نظر آیا۔ کچھ پڑوس کے مرد حضرات بھی وہاں کھڑے نظر آرہے تھے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یا خدا کیا ہوگیا ہے، دل سے دعا نکلی کہ اے مالک ان بچیوں کی ماں کو ان سے جدا نہ کرنا، دعائیں کرتا جب ٹینٹ کے نزدیک پہنچا تو ابو کو وہاں کھڑے پایا، مجھے دیکھتے ہی ابو مخاطب ہوئے "عامر ذرا اپنی بائیک تو نکالو اور قریشی صاحب کے لڑکے کے ساتھ جاکر قبرستان میں قبر کا انتظام کرآؤ، عصر کے بعد تدفین کا ارادہ ہے۔ کیوں قریشی صاحب......"

میرے حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے، مجھ سے بولا تک نہ جارہا تھا، قریشی صاحب کے بیٹے ساجد کو ساتھ لے کر اپنے گھر کے گیٹ پر پہنچا تو میں نے بڑی مشکل سے استفسار کیا "قبر، مگر کس کے لیے؟"

"زرینہ خالہ کی سب سے چھوٹی بیٹی نے زہریلی دوا پی کر خودکشی کرلی ہے۔" ساجد نے آہستگی سے انکشاف کیا۔ "بات دبادی گئی ہے ورنہ پولیس تھانے کا چکر ہوجاتا۔"

مجھے لگا کہ جیسے زمین پھٹے گی اور میں اس میں دفن ہوجاؤں گا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک سفید پوش بے سہارا خاندان پر کیسا قہر ٹوٹا تھا، ہماری بے حسی انتہا کو پہنچ چکی تھی جس نے یہ دن دکھایا تھا، یہ گل کھلایا تھا، ابھی صبح کی بات تو ہے میں نے اسے دروازے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا، بے شک اس کی آنکھوں میں ویرانی اور حسرتوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے مگر بات یہاں تک پہنچ گئی۔ وہ بچی اتنی مایوس ہوگئی کہ اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا، مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ محض نئے کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اپنی زندگی کا خاتمہ کرسکتا ہے، خودکشی کرسکتا ہے، زندگی جیسی قیمتی چیز ہار سکتا ہے، مگر شاید وہ معاملہ صرف نئے کپڑوں کا نہیں تھا، معاشرے کی بے حسی اور منافقت کا تھا۔ معاملہ محرومی در محرومی کا تھا۔ مجھے کئی دن پہلے اس کے احساس محرومی کا پتا چل چکا تھا، ہوسکتا ہے کچھ اور لوگوں کو بھی پتا چل گیا ہو۔ محلے میں درجن بھر لوگ ایسے ہیں جو پانچ وقت کے نمازی ہیں، فجر سے عشا تک کی نماز مسجد میں پڑھتے ہیں، گھر سے مسجد تک کی دوڑ میں، اللہ سے اتنے قریب ہوکر بھی اپنے فرض سے غافل ہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ اگر کسی کی مدد کرنی ہے تو پہلے اپنے گھر، رشتے دار اور پڑوسیوں سے شروع کرو۔ ان کی خبر گیری کرو، کیا ہم سب نام کے مسلمان ہیں؟ اتنے مردہ دل، مادہ پرست اور گنہگار ہیں کہ ہمارے پڑوس میں جیتا جاگتا انسان مایوسی کے ہاتھوں موت کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ گلی کے وہ معززاور مخیر حضرات جو بڑھ چڑھ کر مرحومہ کے کفن دفن اور آخری رسومات میں حصہ لے رہے ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ جن لوگوں کو زندگی میں ہماری امداد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بروقت انہیں مل جائے، مرنے کے بعد کیوں ہمارے دل ان کے لیے پسیجتے ہیں۔ اس عمر میں اگرچہ میں کالج کا ایک کھلنڈرا سا نوجوان تھا مگر مجھے اس بچی کی موت کا جذباتی سبب معلوم تھا۔ اسی لیے اس کی موت میری روح پر تازیانہ بن کر ایسے پچوکے لگا رہی تھی کہ میرا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہونا شروع ہوگیا اور میں ٹھنڈے پسینے کی دھار سے شرابور ہوگیا۔ گیٹ سے بائیک نکالتے ہوئے میرے تصور میں صبح کا بے بس چہرہ اور ویران آنکھیں نظر آنے لگیں۔ ندامت کا اندھیرا میری نظروں میں چھا گیا اور میں چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ اس معاملے میں خود کو مجرم سمجھنے لگا۔ شاید میرے اس اعتراف کو سن کر کچھ لوگ اسے لفاظی ہی سمجھیں اور کچھ اسے معمول کا ایک سانحہ کہہ کر داستان طرازی سمجھ بیٹھیں کیونکہ بدقسمتی سے اب ہم لوگ ان چیزوں کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔ جس شہر میں روزانہ بیس سے پچیس آدمی مرتے ہوں، ٹی وی پر خودکش دھماکے ہونے کے بعد کے مناظر، کٹی پھٹی ٹکڑوں میں بٹی لاشیں دکھائی جاتی ہوں، ایمبولینس کی کان پھاڑ دینے والی آوازیں آتی ہوں، اغوا برائے تاوان اور قتل ہوجاتے ہوں، اس شہر کے لوگ اگلے دن سب غم بھلا کے پھر سے معمول کی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ آخر کس کس بات کی فکر کریں، کس کس کو روئیں، لوگوں نے اس بات کو ڈھٹائی سے تسلیم کرلیا ہے کہ یہی رضائے الٰہی ہے اور اللہ ہی اس ملک کو چلا رہا ہے اور وہی اس کا حل نکالے گا۔ وہ قانون کے محافظ جنہیں چور، ڈاکو، لٹیروں اور قاتلوں کو لگام دینے کے لیے تنخواہیں دی جارہی ہیں، وہی قانون شکنوں کو تحفظ فراہم کرتے نظر آتے ہیں، جس ملک کی شاہراؤں پہ وردی پوش کھلے عام رشوت لیتے نظر آتے ہوں وہاں انصاف کی بات تو سوچنا بھی عبث ہے۔ اس ملک میں ایک بے سہارا بچی کی موت کا دکھ آخر محسوس بھی ہو تو کیسے جبکہ شہر کے گلی کوچوں سے کم عمر معصوم بچیاں غائب ہوجاتی ہوں۔ پھر ان کی پھندا لگی، بے لباس، بے آبرو لاشیں ...... کسی زیر تعمیر عمارت کے ٹینک یا کچرے کے ڈھیر سے برآمد ہوتی ہے۔ آخر ہمارا احساس گیا کدھر، کہاں مرگیا، کیا واقعی ہم لوگ بے حس قوم بن چکے ہیں؟ ہاں ہم بے حس قوم تو ہیں مگر مردہ نہیں کیونکہ بڑے سے بڑے سانحہ کے بعد بھی ہنستے مسکراتے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، شہر کے فاسٹ فوڈز، ریسٹورنٹ اور فرنچائز بھی کھلے رہتے ہیں۔ باربی کیو اوپن ائر میں سڑک کے کنارے کرسیاں ڈالے، مرغ کی رانیں چباتے، تکی اور تکے کھاتے ہوئے ہر غم فراموش کردیتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد میرا وزن گرنے لگا تھا، مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ آنکھیں بند کرتا تھا تو وہی ویران آنکھیں مجھے چبھنے لگتی تھیں۔ کانوں میں درد بھری رونے کی آواز اور سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ میرا نفسیاتی تجزیہ کرایا گیا۔ علاج ہوا اور مجھے کچھ مہینوں کے لیے ماموں جان کے پاس اسلام آباد بھجوادیا گیا تاکہ ماحول کی تبدیلی کا ذہن پر اچھا اثر پڑے۔

وقت کے مرہم نے ڈھٹائی کے ساتھ میرا ہر زخم بھر ڈالا اور میں نے فطری بے حسی سے سمجھوتا کرلیا کہ اللہ کے کاموں میں مصلحت ہوتی ہے اور انسان کچھ نہیں کرسکتا۔

چھ مہینے بعد کراچی لوٹا تو پتا چلا کہ زرینہ آنٹی مکان چھوڑ کر کہیں اور جاچکی ہیں۔ میں نے بھی سب کچھ بھلادیا اور نئے سرے سے کالج جوائن کرلیا۔ اسلام آباد سے واپسی کے کچھ دنوں بعد میں نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا، وہیں میری ملاقات افشین سے ہوئی۔ اسے میں نے سیماب سے ملوایا اور اشارے میں بہت کچھ سمجھادیا۔ اس نے امی سے ذکر کیا اور وہ دونوں اس کے گھر جاپہنچیں۔ امی کو بھی افشین اور اس کے گھر والے پسند آگئے۔

افشین کے ابو ایک کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی جاب کرتے تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکے پر مشتمل گھرانا تھا۔ وہ لوگ سفید پوشی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ معقول زندگی گزار رہے تھے۔ بچے اچھی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ افشین میرے ساتھ ایم بی اے میں تھی اور اس سے چھوٹا بھائی پری انجینئرنگ کے سیکنڈ ایئر میں تھا۔ چھوٹی بہن بینش ابھی چھٹی کلاس میں تھی۔

ہمارا خاندان پانچ افراد ...... پر مشتمل تھا۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی اور پھر بہن سیماب تھی۔ دونوں ..... ابھی پڑھ رہے تھے۔ میں نے ایم بی اے کرنے کے بعد اچھی سیلری پر ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرلی تھی۔ ابو بینک میں گریڈ 3 کے آفیسر تھے۔ ان کی اور میری تنخواہ سے زندگی خوشگوار ہوگئی تھی۔ سیماب کی شادی خاندان میں ہی طے پائی تھی، یعنی امی کی سگی بہن نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ

مانگ لیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ میری اور اس کی شادی ایک ہی دن ہوگی۔

وہ گھر بھر کی چہیتی اور اکلوتی تھی اس ناتے ہم نے شادی کے انتظامات میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ امی نے سوئی سے لے کر بھاری فرنیچر تک کا انتظام کرلیا۔ حتیٰ کہ خالہ کے گھر کے اس پورشن کا جہاں سیماب کو شادی کے بعد شفٹ ہونا تھا، سیماب کی مرضی اور پسند سے ابو نے خود وہائٹ واش کروایا تھا، باتھ روم میں نئے ٹائلز اور فٹنگز کے ساتھ ساتھ بیڈروم میں نیا اسپلٹ بھی لگوادیا تھا۔

یوں تو خالہ نے اپنی طرف سے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی تھی مگر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا اور اس موقع پر وہی کہا جو سب کہتے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے اپنی لڑکی کے لیے کریں۔ اسی کے کام آئے گا۔ ہمارے کس کام کا۔

ہمارے تو بس میں نہیں تھا کہ چاند ستارے توڑ کر اپنی بہن کے ساتھ کردیں مگر اس کا ایک اور حساس پہلو بھی تھا جو ہمیں نظر نہیں آرہا تھا۔

افشین کے گھر والے بھی ہماری ان تیاریوں کو دیکھ رہے تھے۔ تیاریوں کی تمام خبریں انہیں مل رہی تھیں، شادی کی رسومات اور مشترکہ رواج کے تحت ہونے والی ہماری طرف سے کی گئی ہر چیز پر ان کی نظر تھی، شادی کے دنوں میں دونوں خاندانوں کا آپس میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا، گو کہ ہم دونوں کا ملنا جلنا نہیں تھا مگر موبائل پر ہونے والی آدھی ملاقاتوں پر تمام انفارمیشن ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرنے میں کوئی پابندی نہیں تھی، اور تو اور سیماب اور افشین جب تک ایک دوسرے کو ہر بات تمام تر جزئیات اور باریکی سے نہ بتادیتیں انہیں چین نہ آتا، بظاہر یہ تمام تر باتیں عورتوں کی فطرت میں شامل ہیں مگر اس کے درپردہ افشین کے گھر والوں پر ان رابطوں کا اثر پڑ رہا تھا۔ حالانکہ ہم لوگوں کی کوئی ڈیمانڈ وغیرہ نہیں تھی مگر ایک ساتھ ہونے والی دونوں شادیوں میں ہماری طرف سے کیے جانے والے ان اقدامات کا پریشر ہی اتنا اسٹرونگ تھا کہ جن سے بچ کر نکلنا افشین کے گھر والوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ دونوں شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھیں، کسی نے کوئی کسر نہ چھوڑی، دل کھول کر دکھاوا کیا گیا۔ فضول اخراجات، رسم و رواج اور نمود و نمائش میں کمی نہ کی گئی، شادی کے آٹھ مہینے کیسے بیت گئے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ دعوتیں، ہنی مون اور نئی نویلی شادی کے نخرے بھی ختم نہ ہوئے تھے کہ پتا چلا دونوں گھروں میں دلہنوں کے پیر بھی بھاری ہوگئے ہیں۔

زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، مسرتوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے پوری دنیا جھومتی نظر آرہی تھی۔ افشین بڑی اچھی شریکِ حیات ثابت ہوئی تھی۔ میری بات کو اپنا ایمان سمجھ لینے کے ساتھ ساتھ اس نے سلیقہ شعاری سے گھر کے کاموں کو سنبھال لیا تھا۔ گو کہ دورانِ تعلیم اس کا ارادہ نوکری کا تھا مگر ایک بار بھی اس نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پورا گھر اس کی خوش اسلوبی اور سلیقے دارانہ صلاحیتوں اور سلیقہ مندی کا معترف ہوگیا تھا، امی اور ابو کو میں نے ہمیشہ اس کی تعریف ہی کرتے دیکھا۔ میں نے افشین کو اپنی کسی بات پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا، ہاں کبھی کبھی وہ پریشان سی ضرور نظر آتی تھی مگر پوچھنے پر خوبصورتی سے ٹال دیا کرتی تھی۔

میری سسرال نے بھی مجھے بڑی عزت دی تھی، میرے سالے اور سالی تو میرے آگے بچھے جاتے تھے۔ افشین نے میری پسند کی ساری چیزیں گھر والوں کو بتائی ہوئی تھیں، جس دن افشین کے گھر جانا ہوتا میری پسند کے کھانے بنے ہوئے ملتے۔

شادی کے بعد مجھے افشین کے گھرانے کا بغور جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔ وہ مالی حیثیت میں کوئی بہت زیادہ اہمیت کے حامل نہ تھے گو کہ اچھی طرح سے رہتے تھے، بچے ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اپنے گھر کو سلیقہ شعاری کا آئینہ بنا رکھا تھا، زیرِ استعمال پرانے فرنیچر کو بھی اچھی طرح مینٹین کیا گیا تھا، گھر میں ٹی وی، فریج واشنگ مشین کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کم از کم ہر ایک چیز دس سال پرانی ہے۔ یہ اندازہ بھی لگانا کوئی مشکل نہ تھا کہ جدید ڈیزائن کے فرنیچر سے لے کر تمام تر الیکٹرانک آئٹمز بشمول اسپلٹ جو کہ انہوں نے جہیز میں دیے ہیں اس طرح کی کوئی بھی چیز ایک طویل عرصے تک ان کی دسترس میں نہ آنے والی تھی۔

چند مہینے اور گزرے تو مجھے احساس ہوا کہ ہم نے تعلیم یافتہ، باشعور ہونے کے باوجود کتنی بڑی زیادتی کر ڈالی ہے۔ ہم نے اکلوتی بہن ہونے کے ناتے سے اور وسائل میں اس کی سسرال سے کچھ برتر ہونے کی وجہ سے اپنے کیے گئے اقدامات، اخراجات اور بھاری جہیز کو میرٹ سمجھ لیا اور وہی امید اپنی سسرال سے لگالی، جب بھی ہم کوئی نئی چیز خریدتے، سیماب یا امی اس کی خبر فوراً ہی آگے بڑھادیتیں، بادی النظر میں اس کا ایک ہی مقصد ہوتا۔

اب آپ بھی اپنی بیٹی کے لیے اس معیار سے آگے نہ سہی کم تو ہرگز ثابت نہ ہوں۔

شادی کے بعد جب ذرا دعوتوں کا سلسلہ تھما تو کبھی ایسا بھی ہوا کہ ہم بغیر اطلاع دیے سرپرائز کے طور پر افشین کے گھر پہنچ گئے تو ہم نے ہمیشہ ان کو سادہ سا کھانا کھاتے دیکھا، ہاں ہمارے آتے ہی بازار سے فاسٹ فوڈ یا اسپیشل آئٹم ضرور آجاتا، یا پھر شامی کباب تو ہر وقت بنے ہوئے فریج میں رہا کرتے تھے۔ گویا آنٹی کے بنائے ہوئے مزیدار کھانے، نت نئے چائنیز اور اٹالین ڈشز کے ذائقے اور چٹخارے ہمارے آنے پر ہی سرو کیے جاتے تھے۔

مجھے رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا کہ ہم سے کہیں نہ کہیں غلطی ہوئی ہے۔ مجھے افشین کے چہرے پر نظر آنے والی پریشانی کا سبب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اسی دوران ایک جاننے والے کے ذریعے معلوم ہوا کہ ہمارے سسر صاحب نے ایک سال قبل بینک سے 5 لاکھ روپے قرض لیے تھے جسے وہ قسطوں میں ادا کر رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ قرض انہوں نے شادی کے لیے لیا ہوگا۔ بحیثیت ایک باشعور انسان مجھے اب یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اپنی سسرال پر بلاوجہ بوجھ لاد کر انہیں زیرِ بار نہیں کرنا چاہیے۔ مگر ہماری طرف سے ہونے والے وہ تمام اقدامات اور اللے تللے جو کہ ہم نے سیماب کے لیے روا رکھے تھے وہ معاملات تسلسل سے افشین کے سفید پوش خاندان کا استحصال کیے جارہے تھے اور میں تھا کہ بس اس حقیقت کا ادراک ہونے کے باوجود بھی اس استحصال کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاسکا تھا۔

☆☆☆

رمضان کی آمد کے ساتھ ہی امی نے خالہ کو آمادہ کرلیا تھا کہ رمضان کا مہینا سیماب اپنے میکے میں گزارے گی، رمضان کے شروع ہونے تک افشین کی طرف سے یا اس کے گھر والوں کی طرف سے ایسا کوئی اشارہ نہ ملا تو امی اور سیماب نے مجھے اکسایا کہ میں افشین سے اس معاملے میں بات کروں اور ساتھ ہی ساتھ نئے آنے والے مہمان، پہلی عید پر ہونے والی رسومات، عیدی اور عید کے جوڑوں کے متعلق بھی اشارتاً اسے سمجھادوں، مگر اس سے پہلے ہی امی اور سیماب اپنے خاندان کے رسم و رواج اور پہلے بچے کی آمد کے موقع پر ہونے والی رسومات کے بارے میں افشین کو پوری طرح بریف کرچکی تھیں۔ پہلی رمضان سے ایک دن پہلے افشین کے والد اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

رمضان کے پہلے ہفتے افشین کے گھر والوں نے عید پر نیا جوڑا بنانے کے لیے مجھے سوٹ پیس دیا تھا، درزی پرانا تھا اور مجھے پتا تھا باوجود رش کہ عید سے دس پندرہ دن پہلے بھی وہ مجھے انکار نہیں کرے گا۔ افشین کو بھی پتا تھا کہ میں اپنے کپڑے اپنی پسند کے درزی ہی سے سلواتا ہوں اس لیے مجھے پہلے ہی سوٹ پیس دے دیا گیا تھا۔ عیدی اور فضول تحائف کی رسم ابھی باقی تھی۔ نہ جانے کب فون پر نند بھاوج میں اظہارِ خیال ہوا اور باتوں ہی باتوں میں سیماب نے یہ بھی جتادیا کہ ہماری طرف سے تو سوٹ کی سلائی کے پیسے بھی بھجوائے گئے ہیں، اگلے ہی دن افشین نے مجھے کہا کہ کل دفتر سے آتے ہوئے روزہ ہمارے ہاں افطار کریں اور ابو نے جس درزی سے شادی کے کپڑے سلوائے تھے اس کے پاس ناپ دینے کے لیے سوٹ پیس ساتھ لیتے آئیے گا۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا مگر افشین نے بڑا اصرار کیا کہ ابو برا مان جائیں گے، پہلی عید ہے شادی کے بعد، ضرور ساتھ لائیے گا۔ آج گھر والوں کو میں نے بتادیا تھا کہ دوپہر کو دفتر سے واپسی پر میں افشین کے گھر کا چکر لگاؤں گا اور ساتھ ہی سوٹ کی سلائی والی بات بھی بتادی تھی۔ مگر وہاں، دروازے پر کھڑے ہوکر میں نے جو کچھ سنا اس نے مجھے دہلادیا تھا، میں الٹے پیروں لوٹ آیا تھا پھر اگلے دن ایک بڑا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس فیصلے کے سلسلے میں ابو اور امی سے بھی مشورہ کرلیا تھا۔

اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں افشین کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

میں صحیح وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اپارٹمنٹ کی پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ ڈور بیل کی طرف بڑھا تھا کہ رک گیا، کچن کی ادھ کھلی کھڑکی سے پکوڑوں کی اشتہا انگیز خوشبو کے ساتھ کسی کے گنگنانے کی آواز آرہی تھی، کوئی عقیدت بھری آواز میں نعت پڑھ رہا تھا۔

یہ آواز میری چھوٹی سالی کی تھی جو کچن میں مدد کے لیے اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتے ہوئے اپنی سرشاری اور خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے اطمینان بھری سانس کھینچی، فرش پر رکھا ہوا فروٹس سے بھرا شاپر اٹھایا اور سکون کے ساتھ داخلی

گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔
افطار کے بعد نماز پڑھ کر فوراً کھانا لگا دیا گیا، کیونکہ میں نے اس شرط پر آنے کی ہامی بھری تھی کہ افطار پر غیر ضروری لوازمات کا اہتمام نہیں کیا جائے گا۔ پھر بھی کھانے میں میری پسند کا چکن قورمہ بنا لیا گیا تھا۔
مجھے عشا سے پہلے گھر پہنچنا تھا۔ میں نے افشین کے گھر والوں سے اسے لے جانے کی اجازت لی۔ یہ کہہ کر کہ یہ اس کی پہلی عید ہے اور اسے اپنے گھر میں منانی چاہیے۔ اپنے گھر میں، اپنے شوہر کے گھر میں، اپنی سسرال میں۔
افشین کے والدین نے ہلکی سی ردّوقد کی پھر راضی ہو گئے اور ہمیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔
ہمارے گھر میں افشین کی واپسی پر بھرپور استقبال ہوا۔ امی نے بہو کو گلے لگا کر پیار کیا، ابو نے مجھے مبارکباد دی، جی ہاں مبارکباد، ہر چیز طے ہو گئی تھی، سیماب اپنے میاں کے ساتھ اس کے گھر جا چکی تھی، میں نے پہلے ابو کو پھر امی کو افشین کے گھر کے حالات بتائے تھے اور پھر بینش کی اس کی والدہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ امی نے بھی اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں ایک اور جان کو جاتے ہوئے، زندگی کی بازی ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ماضی میں ہونے والی غفلت دہرانا نہیں چاہتا...... ایک اور ننھی، معصوم کانچ کی گڑیا کو ٹوٹتے ہوئے کرچی کرچی ہو کر بکھرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اپنی غفلت کا کفارہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں جس کا اللہ نے مجھے موقع فراہم کر دیا ہے۔
میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کوئی فضول رسم و رواج آڑے نہیں آئے گا، میرا بچہ اس دنیا میں آئے تو اس فخر کے ساتھ کہ پیدائش کے وقت وہ اپنے باپ کے گھر پیدا ہوا تھا۔ وہ تمام فضول رسومات جو کہ غیر ضروری اخراجات کا باعث بنتی ہیں، وہ جوڑے، تحائف، سلامیاں سب بند، امی ابو کو اعتماد میں لینے کے بعد شکر ہے خالہ اور سیماب نے بھی اس حقیقت کو قبول کر لیا۔
میں نے اپنی سسرال میں سہولت سے یہ بات سمجھا دی کہ ان کی بیٹی اب ہمارے گھر کی عزت ہے اور ہمیں عید پر کسی تحائف، کپڑوں اور رقومات کے بجائے صرف ان کی دعا چاہیے اور بچے کی ولادت اس کے شوہر کے گھر میں ہی ہوگی۔
ستر ہویں رمضان کو مجھے افشین کو چیک اپ کرانے کے لیے لے جانا تھا۔ اسی بہانے اپنے گھر سے اس کے فلیٹ پہنچے اور بینش کو ساتھ لے لیا، چیک اپ سے واپسی پر ان دونوں کی کچھ سمجھ نہ آیا جب میں انہیں لے کر شہر کے معروف شاپنگ سینٹر پہنچ گیا، میں نے نہ صرف افشین کو اس کی پسند کی شاپنگ کروائی بلکہ بینش کے لیے عید کی خریداری کی کیونکہ اس دفعہ میں کوئی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا، بینش تو بکا بکا ہی رہ گئی کہ میں کیا کر رہا ہوں، جب پیار بھری ناراضی سے اسے سمجھایا کہ وہ مجھے اگر اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہے تو جیسا میں کہہ رہا ہوں کرتی جائے۔ آخر وہ بچی ہی تو تھی، ابھی ابھی گڑیوں سے کھیلنا چھوڑا تھا، بچی عمر کے اس نازک دور میں انہیں والدین، بھائی بہن کی صحیح توجہ اور اعتماد کی ضرورت پڑتی ہے ایسے میں اگر سہارا نہ ملے تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کب گڑیاں کھیلتی بچیاں خود کانچ کی گڑیا بن کر ٹوٹ جاتی ہیں، جیسے ایک گڑیا ٹوٹ چکی تھی۔ یا اللہ مجھے معاف فرما، یارب ہمیں معاف فرما ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف فرما، میرے دل سے سچی آواز نکل رہی تھی۔
وہ بچی ابھی محتاط تھی اور شاید گھر کی تربیت اور لحاظ اسے خوفزدہ کیے دے رہا تھا مگر میری ناراضی کا داؤ چل ہی گیا، شاپنگ کرتے ہوئے میں نے اپنی ساس کے لیے بھی ایک سوٹ خرید لیا۔
شاپنگ سینٹر کے فوڈ کورٹ میں چائے پیتے ہوئے افشین کو مناسب انداز میں سمجھانے میں کامیاب رہا تھا، بینش آئسکریم کھاتے ہوئے پلے ایریا میں چھوٹے بچوں کو جھولے اور جمپنگ کیسل میں کھیلتا دیکھنے میں منہمک تھی۔
میں نے افشین کو مزید کچھ پیسے دیے بینش کی بقایا خریداری اور کپڑوں کی سلائی جوتے وغیرہ کے لیے جو کہ ابو نے بطور خاص اپنی طرف سے مجھے دینے کو کہے تھے، افشین ابو کا سن کر انکار نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو جب میں نے اپنی ہتھیلیوں سے صاف کیا تو افشین نے بھی اپنے دوپٹے کے پلو سے میری آنکھوں سے آنسو صاف کر دیے۔ میں رو رہا تھا مگر مطمئن تھا کہ میں نے غلط رسومات کی زنجیر توڑ کر ایک گھر کو تباہی سے بچا لیا ہے ورنہ میری سسرال والے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے قرض کے بوجھ تلے دبتے چلے جاتے۔

میں کوئی دو برس قبل اپنے دادا قدرت اللہ کی وفات پر بنگلہ دیش گیا تھا۔ وہاں میرے دادا، دادی، بھائی جان کی بیوی و بچے اور دونوں پھوپیاں رہتی تھیں، انہوں نے دوسری ہجرت نہیں کی۔ سقوط مشرقی پاکستان کے وقت یہ خاندان وہیں رہ گیا تھا کیونکہ اس خاندان کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت دادا کے دوست جبارالدین نے اپنی جان پر کھیل کر کی تھی۔ جب میرے والد نے ان سے کراچی آ کر رہنے کے لیے اصرار کیا تو انہوں نے یہ جواب

چڑیل

جناب ایڈیٹر صاحب
آداب!
میری نگارشات اس سے قبل بھی سرگزشت میں جگہ بنا چکی ہیں۔ کافی عرصہ بعد پھر ایک عجیب وغریب روداد کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے یہ نفسیاتی گتھیوں میں الجھی روداد آپ کو بھی پسند آئے گی۔
ایم الیاس
(کراچی)

دیا تھا کہ وہاں اقتدار پر جو قابض ہیں ان کے دل میں ملک سے محبت کی رمق تک نہیں ہے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے۔ جب میں اپنے تایا کے ساتھ دادا جان کی لحد پر دعا پڑھنے گیا تو میرا بچپن کا بنگالی دوست ساتھ تھا۔ اس قبرستان میں ایک کونے میں چھوٹا سا مزار نظر آیا۔ میرا دوست صبور خان مجھے اس مزار پر لے گیا۔ میں نے وہاں ایک عجیب وغریب سی بات دیکھی۔ اس قبر پر ایک سنگ مرمر کا کتبہ نظر آیا۔ اس پر بنگلہ، انگریزی اور اردو میں ایک عبارت نظر آئی جس کا مفہوم تھا۔ ”یہ ایک مردود کی قبر ہے۔ کوئی اس پر فاتحہ پڑھے اور نہ دعائے مغفرت کرے۔“

میں بھونچکا سا رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ ایسی کوئی عبارت بھی کتبے پر لکھی جاسکتی ہے۔ میں حیران تھا کہ انتظامیہ نے اس عبارت کی اجازت کیسے اور کیونکر دے دی؟

”یہ بڑی غلط اور خلافِ شریعت بات ہے۔“ میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”مرحوم کی بیوہ نے یہ جگہ خرید کر یہ مزار بنایا ہے اور یہ کتبہ نصب کرایا ہے۔ علمائے کرام اور اس قصبے کے لوگوں نے بھی اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں اٹھایا۔ اس کی وجہ میں رات میں بتاؤں گا۔“

اس نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔

رات میں جب میں اس کے ہاں پہنچا تو کھانے کے بعد وہ بتانے لگا۔ ”میں اس کہانی کا ایک کردار بھی ہوں اس لیے اندرونی باتیں بھی جانتا ہوں۔“

”بیوہ کا نام نیلم ہے۔“ صبور خان کہنے لگا ”شاید آپ کو بھی یاد ہوگا۔ اس وقت وہ تین برس کی ہوتی تھی، اسے سب کالی چڑیل...... ننھی چڑیل...... اور نہ جانے کن کن القاب سے پکارا کرتے تھے چونکہ اس وقت وہ نا سمجھ تھی، جانتی نہیں تھی کہ چڑیل کیسی ہوتی ہے۔ وہ اس قدر کالی تھی کہ اس کی ماں بھی روتی تھی، کون تھا جو اسے چھیڑتا نہیں تھا۔ اس پر اس کی ماں کا دل اس قدر دکھتا تھا کہ وہ اسے زہر دے کر مار دینے کا سوچتی تھی۔ لیکن وہ اس کی ماں تھی، اپنی بیٹی کو موت کے منہ میں کیسے دھکیل سکتی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ اس دیش میں کیسے کیسے طوفان اور انقلابات آئے۔ عبدل جو اس قصبے سے نوجوانی کے آغاز کے وقت چلا گیا تھا، ایک لمبی غیر حاضری کے بعد آیا تو اس کی عمر چھبیس برس ہوچکی تھی۔ اس کی ذات میں وہ سب خوبیاں تھیں جو ایک لڑکی کے تصور میں اپنے محبوب کے لیے ہوتی ہیں۔ اس کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ آج تک کوئی شخص اتنا خوبصورت، وجیہہ اور دراز قد پورے قصبے میں نہیں تھا۔ اگر لڑکی سنجیدہ اور بالغ نظر ہو تو اس کے ذہن میں مثالی شوہر کا پیکر بھی ایسا ہی تراشیدہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف صحت مند اور بے حد توانا تھا بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب بھی تھا۔ ایک بحری جہاز میں کیپٹن تھا اور اس نے تقریباً ساری دنیا دیکھ لی تھی۔ اس کا تجربہ ایسا تھا کہ اس کا مستقبل بڑا تابناک تھا۔ اس کی ترقی کے امکانات بڑے روشن تھے۔ جب وہ آیا تو پورے قصبے میں ایسی سنسنی پھیل گئی تھی جیسے پرستان کا کوئی شہزادہ آیا ہو۔

اس کی آمد کے فوراً بعد دعوتوں اور پارٹیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ آپ جانتے ہیں کہ بنگال کے معاشرے میں ایک اچھے داماد کے حصول کے لیے کوئی بات معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ ماضی سے کہیں زیادہ ہم آزاد ہوگئے ہیں۔ پہلے دس بیس فیصد تھے اور اب نوے فیصد مغرب زدہ ہیں۔ یہ قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا ہے کہ ایک شخص دوست سے کہتا ہے کہ اگر تم میری بہن کو پسند کرکے شادی کرنا چاہو تو کرلو، اسے سمجھنے اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ساتھ لے جاسکتے ہو۔ ہوٹلوں اور سنیما ہالز اور دکانوں پر خریداری کرنے جاسکتے ہو۔ اس کے ساتھ شامیں بھی گزار سکتے ہو۔ اس ضمن میں گھر والوں اور والدین کی بھی اجازت اور کھلی چھوٹ ہوتی ہے۔ چونکہ انہیں اپنی لڑکی پر اعتماد ہوتا ہے کہ اس پر آنچ نہیں آئے گی۔ اس میں کچھ فی صد بہک بھی جاتی ہیں۔ تقریبات میں کوئی نوجوان، خوبصورت اور قابل لڑکا نظر آئے تو والدین اپنی بیٹیوں کو خاص طور سے متعارف کراتے ہیں۔

عبداللہ جو عبدل کے نام سے مشہور تھا اس سے لوگ اپنی بیٹیوں کا تعارف توصیفی انداز سے کراتے تھے اور لڑکیاں بھی بے حجابی میں ملبوس میں ہوتی تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جسم کی نمائش مردوں کو متوجہ کرتی ہے۔ زیادہ باہمت اور بے باک قسم کی لڑکیاں تو کسی وسیلے کے بغیر بے تکلفی سے سارے مراحل خود طے کرلیتی تھیں۔ مہربان بھی ہوجاتی تھیں۔ بعد میں پچھتاتی اور روتی دھوتی تھیں۔ پھر انہیں احساس ہوتا تھا کہ یہ کیا ہوگیا ہے۔

اسی دوران میں اس کی مرحومہ ماں کی ایک سہیلی نے ایک تقریب میں اسے ایک لڑکی کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا۔

”عبدل بیٹے! اس لڑکی کو پہچانو تو سہی کہ یہ کون ہے؟ یوں تو تم نے بہت ساری حسین لڑکیاں پل بھر میں پہچان لی تھیں لیکن اسے نہیں پہچان سکتے۔“

عبدل نے اس لڑکی کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے آج تک اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔ یہ بات بھی غلط نہیں تھی۔ اس تقریب میں نہ صرف بہت ساری حسین لڑکیاں بلکہ حسین عورتیں بھی موجود تھیں۔ یہ سب ان لڑکیوں اور عورتوں سے کہیں حسین اور دلکش تھی۔ وہ اس تقریب میں ملکۂ حسن دکھائی دے رہی تھی۔ نمایاں تھی، مرد کیا، مہمان لڑکیاں اور عورتیں حسد، جلن اور رشک بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”عبدل......! تم نیلم کو اس طرح دیکھ رہے ہو جیسے زندگی میں پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے۔“ وہ دل کش انداز سے مسکرائیں۔ ”تم اس کے بچپن کے ساتھی اور پڑوسی تھے۔ وہ سامنے والے دائیں ہاتھ کے ساتویں مکان میں رہتی تھی۔“

عبدل ان سے مزید بات کرتا کہ مہمانوں میں سے ایک جوان شادی شدہ عورت آکر ان صاحبہ کا بازو تھام کر مہمانوں کی بھیڑ میں گھس گئیں۔

وہ حیرت سے اس حسین لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت سے زیادہ اسے اس بات پر غصہ آیا تھا کہ اتنی حسین لڑکی کو وہ پہچان نہ پایا۔ وہ ایسی حسین لڑکی تھی کہ ایک بار دیکھنے کے بعد برسوں کیا زندگی کی آخری سانس تک کوئی بھی بھول نہ سکے۔ دوسری بات یہ تھی کہ نام کے باوجود بھی وہ لڑکی کو ذہن پر لاکھ زور دینے پر بھی پہچان نہیں پا رہا تھا۔ وہ ایک معما بن گئی تھی۔

اس کی حیرانی پر نیلم کے سرخ وگداز ہونٹ مسکرا رہے تھے اور اس کی خوبصورت جھیل سی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں دیے جل رہے تھے۔ اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی ابھر آئی، حیا آئی تو اس نے اسے اور نکھار دیا تھا۔ اس کے دل میں آیا کہ رخساروں پر جو حیا کی سرخی ہے اسے ہونٹوں میں جذب کرلے۔

”کیا تم مجھے ابھی تک پہچاننے سے قاصر رہے ہو؟“ نیلم شرارت سے مسکرادی۔ ”تم اپنی شکست تسلیم کرلو۔ پھر میں بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں؟ تمہیں دس منٹ کی مہلت دیتی ہوں۔“

وہ منتظر رہی کہ عبدل اسے پہچان لے، وہ چکراتا رہا۔ اس نے ذہن پر بڑا زور دیا، یادداشت کے تمام دریچے کھول دیے۔

”میں اپنی شکست صدقِ دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ شرم کی بات ہے کہ یہ حسین اور پھول سا شاداب چہرہ یاد نہیں آرہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں میری یادداشت جواب دے گئی۔“ اس نے خجالت سے کہا۔

”عبدل......!“ نیلم گنگ رہ گئی ”سات برس پہلے کی بات یاد کرو جب تم ملازمت کرنے شپنگ کمپنی کے ایک بحری جہاز پر گئے، اس سے پہلے میں تمہارے گھر کے سامنے والی رو میں ساتویں مکان میں رہتی تھی۔ اس سے پہلے ہم چار برس تک ہم جماعت بھی رہے تھے۔“

عبدل کو اپنی نظروں پر یقین نہ آیا۔ پھر اسے جیسے یاد آنے لگا اور اس نے تحیر زدہ لہجے میں کہا۔

”نیلم...... تم وہی نیلم ہو...... جسے ہم......“ یک لخت وہ کسی خیال کے تحت رک گیا۔ بچپن کی ایک بات زبان پر آتے آتے رہ گئی تھی۔

”ہاں...... ہاں، رک کیوں گئے...... میں وہی ہوں جسے تم نے نیلم چڑیل کا نام دیا تھا۔ تمہارا دیا ہوا یہ نام میرے نام کا جزو بن گیا تھا۔ کون ایسا تھا جو مجھے چڑیل کہہ کر نہیں پکارتا تھا۔“

عبدل اس قدر حیران تھا کہ اس کی زبان گنگ ہوگئی، پھر وہ یہ بھی نہ کہہ سکا کہ یہ بچپن کی بات تھی، حماقت تھی۔ اس حوالے سے آج وہ سخت نادم تھا۔ شرمندگی کا یہ احساس اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ عبدل کو اچھی طرح یاد تھا کہ نیلم صرف اسکول اور جماعت ہی میں نہیں بلکہ پورے قصبے میں سب سے کالی تھی۔ اس کی بدصورتی کے باعث نہ صرف لڑکے بلکہ لڑکیاں بھی اس سے دور بھاگتی تھیں۔ اس لیے ہر کسی نے اسے سچ مچ کی چڑیل سمجھ لیا تھا۔ اس کا نام کالی چڑیل رکھ دیا تھا۔ بچے کیا بڑے تک اس کی شکل سے خوف کھاتے تھے۔ اسے منحوس کہا کرتے تھے۔ کلاس میں اس نام کی دو لڑکیاں اور بھی تھیں مگر ان لڑکیوں نے اپنے نام بدل لیے تھے۔ نیلم میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت حوصلہ مند اور حیرت انگیز قوتِ برداشت کی مالک تھی۔ اس نے کبھی اس چھیڑ چھاڑ اور مذاق کا برا نہیں منایا تھا اور نہ ہی کسی سے شکوہ کیا تھا۔ وہ اس مذاق کو ہنس ہنس کر اور اپنی تضحیک، تذلیل اور توہین کو برداشت کرتی رہی تھی۔ اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تو لوگ مایوس ہوکر تھک گئے۔ ان

کی زبانیں بند ہوگئیں۔ یہ سات برس پہلے کی بات تھی۔ مگر عبدل حیران تھا کہ سات برس میں اتنا بڑا انقلاب کیسے آگیا؟ وقت نے ..... ایک انتہائی بدصورت لڑکی کو دنیا کی حسین لڑکی بنادیا۔ تو جوانی اور شباب کا حسن تو اپنی جگہ تھا لیکن صورت میں تبدیلی ناقابلِ یقین تھی۔

نیلم نے اسے خاموش دیکھ کر بڑے شوخ لہجے میں کہا کہ تم مجھے کلاس میں سب سے زیادہ تنگ اور پریشان کرتے تھے اور میرے بال کھینچتے تھے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر سے باہر باغ میں آگئے تھے۔ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ عبدل نے جواب دیا۔

''شاید اس لیے کہ تمہارے بال جتنے لمبے تھے، اتنے ہی خوبصورت، سیاہ، گھنے اور چمکیلے بھی تھے۔'' وہ ہنس کر بولا''میں تو قطرت کی کاریگری پر حیران ہوں کہ جس نے ایک چڑیل کو چودھویں کا چاند بنادیا۔ لیکن تم مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟''

''باتیں کرنے کے لیے وہ جگہ مناسب نہیں لگی۔ ہم دونوں سب کی نظروں کی گرفت میں تھے۔ لڑکیاں مجھے نفرت بھری نظروں سے گھور رہی تھیں اور ان کی مائیں بھی۔ مجھے یہ جگہ اس لیے بھی مناسب نہیں لگی تھی کہ وہاں اجنبی مہمان بہت زیادہ تھے...... اور پھر تم میرے بچپن کے دوست اور ساتھی رہے ہو۔ مجھے تم سے سات برسوں کی باتیں کرنی ہیں۔ چلو...... کوئی گوشۂ تنہائی تلاش کرتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی دیکھ اور سن سکتا ہے۔'' پھر اس نے عبدل کا ہاتھ تھام لیا اور باغ کے کونے میں بنی ہوئی کوٹھری میں آگئی جو چوکیدار کی خواب گاہ بھی تھی۔

پھر وہ دونوں بستر پر بیٹھ گئے۔ عبدل نے کہا۔''جب میں ملازمت پر گیا تھا تم ایک کمسن لڑکی تھیں۔''

''نہیں...... اس وقت میں کمسن نہیں بلکہ سولہ برس کی ایک بھرپور دوشیزہ تھی، جنابِ من۔'' نیلم نے ہنس کر جواب دیا''حیرانی تو تمہیں اس بات پر ہوگی کہ میرے لمبے لمبے نوکیلے دانت کیا ہوئے؟ میرے چہرے کے بدنما داغ کہاں گئے؟ اور میرے چہرے پر دوسری خوشگوار تبدیلیاں کیسے آگئیں؟ میں انہیں خوش گوار تبدیلیوں کا نام اس لیے دے رہی ہوں کہ یہ سوال خود تم نے کیا...... یعنی یہ کہ میں چڑیل سے چودھویں کا چاند کیسے بن گئی؟''

''مجھے اپنے اس سوال کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں رہی...... اس لیے کہ تم خود لاجواب ہو...... بے مثال ہو۔'' عبدل نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''نہیں عبدل! میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اپنا چہرہ کیسے بدل لیا؟'' نیلم نے دیوار پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا''میں یہ بات زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتی کہ مجھے بدصورتی کا احساس دلانے والے پہلے شخص تم ہو...... اس انقلاب کے سب سے زیادہ ذمے دار بھی تم ہی ہو۔ زندگی کوئی فلم نہیں کہ جس میں کوئی رحم دل جادوگر کسی بدشکل لڑکی کو جادو کے زور سے حسین بنادے اور اس کے دن پھر جائیں۔ میں بدصورت تھی، مجھے کسی جادوگر کے ملنے کی امید نہیں تھی۔ یوں تو وہ بھی زندہ رہتے ہیں جو خوبصورت نہیں ہوتے..... میں اپنی تقدیر پر شاکر و صابر رہتی اور اسی صورت کے ساتھ زندگی گزار دیتی جو قطرت نے عطا کی تھی۔ کہتے ہیں کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے لیکن تم حسین صورت کے قائل تھے۔ چنانچہ میں نے اپنی صورت بدل لی۔ ممکن تھا کہ صورت بدلے بغیر بھی کوئی مجھے پسند کرلیتا، جوانی کے خمار نے مجھے پُرکشش بنادیا اور میرا جسم کشش کے خزانوں سے بھر گیا تھا۔ حسن تو ہر رنگ میں ہوتا ہے۔ میرے کالے رنگ میں بھی حسن دلکشی اور جاذبیت تھی۔ لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اور مجھے پسند کرے...... کیونکہ میں صرف تمہیں پسند کرتی تھی۔ بے پناہ محبت کرتی تھی جبکہ تم مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ تم نے مجھے محض بدصورت سمجھ کر ٹھکرا دیا...... لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اس نفرت کو محبت میں تبدیل کر کے رہوں گی کیونکہ میں عورت ہوں، عورت جو محبت کرنا اور محبت سے دل جیتنا جانتی ہے۔''

عبدل خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ جب نیلم نے سانس لینے کے لیے توقف کیا تو اس نے کہا''وہ میری حماقت تھی۔''

''ایک تم ہی نہیں بلکہ میرے ماں باپ کو بھی میری بدصورتی کا شدید احساس تھا۔ میرا باپ اس لیے میری دوسری بہن کو چاہتا تھا کہ وہ نہایت حسین تھی۔ اس کے امتیازی رویے کا فرق اتنا نمایاں تھا کہ میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔ میری ماں کہتی تھی کہ تم میری بیٹی نہیں لگتیں، تم سے کوئی عقل کا اندھا ہی ہوگا جو شادی کرے گا۔ میرے والدین اور بہن کے ایک حادثے میں چل بسے...... چونکہ انہوں نے بیمہ کرایا ہوا تھا، مجھے لاکھوں کی رقم ملی۔ والد نے اپنی زندگی میں کچھ زمین کمرشل ایریا میں خریدی تھی۔ اسے بیچا تو اس کے دس کروڑ ملے۔ اس کے علاوہ ایک راز کی بات میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم اسے سینے میں دفن کر کے اس کی حفاظت کرو گے۔ تم جانتے ہو کہ میرا باپ تین لانچیں چلاتا تھا۔ اس نے ایک لانچ ایک اسمگلر سے خریدی تھی جو منشیات لے کر سری لنکا جاتا تھا۔ وہ اسمگلر مر گیا تھا۔ میرے باپ کو اس لانچ کی خفیہ جگہ سے سونا شراب اور منشیات ملی جس نے اسے ارب پتی بنادیا۔ ہم نے اسے راز ہی رکھا۔ اب میں اس تمام دولت کی تنہا وارث ہوں۔

میرے والد نے اپنی دولت کو مختلف بینکوں اور صنعتوں کے حصص میں لگایا تھا تاکہ حکومت باز پرس نہ کرے کہ اتنی دولت راتوں رات کہاں سے آگئی؟ بہن اور والدین کی موت کے بعد میں نے سوچا کہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں۔ میں نے اخبار میں ایک مضمون پڑھا جو امریکا میں سرجری کے متعلق تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ جادو معلوم ہوتا ہے۔ پھر میں نے امریکا کے اس سرجری کے ادارے سے رابطہ کیا اور میں امریکا کے شہر شکاگو گئی۔ وہاں ایک سے ایک ماہرِ فن موجود تھے۔ اس شہر کے ایک بہترین اسپتال میں رہی پھر ایک بیوٹی سیلون میں داخلہ لیا اور وہاں مختلف لوشنز کی مدد سے میری کالی رنگت کو گورا بنادیا گیا۔ جب میں دو ماہ بعد بنگلہ دیش آئی تو ایک نہایت مختلف لڑکی تھی۔ پھر میں نے ایک شاندار مکان بنایا اور اس میں منتقل ہوگئی...... کیا میری یہ صورت تمہارے لیے قابلِ قبول ہے......؟''

''تم دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہو جسے دیکھ کر چاند بھی شرما جائے۔'' عبدل نے مسحور ہو کر کہا''اور اگر تم نے صرف میرے لیے یہ سب کچھ کیا ہے...... میری خاطر...... تو میں ہر زیادتی کی تلافی کردوں گا، تمہارا غلام بن کر۔''

نیلم نے جملہ پورا ہونے نہیں دیا۔ اس کے گلے میں بانہیں حمائل کر کے اس کے چہرے پر جھک گئی۔

☆☆☆

عبدل اور نیلم کی شادی بنگال کے روایتی انداز سے اور ایسی دھوم دھام سے ہوئی کہ چٹاگانگ کیا پورے بنگلہ دیش میں شاید ہی کسی کی ہوئی ہوگی۔ پھر ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام بھی ہوا جس میں دو ہزار لوگوں کو کھانا کھلایا گیا۔ عبدل کے لیے زندگی ایک مسلسل کامیابی تھی گو کہ ازدواجی خوشی کا احساس اس کے لیے اجنبی نہیں تھا مگر نیلم کا ساتھ پہلی بار حقیقی خوشیاں لے کر آیا تھا۔ ماضی میں جو محرومیاں اور ناکامیاں تھیں ان کا جیسے ازالہ ہوگیا تھا۔

نیلم بھی حیران تھی کہ صورت میں تبدیلی سے زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی آگئی تھی؟ اندر سے وہ اب بھی وہی تھی لیکن اس کا ظاہری حسن مستقبل کی خوشیوں کا ضامن بن گیا تھا اور اسے یقین آگیا تھا کہ زندگی کی ہر خوشی پر پہلا حق ان کا ہے جو بہت زیادہ خوبصورت ہیں۔

نیلم کو ابتدا ہی سے مطالعے کا شوق تھا بلکہ جنون تھا کیونکہ کتابوں کی دنیا کے لوگ بہت اچھے، مخلص اور ہمدرد تھے۔ ان میں کوئی ریاکاری اور منافقت نہ تھی۔ یہ نیک لوگ تھے، اتنے اچھے تھے کہ کسی کی بدصورتی اور کمزوری کا مذاق نہیں اُڑاتے تھے اور انسان کے کردار کے حسن کو زیادہ اہمیت اور عزت دیتے تھے۔ پھر عبدل کا ساتھ تھا جس نے

اس کی زندگی کو بہاروں سے بھر دیا تھا۔ اسے ایک عجیب سی خوشی ملنے لگی تھی جس سے وہ اب تک نا آشنا تھی۔

ادھر عبدل کو بھی وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کی مردانہ وجاہت کی دلکشی کے باعث لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک حسین اور دولت مند بیوی کا شوہر تھا، وہ خود بھی لڑکیوں میں دلچسپی لینے لگا تھا کیونکہ اسے نہ تو نیلم کی طرح کتابیں پڑھنے کی ضرورت تھی نہ فرصت۔ اس کے نزدیک عورت سے بہتر کتاب کوئی نہیں تھی۔ ایسی رنگین اور سنگین طباعت کسی کتاب کی کہاں ہوتی ہے؟ شادی کے بعد اس نے محسوس کیا تھا کہ جہاز کی ملازمت بھی غیر ضروری ہوگئی ہے کیونکہ نیلم کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے کاروبار سے ہونے والی آمدنی اس کی سالانہ تنخواہ سے بھی زیادہ ہوتی جارہی تھی۔ اس لیے اس نے نوکری سے استعفادے دیا تھا۔

نیلم کے ماں باپ نے اپنی زندگی میں بیٹی کو اہمیت اور محبت نہ دے کر اس کے ساتھ جو ناانصافی کی تھی اس کی تلافی مرکر انہوں نے یوں کی تھی کہ ایک حویلی نما مکان اور ڈھیروں دولت چھوڑ گئے تھے۔ حویلی کے عقب میں ایک بہت بڑا گیراج تھا جس میں بیک وقت چار عدد شاندار گاڑیاں کھڑی رہتیں۔ شادی کے بعد نیلم نے اسے تحفے میں ایک کار دے دی تھی۔ چونکہ عبدل جہاز کے انجنوں کی دیکھ بھال کرلیا کرتا تھا اس لیے اس نے گیراج کے حصے میں ایک ورکشاپ قائم کرلی اور تمام گاڑیوں کی مرمت اور دیکھ بھال خود کرنے لگا۔

نیلم نے دعوتوں کا سلسلہ شروع کررکھا تھا...... آئے دن ان کے سبزہ زار پر جشن کا گمان ہوتا تھا۔ خود نیلم خوبصورت، وجیہہ، جاذب نظر اور دراز قد شوہر کو ساتھ لیے پھرتی تھی۔ اس سحر انگیز شخصیت کے مالک کو اپنی سہیلیوں سے تعارف کراتے وقت اس کا سر فخر سے بلند ہوجاتا تھا۔ اس وقت نیلم کو ایسا محسوس ہوتا جیسے عبدل کوئی نادر روزگار چیز ہو جسے بڑی دشواریوں سے بہت بڑی قیمت ادا کرکے اس نے حاصل کیا ہو۔ چونکہ یہ بات غلط بھی نہ تھی اس لیے اس کا غرور بجا تھا۔ دعوتوں کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ خود نیلم بھی بیزار ہوگئی تھی کیونکہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ عبدل نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اب انہیں دنیا کا نہ سہی، دبئی، سنگاپور اور بینکاک کا ایک چکر لگالینا چاہیے۔ مگر نیلم نے صاف انکار کردیا کہ وہ دعوتوں کے باعث بے حد تھک چکی ہے، آیندہ برس چلیں گے۔

عبدل کے لیے بیکاری بیزاری کا سبب بن گئی تھی۔ وہ شہر کے ایک محدود قصبے سے اکتا گیا تھا۔

چار مہینے بعد عبدل اس نتیجے پر پہنچا کہ جذبات کی رو میں بہہ کر اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ انتہائی احمقانہ اور جذباتی تھا۔ کیونکہ اب اسے بحری جہاز کی زندگی یاد آنے لگی تھی جہاں اس کے ان گنت دوست تھے۔ ان کے ساتھ مل کر ہر قسم کی تفریح ہوتی تھی جو تصورات کی دنیا سے بھی آگے تھی۔ ہر قیود سے آزاد۔ بپھرے ہوئے سمندر کے سنسنی خیز سفر تھے پھر وہ رنگینی بھی جو ساحل پر عام تھی، سارے شہر کا حسن سمٹ کر آنے والے کے لیے بے چین ملتا تھا اور کبھی ایک شب کی رفاقت بھی ایک حسین یاد بن کر دل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجاتی تھی۔ دنیا کی حسین، نوجوان اور پرشباب بدن کی گداز عورتیں اس کے بستر کی زینت بنتی رہی تھیں۔ مگر اب زندگی ایک سپاٹ صحرا بن کر رہ گئی تھی جس نے اس کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا کردیا تھا۔ وہ ایسا خلا تھا کہ جسے نیلم کی محبت بھی پُر نہیں کرسکتی تھی جبکہ وہ اس کے ساتھ جس طرح وارفتگی، والہانہ پن، گرم جوشی اور خود سپردگی سے نچھاور ہوتی تھی اس پر سہاگ کی پہلی رات کا گمان ہوتا تھا۔ مگر اب عبدل کو اس کا حسن مصنوعی نظر آنے لگا تھا۔ اس کا حسین چہرہ پلاسٹک کے پھول کی طرح رنگین، دلکش اور خوش نما تھا۔ پلاسٹک کے پھولوں میں زندگی نہیں ہوتی عورت کی مہک نہیں ہوتی۔ عورت کی یہی خوشبو تو مرد کو سرشار کرتی ہے۔ عورت نام ہی خوشبو کا ہے۔ وہ ایک شاداب پھول ہی تو ہوتی ہے۔

نیلم نے اپنی بے پناہ دولت سے بدصورتی پر پلاسٹک کا خوبصورت خول چڑھالیا تھا۔ مگر اب اس نظر فریب حسین نقاب کے پیچھے سے عبدل کو وہ بدصورت چہرہ جھانکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا جو نیلم کا اصل چہرہ تھا۔ نیلم نے ایک خوبصورت نقاب پہن کر اسے بے وقوف بنایا تھا اور اس ذلت کا انتقام لیا تھا جو برسوں پہلے عبدل نے چڑیل کا خطاب دے کر نیلم کے نصیب میں لکھ دیا تھا۔ جسے وہ چڑیل کہتا تھا، وہی پری کا بھیس بدل کر اسے غلام بنانے میں کامیاب ہوگئی تھی اور اب وہ پوری طرح اس کالی چڑیل کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ یہ محبت نہیں تھی پرانا قرض تھا جو اب عبدل کو مع سود در سود ادا کرنا پڑرہا تھا۔ وہ عین عالم شباب میں اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگا تھا۔ دنیا کی تمام

خوبصورتی جیسے اس کے لیے شجر ممنوعہ ہوگئی تھی۔ شاید نیلم کے لاشعور میں اب بھی یہ خوف پوشیدہ تھا کہ وہ عورت جس کا حقیقی حسن اس کے مصنوعی حسن سے زیادہ طاقتور ہے وہ عبدل کو اس سے چھین نہ لے اس لیے وہ اس پر کڑی نگاہ رکھنے لگی تھی۔

جب وہ اپنی شاندار گاڑی لے کر نکلتا تو نیلم کسی نہ کسی بہانے اس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ عبدل چاہتا تھا کہ وہ گاڑی کو تیز آندھی کی طرح دوڑائے، یہ اس کی جوان اور ولولہ انگیز فطرت کا تقاضا تھا۔ وہ پہاڑوں کی بلندی کو سر کرنا چاہتا تھا، فضا کی وسعتوں میں پرواز کرنا چاہتا تھا اور لامحدود سمندروں کی تسخیر چاہتا تھا۔ مگر اس کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ لگام نیلم کے ہاتھوں میں تھی۔ عبدل اسپورٹس کار کلب کا ممبر بننا چاہتا تھا مگر نیلم اسے تیس میل فی گھنٹا سے تیز چلانے نہیں دیتی تھی کیونکہ وہ اسے اس بات کی اجازت دے کر خود بیوہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کہ یہ بے حد خطرناک اور جان لیوا شوق تھا۔ حقیقت بالکل مختلف تھی۔ اسپورٹس کار کلب میں اس کی پسند کی لڑکیاں آتی تھیں۔ شباب کی سرمستی سے سرشار اور خطرات سے کھیلنے والی لڑکیاں جن کا عزم و حوصلہ بلندی میں ہمالیہ سے بھی اونچا تھا...... اور جو سمجھتی تھیں کہ ناممکن کچھ نہیں۔ عبدل خود کسی ایسی لڑکی کے چکر میں پڑسکتا تھا جس کی فطرت کے تقاضے اس کی اپنی فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔

☆☆☆

نازلی بیس برس کی نہ صرف جوان بلکہ نہایت حسین لڑکی تھی۔ وہ کوئی نیک نام اور فرشتہ صفت لڑکی نہیں تھی اور بہت سے لوگوں کو پاگل بنا چکی تھی۔ اس کا حسن اور اس کے سراپا میں جو کشش کے خزانے تھے وہ ایک تباہ کن قوت تھے اور اس کا آتش فشاں شباب عقل کو ماؤف اور نگاہوں کو خیرہ کردیتا تھا۔ اس کا حصول ہر مرد کی تمنا تھی۔ جب اس نے عبدل کو دیکھا تو فیصلہ کرلیا کہ اب یہ مرد اسی کا... ہوگا۔ وہ اسے نیلم سے چھین لے گی، مسخر کرلے گی۔ اس سوچ کے باوجود اس نے اپنے آپ کو عبدل کے قدموں میں نہیں ڈالا۔ اس نے اپنی ادائے دلبری سے اسے چیلنج دیا کہ ہمت ہے تو مجھے حاصل کرکے دکھاؤ...... عبدل نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔

ابھی عبدل کی عمر اٹھائیس برس تھی اور یہ اس کی فتوحات کی عمر تھی۔ صرف پندرہ دنوں میں وہ اور نازلی یوں مل گئے جیسے ساحل سے ٹکرا کر لوٹنے والی موج ساحل کی طرف بڑھنے والی موج سے ملتی ہے یا پھر دونوں موجیں ایک ہوکر دوبارہ ساحل کی طرف لوٹتی ہیں۔ سارا مسئلہ یہ تھا کہ فرصت کے مواقع اور ملاقات کے بہانے کیسے حاصل کیے جائیں لیکن تقدیر نے ان دونوں پر رحم کھایا۔ نیلم کو اپنی چند دیرینہ سہیلیوں کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے باہر جانا پڑا کیونکہ ان سب کو ایک پرانی سہیلی نے مدعو کیا تھا کہ سب مل بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کریں گے۔ اس سہیلی کی محبت اور دوستی ان سب کو کشاں کشاں لے گئی تھی۔

عبدل گھر پر اکیلا رہ گیا تھا تو اسے نازلی یاد آئی۔ وہ ایک ہی بلاوے پر چلی آئی۔ اس کی قربت میں اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہو اور کسی پُرفضا مقام پر وہ ہنی مون منا رہے ہوں۔ تین دن اور تین راتیں سندر سپنوں کی طرح بیت گئیں۔ اس نے سفر کے دوران گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ یورپ اور امریکا کی لڑکیاں جس فیاضی سے مہربان ہوتی ہیں، جس طرح خوش کرتی ہیں ایک مشرقی عورت اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی...... لیکن نازلی تو فیاضی میں ان سب پر سبقت لے گئی تھی۔ اس بات نے عبدل کو اس کا اسیر بنا دیا تھا۔

نیلم کے واپس آنے کے بعد نازلی کے ساتھ اس کا رابطہ رکھنا مشکل ہوگیا تھا پھر اس کے ضمیر نے بھی ملامت کی کہ اس نے نیلم کی محبت میں بہت بڑی خیانت کی ہے۔ اس کی بے لوث اور جذباتی محبت کو کتنی بے رحمی اور شقاوت سے پامال کرکے اس کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اس نے نیلم کی عظیم محبت کی کوئی قدر نہیں کی ہے، جبکہ نیلم نے اس کی محبت میں ڈوب کر اس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کیا محبت کا صلہ اسی طرح دیا جاتا ہے، اپنے دل میں اٹھنے والے ان سوالوں کو اس نے یہ کہہ کر سمجھایا تھا، ہر شادی شدہ مرد ایسا ہی کرتا ہے۔

نازلی سے جدائی بڑی شاق اور اذیت ناک تھی۔ وہ ایک دوسرے کی کمزوری بن گئے تھے۔ پہلے تو وہ مختلف حیلے بہانوں سے چھپ چھپ کر نازلی سے ملنے جاتا رہا... مگر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات سے جی نہیں بھرتا تھا پھر ان کی ملاقاتیں ہوٹل کے ایک کمرے میں ہونے لگیں جو عبدل نے بک کرلیا تھا۔ اسی دوران ایک روز اچانک نیلم کو اس کی ایک سہیلی کا خط ملا جو بیمار تھی۔ نیلم نے فوراً ہی جانے کا پروگرام بنالیا کیونکہ اس کی سہیلی کو مالی مدد کی سخت ضرورت تھی۔ عبدل نے اس سے پوچھا کہ وہ کتنے دنوں کے لیے جارہی ہے؟ نیلم اسے قطعی جواب نہ دے سکی کیونکہ اس کا انحصار حالات کے درست ہونے پر تھا۔ نیلم نے ایک اندازے سے بتایا کہ دس بارہ دن لگ ہی جائیں گے۔

تیسرے دن رات کے وقت نیلم کا فون آیا تو عبدل نے اپنا ایک ہاتھ نازلی کے منہ پر رکھ دیا جو نشے کی بے خودی میں زور زور سے ہنس رہی تھی۔ نیلم نے اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے سے پہلے نہیں آسکتی... عبدل نے اطمینان کا سانس لیا اور ریسیور رکھ دیا۔

”اگر اس چڑیل نے ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ لیا تو فوراً ہی اس دنیا سے رخصت ہوجائے گی۔“ عبدل نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اپنی اس پری جیسی بیوی کو چڑیل کہہ رہے ہو۔ تم نے کچھ زیادہ ہی چڑھالی ہے۔“ نازلی بولی۔

”حسین......!“ عبدل قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا اور ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا ”اس کا چہرہ تو پلاسٹک کا ہے۔ تمہی بتاؤ نازلی! کوئی اس چہرے سے کیسے پیار کرسکتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کسی قدِ آدم گڑیا سے شادی کرلی ہے۔ کیا پلاسٹک کی گڑیا کوئی عورت ہوسکتی ہے؟ مگر پاگل میں ہوں جس نے اپنی زندگی کو ایک پلاسٹک کی عورت کے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔ اب وہ میری نمائش کرتی پھرتی ہے۔ میری ملکیت کے اس احساس سے اس کا احساسِ کمتری مٹ جاتا ہے۔ اندر سے وہ اب بھی چڑیل ہے۔ مجھے اس چڑیل کے پنجے سے آزاد کرادو نازلی! ورنہ وہ میرا خون پی جائے گی۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا کیونکہ زندگی بہت خوب صورت ہے...... اور زندگی کی ساری خوبصورتی ان انسانوں کے دم سے ہے جو خوبصورت ہیں۔ جیسے میرے اور تمہارے......“

شراب کے نشے میں وہ بہک رہا تھا اور نازلی کی آغوش میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ سال بھر کا غم، دکھ اور درد ان آنسوؤں میں ڈھل کر بہہ رہا تھا اور نازلی اسے تھپک تھپک کر تسلی دے رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد وہ خمار اور آسودگی کے احساس سے سرشار ہوکر گہری نیند میں گم ہوگیا۔

پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بھیانک خواب شروع ہوگیا ہو۔ رات کا اندھیرا ابھی باقی تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اب نیلم کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے سر پر کوئی بھاری چیز پڑی۔ کمرے کی ہر چیز دھندلانے لگی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے نازلی کو پکارنا چاہا مگر وہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ تن کی عریانی سے بے نیاز اور خطرات سے بے خبر۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ تنہا تھا لیکن اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ حرکت کیا جنبش بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ نازلی کہاں ہے؟ کہاں اور کیوں چلی گئی۔ باہر اب بھی اندھیرا تھا، کمرا روشن تھا۔

”تم اپنی محبوبہ کو تلاش کررہے ہو جس کی زندگی میں کئی مرد آئے۔ وہ ایک فاحشہ سے بھی بدتر تھی۔“ نیلم نے استہزائیہ لہجے میں کہا ”اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی تم جانتے ہو کہ اسے مردوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھادیا ہے کہ وہ اپنی زبان بند رکھے گی۔ سمجھانے کی ضرورت بھی کیا ہے، وہ خود بے حد سمجھ دار ہے۔ میں نے اسے موبائل سے بنائی ہوئی فلم دکھادی، تم دونوں کی وہ ایسی فلم ہے کہ کوئی بھی ہزاروں کی رقم دے کر خرید سکتا ہے۔ تم دونوں کبھی قانون کی گرفت میں آسکتے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ زبان بند رکھنے سے فائدے میں رہے گی۔ مزید بدنامی اور رسوائی کے علاوہ قانونی مشکلات سے بھی محفوظ رہے گی کیونکہ اس وقت میں یہاں سے سو میل دور ایک ہوٹل میں مقیم ہوں اور میرے پاس بہت سے گواہ بھی ہیں جو ضرورت پڑنے پر حلف اٹھا کے پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے ہوٹل سے باہر قدم بھی نہیں نکالا۔“

”نیلم......! آخر تم چاہتی کیا ہو؟“ عبدل نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

”اب تک تو میں تمہیں بڑی شدت سے چاہتی تھی اور تم میری دولت کو چاہتے تھے۔“ نیلم نے جواب دیا ”اس کے باوجود مجھے یہ سودا منظور تھا لیکن اب تم کسی اور کو چاہتے ہو اس لیے میں تمہیں قتل کردینا چاہتی ہوں۔ کل میں تمہیں

کوریئر سروس سے ایک خط بھیجوں گی کہ تم میرے پاس آجاؤ اور فون بھی کروں گی۔ ایس ایم ایس بھی کروں گی تم میرے پاس آجاؤ۔ ہم اکٹھے واپس آئیں گے کیونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ڈرائیونگ کے قابل نہیں ہوں۔ ایسا کوئی آپشن نہیں چھوڑوں گی جو مجھے قاتل ثابت کرے۔ میں صرف ایک دن تمہارا انتظار کروں گی اور تمہارے نہ آنے کی صورت میں مجھے حیرت ہوگی۔ چوبیس گھنٹے بعد میری طبیعت ٹھیک ہوجائے گی۔ میں فرض کرلوں گی کہ تم کسی مصروفیت کے باعث نہیں پہنچ سکے۔ یہاں آکے مجھے معلوم ہوگا کہ میری غیر موجودگی میں ڈاکو آئے تھے۔ تم نے ان کا مقابلہ کیا تو انہوں نے تمہیں ہلاک کردیا۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنسی ''کیا خیال ہے، یہ بیان چل جائے گا؟''

عبدل کا جسم خوف ودہشت سے مفلوج ہوگیا تھا۔

''یقین کرو عبدل! مجھے تمہارے مرنے کا بہت افسوس ہوگا۔'' نیلم کہنے لگی ''میں بہت دنوں تک ایک بیوگی کی زندگی گزاروں گی اور عدت کے دن پورے کروں گی۔ تمہارا مقبرہ بہت شاندار ہوگا بلکہ اس کے کتبے کی تحریر بھی عجیب اور انوکھی ہوگی۔ آج تک ایسی عبارت کسی نے کتبے پر نہیں لکھی ہوگی۔ تم مر کے بھی چین نہیں پاؤ گے۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو نیلم!'' وہ دہشت زدہ ہوکر تھر تھر کانپنے لگا ''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے معاف کردو۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق لے لو۔''

''طلاق!'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا ''طلاق تمہاری خواہشات کی تکمیل کا نام ہے۔ تم اس بہانے آزادی چاہتے ہو تاکہ اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھ سکو۔ لیکن اب میں تمہیں کسی قیمت پر معاف نہیں کرسکتی۔ تم نے عورت کی محبت دیکھی ہے اور اب اس کا انتقام دیکھو۔ میں نے تمہیں وہ سب کچھ دیا جو ایک عورت دے سکتی ہے۔ محبت...... دولت...... وفاداری اور گھر کا ہر آرام اور سکھ۔ میں جانتی تھی کہ میری دولت ایک سے ایک حسین مرد کو خرید سکتی ہے...... لیکن کیا خریدا ہوا مرد طوائف نہیں ہوتا؟ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو لیکن میری یہ خوش فہمی بہت جلد دور ہوگئی کیونکہ تم نے مجھے اپنے رویّے سے سمجھا دیا کہ درحقیقت تم میری دولت کے اسیر ہو میری صورت کے نہیں جو پلاسٹک کا خول چڑھانے سے نہیں بدلی ہے۔ صورت تو خدا کی دی ہوئی ہے...... پھر تم جیسے...... لوگ زندگی کی مسرتوں پر اپنی اجارہ داری کیوں قائم رکھتے ہو؟ میرا چہرہ میرا نہیں تھا تو کیا ہوا میرے جذبات تو وہی تھے، خواہشات تو وہی تھیں اور خواب تو وہی تھے جو کسی خوبصورت عورت کے ہوتے ہیں لیکن خوبصورت لوگوں کی اس دنیا نے مجھے احساسِ محرومی کے سوا کچھ نہیں دیا۔''

بے بس پڑے ہوئے عبدل نے محسوس کیا کہ نیلم [illegible] نہیں کہہ رہی ہے۔

''تم سمجھتے تھے کہ میں اندھی ہوں۔'' نیلم کہنے لگی ''مگر میں تمام حالات سے باخبر تھی۔ مجھے پل پل کی خبر پہنچانے والے بہت سارے خیر خواہ تھے۔ مگر میں نے ان سب کو جھوٹا کہا۔ ان کی بات کو میری محبت ماننے کو تیار نہیں تھی۔ لیکن ان کی صداقت آزمانے کے لیے تین دن باہر رہی اور پھر تمہارا جرم ثابت ہوگیا تھا۔ اس مرتبہ میں اس لیے گئی تھی کہ تمہیں سزا دوں۔ وہ خط میں نے خود اپنے ہاتھوں، اپنے نام سے لکھا تھا تاکہ تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ سکوں۔ میں نے جب تمہیں ٹیلی فون کیا تو مجھے نازلی کے ہنسنے کی آواز صاف سنائی دی تھی۔ میں اسی وقت روانہ ہوگئی تھی۔ میں تمہیں شوٹ بھی کرسکتی ہوں لیکن عبدل...... میں چڑیل ہوں، میں تمہیں انسانوں کی طرح ہرگز قتل نہیں کروں گی۔ تمہاری موت دوسروں کے لیے عبرت کا سامان ہوگی۔ خصوصاً ان کے لیے جو تمہاری خوبصورتی کے قائل تھے۔'' وہ باہر گئی۔ جب کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی۔

''جتنا تمہارا دل چاہے چلاؤ۔'' نیلم نے کہا ''تمہاری آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔''

وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی چڑیل کی طرح خوفناک تھی۔ لوہے کے مٹھ والا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔

☆☆☆

لوگ اب بھی عبدل کی دردناک موت کو نہیں بھولے ہیں۔ نیلم اس سے بہت محبت کرتی تھی مگر وہ اس سے نفرت بھی کرتی تھی اس کی نفرت کا ثبوت عبدل کا مقبرہ ہے۔

''کیا نیلم اب بھی زندہ ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نیلم اب بھی حسین ہے...... وہ چالیس برس کی عمر کی ہے لیکن پلاسٹک سرجری کی وجہ سے اس کا چہرہ تروتازہ ہے وہ نوجوان مرد بھی خوبصورت ہوتے ہیں جو ہر تین چار دن بعد اس کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ وہ انہیں خریدتی رہتی ہے...... اس لیے کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔''

آزادی

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم!

انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم دی ہے اور آنکھیں بھی پھر بھی انسان سب کچھ دیکھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ایسے ہی کم عقلوں میں میرا شمار بھی ہوتا ہے، میں نے خود اپنی زندگی تباہ کی۔ اپنی ہنستی بستی گرہستی کو شعلہ دکھایا اور جب خوش وخرم زندگی خاکستر ہوگئی تو سر پکڑ کر رو رہا ہوں۔

ریحان

(لاہور)

وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور میرے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ''کیا دکھانے آئی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''میں کیا دکھا سکتی ہوں۔ میں تو ایک بے وقوف، بے ڈھنگی اور بدصورت عورت ہوں۔''

''ظاہر ہے۔'' میرا انداز بہت بے رحمانہ تھا۔ ''نگہت۔ میں دس دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ مجھے اس قسم کے نخرے پسند نہیں ہیں۔ تم چاہے کچھ بھی پہن لو۔ کیسا بھی

میک اپ کرلو۔ رہو گی ویسی ہی۔ جیسی شروع سے ہو۔"
نگہت روتی ہوئی کمرے میں چلی گئی تھی۔

وہ میری بیوی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ شروع دن سے مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میری شادی زبردستی والدین نے کردی تھی۔ نہ جانے یہ والدین قسم کے لوگ اولاد کے جذبات کا خیال کیوں نہیں رکھتے۔ زبردستی بھڑا دیتے ہیں۔ چاہے شوہر یا بیوی کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہو یا نہ ہو۔

اور دوسری وجہ یہ تھی کہ نگہت کو دیکھ کر میری شاعرانہ حساسیت کو مہمیز نہیں لگتا تھا۔ میں نے کبھی ایسی لڑکی کو اپنانے کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ میرے خوابوں میں تو ویسی لڑکی تھی جس کی زلفیں میرے شانوں پر پریشان ہوجایا کریں۔

جو میرے لب ولہجہ اور میرے موڈ کا ساتھ دے۔ جو پیار بھرے ڈائیلاگس بولنا جانتی ہو۔ نگہت میں اس قسم کی کوئی خوبی نہیں تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی گھریلو بیوی تھی۔ اس ملک اور معاشرے کی لاکھوں بیویوں کی طرح۔ جن میں کوئی رومانس نہیں ہوتا۔ کوئی چہک نہیں ہوتی۔

ہماری شادی کو ابھی صرف ایک ہی برس ہوا تھا۔ لیکن اس ایک برس کے دوران ہم نے ایک دوسرے سے ذہنی دوری کے نہ جانے کتنے مرحلے طے کرلیے تھے۔ میں بہت تیزی سے اس سے دور ہوتا جارہا تھا۔

وہ اپنے طور پر مجھے راغب کرنے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتی تھی لیکن میں اس کی صورت دیکھتے ہی بھڑک اٹھتا۔ اس سے بے زاری کی ایک لہر میرے پورے بدن میں سرائیت کرجاتی۔

اس شام خاندان کی کسی تقریب میں جانا تھا۔ اس لیے وہ بن سنور کر اپنے آپ کو دکھانے کے لیے میرے پاس آئی تھی لیکن میں اسے دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

ہم اس رات پارٹی میں بھی نہیں جاسکے تھے۔

ہمارے خاندان والوں کو اب جا کر احساس ہونے لگا تھا کہ انہوں نے نگہت کے ساتھ شادی کر کے کوئی اچھا نہیں کیا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ اب تو میں گلے میں پڑے ہوئے ڈھول کو بجانے کے لیے مجبور تھا۔

میرا ایک دوست تھا شہاب۔ پچھلے مہینے اس کی شادی ہوئی تھی اور اس کی بیوی کو دیکھ کر میں احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا تھا۔ کیا عورت تھی ، حاضر جواب۔ خوش اخلاق۔ دلچسپ باتیں کرنے والی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اچھا خاصی خوش شکل بھی تھی۔

میں شہاب سے کہا کرتا تھا۔ "یار تم بیوی کے معاملے میں بہت لکی ثابت ہوئے ہو۔"

"ہاں یار۔ فرزین لاکھوں میں ایک ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے۔"

"اور ایک میں ہوں۔ نہ جانے والدین نے کس جرم کی سزا دی ہے مجھے۔"

"نہیں یار۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بھابی بھی بہت اچھی ہیں۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو نا۔ کیونکہ تم دور سے دیکھ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "ذرا میرے دل سے پوچھو تو پتا چل جائے گا کہ وہ کسی طور بھی میرے معیار پر پورا نہیں اترتی۔"

"یار۔ دنیا میں ہر عورت میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے۔"

"پلیز۔ اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ مجھے نگہت میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔"

ایک رات نگہت سے اس بات پر میرا جھگڑا ہوگیا۔ اس نے جھکتے ہوئے کہا۔ "سنیں۔ اگر میں آپ کو پسند نہیں ہوں تو آپ مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔"

"یہی تو پرابلم ہے کہ میں تمہیں طلاق نہیں دے سکتا۔ کیونکہ یہ میری شکست ہے میرے دامن پر دھبا لگ جائے گا کہ اس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔"

"تو کیا آپ اس لیے مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس لیے ورنہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

ہوسکتا ہے کہ آپ کے نزدیک یہ میری بے رحمی ہو۔ لیکن زندگی گزارنے کے لیے مکمل ہم آہنگی اور پسند ضروری ہے۔ ورنہ زندگی عذاب ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہم دونوں کے درمیان دوریاں بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ میں اپنی زندگی ہی سے بے زار ہونے لگا تھا۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ کوئی حسین لمحہ نہیں۔ کوئی میٹھے خواب نہیں۔ بس دفتر جاؤ اور واپس آکر نگہت کی صورت دیکھو۔ اور ایسے میں فائزہ سے ملاقات ہوگئی۔

واہ۔ کیا لڑکی تھی۔ شعلے کی طرح بھڑکتی ہوئی اور بجلی کی طرح ادھر سے ادھر پھرتی ہوئی۔ اس نے پہلی ہی ملاقات اور پہلی ہی گفتگو میں مجھے اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔

فائزہ سے میری ملاقات اپنے دفتر کے سامنے ہوئی تھی۔ میں حسب معمول اپنے دفتر سے باہر نکلا تو میں نے فائزہ کو دیکھا۔ اس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا اور وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ جینز اور شرٹ میں وہ بہت خوبصورت اور اسمارٹ دکھائی دے رہی تھی۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ "کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔" میں نے پوچھا۔

"پلیز۔ کیا آپ ٹائر بدل سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر شروع ہوجائیں۔ بہت دیر ہوگئی کھڑے کھڑے۔ نہ جانے لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ کسی کی مدد ہی نہیں کرتے۔"

"اور نہ جانے لڑکیوں کو کیا ہوگیا ہے کہ کار ڈرائیو تو کرلیں گی لیکن ٹائر نہیں بدل سکتیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس جیک وغیرہ ہے۔"

"ہاں سب کچھ ہے۔ اسپیئر وہیل بھی ہے۔"

میں نے کچھ دیر میں اس کا ٹائر بدل دیا تھا۔ "اب شکریے کے طور پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"جو آپ چاہیں۔"

"ظاہر ہے کہ آپ ٹائر بدلنے کا معاوضہ تو نہیں مانگیں گے۔" اس نے کہا۔ "اس لیے صرف یہ کرسکتی ہوں کہ جہاں آپ جارہے ہیں وہاں آپ کو ڈراپ کردوں۔"

"میں خداداد کالونی تک جارہا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "اور وہ آپ کا روٹ ہو نہیں سکتا۔"

"اتفاق سے وہی روٹ ہے۔" اس نے کہا۔ "میں اس طرف سے گزرتی ہوئی نرسری تک جاؤں گی۔"

میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فائزہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ قسمت کبھی کبھی یوں بھی مہربان ہوجاتی ہے کہ راستہ چلتے ہوئے آپ کو وہ مل جاتا ہے جس کی آرزو دل میں ہوتی ہے۔

فائزہ جیسی لڑکی کسی تحفے کی طرح مجھے مل گئی تھی۔

اس کے سامنے بے چاری نگہت تو اس طرح تھی جیسے سورج کے سامنے دیا جل رہا ہو۔ فائزہ کی باتیں، اس کی ادائیں، اس کی خوش لباسی۔ اس کی حس ظرافت۔ یہ سب کمال کی تھیں اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔

بعض لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں دنیا بھر کی خوبیاں دے دیتی ہے۔ فائزہ کو قدرت کی طرف سے بہت کچھ حاصل تھا۔

ہم دونوں نے شاید یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ فائزہ کے بارے میں تو نہیں بتا سکتا لیکن میری بے قراری بہت شدید تھی۔

وہ میرے اعصاب پر چھا کر رہ گئی تھی۔ اور خود اس کا بھی یہی حال ہونے لگا تھا۔ اگر کسی دن میں اس سے نہیں مل پاتا۔ یا میں اسے فون نہیں کرتا تو اس کے درجنوں فون آجاتے۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کیوں نہیں مل رہے۔ کہاں غائب ہوگئے ہو وغیرہ وغیرہ۔

میرے ذہن میں ایک خلش سی تھی۔ میں نے ابھی تک اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ ایک خوف سا لگا رہتا تھا کہ اگر بتا دیا تو پھر کیا ہوگا۔ وہ ناراض ہو کر مجھے چھوڑ دے گی۔ اور میں اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔

ایک دن اس نے مجھے نگہت کے ساتھ دیکھ لیا۔ میں بہت کم نگہت کو اپنے ساتھ مارکیٹ لے جاتا تھا۔ اس دن وہ ضد کر کے میرے ساتھ نکلی تھی اور وہیں فائزہ نے ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا تھا۔

وہ اچانک ہی سامنے آگئی تھی۔ اس نے جیسے دیکھا اور ایک طرف مڑ کر چلی گئی۔ میں سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ اسے آواز دوں یا کیا کروں۔

دوسری شام اس نے مجھ سے ملاقات کی اور اس کا پہلا سوال ہی یہی تھا۔ "وہ عورت کون تھی۔"

یہی موقع تھا کہ اسے نگہت کے بارے میں بتا دیا جائے۔ "فائزہ۔ وہ میری بیوی تھی۔"

"بیوی۔" اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ "تو تم شادی شدہ ہو۔"

"ہاں۔ اور یہ مجبوری کی شادی تھی۔" میں نے بتایا۔ "اور آج تک میرے ذہن اور دل نے اسے اپنی بیوی تسلیم نہیں کیا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ہے تو تمہاری بیوی۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "میں نے تو اپنے گھر والوں سے تمہاری بات تک کرلی تھی اور جب انہیں

یہ معلوم ہوگا کہ میں ایک شادی شدہ مرد کے لیے پاگل ہورہی ہوں تو خود سوچو۔ ان کا کیا حال ہوگا۔"

"مجھے اس کا احساس ہے فائزہ۔"

"کیا فائدہ ایسے احساس کا۔" اس کی ناراضگی بڑھتی جارہی تھی۔ "خود سوچو۔ میں تمہیں اس حال میں کیسے اپنا سکتی ہوں۔ محبت کے اس کھیل کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اب میرے اور تمہارے راستے الگ ہورہے ہیں۔"

"نہیں فائزہ پلیز۔ ایسا مت کرو۔" میں بلبلانے لگا۔ "زندگی میں پہلی بار تم ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح میری زندگی میں آئی ہو۔ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ میں تو تمہارے بغیر ادھورا رہ جاؤں گا۔"

"اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم دو منزلوں کے مسافر ہیں۔"

وہ چلی گئی۔ ناراض ہوکر گئی تھی۔

میں بہت دیر تک اس ہوٹل میں خاموش بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں فائزہ سے دست بردار ہوجاؤں۔ زندگی نے پہلی بار مجھ پر ایک مہربانی کی تھی۔ میں اس مہربانی سے کیسے منہ موڑ سکتا تھا۔

اس دن کے بعد سے نگہت اور زیادہ بری لگنے لگی تھی۔ اس کی صورت تک دیکھنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوگیا تھا میرے ساتھ۔

میں فائزہ کو فون کیا کرتا۔ وہ یا تو میرا نمبر دیکھ کر فون کاٹ دیتی یا پھر مختصر بات کر کے سلسلہ ختم کردیتی۔ اور جب صورت حال میرے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت ہوگئی تو ایک دن میں نے حتمی فیصلہ کر کے اسے فون کیا۔ "فائزہ۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ فوری طور پر۔"

"سمجھ میں نہیں آتا ریحان کہ تم بار بار مجھے کیوں فون کرتے ہو۔"

"اس لیے کہ میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور آج کی ملاقات بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گی۔"

جب وہ ملی تو میں نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "فائزہ۔ میں نگہت کو طلاق دے رہا ہوں۔"

"یہ سب زبانی باتیں ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ کیونکہ تم میرے لیے ناگزیر ہوگئی ہو۔"

"دیکھو۔ صرف میرے لیے ایسا مت کرو۔"

"تمہارے لیے نہیں کررہا۔ اپنی خوشی کے لیے کررہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ میں اسے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ اپنی تمام تر نفرتوں کے باوجود۔ کیونکہ اسے طلاق دینے میں میری ہتک تھی۔"

"وہ کس طرح۔"

"اس لیے کہ وہ مجھ سے طلاق چاہتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"سمجھ گئی۔ اور تم اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو۔"

"ہاں۔ ایسا ہی سمجھ لو۔ میں اس عورت کو تڑپانا چاہتا تھا لیکن تمہاری وجہ سے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اور اب میں اسے طلاق دے رہا ہوں کیونکہ میرے نزدیک تمہاری اہمیت ہے نگہت کی نہیں۔"

پھر میں نے نگہت کو طلاق دے دی۔

بہرحال یہ جیسا بھی مرحلہ ہو، گزر ہی گیا۔

نگہت کو طلاق دینے کے بعد کئی دن ضروری کاغذی کارروائیوں میں لگ گئے۔ کونسلر، سٹی گورنمنٹ کی تصدیق۔ وغیرہ، وغیرہ۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے فائزہ کو فون کیا۔ "فائزہ۔ میں نے نگہت کو طلاق دے دی ہے۔ اب یہ بتاؤ میں کب تمہارے گھر آجاؤں۔"

"کبھی نہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں یہی چاہتی تھی کہ تم نگہت کو طلاق دو۔" اس نے کہا۔ "بے وقوف اور بے رحم انسان۔ نگہت میری سب سے اچھی دوست ہے۔ اس نے یہ بتایا تھا کہ تم زبردستی اسے اپنے ساتھ رکھو گے۔ اسے کبھی آزاد نہیں کرو گے۔ اس لیے ہم دونوں نے مل کر یہ ناٹک کیا تھا۔ ورنہ تم... تم تو اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے بات بھی کی جائے۔"

اس نے فون بند کردیا۔ اور میں... میں کہاں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔ اور آج بھی کہیں نہیں ہوں۔ میرے اندر کا ضدی اور خودسر مرد تو نہ جانے کب کا مر چکا ہے۔

□

اپنی آگ

مکرمی مدیر اعلیٰ

السلام علیکم!

یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ اس معاشرے میں عورت کو پیر کی جوتی سمجھا جاتا ہے مگر یہی عورت جب سینہ سپر ہوجائے تو کیسی قیامت لاسکتی ہے آپ بھی ملاحظہ کریں۔ میں نے اپنا نام و پتا غلط لکھا ہے لیکن کہانی حقیقی ہے۔ میں نے یہ جرم کیا ہے۔ ضمیر پر بوجھ ہے اسے ہلکا کرنے کے لیے ہی میں نے اپنا راز کاغذ پر منتقل کیا ہے، اگر پسند آئے تو شائع کردیں۔

عذرا

(کراچی)

میں نے اس کی صورت اس شیشے کے دروازے سے دیکھی تھی جس کے صرف ایک ہی طرف دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صرف میں اسے دیکھ رہی تھی اور پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ میرے اعصاب سنسنا رہے تھے۔ ہاتھ کانپنے لگے تھے۔

میرے پاس کھڑی ہوئی دونوں لڑکیاں بہت غور سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں میری اس بدلتی ہوئی کیفیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اسی لیے شہناز نے میرے

شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیا ہوا چیف، خیریت تو ہے۔“

”ہاں خیریت ہی ہے۔“ میں نے پسینا پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ میری آواز اس وقت ڈوبنے لگی تھی۔

”چیف تو پھر کیا خیال ہے۔“ دوسری لڑکی نسرین نے پوچھا۔

یہ لڑکی مجھے چیف کہا کرتی تھی۔ کیونکہ میں ان کی چیف تھی یا انہوں نے مجھے ایسا سمجھ لیا تھا۔

”بتاؤ چیف۔ تم تو کچھ بیمار دکھائی دے رہی ہو۔“ نسرین نے کہا۔

”دیکھو۔ اس کو کچھ دیر تک یہیں الجھائے رکھو۔“ میں اپنے آپ پر قابو پا کر بولی۔ ”میں اس کے بارے میں بعد میں فیصلہ کروں گی۔ بس اسے جانے نہیں دینا۔“

”اور اگر یہ جانے کی بات کرے تو۔“

”تو پھر تم اچھی طرح جانتی ہو کہ کسی کو کس طرح روکا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

میں اس کمرے سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں آگئی۔ یہ کمرا میرے آرام کے لیے تھا۔ ایک مسہری، ایک میز، دو کرسیاں اور ایک کتابوں کی چھوٹی سی الماری۔

میں یہاں آکر بستر پر بے سدھ ہو کر گر پڑی۔ میرا جسم اس وقت بھی میرے قابو میں نہیں تھا۔ بری طرح لرز رہا تھا۔

آج بھی مجھے اک فیصلہ کرنا تھا۔ لیکن آج تو یہ فیصلہ میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اب سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ ایک لمحے میں فیصلہ کرتی تھی اور اس پر عمل بھی ہو جاتا تھا لیکن آج......

☆☆☆

میری اس کہانی کی ابتدا اب سے دو سال پہلے ہوئی تھی۔

میں ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر جانے والی۔ میرے راستے میں کوئی الٹ پھیر بھی نہیں تھا۔

ایک راہ تھی جو مقررہ وقت سے ہوتی ہوئی اپنی آخری منزل تک چلی جا رہی تھی۔

ہمارے یہاں کی ہر لڑکی کے راستے طے شدہ ہی ہوتے ہیں۔ گھر کے کام کاج، تعلیم اس کے بعد شادی، شادی کے بعد شوہر اور بچے۔ ایک خاص راستہ۔ اور شاید یہی ہر نارمل لڑکی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ الجھے ہوئے واقعات تو بہت کم کسی کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں۔ جیسے میرے ساتھ پیش آگئے تھے۔

میرے ابو ایک سرکاری محکمہ میں کام کیا کرتے تھے۔ ہم سبھوں کی بہت نارمل سی لائف تھی، جس طرح ہوا کرتی ہے۔ دو بہنیں تھیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی تھی اور میں اپنا آخری تعلیمی سال مکمل کر رہی تھی۔

ایک بھائی تھا پرویز جو مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ وہ تعلیم ختم کر کے کہیں ملازمت کر رہا تھا۔ ایک امی تھیں۔ بس یہ تھا پورا گھرانا۔ اور ان ہی کے درمیان میں اپنی آنکھوں میں آنے والے خوش گوار دنوں کے خوش گوار سپنے سجائے زندگی گزار رہی تھی۔

میری صورت شکل بھی بہت اچھی تھی۔

اس لیے ماں باپ یہ سوچا کرتے تھے کہ شاید میرے لیے کوئی شہزادہ کہیں سے آجائے گا۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔

نہ جانے کیوں۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو بھی اپنے آپ کو زیادہ بچا کر اور محتاط ہو کر زندگی گزارتا ہے۔ اس کے ساتھ تماشے ہوا کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ پریشانیاں ہوتی ہیں۔ جبکہ بے باک قسم کی لڑکیوں کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں ہے۔

میں نے اپنے گھر کے کاموں کی وجہ سے ایک صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ میرے پاس ایک موبائل سیٹ تو تھا لیکن اس لیے نہیں کہ میں اس پر کسی سے فلرٹ کرتی پھروں۔ صرف ضروری کاموں کے لیے استعمال کیا کرتی۔

اسی لیے کسی لڑکے سے میری دوستی بھی نہیں تھی۔ بس گھر سے نکلتی۔ جھکی ہوئی گردن کے ساتھ اسٹاپ پر آیا کرتی اور بس پکڑ کر سیدھی کالج پہنچتی۔ وہاں سے سیدھی گھر آجاتی۔ اس کے علاوہ میرا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔

خاندان والے میری فطرت اور صورت شکل کو دیکھ کر کہا کرتے کہ میرا نصیب بہت اچھا تھا۔ لیکن ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ نصیب بنانے والا تو کوئی اور ہے۔ کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

میں گزشتہ کئی دنوں سے یہ دیکھ رہی تھی کہ ایک لوفر لیکن امیر قسم کا نوجوان مجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے شاید میرے لیے ایک قسم کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ وہ صبح اپنی شاندار گاڑی میں اسٹاپ پر آجایا کرتا اور

مجھے دیکھتا رہتا اور جب میں بس میں سوار ہو جاتی تو وہ اپنی گاڑی میری بس کے پیچھے لگا دیتا۔ اس طرح وہ کالج تک چلا آتا تھا۔

کالج سے واپسی میں بھی وہ یہی حرکت کرتا تھا۔ مجھے اس کی نگاہیں اپنے جسم میں اترتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ وہ اس ندیدے پن سے دیکھا کرتا جیسے مجھے کھا جانے کا ارادہ کر چکا ہو۔

میں اس کو دیکھ کر گھبرا جایا کرتی۔ اس کے انداز میں پیار نہیں بلکہ ہوس ہوا کرتی تھی۔ قدرت نے عورت کو یہ صلاحیت تو دے رکھی ہے کہ اسے اچھی بری نگاہوں اور تیور کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

میں نے ایک بار اس وقت اسے جھڑک دیا جب اس نے گاڑی میرے برابر لا کر روک دی۔ اس وقت کالج کی میری دوسری سہیلیاں مجھ سے کچھ فاصلے پر آرہی تھیں۔ اسی لیے مجھے یہ امید تھی کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کر سکے گا۔ اس نے جب گاڑی میرے پاس لا کر روکی تو میں اس پر برس پڑی۔ ”کمینے انسان۔ کیا سمجھ رکھا ہے تو نے۔ خبیث۔ اگر آئندہ اس قسم کی حرکت کی تو منہ لال کر دوں گی۔ دو کوڑی کا انسان۔ یہ سمجھتا ہے کہ ہر لڑکی تیری ماں بہن جیسی ہوتی ہے کہ جس نے چاہا گاڑی میں بٹھا لیا۔“

”لڑکی تو نے مجھے ماں بہن کی گالی دے کر اچھا نہیں کیا ہے۔“ وہ غرایا۔ ”اس وقت تو میں کچھ نہیں کہہ رہا۔ لیکن اب یاد رکھنا۔ میں تیرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

پھر وہ اپنی گاڑی تیزی سے بھگا لے گیا۔ میں بے انتہا خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ایسا میرے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں پسینے پسینے ہو گئی۔ اس دوران دوسری لڑکیاں میرے پاس آگئی تھیں۔ ”کیا ہوا نازو خیریت تو ہے۔“ کسی نے پوچھا۔

”ہاں۔ خیریت ہے۔“ میں پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ لڑکا؟“

”وہی جو اس قسم کے کمینے لڑکے کہا کرتے ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”وہی دھمکی، چھچھورا پن۔“

”خدا غارت کرے ایسے لوگوں کو۔“

”میرا خیال ہے کہ خدا نے ایسے لوگوں کو چھوٹ دے رکھی ہے۔“ نوشین نام کی لڑکی نے کہا۔ ”اس لیے ان کا علاج اب خود ہم ہی کو کرنا ہوگا۔“

نوشین ہمارے گروپ میں سب سے بولڈ قسم کی لڑکی تھی۔

”بہرحال تم محتاط رہنا۔“ فریدہ نے کہا۔ ”یہ کم بخت اپنی ضد میں آکر سب کچھ کر جاتے ہیں۔“

اس کا خوف تو مجھے بھی تھا۔ لیکن میں نے ان لڑکیوں کے سامنے اظہار نہیں کیا۔ اور نہ ہی گھر جا کر کسی کو بتایا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ خوامخواہ سب پریشان ہو جاتے۔

بہتر یہی تھا کہ احتیاط کی جائے۔ جس حد تک بھی ہو۔

کئی دنوں تک میں بہت خوفزدہ رہی۔ لیکن وہ لڑکا اس کے بعد دکھائی نہیں دیا۔ ممکن تھا کہ وہ خوفزدہ ہو گیا ہو یا کسی موقع کے انتظار میں ہو جب مجھ پر ہاتھ ڈال سکے۔

پھر میرا دوسرا اندیشہ ہی درست ثابت ہوا۔ وہ موقع کے انتظار میں تھا۔ اس نے ایک بار کالج سے گھر کی طرف جاتے ہوئے اچانک میرے پاس اپنی گاڑی روکی اور اس میں سے دو آدمی اتر آئے۔

یہ دونوں ہی مسلح تھے۔ جبکہ وہ لڑکا ڈرائیونگ سیٹ ہی پر بیٹھا رہا تھا۔ یہ سب کچھ ایک ہی لمحے میں ہوا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

میں تو اس کی طرف سے کسی حد تک مطمئن ہو چلی تھی کہ اس نے مجھ پر ہاتھ ڈال دیا۔

میں مزاحمت بھی نہیں کر پائی۔ کسی کو اپنی مدد کے لیے آواز بھی نہیں دے سکی۔ ویسے بھی اس شہر میں کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ کون اسلحہ والوں کے سامنے آتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی زندگی پیاری ہوا کرتی ہے۔

مجھے گاڑی میں بٹھا لیا گیا۔

میں نے شور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان میں سے ایک نے میری کمر کے ساتھ اپنا پستول لگا دیا۔ ”بس خاموش۔ آواز نہیں نکالنا۔“

”کیوں۔ مجھے ماں بہن یاد دلا رہی تھی نا۔“ وہ لڑکا غرایا۔ ”اب بتاؤں گا کہ میری ماں بہن کیسی ہیں۔“

”خدا کے لیے جانے دو مجھے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ میں رونے لگی تھی۔

”جان من۔ بگاڑا تو تمہارے حسن نے ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”کباڑہ کر دیا ہے میرا۔ اب میں اس طرح تو نہیں جانے دوں گا نا۔“

بہرحال دو تین گھنٹوں کے بعد جب اس نے مجھے

ایک سڑک پر اترا تو میں لٹ چکی تھی۔ میرے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ میری عزت نفس کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح اپنے گھر پہنچی اور اپنے کمرے میں آکر بند ہوگئی۔ اس نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ برباد کر دیا تھا مجھے۔ تباہ کر دیا تھا۔ اور میرا قصور کیا تھا۔ یہی نا کہ میں خوبصورت تھی اور میرے گھر والے کمزور تھے۔ وہ اس کم بخت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

گھر والوں سے میں نے سر درد کا بہانہ کر دیا تھا۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر روتی رہی تھی۔ پھر بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھال کر گھر والوں کے سامنے آئی تھی۔

ایک دل تو یہ چاہتا تھا کہ میں خودکشی کرلوں۔ عورت کے لیے اس کی ایسی توہین سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ جب جسم کے ساتھ روح بھی مجروح ہو جائے۔

میں نے گھر والوں سے بہانہ کر دیا کہ چونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اسی لیے کچھ دنوں تک کالج نہیں جاسکوں گی۔ کسی اور نے میری اس تبدیلی کو محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن امی نے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگالیا تھا۔ اسی لیے وہ کریدتی رہتیں۔ معلوم کرنے کی کوشش کرتیں لیکن میں اپنے طور پر انہیں مطمئن کر دیا کرتی۔

ایک ہفتہ تک میری یہی حالت رہی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ بار بار اپنی توہین یاد آتی اور میرا خون کھول کر رہ جاتا۔

سب کچھ شاید اسی طرح چلتا رہتا۔ جس طرح ہزاروں لاکھوں لڑکیوں اور کمزور عورتوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ لیکن شاید میرے ساتھ کچھ اور ہونا تھا۔

اس لیے ایک دن ایک پارک میں مجھے ایک لڑکی مل گئی، تحریم۔ میں اکثر اس پارک میں جا کر بیٹھ جایا کرتی۔ سوچتی رہتی۔ میں کہاں سے کہاں آچکی تھی۔

وہ اپنے ہی علاقے کا لیڈیز پارک تھا۔ اس لیے یہ اطمینان تھا کہ وہاں مرد نہیں آسکتے۔ میں کسی اور کی بدنگاہی کا نشانہ نہیں بن سکتی۔

اس شام بھی میں نہ جانے کس قسم کے خیالات میں تھی کہ وہ میرے برابر آکر بیٹھ گئی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ''ہیلو۔ میں تحریم ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''میں عذرا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کیا تم کہیں قریب ہی رہتی ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ دوسری گلی میں میرا گھر ہے۔''

''میں اگر کچھ پوچھوں تو برا تو نہیں مانو گی۔''

''نہیں تو بتاؤ۔ کیا پوچھنا ہے۔''

''میں کئی دنوں سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''بلکہ آبزرو کر رہی ہوں۔ یہ میرا مشغلہ ہے۔ میں تنہا بیٹھے انسان کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کیا کرتی ہوں۔ اور بڑی حد تک صحیح نتیجہ نکال لیتی ہوں۔''

''تو پھر میرے بارے میں بتاؤ۔ تم نے کیا نتیجہ نکالا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ تم کسی کے خلاف سخت غصہ میں ہو۔'' اس نے بتایا۔

''تحریم۔ تم نے تو حیران کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا۔''

''بہت آسانی سے۔'' اس نے کہا۔ ''تم آپ ہی آپ کچھ بولتی رہتی ہو۔ کبھی دانت پیستی ہو۔ کبھی غصے میں آکر اپنی مٹھیاں اس طرح بھینچتی ہو جیسے کسی کو گھونسے مارنے کا تصور کر رہی ہو۔ تو یہ سب اسی بات کی علامت ہے کہ تمہارے سینے میں کوئی آگ بھڑک رہی ہے۔''

''تم۔ واقعی با کمال لڑکی ہو۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔ ''تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔''

''چلو۔ اب اگر مجھ پر اعتماد کرنے لگی ہو تو مجھے بتادو کہ تمہارے سینے میں آگ کیوں لگی ہوئی ہے۔''

میں تو خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ کسی کو اپنا حال بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلوں۔ مجھ پر گھٹن سی طاری ہوگئی تھی۔ اور اس گھٹن نے ذہنی طور پر مجھے مفلوج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر اس لڑکی کو بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

وہ میرے لیے اجنبی تھی۔ اس سے پھر کہاں ملاقات ہونے والی تھی۔ اسی لیے میں نے دبے لفظوں میں کچھ جھجکتے ہوئے اور کچھ شرماتے ہوئے اپنے اوپر گزری ہوئی داستان سنادی۔

وہ بہت دھیان سے سنتی رہی تھی۔

میرے خاموش ہو جانے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''بہت برا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔ لیکن تم کہیں خودکشی کا ارادہ تو نہیں کر رہی ہو۔''

''میں نے سوچا تھا۔'' میں نے سچائی سے کہا۔ ''لیکن پھر۔ جانے کیوں رک گئی۔''

''بے وقوف ہو تم۔ خودکشی تو اسے کرنی چاہیے جس نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔''

''ایسے لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرا کرتے۔''

''مرے گا۔ اگر تم ہمت کرو تو۔'' اس نے عجیب انداز سے کہا۔

''کیا؟'' اب میں چونک پڑی۔ کیونکہ اس کے لہجے میں یقیناً کوئی خاص بات تھی۔ ''تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں نہیں سمجھ سکی۔''

''مصیبت تو یہ ہے کہ عورت نے ہمیشہ خود کو مظلوم اور کمزور سمجھا ہے۔ اس لیے اس کو کھلونا بنایا جاتا ہے۔ وہ تھوڑی سی ہمت کرلے تو ایسے اوباشوں کو سزا بھی دے سکتی ہے۔ ان کو مزہ چکھا سکتی ہے۔''

''میرے لیے تو ناممکن ہے۔ میں اس کا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔''

''پہلے ارادہ پختہ کرو۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم واقعی اس سے بدلہ لینا چاہتی ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہی چاہتی ہوں۔''

''تو پھر جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔'' پھر اس نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

میں اس شخص کی گاڑی کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

اس نے میرے پاس آکر بریک لگادی۔ ''تم۔'' اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا چاہتی ہو؟''

''صرف دو باتیں کروں گی۔'' میں نے کہا۔ ''آج تمہیں مجھے اغوا کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ میں تو خود ہی تمہارے سامنے آکر کھڑی ہوگئی ہوں۔''

اس نے کچھ سوچ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ مطلب یہ تھا کہ میں اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ میں اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''بتاؤ کہاں چلوں؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے فلیٹ۔'' میں نے بتایا۔

''تمہارے فلیٹ۔'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تمہارے دیے ہوئے اس حادثے کے بعد میں اپنے گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔'' میں نے بتایا۔

جانبلاط بشیر

جو غالباً علی کا پوتا تھا۔ عکا کی مسجد کے نمونے کی مختارہ میں مسجد تعمیر کرائی۔ اس نے امیر بشیر ثانی شہاب کی تخت نشینی میں 1202ھ۔ 1788ء میں مدد دی اور ایک عرصے تک اس کا مددگار رہا۔ جب امیر بشیر مصر گیا تو اس نے امیر کی غیر حاضری میں اس کے نائب عباس کو امیر کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ امیر بشیر نے واپسی پر مختارہ کے مقام پر اسے شکست دی۔ 1640ھ۔ 1825ء میں اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ 1841ء میں خاندان شہاب کے سقوط کے بعد عثمانی ترکوں نے شوف کی حکومت کے لیے جانبلاط خاندان کی جگہ خاندان ارسلان کو ترجیح دی۔ سعید جانبلاط نے 1860ء میں قید خانے میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نسیب نے ارسلن کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی اور انیسویں صدی میں ارسلان کو شوف حکومت سے نکال دیا۔

مرسلہ: عارف حسین گردیزی، ملتان

''تو اب کیا کرنے لگی ہو۔'' اس نے پوچھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر تاسف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ بلکہ وہ مسکرا رہا تھا۔ شاید اسے کسی لڑکی کو برباد کر کے اور اس کی دکھ کی داستان سنتے ہوئے خوشی ہو رہی تھی۔

''کرنا کیا ہے مجھے۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ دنوں کے لیے اپنی ایک دوست کے فلیٹ میں آگئی ہوں۔ اس کے ساتھ نوکری تلاش کر رہی ہوں۔''

''اور تمہاری دوست کیا کرتی ہے۔''

''وہ فیکٹری جاتی ہے۔ اور شام کو واپس آتی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس وقت بھی وہ فیکٹری میں ہوگی۔''

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ شاید اسے ایک اور موقع ملنے والا تھا۔ ''کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں۔'' اس نے پوچھا۔

''میرے لیے اور کیا رہ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تو سوائے تمہارے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ میں تو اس لیے تمہاری گاڑی کے سامنے آئی تھی کہ یا تو تم مجھے قبول کرلو یا پھر موت دے دو۔ کیونکہ میں تو اب کہیں بھی

نہیں جاسکتی۔ میرے سارے راستے تمہاری طرف آکر بند ہوگئے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔" اس نے گردن ہلائی۔ "پریشان نہ ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں اسے باتوں میں لگا کر فلیٹ تک لے آئی۔ ایسی باتوں کی ٹریننگ مجھے تحریم ہی نے دی تھی۔ اور میں خود کو پہلے سے کہیں زیادہ بااعتماد محسوس کرنے لگی تھی۔

فلیٹ کی چابی میرے ہی پاس تھی۔

وہ اندر آکر بہت خوش ہوگیا تھا۔ "واہ۔ یہ تو بہت پرسکون فلیٹ ہے۔"

"تم بیٹھو میں چائے لے کر آتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہم باتیں کریں گے۔"

ساری کارروائی چائے کے ساتھ ہونی تھی۔ اس وقت میں بہت پرجوش ہورہی تھی۔ اس کمینے کی اس حرکت کے بعد میرے لیے زندگی کا مفہوم ختم ہوچکا تھا۔ لیکن تحریم سے ملنے کے بعد ایک مقصد سامنے آگیا تھا۔ اس مقصد نے مجھے پرجوش کردیا تھا۔ اب نئے انداز سے جینے کا حوصلہ مل گیا تھا مجھے۔

چائے کے کپ میں ذرا سی دوا ملانا کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ میں نے اس کے سامنے چائے کی پیالی کے ساتھ کیک بھی رکھ دیا تھا۔ "لو۔ شروع ہوجاؤ۔ میں چینج کرکے آتی ہوں۔"

میں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں تحریم موجود تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے اب تک کی کارروائی بتائی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے بھی سرگوشی کی۔ "میں بھی تیار ہوں۔"

میں ایک بھڑکا دینے والا لباس پہن کر جب اس کے سامنے آئی تو وہ خباثت بھرے انداز میں مسکرانے لگا۔ اس نے اپنی سگریٹ جلالی تھی اور چائے ختم کرچکا تھا۔

"واہ۔ بہت۔ بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔" اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"اب میں اس قسم کے لباس پہننے لگی ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اچ۔ اچھا۔ اچھا کرتی ہو۔" اپنی آواز کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ڈولنے لگا تھا۔

پھر سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ وہیں صوفے پر لڑھک گیا تھا۔ بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں نے نیچے گری ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر تحریم کو آواز دی۔ "آجاؤ۔"

تحریم اپنے ہاتھ میں ایک سرنج لیے داخل ہوئی جس میں کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ اس نے پاس آکر اس کو دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ "ذلیل انسان۔ اب تم کسی اور کو برباد کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"تحریم۔ ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ انجکشن کام کرتا ہے۔"

"ایسا ویسا۔ یہ کوریا والوں کی تیکنیک ہے۔ وہاں ایسے جنسی درندوں کو یہ انجکشن لگاتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہوجاتا ہے۔"

میں نے بے ہوشی کی حالت میں اس کی آستین اٹھادی۔ تحریم نے پوری مہارت سے سرنج کا محلول اس کے جسم میں اتار دیا۔ "بس۔ اب یہ دس منٹ کے بعد ہوش میں آجائے گا۔" اس نے کہا۔ "اس کے بعد تم اس کو جتنا مشتعل کرسکتی ہو۔ جنسی تحریک دلاسکتی ہو۔ وہ کرنا۔"

"فرض کرو اگر اس انجکشن نے کوئی کام نہیں کیا تو۔"

"اول تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر میں دوسرے کمرے میں موجود ہوں۔ تمہاری ایک آواز پر آجاؤں گی۔"

تحریم پھر کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ دس بارہ منٹ کے بعد اسے ہوش آگیا تھا۔ وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا تھا تم کو۔" میں نے پوچھا۔ "تم نے اپنی سگریٹ بھی نیچے گرادی تھی۔"

"پتا نہیں کیا ہوا تھا۔" اس نے کہا۔ "شاید نیند آگئی تھی۔ لیکن ایسی نیند تو پہلے کبھی نہیں آئی۔"

"بلڈ پریشر چیک کرالینا۔ اس کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے۔ خیر۔ یہ بتاؤ تمہارا کیا پروگرام ہے۔" اس نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر ہوس جاگنے لگی تھی۔

"کچھ نہیں۔ کچھ دیر تمہارے ساتھ بیٹھنا ہے۔ اس کے بعد میری دوست آجائے گی۔"

"کہاں بیٹھنا ہے۔" اس نے پوچھا۔ "یہیں۔"

"نہیں۔ کمرے میں چلتے ہیں۔"

وہ سرشار ہو کر میرے ساتھ کمرے میں آگیا۔ یہاں

میں نے اپنے آپ کو اور بھی ایکسپوز کر دیا تھا۔ پھر اس کی بے تابی ندامت، جھلاہٹ، شرمندگی یہ سب دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ دیوار سے سر ٹکرانے لگا تھا۔ اپنے بال نوچنے لگا تھا۔ انجکشن نے کمال کا اثر دکھلا دیا تھا۔ وہ کسی قابل ہی نہیں رہا تھا۔

تحریم نے یہی بتایا تھا کہ انسان ہمیشہ کے لیے بے کار ہو جاتا ہے۔ وہ تڑپتا ہے۔ مچلتا ہے۔ فریاد کرتا ہے لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ اور اس کا اثر بھی وقتی نہیں بلکہ دائمی ہوتا ہے۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے کیا ہو گیا ہے۔" وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ "تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا۔"

"کیسی بات کر رہے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے لیکن یہ تو پتا چلے کہ کیا ہوا ہے۔"

"میں۔ میں۔" وہ کچھ بتا نہیں پایا۔ اس نے اپنے آپ کو سمیٹا اور نہ جانے کیا کیا بولتا ہوا اس کمرے اور اس فلیٹ سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد تحریم دوسرے کمرے سے آ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ پڑے تھے۔ "مبارک ہو۔"

تحریم نے کہا۔ "تم نے اس کا کام اتار دیا۔ اسے کہتے ہیں انتقام۔ کسی کو مار دینا کوئی بات نہیں ہوتی۔ اصل انتقام تو یہ ہے جو تم نے آج اس سے لے لیا ہے۔ اب یہ زندگی بھر روتا اور سسکتا رہے گا۔ لڑکیاں اس کے اختیار میں ہوں گی لیکن یہ خود بے اختیار ہوگا۔"

تو یہ راہ مجھے تحریم نے دکھائی تھی۔

اس نے ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کا بھائی کوریا میں ڈاکٹر تھا۔ وہ اس کے ذریعے انجکشن منگوالیا کرتی۔ وہ نوجوان تو آغاز تھا۔

اس کے بعد ہم نے اور کئی اوباش لوگوں کا اسی طرح علاج کیا۔ تحریم دو اور لڑکیوں کو لے آئی تھی۔ یہ دونوں بھی ایسے ہی نوجوانوں کے ہاتھوں برباد ہو چکی تھیں۔

تحریم نے انہیں ٹریننگ دی۔ ان کو بدلے کے لیے اکسایا۔ یہ کہا کہ عورت اس لیے پیدا نہیں ہوئی کہ مظلوم بن کر صرف آنسو ہی بہاتی رہے۔ بلکہ اسے آگے بڑھ کر اپنا حق وصول کرنا ہے اس معاشرے سے۔ بدلہ لینا ہے ایسے لوگوں سے جو عورت کو صرف کھلونا سمجھتے ہیں۔

ان لڑکیوں نے کئی ایسے اوباش نوجوانوں کو گھیرا۔ انہیں تحریک دے کر فلیٹ میں لائیں اور ان اوباش نوجوانوں کو ناکارہ کر کے واپس بھیج دیا گیا۔

اب وہ جہاں بھی ہوں گے۔ اپنی بوٹیاں نوچ رہے ہوں گے۔

تحریم کی شادی ہو گئی۔ وہ امریکا چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کی جگہ لے لی۔ لڑکیاں مجھے چیف کہا کرتی تھیں۔

☆☆☆

اور آج جب ایک اور نوجوان اس فلیٹ میں لایا گیا تو وہ ایک سوالیہ نشان ایک امتحان کی طرح میرے سامنے تھا۔

کیا میں اپنے بھائی کے ساتھ بھی ایسا کر سکتی تھی۔

ہاں۔ وہ میرا بھائی تھا، میرا چھوٹا بھائی جو عیاشی کے راستے پر چل نکلا تھا۔ میں اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس کے لیے سوچتی رہتی کہ اس کی پسند کی بیوی لے کر آؤں گی۔

میرے پاس کھڑی ہوئی لڑکی شہناز میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ "کیا بات ہے چیف۔ کیا ہوا ہے تم کو۔ تم اس نوجوان کو دیکھ کر کیوں بے حال ہو گئیں۔"

میں نے شہناز کو بتا دیا۔ "شہناز۔ وہ۔ وہ میرا بھائی ہے۔"

"اوہ۔" شہناز نے ایک گہری سانس لی۔

"اس کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو ہم نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔ وہ میرا بھائی ہے۔ لیکن ہے تو مرد۔ ایک اوباش اور بگڑا ہوا نوجوان۔ اسے بھی سزا ضرور ملنی چاہیے۔"

پھر میرے اشارے پر اسے بھی انجکشن لگا دیا گیا۔

وہ میرا آخری کام تھا۔ اس کے بعد میں نے یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ مجھے کسی کو سزا دینے کا اختیار کہاں تھا۔ میں نے قانون کیوں اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا؟

شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنا انصاف اپنے خدا پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ لیکن میں تو بدلے اور انتقام کی راہ پر چل پڑی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج میں خود اپنی لگائی ہوئی آگ میں اس طرح جل رہی ہوں کہ جب میں اپنے بھائی کو شادی سے انکار کرتے اور اپنے کمرے میں چھپ چھپ کر روتے ہوئے دیکھتی ہوں تو خود میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

آٹھ لاکھ

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ کیسی کیسی زندگی گزار رہے ہیں اس بارے میں آپ بھی جانتے ہوں گے سو میری ایک واقف کار بھی عجیب سی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ میرے لیے کبھی بہت اہم تھی اس لیے میں اس کی روداد لکھ رہا ہوں۔ اس روداد کا ایک کردار میں بھی ہوں اس لیے خود بیتی کے انداز میں لکھا ہے۔ پلیز اسے شائع ضرور کریں۔

اختر
(لاہور)

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے دیکھ کر دل کی عجیب حالت ہوئی تھی۔ نہ جانے اس نے کس بے چارے کو پھانس رکھا تھا۔

اس کے ساتھ ایک بہت معقول صورت معزز سا شخص تھا۔ دونوں ایک شاندار گاڑی سے اترے تھے اور ایک شان کے ساتھ ایک بڑے سُپر اسٹور میں داخل ہو گئے تھے۔

میں اس عورت کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ نادیہ نام تھا اس کا۔ اب سے دس سال پہلے وہ بہت خوبصورت

اور بہت جوان ہوا کرتی تھی۔ ویسے آج بھی اس کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ اس کی دل کشی ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ شاید پہلے سے زیادہ اچھی ہوگئی ہے۔

نادیہ ہمارے ہی محلے میں رہتی تھی۔ انتہائی بے دھڑک قسم کی لڑکی۔ جس کے والدین بھی اس سے تنگ آچکے تھے۔ وہ محلے کے مردوں اور لڑکوں کو دل بھر کر بے وقوف بنایا کرتی۔

ہر ایک سے اس کے تعلقات تھے اور ہر ایک سے وہ پیسے کھینچا کرتی۔ لیکن میں ایسا بے وقوف تھا جو اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔

وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں شاید واحد آدمی تھا جو اسے نصیحت کرنے کے موڈ میں ہوا کرتا اور وہ میری بات سن کر مذاق میں اُڑادیا کرتی۔ ''ارے جانے دیں اختر صاحب! زندگی انجوائے کرنے کا نام ہے اور انجوائمنٹ مفلسی میں نہیں ہوتی۔ اس کے لیے پیسے درکار ہوتے ہیں۔''

''چاہے پیسوں کے لیے عزت ہی کیوں نہ چلی جائے۔''

''عزت وغیرہ پرانے زمانے کی باتیں تھیں۔ آج کی عزت دولت ہے۔''

''کیا مطلب! کیا دولت کے لیے تم کسی کے بھی ساتھ رات بسر کرسکتی ہو۔''

''کیوں نہیں، اگر کوئی ڈھنگ کی قیمت لگادے تو۔'' وہ ہنس کر کہتی اور میں بھنا کر رہ جاتا۔

میں جانتا تھا کہ وہ ابھی خراب نہیں ہوئی ہے۔ وہ صرف باتیں کرتی ہے۔ اور بے وقوف بنانے کا عمل جاری رکھتی ہے۔ اس لیے میں اسے سمجھایا کرتا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

وہ کئی بار مختلف لوگوں کے ساتھ کئی مقامات پر بھی دکھائی دی۔ ان کے ساتھ ہنستی بولتی ہوئی۔ شاپنگ کرتی ہوئی، نہ جانے اس نے اپنی زندگی کیسی بنالی تھی۔

جبکہ اس کے والدین اور دونوں بھائی بہت سیدھے سادے تھے۔ وہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے شرمندہ شرمندہ سے رہتے۔

ایک بار میں نے اس سے کہا۔ ''نادیہ، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے بے پروائی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے، شادی کیوں کی جاتی ہے۔ ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے۔''

''اور تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟''

''فی الحال آٹھ ہزار ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ آٹھ ہزار میں زندگی اچھی گزر سکتی ہے۔''

''پھر تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے جل کر پوچھا۔

''کم از کم آٹھ لاکھ۔'' اس نے بتایا۔ ''تب جا کر میں خود کو ایڈجسٹ کرسکوں گی۔''

''اور اسی چکر میں تباہ ہوجانا۔''

''یہ میرا ایجنڈا ایک ہے۔ دیکھو اختر، میرے اور تمہارے درمیان محبت کا رشتہ ہے۔ بس محبت کرتے رہو اور خوش رہو۔ شادی وغیرہ کی کوشش نہ کرنا۔ ہاں، اگر تم مجھ سے کچھ سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں اس کے لیے حاضر ہوں۔''

''نہیں، مجھے ایسے کسی سکون کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بے وقوف ہو تم۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ورنہ دوسرے تو موقع کے انتظار میں رہتے ہیں۔''

میں اسے برا بھلا کہہ کر واپس آگیا۔

ایک دن میں نے نادیہ کو جبار کے ساتھ دیکھ لیا۔ جبار دوسرے محلے کا ایک بدمعاش قسم کا آدمی تھا۔ اس کی ساکھ اچھی نہیں تھی۔ وہ ایک شرابی اور عیاش آدمی تھا۔ اس کا ایک ہوٹل بھی تھا جو بہت اچھی طرح چل رہا تھا۔ جبار کو نادیہ کے ساتھ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ یہ لڑکی خدا جانے کیوں اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

میں نے یوں ہی سرسری انداز میں اس سے دریافت کیا۔ ''میں نے کل تمہیں کسی کے ساتھ دیکھا تھا۔''

''جبار کے ساتھ دیکھا ہوگا۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''کیا تم جانتی ہو کہ جبار کس قسم کا آدمی ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں۔ لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے پیسوں سے دلچسپی ہے۔ وہ ہر رات کے پانچ ہزار روپے دیا کرتا ہے۔''

''کیا؟'' میں سکتے میں آگیا تھا۔ ''نادیہ، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''تم جانتے ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتی۔''

''اور اب تک کتنی بار اس کے پاس جاچکی ہو۔''

''پرسوں تیسری بار گئی تھی۔ پیسوں کی ضرورت تھی اس لیے۔''

''شرم نہیں آئی تمہیں۔''

''زیادہ باپ بننے کی کوشش مت کرو۔'' اس نے کہا۔ ''اگلے ہفتے مجھے پھر دس ہزار کی ضرورت ہے۔ کیا دے سکو گے۔''

''میں کہاں سے دوں گا؟''

''تو پھر کیوں لیکچر دیتے ہو۔''

''نادیہ، تم ایک کرپٹ لڑکی ہوچکی ہو۔''

''یہ مجھے خود بھی معلوم ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے لیے کوئی نئی اطلاع نہیں ہے۔''

میری بے وقوفی دیکھیں کہ اس کے باوجود میں اس امید پر اس کی محبت میں گرفتار رہا تھا کہ شاید وہ اپنا یہ انداز ترک کردے گی۔ شاید اسے عقل آجائے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔

اس کی کہانیاں اس محلے سے نکل کر دوسرے محلوں تک جانے لگی تھیں۔ اب گاڑیاں اسے لینے کے لیے آیا کرتیں۔ اس کے جسم پر قیمتی لباس ہوتا۔ ہاتھ میں مہنگا ترین موبائل فون۔

وہ نہ جانے کہاں سے کہاں چلی گئی تھی۔

ایک بار میں نے اس سے آخری بات کی۔ ''نادیہ، اب بہت ہوگئی۔ اب تمہیں میری بات ماننی ہوگی۔''

''چلو بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''شاید تم نہیں جانتیں کہ میری تنخواہ اب پندرہ ہزار ہوچکی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''تو پھر۔'' وہ مسکرادی۔ ''مبارک ہو تم کو۔''

''نادیہ، اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ شادی کرسکوں۔ پندرہ ہزار میں ہم زیادہ آرام سے نہ سہی، لیکن ایک پُرسکون زندگی تو گزار سکتے ہیں۔ وہ زندگی جو ہر لڑکی کے لیے خواب ہوتی ہے۔''

''بھولے میاں، پندرہ ہزار تو میرے دو دن کے اخراجات ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں یہ بتا چکی ہوں کہ تم ان چکروں میں نہ پڑو۔ میرے خواب مت دیکھو۔ میں تمہارے بس کا روگ نہیں ہوں۔''

اس دن پہلی بار مجھے اس پر غصہ آیا تھا۔ ایسا غصہ کہ دل چاہا اس کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن میں کچھ نہیں کرسکا، اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

میرے دوست مجھے سمجھایا بھی کرتے تھے۔ ''یار اختر،

تم بھی کس لڑکی کے چکر میں پڑ گئے ہو۔ بھول جاؤ اس کو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کیسی ہے۔ اس جیسی کرپٹ لڑکی تو شاید پورے شہر میں کوئی نہیں ہوگی۔"

"جانتا ہوں میں کہ وہ حد سے زیادہ آوارہ اور بدچلن ہے۔ اس کے باوجود میں چونکہ اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ہوں۔"

"چاہے وہ تم کو بے وقوف بناتی رہے۔"

"کچھ دنوں کی بات ہے۔ اسے خود ہی میرے خلوص کا احساس ہو جائے گا۔ اس وقت وہ پلٹ کر میری ہی طرف آئے گی۔"

"بس بھائی تم اسی قسم کا خواب دیکھتے رہو۔"

میں نہ جانے کیوں اس کی طرف سے پُرامید تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب وہ بڑی ٹھوکر کھائے گی تو اس وقت سہارے کے لیے میری ہی طرف دیکھے گی۔ اور میں اسے اس وقت اس کے ماضی کی یاد دلائے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لوں گا۔ لیکن میرے یہ خواب ادھورے ہی رہے۔

کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ اور بگڑتی چلی گئی اور نوبت یہاں تک آئی کہ ان لوگوں کو وہ محلہ چھوڑ دینا پڑا۔ وہ بے چارے زیادہ بدنامی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ محلہ ہی چھوڑ گئے۔

نادیہ نے اتنا کرم کیا کہ مجھے فون کے ذریعے اس نے اپنا نیا پتا سمجھا دیا تھا۔ ایک بار میں اس سے ملنے بھی گیا تھا۔ وہاں بھی اس کے وہی لچھن تھے۔

"نادیہ، لگتا ہے تم اب یہاں سے بھی نکالی جاؤ گی۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس محلے میں ایسا نہیں ہوگا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "کیونکہ یہاں میں نے اپنا اسٹائل بدل لیا ہے۔ میں اب محلے سے باہر جا کر کارروائیاں کرتی ہوں۔ اس محلے کے لوگ بے چارے تو میری شرافت کی گواہی بھی دے سکتے ہیں۔"

"لعنت ہو تم پر۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تمہیں اپنے والدین کی عزت کا بھی احساس نہیں رہا۔"

"والدین کی تو بات ہی مت کرو۔ انہوں نے سوائے مفلسی کے اور دیا ہی کیا ہے۔"

"کچھ بھی ہو، وہ تمہارے والدین ہیں۔ انہوں نے تمہیں جنم دیا ہے۔"

"کیا ضرورت تھی جنم دینے کی۔ میں بغیر جنم کے خوش رہتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے نزدیک گناہ اور ثواب کا تصور بھی ختم ہو چکا ہے۔"

"یہ سب کمزور لوگوں کی باتیں ہیں۔ جن کو کوئی راہ نہیں سوجھتی وہ گناہ اور ثواب کا چکر لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

میں نے اس دن بھی اسے شادی کی پیشکش کی۔ لیکن اس نے معمول کے مطابق میرا مذاق اڑا کر رکھ دیا۔ میں بہت خفیف ہو کر وہاں سے چلا آیا تھا۔

میں نے اس کے والدین سے بھی ملاقات کی اور اشاروں میں انہیں نادیہ کی حرکتوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کی۔ نادیہ کے باپ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بیٹے، تم جو کچھ بتانا چاہتے ہو، ہم سب جانتے ہیں۔"

"تو پھر آپ لوگ اس پر کنٹرول کیوں نہیں کرتے؟"

"وہ کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔"

"اس کی شادی کر دیں۔" میں نے کہا۔

"ایسی لڑکی کو کون قبول کرے گا۔"

"میں اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور آج سے نہیں، بلکہ برسوں سے۔"

"اس کی حرکتوں کو جاننے کے باوجود۔"

"جی ہاں، سب کچھ جاننے کے باوجود۔" میں نے بتایا۔ "میں نہ جانے کتنی بار اسے شادی کے لیے کہہ چکا ہوں۔ میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ پندرہ ہزار روپے تنخواہ ہے میری۔ لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ساری زندگی نادیہ کا خیال رکھوں گا۔"

"بیٹے۔" اس کے باپ کی آواز کانپنے لگی تھی۔ "اس دور میں تم ایک بے مثال آدمی ہو۔ تمہارا جذبہ قابلِ قدر ہے۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ اس کم بخت کو تم سے اچھا آدمی اور کون مل سکتا ہے۔ تم بہت جلد نادیہ کو حاصل کر لو گے اور مجھے امید ہے کہ تم اسے خوش بھی رکھو گے۔"

میں واقعی مطمئن ہو گیا تھا۔ کیونکہ پہلی بار میں نے اپنے دل کی بات نادیہ کے والدین تک پہنچا دی تھی۔ دو دنوں کے بعد میرے پاس نادیہ کا فون بھی آ گیا۔

وہ بہت ہی پُرجوش سی ہو رہی تھی۔ "اختر، کیا تم نے میرے ابو سے میرے بارے میں کوئی بات کی تھی؟"

"ہاں، میں نے شادی کی بات کی تھی۔"

"اختر، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "یہ بتاؤ کیا کھلا رہے ہو۔"

"جو تم کہو۔" میں خوش ہو گیا تھا۔

"تو پھر رات کو مدراز پر آجاؤ۔" اس نے کہا۔ "جہاں تم ایک بار مجھے بہت پہلے لے گئے تھے۔"

"ہاں، یاد ہے مجھے۔" میں خوش ہو کر بولا۔ "میں پہنچ جاؤں گا۔"

اب منزل میرے سامنے آگئی تھی۔ وہ منزل جس کا تصور میں نے نادیہ کی ذات سے وابستہ کر رکھا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے تصور میں صرف وہی ہوتی تھی۔

عشق شاید اسی کو کہتے ہیں کہ محبوب کی ہزار خامیوں کے باوجود اس کے علاوہ کسی اور کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔

میں نے اپنی جیب میں پیسے رکھے اور ہوٹل پہنچ گیا۔ چونکہ میں اس سے محبت کرتا تھا اس لیے اس کی پسند ناپسند سب کچھ میرے سامنے تھی۔ میں جانتا تھا کہ اسے کون سا کھانا پسند ہے۔ سوئٹ میں اسے کیا اچھا لگتا ہے۔ اس کا پسندیدہ رنگ کون سا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

کبھی کبھی وہ کہا بھی کرتی تھی "اختر، میرے بارے میں شاید خود مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔"

"محبت کرتا ہوں نا، اسی لیے۔"

"اور شاید تمہاری یہ محبت اٹھارہویں صدی والوں جیسی ہے۔" وہ ہنس دیتی۔ "وہی انداز، وہی پاگل پن۔"

نادیہ ٹھیک وقت پر آئی تھی اور اس نے بھی وہی رنگ پہن کر رکھا تھا جو مجھے پسند تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

اتنی خرابیوں کے باوجود اس کے چہرے کی شادابی اور دل کشی برقرار تھی۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے پوچھا۔ "ہاں بھئی مجنوں صاحب، اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

"وہی جو شروع سے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تو میں نے تمہارے ابو کو بھی اپنا پیغام دے دیا ہے۔"

"اختر، تم شاید یہ سمجھ رہے ہو گے کہ تمہارے اس پیغام کو پا کر میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں گی یا میرا خون بڑھ گیا ہوگا یا میں خوشی سے پاگل ہو کر ناچتی پھروں گی۔" اس کا لہجہ اچانک ہی تبدیل ہو گیا تھا۔

"میں حیرت زدہ سا اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ "نادیہ! تم یہ کیا بولے جا رہی ہو۔"

"اب ہوش میں آجاؤ مسٹر اختر۔" اس کا لہجہ بہت ہی تحقیر آمیز ہو رہا تھا۔ "تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ کیا ہے اوقات تمہاری۔ پندرہ ہزار مہینے پر مجھ سے شادی کرنے چلے ہو۔"

آکسی میٹر

خون میں موجود آکسیجن کی مقدار کی پیمائش کرنے کا آلہ، اس کا سینسر کان کی لو یا انگلی پر لگایا جاتا ہے، اس سینسر کے ذریعے کان کی لو یا انگلی میں روشنی کی دو مختلف طول موج (wave length) کی حامل شعاعیں داخل کی جاتی ہیں اور پھر موازنہ کیا جاتا ہے جس سے انسانی خون میں آکسیجن کی مقدار معلوم کی جاتی ہے۔ ان دونوں شعاعوں میں سے ایک کا طول موج 800 ن م جبکہ دوسری کا 640 ن م (NM) ہوتا ہے۔ خون میں آکسیجن کی مقدار مناسب ہونے کی صورت میں 640 این ایم کی طول موج والی شعاع کے طول موج میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: اطہر حسین، کراچی

"سکون کے لیے پندرہ ہزار بہت ہیں۔"

"جہنم میں جائے ایسا سکون۔"

"نادیہ، شاید تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔" مجھے بھی غصہ آتا جا رہا تھا۔

"ہوش ہی میں ہوں۔ بے ہوش ہوتی تو تم جیسوں سے شادی بھی کر لیتی۔" اس نے کہا۔ "میں اتنے دنوں تک تمہارے ساتھ اس لیے ہنستی بولتی رہی ہوں کہ تم پر ترس آتا تھا۔ اس کے علاوہ تم اور کسی قابل نہیں ہو۔"

"نادیہ، تم اپنے حق میں بہت برا کر رہی ہو۔" میں غصے سے کھولنے لگا تھا۔

"پلیز اختر صاحب، آئندہ سے اس قسم کی باتیں مت کرنا۔" وہ جانے کے لیے اٹھ گئی۔

یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا پہاڑ بھی سر سے گزر جائے تو احساس نہیں ہوتا اور کبھی ایک کنکر بھی ہوش ٹھکانے لگا دیتا ہے۔

اور یہ ہی ہوتا ہے کہ محبت کرنے والے کبھی کبھی بے انتہا نفرت بھی کرنے لگتے ہیں۔ میرے دل میں اب اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی تھی بلکہ اس سے نفرت ہو گئی

تھی، بے پناہ نفرت۔
اس کی آخری ملاقات اور اس کی باتوں نے مجھے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔ اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ شاید میں کسی بھی قابل نہیں تھا۔ ایک ناکام انسان تھا۔ ایسا انسان، جس کو نادیہ جیسی لڑکی نے بھی ٹھکرادیا تھا۔ اس کے بعد میں نے نادیہ سے ملاقات کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس کی ٹوہ میں لگا رہا۔
انتقام محبت اور نفرت ہی کے امتزاج کا نام ہوتا ہے۔ میں اب اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ کسی طرح بھی ہو اور انتقام بھی شدید لینا تھا۔
اور پھر اچانک پتا چلا کہ ان لوگوں نے وہ محلہ بھی تبدیل کردیا ہے۔ وہ کہیں اور چلے گئے ہیں۔ کہاں، یہ میں نہیں جانتا تھا۔
ان کے محلے والوں سے پتا چلا کہ نادیہ کی حرکتوں کی وجہ سے محلے والوں نے ہنگامہ کرکے ان لوگوں کو وہاں سے نکلوادیا تھا۔
میں افسوس کرتا رہ گیا۔ میں اس کم بخت سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ میں نے انتقام کی جو ترکیب سوچی تھی وہ بہت ہی غیر مہذب، وحشیانہ ترکیب تھی۔ لیکن اس سے آسان ترکیب ہو بھی نہیں سکتی تھی۔
میں نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس کا چہرہ ہی تو ساری خرابیوں کی جڑ تھا۔ اس چہرے نے اتنے فتنے جگائے تھے۔
لیکن وہ کم بخت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔
ہوسکتا ہے وہ لوگ شہر ہی چھوڑ گئے ہوں۔ کیونکہ شہر میں ہوتے تو کبھی نہ کبھی ضرور دکھائی دے جاتے اور اس طرح کئی برس گزر گئے۔
میں شاید اسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ اچانک دکھائی دے گئی۔
ایک شاندار گاڑی سے اترتی ہوئی۔ اس کے ساتھ وہ باوقار اور خوبصورت آدمی اس کا شوہر ہی ہوسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔
جس طرح اس نے میری زندگی برباد کی تھی، اس طرح میں بھی اسے برباد کردینا چاہتا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ مجھے اچانک نظر آگئی تھی۔
اب اس وقت اس پر تیزاب پھینکنے کا موقع تو نہیں تھا۔ پھر کیا ہوسکتا تھا۔

ہاں، ایک طریقہ اور بھی تھا۔ اس کے شوہر کو بدگمان کرنے کا۔ نادیہ کی زندگی کو جہنم بنانے کا۔ اس کے لیے مجھے تھوڑی سی دلیری سے کام لینا ہوتا۔
کچھ دیر کے بعد دونوں اسٹور سے باہر آتے ہوئے دکھائی دے گئے۔
میں فیصلہ تو کرہی چکا تھا۔ اسی لیے لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ نادیہ نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ ”یار نادیہ! کہاں غائب ہوگئی تھیں۔“ میں نے بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ ”میں تو پورے شہر میں ڈھونڈتا رہا ہوں۔“
اس وقت میں اس کے شوہر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا کہ اس کے چہرے کے کیا تاثرات ہوں گے۔
”اختر، کیسے ہوتم؟“ نادیہ نے پوچھا۔
”میں تو ٹھیک ہوں۔ لیکن جن لوگوں کو تم بے وقوف بنا کر محلے سے بھاگی ہو وہ تمہیں یاد کررہے ہیں۔“
”مسٹر میری طرف دیکھیں۔“ اس آدمی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میں نادیہ کا شوہر ہوں۔“
”اوہ، آپ نادیہ کے شوہر ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ تو مجھے بہت شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ محترمہ......“
”آپ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نادیہ کا کردار خراب رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بہت سے لوگوں سے اس کے تعلقات رہے ہیں۔“
”جی ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔“
”تو پھر آپ یہ جان لیں کہ یہ سب، مجھے معلوم ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”نادیہ نے کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی ہے۔“
”اور شاید تم اس چکر میں ہوگے کہ مجھے بلیک میل کرسکو۔“ نادیہ نے کہا۔ ”بے وقوف آدمی! یہ تو دیکھو کہ تم میرے شوہر سے بکواس کیے جارہے ہو اور میں اتنے اطمینان سے کھڑی ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں انہیں سب کچھ بتا چکی ہوں۔ اس لیے تم ان کو بدگمان نہیں کرسکتے۔ اور ہاں، ایک بات تمہیں یاد ہوگی، تم نے جب مجھ سے شادی کی بات کی تھی تو میں نے کہا تھا کہ آمدنی کم از کم آٹھ لاکھ ہونی چاہیے۔ اب یہ دیکھ لو کہ یہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے بھی ہیں اور ان کی آمدنی بھی آٹھ لاکھ ہے۔“
اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جبکہ میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہ گیا تھا۔

آشیانہ ابدی

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم!
ہمارا معاشرہ کس طرح اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ لالچ میں ہم کس قدر اندھے ہوچکے ہیں کہ عاقبت کو پوری طرح بھلاچکے ہیں۔

مکرم شاہ
(کراچی)

رفیع مرزا سے میری ملاقات بیس برس پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے اسٹیٹ کا کام شروع کیا تھا۔ رفیع مرزا اس وقت بھی اسٹیٹ کی دنیا کا ایک بڑا نام تھا مگر نیک نام نہیں تھا۔ اسکیمیں ایسی تھیں جو اس نے لوگوں کے ہاتھ بیچی تھیں اور اب وہ بے چارے روتے پھر رہے تھے۔ کیونکہ دونوں اسکیمیں ایک ہی زمین پر تھیں۔ پہلے اس نے سوسائٹی کے نام سے پیرہائی وے پر زمین حاصل کی اور پھر اسے فروخت کرکے سوسائٹی کا نام بدل دیا اور اسے پھر

فروخت کر دیا۔ شہر قائد میں افغانیوں کی آمد سے ایک نئے کلچر کا آغاز ہوا۔ زمینیں... جو بے آباد پڑی تھیں قبضے کر کے بیچی جانے لگیں۔ پہلے سرکاری زمینوں کی باری آئی اور پھر نجی اسکیموں پر بھی قبضے ہونے لگے۔ قبضہ گروپ پہلے ان زمینوں پر ایک کچی بستی بسا دیتے اور پھر آس پاس کی زمینوں کی حد بندی کر کے پلاٹ بیچنا شروع کر دیتے۔ جب لوگ یہاں آباد ہو جاتے تو جوڑ توڑ کر کے بجلی، پانی اور گیس کا بندوبست کر لیا جاتا تھا۔ ایک بار یہ چیزیں آجاتیں تو آبادی کے لیز ہونے کی راہ ہموار ہو جاتی۔ یہ کھیل گزشتہ تیس برس سے مسلسل کھیلا جا رہا ہے۔

1993ء میں یہ سب زور و شور سے جاری تھا۔ اسٹیٹ کا کام شروع کرنے کے بعد یہ ساری باتیں میرے علم میں آئی تھیں۔ میں نے یونیورسٹی روڈ پر آفس کھولا تھا۔ شروع میں اکیلا کام کرتا تھا۔ جب کام بڑھا تو ایک لڑکا رکھ لیا جو دفتر میں بیٹھتا تھا اور خود میں گاہکوں کے ساتھ پھرتا تھا۔ ان ہی دنوں میری رفیع مرزا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی اسکیم کے پلاٹ سیل کر رہا تھا اور اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ بچ جانے والے پلاٹ تھے جو سیل ہونے سے رہ گئے تھے۔ اب وہ انہیں اسٹیٹ کا کام کرنے والوں کے توسط سے نکالنا چاہتا تھا۔ مجھے اس اسکیم کا پتا چل گیا تھا کہ یہاں پلاٹ دو بار بیچے ہوئے تھے اور بعض پلاٹوں کی تو تین فائلیں بھی تھیں اور میں یہ سب خود دیکھ چکا تھا۔ رفیع مرزا ہمارے ذریعے کام نکلوانا چاہتا تھا۔

دنیا میں کچھ کاروبار ایسے ہیں جن میں جھوٹ کے بغیر گزارا نہیں ہے۔ اس میں جتنا قصور کاروبار کرنے والے کا ہوتا ہے اتنا ہی گاہک کا بھی ہوتا ہے۔ اگر آدمی سو فیصد سچ بولے تو کام نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اگلا یہ سوچ کر آتا ہے کہ اسے جھوٹ ہی سننے کو ملے گا۔ ایسا ہی ایک کام اسٹیٹ کا بھی ہے۔ یہاں سچ بولا جائے تو اسے جھوٹ سمجھا جائے گا اور جب جھوٹ بولا جائے تب ہی کام چل سکتا ہے۔ لیکن جب میں نے کام شروع کیا تب ہی سوچ لیا تھا کہ دو نمبر سے گریز کروں گا۔ اللہ معاف کرے جھوٹ تو میں بھی بولتا ہوں اور دن بھر بولتا ہوں لیکن سودے اصلی کراتا ہوں۔ بیس سالوں کے دوران میں نے کبھی ایسا سودا نہیں کرایا جو دو نمبر ہو جس میں زمین یا جائداد قبضہ کرنے والا کسی بھی طریقے سے اسے فروخت کر رہا ہو یا کوئی خرید رہا ہو۔ اس لیے جب رفیع مرزا نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے انکار کر دیا حالانکہ وہ دس فیصد کمیشن دے رہا تھا جب کہ عام سودوں میں ہمیں روپیہ کر دو فیصد کمیشن ملتا ہے۔

میرا تعلق حیدرآباد کی ایک پڑھی لکھی سندھی فیملی سے ہے۔ ہمارا... خاندان صدیوں سے تعلیم سے منسلک ہے۔ چھ نسل پہلے ہمارے بزرگ سمرقند سے آئے تھے اور سندھ میں آباد ہوئے، ان کے علم و فضل کی وجہ سے مقامی حکمرانوں نے قدر کی اور زمینیں بھی دی تھیں۔ مگر میرے بزرگ تعلیم سے وابستہ رہے۔ میرے والد اور دو چچا کالج اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر تھے۔ میرے بھائی بھی پڑھ لکھ کر اسی میدان میں آئے۔ مجھے بھی کراچی یونیورسٹی تعلیم کے لیے بھیجا تھا لیکن میں نے آنرز کر کے آگے تعلیم ترک کر دی۔ اصل میں، میں نے پسند کی شادی کر لی تھی اور گھر والے اس پر ناراض تھے۔ ان کی طرف سے مالی سہارا ختم ہوا تو مجبوراً مجھے روزگار کے لیے تعلیم چھوڑنا پڑی تھی۔ پہلے ایک اسٹیٹ ایجنسی پر کام کیا اور پھر اپنی ایجنسی کھول لی۔ اللہ نے کام میں برکت دی۔ کچھ عرصے بعد میں نے سفاری پارک کے قریب گلستان جوہر میں فلیٹ لے لیا۔ بیوی بچے خوش تھے کیونکہ فلیٹ لگژری اور ماحول بہت اچھا تھا۔ تیسری منزل سے سفاری پارک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ پھر یہ جگہ مجھے کام سے بھی قریب پڑتی تھی۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا اس لیے بھی رفیع مرزا کو جواب دے دیا۔

"معاف کیجیے گا مرزا صاحب، میں دو نمبر سودے نہیں کراتا۔"

"تب یہیں بیٹھے رہنا۔" اس نے طنزیہ انداز میں میری ایجنسی کا جائزہ لیا۔ یہ چھوٹی سی دس بائی بارہ کی دکان میں تھی۔ اچھا لیکن سادہ فرنیچر اور سامان تھا۔

"کوئی بات نہیں اللہ یہاں بھی روزی دے رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "بہت گناہ گار ہوں لیکن اس کا شکر اسی طرح ادا کر سکتا ہوں کہ اس کے دیے حلال میں حرام کی ملاوٹ نہ کروں۔"

میرے جواب پر رفیع مرزا کا موڈ خراب ہو گیا تھا اور وہ بغیر سلام دعا کے رخصت ہو گیا۔ حالانکہ جب دفتر میں آیا تھا تو اس نے بڑے تپاک سے سلام دعا کی تھی۔ ملازم ریاض نے کہا۔ "مکرم بھائی، یہ بہت اچھی پیشکش لے کر آیا تھا۔ آس پاس کے سارے اسٹیٹ والے اس کے لیے کام کر رہے ہیں۔"

"کرتے رہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو میں کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

ریاض نوجوان تھا اور ذہین بھی تھا۔ اس نے میرے ساتھ رہ کر بڑی تیزی سے کام سیکھا تھا مگر شاید وہ میرے اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ بہر حال وہ ملازم تھا اس لیے چپ رہا۔ چند سالوں میں میں نے اپنی ایک ساکھ بنالی تھی۔ جان پہچان والے آنکھ بند کر کے میرے پاس آتے تھے کہ مجھ سے ان کو نقصان نہیں ہوگا۔ اس لیے کام چل رہا تھا اور اللہ نے نصیب میں جو روزی لکھی تھی وہ مل رہی تھی۔ میں نے رفیع مرزا کا کام نہیں لیا تھا لیکن اس کے بارے میں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اس وقت وہ تقریباً چالیس برس کا تھا۔ اس کے باپ کی معمولی سی اسٹیٹ ایجنسی تھی لیکن جب رفیع مرزا نے ایجنسی سنبھالی تو وہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی تھی۔ چند سال بعد اس نے اپنا دفتر ناگن چورنگی کے پاس ایک بڑی جگہ شفٹ کر لیا۔ پہلے یہ جگہ کرائے پر لی تھی پھر اسے خرید لیا۔ دو نمبر اسکیمیں بنانے کے ساتھ وہ زمینوں پر قبضے کر کے اور وہاں جعلی گوٹھ بسا کر سرکاری اور نجی زمینوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

رفیع مرزا نے کچھ جرائم پیشہ افغانیوں کو ساتھ ملا لیا تھا۔ ان کی مدد سے وہ زمینوں پر قبضے کراتا تھا اور بعد میں جب زمین بک جاتی تو وہاں بسنے والے لوگوں کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا جاتا تھا۔ پھر وہ اس زمین کو جعلی لیز کراتا، وہاں پانی بجلی اور گیس کی سہولت آچکی ہوتی تھی ورنہ وہ خود لے آتا اور پھر اس زمین کو مہنگے داموں فروخت کرتا۔ آج اس شہر میں ایسی کتنی ہی اچھی اور صاف ستھری سمجھی جانے والی آبادیاں ہیں جو باقاعدہ لیز بھی ہیں لیکن درحقیقت انہیں قبضہ کر کے بسایا گیا تھا۔ ان کی مالک حکومت تھی یا پھر عام افراد جو اپنی ملکیت حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ وہ مسلح بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور اپنی جائز ملکیت سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس پہلی ملاقات کے بعد بھی رفیع مرزا سے وقفے وقفے سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ چند سال بعد اس نے پھر مجھ سے رابطہ کیا۔

"مکرم صاحب آپ سے کام ہے۔"

"سائیں حاضر ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر آپ جانتے ہیں بندہ دو نمبر کام نہیں کرتا ہے۔"

"تب ہی تو آپ سے رابطہ کیا ہے ورنہ میرے پاس دو نمبر کام کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے آگے حکم کریں۔"

"ہو سکے تو وقت نکال کر میرے دفتر آجائیں، آپ نے دیکھا نہیں ہے تو...."

"دیکھا ہے سائیں۔"

"بس تو کل صبح میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

مجھے رفیع مرزا اور اس کے کام کرنے کا انداز پسند نہیں تھا لیکن کاروبار میں آدمی کو یہ سب نظر انداز بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں اگلے روز مقررہ وقت پر رفیع مرزا کے دفتر پہنچ گیا۔ اس نے گرم جوشی سے سلام دعا کی۔ "کیسے ہیں مکرم شاہ سائیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کہیے کیسے یاد کیا؟"

"وہ بھی بتاتا ہوں، پہلے کچھ ٹھنڈا ہو جائے بہت گرمی ہے آج۔"

اس کا دفتر مکمل اے سی تھا اور گرمی کا نام و نشان نہیں تھا پھر بھی اس نے یخ بستہ جوس منگوا لیا۔ جوس کے دوران وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ اصل موضوع پر آئے۔ ہر اسٹیٹ والا اپنی زبان کی کمائی کھاتا ہے۔ جو جتنا زیادہ چرب زبان اور میٹھے لہجے میں بولنے والا ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ رفیع مرزا جیسے لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بدمعاشی سے کام نکلوانے کا قائل تھا لیکن اس کی بدمعاشی ہر جگہ نہیں چل سکتی تھی۔ ایسی جگہوں کے لیے اس کے پاس زبان موجود تھی۔ وہ مجھے اپنی کامیابیوں کے قصے سنا رہا تھا اور مستقبل کے عزائم واضح کر رہا تھا۔ اس نے اچانک میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"مکرم سائیں، ابھی ایسا وقت آنے والا ہے جب زمین سونا ہو جائے گی۔ لوگ پاگلوں کی طرح پیسا لے کر آئیں گے۔ ایک سودے کے پیچھے دس دس لوگ ہوں گے۔"

میں مسکرایا۔ "ابھی تو حالت یہ ہے کہ دس سودے ہیں اور ایک بندہ بھی نہیں ہے۔"

"بس سائیں کچھ وقت ہے جو اس سے فائدہ اٹھائے گا وہی آگے فائدے میں رہے گا۔"

"ابھی فائدہ کیسے اٹھائے گا۔"

"میں چاہتا ہوں آپ میرے لیے کام کرو۔"

"میں پہلے بھی معذرت کر چکا ہوں...."

"نہ نہ اس بار معذرت نہیں چلے گی، پھر کام بھی ایک نمبر ہوگا۔ اب کیا اعتراض ہے۔"

میں نے غور کیا، اگر کام ٹھیک تھا تو مجھے رفیع مرزا کے کردار سے کیا لینا دینا تھا، میں اپنا کام کرتا اور اپنی روزی کماتا۔ میں نے سر ہلایا۔ "کچھ فروخت کرانا ہے؟"

"خریدنا ہے۔" اس نے کہا تو مجھے تعجب ہوا۔

"سائیں ابھی تو مارکیٹ گری ہوئی ہے۔"

"اسی کا تو فائدہ اٹھانا ہے۔" اس نے کہا پھر پلاسٹک پیپر پر چھپا ہوا ایک خوب صورت نقشہ میرے سامنے کر دیا۔ یہ اسکیم تھرٹی تھری کا نقشہ تھا۔ "سائیں آپ کو اس علاقے میں ملنے والے ہر چانس کا سودا اٹھانا ہے۔"

چانس کے سودے سے مراد کوئی ایسی زمین یا جائداد جو کسی وجہ سے اپنی اصل مالیت سے کم پر مل رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔ "کام ہو سکتا ہے کیا آپ کے پاس کوئی پارٹی ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔" اس نے کہا۔ "آپ کو تین فیصد کمیشن دیا جائے گا مگر ایک بات کا خیال رکھنا ہے سودا جتنا اضافی فائدے والا ہو اتنا اچھا رہے گا۔ کمرشل ہو، سنگل پٹی ہو کارنر اور ویسٹ اوپن ہو۔ لیکن ایسا ضروری نہیں ہے۔ اگر اس سے ہٹ کر کوئی عام سودا کم قیمت میں مل رہا ہے تو وہ بھی پکڑنا ہوگا۔"

مجھے کاروبار کے نقطہ نظر سے اس کی پیشکش اچھی لگی کیونکہ ایسے کوئی نصف درجن سودے تو میرے پاس بھی تھے اور اتفاق سے یہ سب اسی علاقے میں تھے کیونکہ میں زیادہ تر یہیں کام کرتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "رینج کیا ہوگا؟"

"کوئی حد نہیں ہے۔ اگر فلیٹ کے لیے مخصوص پلاٹ بک رہے ہوں تو وہ بھی چاہئیں۔"

میں اندر سے خوش ہو گیا اس کا مطلب ہے رفیع مرزا کے پاس پارٹی بڑی تھی اور بڑی پارٹی اس وقت تک پیسا نہیں لگاتی ہے جب تک اسے اپنے ایک ایک پیسے کی مع سود واپسی کا یقین نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ حالات بدلنے والے تھے اور زمین و جائداد کی قیمت اوپر جانے والی تھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "مکرم شاہ سوچنے میں وقت ضائع نہ کریں۔ یہ بھی چانس کا سودا ہے۔ کیونکہ صاف سودے کرتا ہیں اس لیے آپ کو بلایا ہے۔ آپ کو بھی مسئلہ نہیں ہوگا اور پارٹی بھی مطمئن رہے گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ جانتے ہیں یہ سودے کیسے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک گھنٹے کی دیر سے سودا ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں میری بات؟"

"بالکل سائیں، آپ بے فکر رہیں، ایک اکاؤنٹ آپ کو ہینڈ اوور کر دیا جائے گا۔ آپ اس کا چیک دے سکتے ہیں۔ چیک دینے کے بعد آپ سودے کی تفصیل مجھے دو گے اور میں آگے اوکے کروا دوں گا۔"

ایسا لگ رہا تھا جیسے رفیع مرزا نے سب پہلے سے طے کر لیا تھا۔ اس نے ادائیگی کا طریقہ کار بھی نہایت چالاکی سے طے کیا تھا۔ میں سودا کرتا اور چیک دیتا یعنی میرے ہاتھ میں کیش نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ مجھے دس ہزار، پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے چیک کراس کر کے دیے جائیں گے۔ میں سودے کی قیمت کے لحاظ سے آگے چیک دوں گا۔ سودے میں اگر کوئی گڑبڑ محسوس ہوتی تو دو دن میں چیک کی ادائیگی روکی جا سکتی تھی۔ اس وقت آن لائن سسٹم نہیں تھا۔ اس لیے چیک دو دن میں کلیئر ہوتا تھا۔ صرف ایک فون کال کر کے ادائیگی روکی جا سکتی تھی۔ مجھے اعتراض ہوا۔ "اس طرح تو میری بات خراب ہوگی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ آپ فوراً بیعانہ دے دیں۔ اگر پارٹی سکون والی ہے تو چھان بین کر کے ہی بیعانہ دیا جائے گا ہاں پارٹی عجلت میں ہو اور دوسری جگہوں پر بھی بھاگ رہی ہو تو اسے پکڑنے کے لیے چیک دیا جا سکتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں اول تو ایسا بہت کم ہوگا شاید دس میں سے ایک سودے میں نوبت آئے دوسرے اس کام میں اونچ نیچ تو چلتی ہے کیا آپ کے سودے کینسل نہیں ہوتے؟"

"ان کا نقصان گاہک کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں براہِ راست سودے میں شامل نہیں ہوتا ہوں۔ مجھے کمیشن کا نقصان ہوتا ہے لیکن یہاں تو میں براہِ راست سودے میں شامل ہو رہا ہوں اگر اس میں نقصان ہوا تو ذمے دار کون ہوگا؟"

"اس کا تعین کر لیا جائے گا۔" رفیع مرزا نے چالاکی سے کام لیا وہ صاف بات نہیں کر رہا تھا۔

"نہیں سائیں، آپ واضح بتائیں، میں چھوٹا ایجنٹ ہوں، نقصان برداشت نہیں کر سکتا، اگر آپ نقصان خود برداشت کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ آپ کوئی دوسرا بندہ تلاش کر لو۔"

"نہیں نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "ٹھیک ہے سائیں، نقصان آپ کا ذمہ نہیں ہوگا لیکن اس صورت میں آپ کو بہت احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے کام کے معاملے میں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ سودے پکے ہوں گے۔"

رفیع مرزا خوش ہو گیا۔ "یہی تو میں چاہتا ہوں۔ یقین کریں آپ کو بہت فائدہ ہوگا چند سال میں اتنا کما لو گے کہ پھر بیٹھ کر کھاؤ گے۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے کہا ویسے مجھے اس کی بات کا پورا یقین نہیں تھا کیونکہ وہ چکر باز آدمی تھا اور مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ دھوکا نہ کر جائے۔ پراپرٹی کے کام میں بے شمار چکر ہوتے ہیں، برسوں پرانے کام کرنے والے بھی چکر میں آ جاتے ہیں۔ مگر جب میں نے دو تین سودے کرائے اور کوئی مسئلہ نہیں ہوا تو مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ میرا کمیشن ہاتھ کے ہاتھ ملتا تھا۔ ایک سال میں، میں نے کوئی پچاس کے قریب سودے کرائے اور اتنا کمایا کہ پانچ سال میں بھی اتنا نہیں کما سکتا تھا۔ اس کے بعد مارکیٹ اٹھنا شروع ہوئی۔ میں نے خود جو کمایا تھا اس کا بیشتر حصہ پراپرٹی میں لگا دیا۔ نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اس کام میں بہت تیزی آ گئی تھی۔ اچھے علاقوں میں قیمت ہفتے اور مہینے کے حساب سے بڑھ رہی تھی۔ ان دنوں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ دن رات کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ کمائی کے چکر نے ایسا جکڑ لیا تھا کہ بیوی بچوں کے لیے وقت نہیں ملتا تھا۔

دو ہزار تین تک یہ مصروفیت برقرار رہی۔ پھر مارکیٹ بیٹھنا شروع ہو گئی۔ اگرچہ اچھے علاقوں میں اب بھی قیمت اوپر جا رہی تھی لیکن جس اسکیم میں، میں رفیع مرزا کے لیے کام کر رہا تھا وہاں قیمتیں اچانک ہی آدھی گر گئی تھیں۔ میں صرف خریداری کراتا تھا اس دوران میں مجھ سے ایک بھی پراپرٹی فروخت نہیں کرائی گئی تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مارکیٹ گرنے سے پہلے رفیع مرزا اور اس کی پارٹی اپنا سرمایہ منافع کے ساتھ نکال چکی ہوگی۔ نقصان ان کے بعد خریدنے والوں کے حصے میں آیا ہوگا۔ چار سال تک میں ان کے لیے کام کرتا رہا۔ پھر جب انہوں نے خریداری ختم کی تو میں نے بھی پراپرٹی سے اپنا سرمایہ نکال لیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اب پراپرٹی بیٹھے گی اور ایسا ہی ہوا۔ کنٹریکٹ ختم ہوا لیکن رفیع مرزا کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی، اس دوران میں، میں نے اتنا کما لیا تھا کہ اب ساری عمر بیٹھ کر بھی کھاتا تو گزارہ ہو جاتا۔

لیکن آدمی کی فطرت ہے کہ لاکھ کمانے والا کروڑ کمانا چاہتا ہے اور کروڑ کمانے والا ارب کمانا چاہتا ہے۔ اس لیے میں بھی آرام سے بیٹھنے کے بجائے مصروفِ عمل رہا۔ اپنے علاقے میں کام شروع کر دیا۔ یہاں صورتِ حال اچھی تھی۔ آنے والے تین چار سالوں میں اور بھی اچھا کمایا۔ پھر اس کے بعد پراپرٹی کا کام دوبارہ اپنی ایک عشرے پہلے والی ڈگر پر آ گیا یعنی اب ہمیں گاہک کے آگے پیچھے ہونا پڑتا تھا اور ایک ایک سودے کے لیے بے تحاشا بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی۔ رفیع مرزا سے رابطہ ختم ہوا تو ملنا جلنا بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہی ہو گیا۔ البتہ اس کے بارے میں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اب بڑوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے بہت کمایا تھا۔ پہلے گلشن میں رہتا تھا لیکن پھر کلفٹن شفٹ ہو گیا۔

پھر اطلاع آئی کہ زمینوں پر قبضے کے کیس میں رفیع مرزا گرفتار ہو گیا ہے اور عدالت میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ وہ پچھلی حکومت کا منظورِ نظر تھا، نئی حکومت آئی تو اس کی بھی کم بختی آ گئی۔ زمینوں پر قبضے کے کیس کھل گئے اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس کے بارے میں خبریں آنا بند ہو گئیں۔ روزگار کے ساتھ ساتھ امن و امان، پانی، بجلی اور گیس کے مسائل نے ہر فرد کو یوں گھیرا کہ کسی کو کچھ یاد نہیں رہا تو رفیع مرزا کہاں یاد رہتا۔ موقع کی مناسبت سے میں نے ہاتھ پاؤں سمیٹ لیے تھے۔ پراپرٹی تو مستقل ڈاؤن جا رہی تھی اور اب بھی برا حال ہے۔ بڑی مشکل سے مہینے میں ایک دو سودے ہوتے تھے لیکن کرائے پر مکانوں اور فلیٹوں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ چھ سات مکانات اور فلیٹ کرائے پر دلانے سے اتنا مل جاتا ہے کہ مہینے کا خرچ نکل آتا ہے۔

بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ سب سے بڑا انجینئر بن گیا ہے اور اس سے چھوٹا ابھی ایم بی اے کر رہا ہے۔ بیٹی ایم بی بی ایس کے پہلے سال میں ہے۔ رحیم کو ایک الیکٹرانکس کے کارخانے میں جاب ملی ہے مگر فی الحال وہ اپنا ہی خرچہ پورا کر رہا ہے یعنی باقی گھر مجھے ہی چلانا پڑتا ہے۔ اگر میں نے پہلے سے نہ کما رکھا ہوتا تو اپنے بچوں کو یوں اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں رفیع مرزا کا احسان مند تھا۔ کیونکہ اسی نے کمائی کا یہ موقع دیا تھا۔ اگرچہ بعد میں آنے والی گرم بازاری میں تقریباً ہر اسٹیٹ کا کام کرنے والے نے کچھ نہ کچھ کمایا تھا۔ مگر ہر ایک کو یہ موقع نہیں ملا تھا جو رفیع مرزا نے مجھے دیا تھا۔ میں اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن

اس کا یہ احسان ضرور مانتا تھا۔ اگرچہ اس میں بھی اس کی اپنی غرض تھی، اسے معلوم تھا میں غلط سودا نہیں کروں گا اور اسے دھوکا نہیں دوں گا۔ وہ پوری بے فکری سے میرا لایا ہوا سودا آگے کرسکتا تھا۔

رفیع مرزا نے جو کیا تھا اب وہ اس کی سزا بھگت رہا تھا۔ میں نے اب تک جتنے قبضہ گروپس کے کرتا دھرتاؤں کو دیکھا تھا، وہ حرام تو کما لیتے تھے مگر عام طور سے ان کا انجام عبرت ناک ہوتا تھا۔ ان کا کمایا ہوا حرام بیماریوں اور ناگہانی اموات کی صورت میں نکلتا تھا۔ ایک مشہور قبضہ گروپ کا سربراہ جس نے اربوں کی زمین قبضہ کرکے بیچی تھی۔ اس کے دو جوان بیٹے دشمنی میں مارے گئے اور اب خود فالج کا شکار ہوکر اسپتال میں پڑا ہے۔ بیوی اور بیٹیاں اسے پوچھتی بھی نہیں ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال دوسروں کا ہے۔ ہم یہ سب کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر عبرت بہت کم لوگ پکڑتے ہیں۔ زمین کے معاملے میں فراڈ اور دھوکا کرنے پر رب کائنات کی پکڑ بہت سخت ہوتی ہے اور آخرت میں جو سزا ملے گی وہ تو واضح ہے۔ اس لیے میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ مجھ سے اس معاملے میں کوئی غلطی بھی نہ ہو۔ بے شک مجھے مالی نقصان ہوجائے لیکن اللہ کی پکڑ سے بچ جاؤں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خراب حالات میں بھی جب دوسرے بیکار بیٹھے ہیں یا دوسرے تیسرے دھندوں میں پڑ گئے ہیں آج بھی میں سکون سے اپنا گھر چلا رہا ہوں۔

میں صبح دس بجے دفتر کھول لیتا ہوں۔ ریاض بارہ بجے آتا تھا اس وقت تک میں آنے والے گاہکوں سے نمٹتا تھا اس کے بعد میں وزٹ پر نکل جاتا اور ریاض دفتر دیکھتا۔ شام تک میں گاہکوں کو پراپرٹی دکھاتا اور پھر دفتر آجاتا۔ کبھی شام کے بعد بھی جانا ہوتا تھا لیکن عام طور سے میں شام سے پہلے اس قسم کے کام نمٹا لیتا تھا۔ مغرب کے بعد میں صرف مجبوری میں کسی کو وزٹ کراتا تھا۔ اس روز میں شام کے وقت ایک گاہک کو بکنے والا فلیٹ دکھا رہا تھا کہ ریاض کی کال آئی۔ ”مرزا صاحب آئے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”کون مرزا صاحب؟“

”رفیع مرزا صاحب۔“ ریاض نے بتایا تو مجھے جھٹکا لگا تھا۔

”اچھا میں آتا ہوں تقریباً آدھا گھنٹا لگے گا اُن کو چائے پانی کا پوچھو۔“

گاہک کو فلیٹ دکھا کر میں آدھے گھنٹے سے پہلے واپس دفتر پہنچ گیا تھا جہاں رفیع مرزا میرا منتظر تھا۔ زمانہ کیسے بدل گیا تھا۔ وہ شخص جس کا ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا تھا آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کہاں وہ چمکتا دمکتا شخص، سرخ و سفید رنگت اور سلیقے سے کلر کیے ہوئے سیاہ بال ہوتے تھے۔ بے داغ اور بے شکن لباس ہوتا تھا۔ کہاں یہ جلی ہوئی سانولی رنگت والا شخص جس کے بالوں اور داڑھی کا بیشتر حصہ سفید ہوگیا تھا۔ شکن آلود لباس میں پریشان حال نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہوگیا۔ عاجزی سے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے۔

”مکرم شاہ صاحب، کیسے ہیں آپ؟“

”اللہ کا شکر ہے مرزا صاحب۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کیسے ہیں، بہت دنوں بعد زحمت کی۔“

”آپ کے سامنے ہوں۔“ وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”باقی آپ سمجھدار ہیں، آدمی کیوں آدمی کے پاس آتا ہے؟“

میں اسے کونے میں اپنی میز پر لے آیا۔ موسم کی مناسبت سے میں نے چائے منگوائی۔ ”میں نے سنا تھا کہ آپ.....“

”ٹھیک سنا تھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کئی کیس تھے، نمٹتے نمٹتے کئی سال اور ساری جمع پونجی لگ گئی۔ باعزت بری ہوگیا لیکن خالی ہاتھ پھر رہا ہوں۔“

”پھر سے کام شروع کیا؟“

”اسی سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا ہوں، آپ کے پاس بھی اسی لیے آیا تھا۔“

چائے آئی۔ میں نے کپ بنا کر اس کے سامنے رکھا۔ ”حکم کریں مرزا صاحب؟“

اس نے سرد آہ بھری۔ ”حکم کیا ہم تو درخواست کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔“

رفیع مرزا کا حلیہ درست نہیں تھا اور باتوں سے بھی مایوسی ٹپک رہی تھی لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے ہمت ہار جانے والوں میں سے تھا۔ جہاں تک میں نے اسے جانا تھا وہ آخر تک مقابلہ کرنے والے لوگوں میں سے تھا۔ مجھے تو اس میں بھی شک تھا کہ اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا تھا اس نے کروڑوں نہیں اربوں کمائے تھے۔ کیا یہ ساری رقم اس نے خود کو بری کرانے پر خرچ کردی ہوگی۔ ہمارا نظامِ انصاف عام آدمی کے لیے مہنگا ہے لیکن دولت

مندوں کے لیے سستا ہوجاتا ہے۔ چائے پی کر اس نے کپ رکھا اور آگے جھک کر بولا۔ ”آپ.... سوسائٹی کے بارے میں تو جانتے ہوں گے؟“

اس نے جس سوسائٹی کا نام لیا تھا میں اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ یونیورسٹی روڈ اور سپر ہائی وے کے درمیان واقع تھی۔ پرانی سوسائٹی تھی مگر غیر آباد پڑی تھی کیونکہ بلڈر لوگوں سے پیسے وصول کرکے غائب ہوگیا تھا اور یہاں کسی قسم کا کوئی ترقیاتی کام نہیں ہوا تھا۔ بس زمین ہی پڑی تھی۔ ایک زمانے میں اس پر قبضے کی کوشش... بھی کی گئی تھی لیکن کسی وجہ سے قبضہ کامیاب نہیں ہوا تھا حالانکہ بلڈر بھی نہیں تھا اور نہ ہی بے چارے الاٹیوں میں اتنی سکت تھی کہ وہ زمین چھڑوا سکتے۔ قابض خود چلے گئے تھے۔ شاید آس پاس کی آباد ہوجانے والی پوش سوسائٹیوں کے مکینوں نے کوئی جیک لگایا تھا، وہ اپنی سوسائٹیوں کے پاس کوئی مشکوک کچی آبادی نہیں چاہتے تھے۔ زیادہ بڑی سوسائٹی نہیں تھی مشکل سے پانچ ایکڑ پر تھی۔ ابھی یہاں صرف کیکر کا جنگل تھا۔ میرے پاس اس سوسائٹی کی کچھ فائلیں بکنے کے لیے آئی تھیں لیکن کسی نے خریدنے کی کوشش نہیں کی۔ اب تو برسوں سے کوئی پلاٹ بکنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔

”جی مرزا صاحب واقف ہوں، فی الحال اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔“

”مجھے اس سوسائٹی کے چند پلاٹ درکار ہیں؟“

”دیکھنا پڑیں گے، میرے پاس تو کوئی فائل نہیں ہے شاید کسی اور اسٹیٹ والے کے پاس پڑی ہو فائل۔“

رفیع مرزا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کسی کے پاس نہیں ہیں، یہ مخصوص پلاٹ ہیں اور مجھے یہی چاہئیں۔“

میں نے اس کی فرمائش پر غور کیا۔ ”جب کوئی فائل ہی نہیں ہے بکنے کے لیے تو میں سودا کیسے کروں گا؟“

وہ مسکرایا۔ ”ایک اسٹیٹ ایجنٹ کی صلاحیت ایسے ہی سودوں میں سامنے آتی ہے وہ لوگوں کو کیسے کچھ خریدنے یا بیچنے پر آمادہ کرتا ہے۔“

”جن کے پلاٹ ہیں اُن کے نام پتے؟“

”یہ بھی آپ کو خود تلاش کرنے ہوں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ویسے تو یہاں ریٹ ایک سو بیس گز کے پلاٹ کا دو ڈھائی سے زیادہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی اڑ جائے تو میں اس سے بھی اوپر دوں گا۔ اتنی گز کے پلاٹ کی قیمت کا آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔“

میں سمجھ رہا تھا رفیع مرزا کسی پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا جو اس سوسائٹی کے بیشتر پلاٹ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ شاید یہاں اپنی مرضی کا کوئی بنگلوز پروجیکٹ بنانا چاہتی تھی کیونکہ یہ جگہ ایسے کسی کام کے لیے نہایت موزوں تھی۔ اگرچہ آج کل حالات سرمایہ کاری کے لیے سخت ناموزوں تھے لیکن اس قسم کے پروجیکٹ سالوں لیتے ہیں۔ ممکن ہے آنے والے تین چار سال میں حالات بہتر ہو جاتے اور پھر بلڈر اپنی جیب سے کچھ نہیں کرتے ہیں وہ لوگوں سے پیسا وصول کر کے ہی آگے کام کرتے ہیں اور اس میں سے اپنا حصہ پہلے ہی نکال لیتے ہیں۔ میں نے رضا مندی ظاہر کی۔ ”ٹھیک ہے میں دیکھوں گا آپ پلاٹس کے نمبرز بتا دیں۔ کوئی اور معلومات ہو تو وہ بھی دے دیں۔“

رفیع مرزا نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھا۔ ”اس میں تمام مطلوبہ پلاٹس کے نمبرز ہیں۔“

”مرزا صاحب ٹائم کا مسئلہ بھی ہے آپ بھی جانتے ہیں کہ ان کے مالکان کا پتا لگانے میں کتنی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ اس لیے وقت لگے گا۔“

”وقت ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور ایک لفافہ نکال کر میرے سامنے رکھا۔ ”اس میں آپ کے وقت اور بھاگ دوڑ کے اخراجات کی رقم ہے۔ دوسرے ہر سودے پر دس فیصد کمیشن ملے گا اور اگر مارکیٹ ریٹ سے کم پر سودا کرا دیا تو اوپر بچنے والی رقم بھی آپ کی ہوگی۔“

اب مجھے اس معاملے سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے لفافہ ذرا کھول کر دیکھا اس میں ہزار والے بیس نوٹ تھے اور یہ معقول رقم تھی۔ میں نے لفافہ اٹھا لیا۔ ”ڈن ہے۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ ”بس تو آپ شروع کر دیں یوں سمجھ لیں کہ ایک مہینے کے اندر یہ تمام پلاٹس درکار ہیں۔ اخراجات کی رقم کا کمیشن سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“

”میرے پاس آپ کے کونٹیکٹ نہیں رہے ہیں۔“

جواب میں رفیع مرزا نے اپنا کارڈ نکال کر دیا اور مجھ سے میرا کارڈ لے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کارڈ دیکھا تو اس پر عجیب سا نام لکھا تھا۔ آشیانہ ابدی اور نیچے رفیع مرزا کا نام اور رابطے کے نمبر دیے ہوئے تھے۔ آشیانہ ابدی سے کیا مطلب تھا؟ یہ واضح نہیں تھا کہ یہ کسی سوسائٹی کا نام ہے یا کسی کمپنی کا۔ پھر میں نے کاغذ دیکھا، یہ کوئی درجن پلاٹ تھے۔ اتفاق سے اس سوسائٹی میں صرف ایک سو بیس اور اسی گز کے پلاٹ تھے۔ کیونکہ بہت پہلے شروع ہوئی تھی اور اس وقت پتا نہیں تھا کہ یہ علاقہ اتنا اٹھ جائے گا شاید اسی لیے سوسائٹی میں بڑے پلاٹ نہیں رکھے گئے تھے۔ اب اس کے آس پاس جو سوسائٹیاں آباد تھیں ان میں سب سے چھوٹا پلاٹ ایک سو بیس گز کا تھا اور ان کی تعداد بھی محدود تھی۔ دو سو، چار سو اور چھ سو گز کے پلاٹ زیادہ تھے اسی لحاظ سے ان آبادیوں کی ساکھ تھی۔ اگر اس سوسائٹی کے پلاٹ دوبارہ کاٹے جاتے اور بڑی کیٹگری رکھی جاتی تو اس کی قیمت بھی کہیں اوپر چلی جاتی۔ پھر یہاں ترقیاتی کام بھی ہو جاتے۔ یقیناً رفیع مرزا جن لوگوں کے لیے کام کر رہا تھا ان کی یہی سوچ تھی۔

اگلے روز سے میں نے کام شروع کر دیا۔ سوسائٹی کا دفتر کب کا بند ہو چکا تھا اور اس کا سارا ریکارڈ سوک سینٹر میں موجود تھا لیکن اس ریکارڈ تک رسائی آسان نہیں تھی۔ جب میں نے ریکارڈ کیپر سے مطلوبہ معلومات کے لیے کہا تو اس نے حسب توقع جواب دیا۔ ”نہیں جناب ہمیں اجازت نہیں ہے کسی کو ایسی معلومات دینے کی۔“

البتہ جب میں نے ایک خالی فائل میں ہزار کا نوٹ رکھ کر اس کے سامنے کیا اور درخواست کی کہ ایک نظر اسے بھی دیکھ لیں تو اس کا انکار اقرار میں بدل گیا۔ اس نے صفائی سے نوٹ غائب کیا اور آہستہ سے بولا۔ ”لنچ کے دوران آنا اس وقت یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے۔ میں تمہیں فائلیں دکھا دوں گا۔“

میں ایک بجے اس کے پاس پہنچا تو وہ مجھے لے کر ریکارڈ روم میں آیا اور سوسائٹی والے حصے سے فائلیں نکال کر چیک کرنے لگا۔ پلاٹ ابھی تک لیز نہیں ہوئے تھے کیونکہ لیز کی رقم بلڈر نے الاٹیوں سے وصول کر لی تھی مگر کے ڈی اے کو نہیں دی تھی۔ اس لیے کے ڈی اے الاٹیوں کو لیز دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔ حالانکہ اس میں لوگوں کا نہیں حکومت اور ان بلڈرز کا قصور ہے جنہیں زمین فروخت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ جو کام سرکار کا ہے وہ اپنے من پسند افراد کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ عوام کو جیسے چاہو لوٹو۔ بعد میں عوام کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ہے۔ فائلیں دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ تمام خیالات آ رہے تھے۔ یہ بہت غریب لوگ تھے جنہوں نے اس سوسائٹی میں پلاٹ لیے تھے اور رقم ادا کرنے کے باوجود انہیں نہ تو پلاٹ ملے اور نہ ہی اپنی ادا شدہ رقم واپس ملی تھی۔ میں نے مطلوبہ فائلوں سے الاٹیوں کے پتے، این آئی سی نمبر اور دیے ہوئے فون نمبر نوٹ کیے۔ لیکن فون نمبر سب کے ساتھ نہیں تھے۔ پتے بھی مشکوک تھے کیونکہ یہ دو عشرے پرانے پتے تھے۔ آج نہ جانے وہ لوگ ان پتوں پر ملتے بھی یا نہیں۔

میں نے کوشش شروع کی۔ سب سے پہلے ان پتوں کی تصدیق کی۔ درجن میں سے آٹھ افراد وہیں کے رہائشی نکلے جو پتا لکھوایا تھا۔ ان میں سے تین انتقال کر گئے تھے اور اب پلاٹ وارثوں کے نام تھے۔ وارثوں سے بات کرنے میں آسانی ہوئی۔ وہ مایوس تھے کہ اب ان کے پلاٹ کو کون لے گا وہ اسے فروخت کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ میں نے رابطہ کیا اور انہیں آفر کی تو وہ راضی ہو گئے تھے۔ یہ تین سودے تو ایک ہفتے کے اندر ہو گئے تھے۔ رفیع مرزا بہت خوش تھا اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی کام دکھاؤں گا۔ اس دوران میں، میں باقی چار افراد کی تلاش کرتا رہا۔ یہ کام آسان نہیں تھا وہ ان جگہوں کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ محلے والوں سے مل کر ان کے نئے پتے کا معلوم کرتا رہا۔ یہ آسان نہیں تھا کیونکہ اکثر لوگوں کو نہیں معلوم تھا کہ محلہ چھوڑنے والے کہاں گئے تھے اور بات بھی خاصی پرانی ہو گئی تھی۔ واقف کار آدمی کو تلاش کرنا بھوسے میں سے سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔ میرا کام ہی ایسا تھا اس میں اکثر اوقات بہت زیادہ بھاگ دوڑ اور کوشش کے بعد بھی ہاتھ میں کچھ نہیں آتا اور دس میں سے کوئی ایک سودا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ میں نے اسٹیٹ کے دوسرے کام ریاض پر چھوڑ دیے تھے۔ وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ میں صرف رفیع مرزا کا کام کر رہا تھا۔ تین سودوں میں مجموعی طور پر سوا لاکھ روپے ملے تھے اور یہ پورے مہینے کی کمائی کے برابر رقم تھی اس لیے بھاگ دوڑ بری نہیں لگ رہی تھی۔

جن پانچ پلاٹوں کے مالکان زندہ تھے، ان سے رابطہ کیا۔ ان میں سے چار بیچنے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن ایک بڑی بی نے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پلاٹ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے رکھا ہوا تھا اور وہ اسے اسی وقت فروخت کریں گی جب ان کی بیٹی کی شادی ہوگی۔ ان کو ڈھائی لاکھ سے زیادہ کی رقم کی پیشکش کی گئی لیکن ان کے ذہن میں بیٹھا ہوا تھا کہ صرف پلاٹ کی صورت میں ان کی رقم محفوظ رہے گی۔ وہ اسے کیش کرانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان کی بیٹی ابھی صرف بارہ برس کی تھی اور کم سے کم چھ سات برس تک اس کی شادی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے رفیع مرزا سے کہا تو اس نے آفر بڑھانے کو کہا۔ میں نے ایسا بھی کر کے دیکھ لیا آفر تین لاکھ تک لے گیا مگر خاتون مان کر نہ دیں۔ ایک مہینا گزر گیا درجن میں سے دس سودے ہو گئے تھے۔ ایک خاتون کا اور ایک گم شدہ صاحب کا پلاٹ مسئلہ بنا ہوا تھا۔ ان کا پتا تمام تر کوشش کے باوجود نہیں چلا تھا۔ میں نے رفیع مرزا سے کہا۔

”یہ دو پلاٹ اٹک گئے ہیں، اب بتائیں کیا کرنا ہے؟“

”یار تم اسٹیٹ والے ہو کوئی جگاڑ لگاؤ، کوشش کرو کسی بھی طرح اس بڑھیا کو راضی کرو۔“

”چلیں وہ بڑھیا تو سامنے ہے اسے راضی کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن جو سرے سے غائب ہوا ہے اسے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں اخبار میں اشتہار دوں اور بڑے پیمانے پر دوں، کسی نہ کسی کی نظر تو پڑے گی۔“

”ایسا کر کے بھی دیکھ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ یہ صاحب یا تو ملک سے باہر چلے گئے ہیں یا پھر دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔“

”میں اسے دیکھتا ہوں تم بڑی بی کو آمادہ کرو۔“

جب سودے ہونا شروع ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ پلاٹ خود رفیع مرزا خرید رہا ہے کیونکہ سیل ڈیڈ اس کے نام پر ہو رہے تھے۔ جب کہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی پارٹی کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہ سارا چکر مجھے عجیب و غریب لگنے لگا تھا۔ وہ اتنی کوشش کر رہا تھا ان چند پلاٹوں کے لیے جبکہ وہ اس سے کہیں بڑی زمین ایک وقت میں قبضہ کر کے بیچ کر کھا بھی گیا تھا۔ اس لاوارث سوسائٹی کے چند پلاٹ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بن سکتے تھے۔ تب وہ اتنا لمبا چکر کیوں چلا رہا تھا؟ میں نے اشاروں میں اس سے پوچھا بھی تھا لیکن وہ ٹال گیا۔ اس سے مجھے لگا کہ وہ کوئی بڑا گیم کھیل رہا تھا۔ میں نے بڑی بی سے ایک ملاقات اور کی۔ وہ بہت غریب تھیں۔ ایک تقریباً کچی آبادی میں دو کمروں کے مکان میں رہ رہی تھیں۔ یہ پلاٹ ان کے شوہر نے ان کے نام پر لیا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

”اماں اس سوسائٹی کی ویلیو نہیں ہے۔“

”بیٹا کبھی تو ہو جائے گی۔“

مجھے خطرہ لگ رہا تھا کہیں تنگ آ کر رفیع مرزا ان کا پلاٹ ہی نہ کھا جائے اور اس کے لیے ایسا کرنا بہت آسان

تھا۔ وہ اسے اپنے نام پر لیز کرا سکتا تھا کیونکہ ابھی یہ زمین لیز نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس خطرے کا ذکر ڈھکے چھپے انداز میں کیا۔ ”اماں کیا فائدہ کوئی بااثر آدمی پلاٹ پر قبضہ کر لے تب آپ کیا کریں گی؟“

”بیس سال سے تو کسی نے قبضہ کیا نہیں تو اب کیا کرے گا۔“

”اماں زمین بیچ کر سونا لے لو اس کی قیمت بھی بڑھتی ہے۔“

وہ اس پر بھی تیار نہیں تھیں۔ ”بیٹا میں غریب عورت کہاں سونا سنبھالتی پھروں گی ابھی تو سکون سے بیٹھے ہیں پھر سکون بھی نہیں رہے گا۔ ہر وقت ڈر لگا رہے گا کہ کوئی آ کر ہم ماں بیٹی کو مار نہ جائے۔ سونا جائے ساتھ ہی جان بھی جائے۔“

میں نے تنگ آ کر کہا۔ ”آپ زمین ہی کیوں رکھنا چاہتی ہیں؟“

”میرے میاں نے کہا تھا کہ زمین کبھی نقصان نہیں دیتی ہے ہمیشہ فائدہ دے کر جاتی ہے۔“

بڑی بی سے بات کرتے ہوئے اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کہا۔ ”اماں ایک تجویز ہے، آپ کا یہ پلاٹ ابھی الاٹ ہے، لیز نہیں ہے، کوئی ترقیاتی کام بھی نہیں ہوا ہے اگر آپ کو اس بدلے لیز جگہ پلاٹ مل جائے اور وہاں تھوڑا بہت کام بھی ہوا ہو تو کیسا رہے گا۔ اس میں خطرہ ہے لیز پلاٹ میں اتنا خطرہ نہیں ہوتا ہے۔“

بڑی بی سوچ میں پڑ گئیں۔ میرے پاس ایک لیز سوسائٹی کی فائل پڑی تھی یہ ذرا دور اور سپر ہائی کے ساتھ تھی لیکن اس کی ویلیو بڑھنے کا امکان تھا کیونکہ یہاں بجلی اور پانی آنے والا تھا۔ بڑی بی کو قائل کرنے کے لیے میں نے انہیں اس جگہ کا وزٹ کرایا اور پلاٹ بھی دکھایا۔ انہیں یہ سوسائٹی پسند آ گئی کیونکہ جس سوسائٹی میں پلاٹ تھا وہاں تو جنگل تھا اور یہاں سڑکیں بن گئی تھیں۔ سیوریج ڈال دی گئی تھی۔ پانی کی لائنیں اور بجلی کے کھمبے کی تنصیب بھی مکمل ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں تعمیرات کا آغاز ہو گیا تھا اور آنے والے تین چار سال میں سوسائٹی اٹھ جاتی۔ میرے پاس جو فائل تھی اس کا مالک پونے تین لاکھ مانگ رہا تھا۔ جب کہ رفیع مرزا نے اس پلاٹ کے حصول کے لیے مجھے تین لاکھ کی حد دی تھی۔ میں نے اس سے اجازت لی اور ضروری کارروائی کرا کے پلاٹ بڑی بی کے نام ٹرانسفر کرا دیا اور ان کا پلاٹ رفیع مرزا کے نام پر آ گیا۔ یہ ساری کارروائی ایک ہفتے میں ہو گئی تھی میں نے بڑی بی سے وعدہ کیا تھا کہ پلاٹ بکنے کا وقت آئے گا تو میں اچھی سے اچھی قیمت میں بکوانے کی کوشش کروں گا۔ یوں وہ بھی خوش ہو گئیں اور رفیع مرزا کا کام بھی ہو گیا تھا۔

اس سودے کے بعد رفیع مرزا نے کہا۔

”یہ بھی نمٹ گیا بس اب آنکھ کی سوئیاں باقی رہ گئی ہیں۔“

”یعنی گم شدہ پلاٹ مالک؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے مسلسل دو ہفتے ہر اتوار کو پانچ بڑے اخباروں میں اشتہار دیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا کسی نے رابطہ نہیں کیا مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ کی بات درست ہے مالک یا تو ملک سے باہر ہے یا پھر دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔“

”میرا خیال ہے اب اس ایک فائل کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ہے۔ باقی پوری سوسائٹی تو آپ خرید ہی چکے ہیں۔“

رفیع مرزا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”آپ ذہین آدمی ہیں شاہ صاحب۔“

”لیکن اتنا ذہین نہیں ہوں کہ آپ کا مقصد جان سکوں۔ سچی بات ہے میں بالکل اندازہ نہیں کر سکا ہوں کہ اس خریداری سے آپ کا مقصد کیا ہے۔ اس ساری سوسائٹی کی ویلیو ملا کر بھی ڈھائی کروڑ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ کل ایک سو چودہ پلاٹ ہیں۔ ساٹھ ایک سو بیس گز کے اور چوّن اسّی گز کے ہیں۔ یعنی یہ اتنا بڑا سودا نہیں ہے۔ کم سے کم آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ پھر آپ اس کے پیچھے اتنی خواری کیوں کر رہے ہیں؟“

رفیع مرزا نے سرد آہ بھری۔ ”بس شاہ صاحب، حالات نے یہ دن دکھائے ہیں۔ ورنہ آپ جانتے ہیں میں چھوٹے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ لیکن وقت نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔“

اتنا تو میں جان گیا تھا کہ رفیع مرزا کی مالی حالت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ ارب پتی والا زمانہ گزر گیا تھا۔ اس کا ناگن چورنگی والا عالی شان دفتر سیل ہو گیا تھا۔ رہائش بھی کلفٹن سے گلشن میں منتقل ہو گئی تھی۔ میں اس کے گھر والوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا کیونکہ اس نے اپنی اولاد کو کبھی اس کام میں شامل نہیں کیا تھا بس اتنا تھا کہ اس کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ میں نے گھر والوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے سب اپنے گھروں میں ہیں۔ بیٹیاں بیاہ دی ہیں اور دونوں بیٹے ملک سے باہر ہیں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دلائی وہی ان کے کام آ رہی ہے۔ دو بیٹیاں بھی ملک سے باہر ہیں بس ایک یہاں ہوتی ہے وہی ہم بڈھے

بڑھیا کو پوچھنے آ جاتی ہے۔“

”آپ نے اپنے بیٹوں کو اس کام میں کیوں نہیں ڈالا؟“

”شاہ صاحب، آپ جانتے ہیں جیسے اس کام میں وارے نیارے ہیں اسی طرح برا وقت آتے بھی دیر نہیں لگتی ہے۔ اس لیے بیٹوں کو پڑھائی مکمل ہوتے ہی باہر بھیج دیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اچھا ہوا ورنہ میرے ساتھ وہ بھی لپیٹ میں آ جاتے۔“

”آپ کے پارٹنر بھی تو تھے؟“

”انہی نے مروایا۔“ رفیع مرزا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”جن لوگوں کو میں زمین سے اٹھا کر آسمان تک لایا موقع پاتے ہی انہوں نے میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔ جب تک جیل میں رہا وہ باہر سب کھا پی کر غائب ہو گئے تھے اور میرے پاس بس وہی بچا جو ان کی دسترس سے باہر تھا۔ اب اسی سے خود کو دوبارہ جمانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

رفیع مرزا نے اس دن ذرا کھل کر بات کی لیکن اپنے مقصد کے بارے میں ایک لفظ نہیں نکالا کہ آخر وہ کیوں اس سوسائٹی کی ساری زمین لینا چاہتا ہے؟ اگر وہ یہاں ترقیاتی کام کرا کے آگے سیل کرنا چاہتا تھا تو اس کے لیے بہت بڑی رقم درکار تھی اور اس عرصے میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رفیع مرزا کا ہاتھ تنگ ہے۔ بے شک وہ پلاٹوں کے حصول کے لیے فراغ دلی سے خرچ کر رہا تھا۔ مگر اس کی ذاتی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایسے میں زمین پر کوئی بڑا پروجیکٹ شروع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر سوسائٹی کی جگہ کوئی فلیٹوں کا کمپلیکس بنایا جاتا تو اس کے لیے بھی بڑی رقم درکار تھی۔ جب تک رفیع مرزا کسی اور کو شامل نہ کرتا وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کچھ کر سکے مگر پارٹنر کے لفظ سے متنفر ہو گیا تھا۔ اب اس کا کہنا تھا کہ آدمی روکھی سوکھی کھا لے مگر کسی سے پارٹنر شپ میں کام نہ کرے۔ بہرحال مسئلہ آخری پلاٹ کا تھا اور لگ رہا تھا اس کے حصول کے بغیر اس کا کام نہیں ہو گا۔ اخباروں میں اشتہار کا طریقہ بھی ناکام رہا تھا۔ اب کیا رہ جاتا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا میں نے پلاٹوں کی فائلوں سے اس کا شناختی کارڈ نمبر بھی نکالا تھا۔ ظاہر ہے یہ پرانے شناختی کارڈز کے نمبر تھے۔ اب نئے کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ چل رہے ہیں اور پرانے سرے سے متروک ہو چکے ہیں لیکن اب بھی کام آ جاتے ہیں۔ میرے ایک واقف کار صابری صاحب نادرا میں آفیسر گریڈ میں تھے۔ مجھے ان کا خیال آیا۔

خواجہ آصف

1926-1996ء

نیشنل پریس ٹرسٹ کے سابق چیئرمین اور سابق مدیر روزنامہ ”پاکستان ٹائمز“، گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا اور گولڈ میڈل لیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد صحافت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ 1948ء میں پاکستان ٹائمز میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ 1960ء کے عشرے میں وہ پاکستان ٹائمز کے مدیر مقرر ہوئے اور 12 سال تک اس عہدے پر خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین بنے لیکن جنرل محمد ضیاء الحق کے عہدِ حکومت میں انہیں نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین کے عہدے سے ہٹا دیا گیا، کیونکہ انہوں نے حکومتی پالیسیوں کے مطابق اخبار کو چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایک عرصہ تک بے روزگار رہے۔ 1983ء میں انہیں دل کا شدید دورہ پڑا لیکن بچ گئے۔ بعد ازاں انہوں نے اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ ”دی مسلم“ کے مشاورتی بورڈ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1988ء میں انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ ان کے سہ ماہی رسالے کو مدوّن کرتے رہے۔ اسلام آباد میں انتقال کیا۔

مرسلہ: فاطمہ بھٹی، ملتان

میں نے ان کا نمبر ملایا اور رفیع مرزا کو ایک منٹ انتظار کا اشارہ کیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے کہا۔ ”صابری صاحب، بکرم علی شاہ بات کر رہا ہوں۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے؟“

”حکم کریں شاہ صاحب۔“ وہ بولے۔ ”کام کے بہانے سہی آپ کے نیاز تو حاصل ہوں۔“

”وہ بھی ہو جائیں گے سائیں، کام یہ ہے کہ ایک شخص کے پرانے شناختی کارڈ نمبر کی مدد سے اس کے نئے شناختی کارڈ کا پتا اور نمبر نکلوانا ہے۔“

”ہو جائے گا آپ نمبر بتائیں۔“ اس نے کہا تو میں نے نمبر بتایا۔

”ایک دو گھنٹے میں جیسے ہی معلوم ہوتا ہے میں خود آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔“

میں نے فون رکھا تو رفیع مرزا نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہ

خیال تو ذہن میں آیا نہیں، کیا کہہ رہا تھا دوسرا بندہ؟"

"صابری صاحب ہیں۔ نادرا میں چلے گئے تھے اور اب اوپری درجے کے افسر ہیں۔ پرانے واقف کاروں میں سے ہیں اور آنکھ میں مروت رکھتے ہیں اسی لیے آج بھی پہلے کی طرح ملتے ہیں۔"

ہم بیٹھے گپ شپ کرتے اور چائے پیتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد صابری صاحب کا فون آگیا۔ "شاہ صاحب مل گیا ہے۔ پتا اور نمبر نوٹ کرلیں۔"

میں نے نمبر اور پتا نوٹ کیا۔ "صابری صاحب بہت شکر گزار ہوں، ممکن ہے اس سلسلے میں دوبارہ آپ کی مدد کی ضرورت پڑے۔ اگر یہ اس پتے پر بھی نہ مل سکا تو اس کے ب فارم میں اس کے بہن بھائیوں کا پتا درکار ہوگا۔"

"اگر ب فارم بنا ہوا ہو تو مل جائے گا۔ ویسے یہ بندہ خود اب باسٹھ سال کا ہوگیا ہے۔"

"تب اس کا اپنا ب فارم ہوگا اس کی بیوی بچوں کی تفصیل ہوگی۔"

"ہاں ان کی مل سکتی ہے۔ ویسے یہ چکر کیا ہے شاہ سائیں؟"

"اسٹیٹ کا معاملہ ہے۔" میں نے مبہم انداز میں کہا اور پھر دعا سلام کر کے فون بند کردیا۔ میں نے کاغذ رفیع مرزا کی طرف بڑھایا۔ "یہ ہے اس کا نیا شناختی کارڈ نمبر اور پتا۔"

"اس کا پتا چل جائے۔"

پتا گلستان جوہر کا تھا اور شناختی کارڈ آج سے دو سال پہلے بنوایا گیا تھا آدمی بوڑھا ہوگیا تھا لیکن وہی تھا۔ "بس دعا کریں کہ زندہ ہو۔"

رفیع مرزا ہنسا۔ "حالانکہ آسانی سے پلاٹ وہ ملے جن کے مالکان مرچکے تھے۔"

"پر وہ بھی مل گئے جن کے مالکان زندہ ہیں۔"

"بس تو آپ کوشش کریں جلد از جلد یہ پلاٹ بھی مل جائے۔"

"میں آج ہی کوشش کرتا ہوں۔ پاس ہی کا پتا ہے دکان سے چلا جاؤں گا۔"

میں نے اسی رات پلاٹ کے مالک سے رابطہ کیا۔ میں نے اسے بتایا نہیں کہ اسے کتنی مشکل سے تلاش کیا ہے۔ بس اسے آفر دی کہ اس کے پلاٹ میں ایک پارٹی دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ ریٹائرڈ تھا اور گھر میں ہوتا تھا۔ اس نے برسوں پہلے یہ پلاٹ لیا تھا اور اس کی قسطیں ادا کی تھیں، اب تو وہ بھول بھی گیا تھا۔ میری پیشکش سے اسے یاد آیا۔ وہ اچھا کھاتا پیتا شخص تھا تبھی شاید اسے اپنے پلاٹ کی پروا نہیں تھی اور وہ اسے تقریباً بھول گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ کاغذات دیکھ کر بتائے گا۔ اگلے دن میں نے اس سے رابطہ کیا تو اس نے انکار کردیا۔ "شاہ صاحب معذرت کے ساتھ ابھی میرا فروخت کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"جناب اچھی آفر مل رہی ہے اور پھر اس سوسائٹی کا فی الحال کوئی مستقبل نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے، مجھے ضرورت نہیں ہے کہ میں پلاٹ فروخت کروں اب تک پڑا تھا آیندہ بھی پڑا رہے گا میرے نہ سہی اولاد کے کام آئے گا۔"

میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ذہن بنا چکا تھا اس لیے انکار پر قائم رہا۔ میں نے رفیع مرزا کو بتایا کہ آدمی نہیں مان رہا ہے۔ اس نے کوشش کرنے کو کہا۔ "اسے تین لاکھ کی پیشکش کرو۔"

"مرزا صاحب، تین پر بھی نہیں مانے گا۔ وہ خود اچھی خاصی حیثیت کا آدمی ہے گلستان جوہر میں ایک کروڑ کے مکان میں رہ رہا ہے۔ آپ خود سوچیں تین لاکھ کی اس کے نزدیک کیا حیثیت ہوگی؟"

"شاہ صاحب آپ کوشش تو کریں۔"

میں نے پھر ان صاحب سے رابطہ کیا۔ حسب توقع اس نے انکار کردیا۔ مگر ساتھ ہی پوچھ لیا۔ "یہ چکر کیا ہے آپ کا کلائنٹ اتنا بے چین کیوں ہے۔ میں دو دن پہلے خود دیکھ کر آیا ہوں وہاں جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بلڈر کا کوئی اتا پتا نہیں ہے اور لیز بھی نہیں ہے۔"

"کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہمارا کام تو سودے کرانا ہے، کوئی کیوں خرید رہا ہے اور کوئی کیوں بیچ رہا ہے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ویسے آپ کے ذہن میں کوئی قیمت تو ہوگی؟"

میں نے ایسے ہی پوچھا تھا لیکن اس کے جواب نے مجھے اچھل پڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ "اگر مجھے دس لاکھ کی آفر ہو تو میں غور کروں گا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں جناب، یہاں پلاٹ ڈھائی اور پونے تین لاکھ میں فروخت ہوئے ہیں آپ دس لاکھ مانگ رہے ہیں یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ کے کلائنٹ کی مرضی ہو تو بات

کر لیجیے گا مگر اب مہربانی کر کے میرا وقت ضائع مت کریں۔" اس کا لہجہ روکھا ہو گیا اور اس نے فون بند کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ پلاٹ رفیع مرزا کی قسمت میں نہیں تھا۔ دس لاکھ پر وہ کسی صورت نہ مانتا۔ بہر حال اسے بتانا تو تھا۔ میں نے اسے کال کر کے ناکامی کی اطلاع دی تو وہ دس لاکھ کا سن کر چپ ہو گیا۔ مجھے لگا اسے سکتہ ہو گیا ہے لیکن جب اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے اس سے بات کر لو میں دس لاکھ دوں گا۔"

مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا۔ "کیا کہہ رہے ہیں مرزا صاحب، وہ دس لاکھ مانگ رہا ہے۔"

"مجبوری ہے شاہ صاحب، مجھے یہ پلاٹ ہر صورت چاہیے۔ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ آپ اس سے رابطہ کریں اور کہیں کہ ہمیں منظور ہے لیکن کارروائی جلدی ہونی چاہیے۔"

یہاں وقت کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ الاٹ منٹ کی بنیاد پر سیل ڈیڈ ہونی تھی اور مالک حقِ ملکیت پاور آف اٹارنی کے ذریعے مرزا کو منتقل کر دیتا۔ میں نے اسے کال کی تو پہلے اس نے جھنجلائے انداز میں ریسیو کی لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میرا کلائنٹ دس لاکھ دینے کے لیے تیار ہے تو غالباً وہ بھی دم بہ خود رہ گیا تھا۔ بہر حال میں نے اسے یقین دلایا کہ یہ سچ ہے اور دیکھا جائے تو اس میں میرا فائدہ بھی تھا۔ مجھے پورے ایک لاکھ ملتے۔ دو مہینے میں اتنا کما لیا تھا کہ سال بھر کا خرچ نکل آیا تھا۔ اگلے دن میں نے سیل ڈیڈ کرا دیا اور رفیع مرزا نے رقم ادا کر کے فائل لے لی تھی۔ اس کے بعد وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا تو طویل عرصے تک اس کی صورت نہیں دکھائی دی تھی۔ یہ آج سے کوئی دو سال پہلے کی بات تھی.... بہر حال رفیع مرزا سے یہ دوسرا دور بھی میرے لیے فائدے مند رہا تھا۔

یہ چند مہینے بعد کی بات ہے میں اس طرف سے گزر رہا تھا کہ سوسائٹی کی زمین پر دو عدد بلڈوزر جھاڑیاں کاٹ کر ایک جگہ جمع کر رہے تھے اور ساتھ ہی ایک طرف مزدور اور مستری پتھر اور سیمنٹ کی مدد سے دیوار اٹھا رہے تھے۔ میں نے بائیک روک لی اور ایک مستری سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"زمین صاف کر کے ادھر چار دیواری بنانی ہے۔" مستری نے جواب دیا۔

"کون کروا رہا ہے یہ کام؟"

"رفیع صاحب کرا رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا تو میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ یہ تو واضح تھا کہ رفیع مرزا کا کچھ کرنے کا ارادہ تھا۔ تبھی اس نے فوری طور پر یہ کام شروع کرا دیا تھا۔ زمین بہت بڑی تھی۔ جھاڑیوں کی صفائی تو ایک دن میں ہو سکتی تھی لیکن چار دیواری بننے میں یقیناً خاصا وقت لگتا۔ اب یہ ہوتا کہ میں جب بھی اس طرف جاتا اس جگہ کا معائنہ ضرور کرتا تھا۔ دوسری بار گیا تو ایک طرف کی دیوار مکمل ہو چکی تھی۔ یہ زرد بھربھرے پتھروں اور سیمنٹ کی مدد سے بنائی جانے والی فٹ بھر موٹی اور کوئی آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ اس دوران میں کچھ مزدور زمین کھود کر مٹی ہموار کر رہے تھے۔ وہ پتھر اور جھاڑیوں کی جڑیں نکال رہے تھے۔ صاف کی گئی جھاڑیاں ایک طرف پڑی خشک ہو رہی تھیں۔ تیسری بار گزرا تو دوسری دیوار بھی مکمل ہو گئی تھی اور تیسری پر کام جاری تھا۔ زمین ہموار کر دی گئی تھی اور جھاڑیاں جلا کر ان کی راکھ زمین پر پھیلا دی گئی تھی۔

اس سے اگلی بار گزرا تو چار دیواری مکمل ہو گئی تھی۔ اس میں سڑک والی طرف بڑا سا جالی دار فولادی گیٹ بھی لگ گیا تھا اور گیٹ کے بالکل ساتھ تعمیر کا کام جاری تھا۔ اس بار میں نے اندر جا کر دیکھا۔ چند مستری اور مزدور تین کمروں کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ یہ آر سی سی تعمیر نہیں تھی کیونکہ صرف اینٹیں رکھی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بکنگ آفس بنایا جا رہا تھا۔ ایک کمرا خاصا بڑا تھا اور باقی دو چھوٹے چھوٹے تھے۔ مین گیٹ بڑا اسٹائلش قسم کا تھا۔ چار دیواری سرخ مائل زرد بڑے چھوٹے پتھروں کی بنائی گئی تھی اور اب اس پر زعفرانی رنگ کیا جا رہا تھا۔ احاطے کے اندر دیوار کے ساتھ اور جا بہ جا تیزی سے بڑھنے اور خوشنما صورت اختیار کرنے والے درخت لگائے گئے تھے۔ زمین بالکل صاف اور ہموار کر دی گئی تھی۔ چونے سے لائنیں بنا کر بڑے بڑے حصوں کو الگ کیا گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جلد یہاں کام کا آغاز کیا جائے گا۔

اتفاق سے ان ہی دنوں مجھے دل میں تکلیف اٹھی اور اس کی فکر میں لگ گیا۔ معائنہ کرایا تو دل میں دائیں طرف کی دو رگیں بند نکلی تھیں۔ ڈاکٹر نے فوری بائی پاس کرانے کا مشورہ دیا۔ مسئلہ انجیو گرافی کی حد سے نکل گیا تھا۔ اس لیے سوائے آپریشن کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ بلڈ پریشر کا مسئلہ خاصے عرصے سے مسلسل ساتھ تھا۔ دوائیں کھاتا اور کبھی غفلت کر جاتا تھا۔ اسی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا تھا۔ ایک مہینے

بعد بائی پاس کا آپریشن ہوا۔ ایک ہفتے کارڈیو میں رہا تھا۔ پھر گھر آ گیا۔ ڈاکٹروں نے کم سے کم چھ مہینے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ خود میری ہمت بھی نہیں تھی اس لیے آرام کرتا رہا۔ بیوی بچے خوش تھے کہ ان کے ساتھ ہوں۔ کام کوئی تھا نہیں اور ڈاکٹروں نے فی الحال آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اسی غرض سے بیوی بچوں کے ساتھ حیدر آباد ہو آیا جہاں ہمارا آبائی گھر تھا۔

اس دوران میں ریاض کام کرتا رہا اور اس نے بہت اچھے انداز سے ایجنسی سنبھالی تھی۔ آمدنی میں فرق نہیں آنے دیا تھا اس لیے میں اسے تنخواہ کے علاوہ آمدنی سے حصہ دینے لگا۔ تنخواہ کے علاوہ جو سودے وہ کراتا تھا اس کا ساٹھ فیصد کمیشن.... اسے پہلے بھی ملتا تھا۔ آٹھ مہینے بعد میں نے دوبارہ دفتر جانا شروع کیا لیکن دفتر آنے کے باوجود میں کچھ عرصے پہلے کی طرح باہر نہیں نکل سکا تھا کیونکہ ذرا سی بھاگ دوڑ کرنے سے تھک جاتا تھا۔ باہر کا سارا کام اب ریاض نے سنبھال لیا۔ بہر حال رفتہ رفتہ طبیعت سنبھلنے لگی تو پہلے کی طرح کام کرنے لگا۔ ایک کلائنٹ نے اسی طرف مکان فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جس طرف رفیع مرزا نے زمین لی تھی۔ میں اس طرف گیا تو مجھے خیال آیا۔ کلائنٹ سے نمٹ کر میں رفیع مرزا کی زمین پر آیا۔ یہاں اس دوران میں تعمیرات کا کام مکمل ہو گیا تھا اور سادہ سی سفید عمارت تیار تھی۔ مگر اس کے علاوہ نہ تو زمین کھودی گئی تھی اور نہ ہی کسی تعمیر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ اس وقت احاطے کے ایک طرف چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ ایک بس کھڑی تھی اور تقریباً ساٹھ ستر افراد کا مجمع ایک جگہ گھیرے کھڑا تھا۔

زمین اسی طرح خالی تھی البتہ درخت اور دیوار سے لگی بیلیں خاصی بڑی ہو گئی تھیں۔ اس سے یہ جگہ خوب صورت اور صاف ستھری دکھائی دے رہی تھی۔ میں آگے آیا جہاں لوگ جمع تھے۔ جب میں کچھ آگے آیا تو دم بہ خود رہ گیا کیونکہ وہاں زمین میں ایک قبر کھدی ہوئی تھی اور ایک میت دفنانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ یہی نہیں وہاں تقریباً دو درجن قبریں دکھائی دی رہی تھیں۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا جو ذرا پیچھے کھڑے تھے۔ "یہ کیا جناب، یہاں قبرستان کب بنا ہے؟"

ان صاحب نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کیا مطلب قبرستان کب بنا۔ یہ قبرستان ہی ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "آپ ناراض نہ ہوں، میں

اسٹیٹ کا کام کرتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ یہ جگہ کچھ عرصے پہلے تک ایک سوسائٹی کی تھی۔ پھر ایک صاحب رفیع مرزا صاحب نے اس پوری سوسائٹی کو خرید لیا تھا۔

"رفیع مرزا صاحب نے ہی اس جگہ کو قبرستان کے لیے مخصوص کیا کیونکہ اس پورے علاقے میں قبرستان نہیں ہے اور لوگوں کو اپنی میتیں دفنانے کے لیے دور دراز کے قبرستانوں میں جانا پڑتا ہے۔ جگہ بھی مشکل سے ملتی ہے۔"

میں حیران رہ گیا تھا رفیع مرزا نے اس جگہ کو قبرستان بنا دیا تھا۔ دوسری قبروں کے ساتھ کتبے لگے تھے اور یہ جگہ اتنی صاف ستھری ہو رہی تھی کہ کم سے کم میں نے آج تک کوئی قبرستان اتنا صاف اور خوشنما نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دوسروں کے ساتھ تدفین اور دعا میں شرکت کی۔ پھر دفتر کی طرف آنے لگا۔ سفید عمارت قبرستان کا دفتر تھا۔ میری نظر احاطے کے دوسری طرف چند اور قبروں کی طرف گئی۔ ایک جگہ قبریں تھیں اور یہ چھوٹے بچوں کی تھیں جب کہ دوسری طرف قبریں عورتوں کی تھیں۔ کتبوں سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا۔ جس جگہ میت دفنائی گئی تھی، وہ جگہ مردوں کے لیے مخصوص تھی۔ گویا اس قبرستان میں تین الگ الگ حصے کیے گئے تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو الگ الگ جگہ دفن کیا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا بس پر آشیانہ ابدی ویلفیئر ٹرسٹ لکھا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا رفیع مرزا نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا اس پر بھی آشیانہ ابدی لکھا ہوا تھا۔ مین گیٹ کے اوپر بھی لوہے کی سلاخوں کی مدد سے یہی نام لکھا ہوا تھا اور اس سے قطعی پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ کوئی قبرستان ہے۔ دیواروں پر چڑھی خوشنما پھولدار بیلوں کی وجہ سے باہر سے یہ کوئی ہرا بھرا باغ لگتا تھا۔

میں دفتر کی طرف آیا میرا خیال تھا کہ وہاں شاید رفیع مرزا سے ملاقات ہو جائے۔ لیکن اس کے بجائے وہاں ایک چوکیدار اور عملے کے دو افراد تھے۔ ان میں ایک خوش پوش اور تیز طرار سا نوجوان تھا۔ یہ عمارت کے چھوٹے کمروں پر مشتمل دفتر تھا۔ جب کہ عقب میں بڑا کمرا تھا۔ اس کا راستہ دفتر سے الگ تھا۔ اندر بہترین فرنیچر اور فکسچر تھا۔ دیواروں پر قرآنی طغرے اور زندگی و موت سے متعلق احادیث فریم کی ہوئی لگی تھیں۔ نوجوان نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس نے دوسرے فرد کو جو اصل میں چپراسی تھا کولڈ ڈرنک لانے کا حکم دیا اور مجھ سے بولا۔ "میں عبدالرحیم ہوں، فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"میں یہاں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں نے براہِ راست پوچھا تو مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا۔

"کیوں نہیں جناب۔" وہ مستعد ہوگیا۔ "اگر آپ پیشگی جگہ محفوظ کرائیں گے تو آپ کو بیس فیصد ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا اور سالانہ مینٹیننس میں بھی رعایت ملے گی۔"

عبدالرحیم کی بات سے لگ رہا تھا کہ یہاں قبر کے لیے جگہ کی قیمت وصول کی جاتی تھی۔ میں نے اپنی حیرت دباتے ہوئے پوچھا۔ "جگہ کی مد میں کتنا ادا کرنا پڑے گا اور سالانہ مینٹیننس کتنی ہے؟"

"دیکھیں نارمل چارجز بڑوں کے لیے ایک لاکھ روپے اور بچوں کے لیے ساٹھ ہزار روپے ہیں اور سالانہ مینٹیننس دس ہزار ہے۔ کم سے کم دس سال کی پیشگی جمع کرانا ہوگی۔ لیکن اگر آپ پیشگی بکنگ کرائیں تو مجموعی ادائیگی میں بیس فیصد رعایت دی جائے گی۔"

میں دنگ رہ گیا تھا۔ "ایک لاکھ روپے اور اتنے ہی سالانہ چارجز.... یہ بہت زیادہ نہیں ہیں؟"

"بالکل زیادہ نہیں ہیں جناب۔" عبدالرحیم بولا۔ "دیکھیں یہاں کوئی قبرستان نہیں ہے اور میت کو بہت دور لے جانا پڑتا ہے۔ بیس سے پچیس ہزار قبر اور کھدائی کے وہاں بھی دینے پڑتے ہیں۔ پھر غسل اور جنازہ لے جانے کے اخراجات الگ ہوتے ہیں۔ سرکاری قبرستانوں کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟ دو سال بعد وہاں قبر کا سراغ بھی مشکل سے ملتا ہے۔ قبر پر قبر بنائی جا رہی ہے۔ گندگی اور کچرا ہوتا ہے۔ کتے اور آوارہ جانور پھر رہے ہوتے ہیں۔ جرائم پیشہ اور منشیات فروش اڈے بنا کر بیٹھے ہیں۔ آدمی سکون سے دعا بھی نہیں کر سکتا ہے۔"

میں نے دل میں تسلیم کیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ "لیکن یہ اخراجات پھر بھی زیادہ نہیں ہیں؟"

"بہت مناسب ہیں جناب، یوں سمجھ لیں کہ ہم صرف خدمت کے لیے بیٹھے ہیں۔ یہ زمین خریدی اور اسے صاف ستھرا کیا۔ اس جگہ کی مستقل دیکھ بھال ہوتی ہے آپ کو یہاں نہ کچرا اور گند نظر آئے گی۔ جانوروں اور غیر متعلقہ لوگوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ قبروں کی باقاعدہ دیکھ بھال اور حفاظت ہوتی ہے۔ یہاں گرینری ہے، آنے والے چند سالوں میں مزید گرینری ہو جائے گی اور ماحول مزید خوب صورت ہو جائے گا۔ ہر قبر کے ساتھ دفنانے والے کی مرضی کے مطابق آرائشی پودے لگائے جاتے ہیں۔ جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے یہاں نصف درجن افراد کا عملہ ہے جو یہاں صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتا ہے۔ ان کو تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں، آپ کو یہاں کوئی خرابی یا دل خراب کرنے والی چیز دکھائی دی ہے جو عام قبرستانوں میں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ لوگ اپنے پیاروں کو اچھی جگہ دفناتے ہیں اور جب وہ ان کے لیے دعا کرنے آتے ہیں تو ان کو کوئی کوفت نہیں ہوتی ہے۔ پھر ہم میت بس اور دوسرے لوازمات بھی فراہم کرتے ہیں جیسے غسال اور کفن و متعلقہ اشیا ان کے لیے لوگوں کو دور دراز کی مارکیٹوں میں نہیں بھاگنا پڑتا...... ادائیگی کے بعد ہر چیز ہمارے ذمے ہو جاتی ہے۔ غمزدہ لواحقین کو کسی چیز کے لیے فکر مند نہیں ہونا پڑتا...... اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک لاکھ اور ساٹھ ہزار بہت کم رقم ہے جو لوگ اپنے پیاروں کے لیے ادا کرتے ہیں۔"

عبدالرحیم بہت تیز طرار اور چرب زبان شخص تھا۔ اس میں دوسروں کو قائل کر لینے کی صلاحیت تھی۔ "کیا لوگوں نے پیشگی بکنگ کرائی ہے؟"

"بے شمار جناب۔" اس نے کہا۔ "آپ یقین نہیں کریں گے اس وقت یہاں ایک چوتھائی جگہ بک ہو چکی ہے۔ ہم نے لوگوں کے لیے ایک سہولت اور بھی رکھی ہے۔ آپ اپنے لیے بڑی جگہ بک کرا سکتے ہیں۔ یعنی قبرستان میں خاندانی احاطہ الگ ہوگا۔ اس میں مزید ڈسکاؤنٹ دیا جائے گا۔"

جب میں وہاں سے نکلا تو سوچ رہا تھا کہ رفیع مرزا نے کیا پلان سوچا تھا۔ اس نے زندوں کے بجائے مردوں کی ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی اور جتنا زندوں سے نہیں کمایا تھا اس سے زیادہ مُردوں سے کما رہا تھا۔ دو سال سے کم عرصے میں اس کا کام چل نکلا تھا۔ مجھے یقین تھا آنے والے چند سالوں میں یہ اسکیم سب سے زیادہ تیزی سے آباد ہوگی کیونکہ مُردے بجلی، گیس اور پانی جیسی سہولتیں نہیں مانگتے ہیں انہیں صرف دو گز جگہ درکار ہوتی ہے اور یہاں جگہ بہت تھی۔ یہاں ہزاروں قبروں کی جگہ تھی اور عبدالرحیم نے جو ریٹ بتائے تھے۔ رفیع مرزا اتنا کما سکتا تھا جو اس نے ساری عمر میں نہیں کمایا ہوگا۔ بلکہ یہ جگہ مستقل کمائی کا ذریعہ ہوگی۔ اس نے اپنی اولادوں کے مستقبل کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔